دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ کراچی
ستمبر 2022
قیمت 150 روپے
بانی
معراج رسول

مدیر اعلیٰ
عذرا رسول

مدیر : لیق عیال
نائب مدیر : ڈاکٹر نعیم اختر

منیجر اشتہارات
محمد شہزاد خان
0333-2256789

سرکولیشن منیجر
سید منیر حسین
0333-3285269

07 — **چینی نکتہ چینی** — مدیر اعلیٰ
قارئین کی کرم فرمائیاں اور کج ادائیاں
نامہ و پیام، محبتیں، عنایتیں اور شکایتیں

12 — **خونی محافظ** — امجد رئیس
رابرٹ کریس کے بہترین ناولوں
میں سے ایک کا انتخاب……

43 — **سرغنہ** — فاطمہ حسام
چونکا دینے والے انجام سے بھرپور
ایک دلچسپ کہانی…

49 — **بیان حلفی** — عکس فاطمہ
اس شخص کی کتھا جو دنیا کی بدصورتی
سے تھوڑی کی چاہ مانگتا

55 — **کارگزار** — سیرینا راض
مجرم کے تعاقب میں دوڑتے
بھاگتے نوجوان کی کارگزاری کا انجام

72 — **دہر** — کشام بٹ
عروس البلاد کراچی سے شہرِ ظلمات تک ”یوا“ تک
ایک سنسنی خیز اور تحیر خیز ناقابل فراموش سلسلہ

101 — **اناڑی** — خلیل جبار
ایک فرض شناس پولیس
افسر کی تحقیق و تفتیش کا نتیجہ

111 — **اُلجھن** — اے آر راجپوت
معمولی اور غیر اہم چیزوں کی
گمشدگی کا سنسنی خیز ماجرا

121 — **تیاگ** — عمران قریشی
بہترین زندگی کی خواہش میں سب
کچھ تیاگ دینے والی کی حسرت ناتمام

130 — **شعلہ زن** — روبینہ رشید
ایک سادہ و معصوم نازک اندام
دوشیزہ کی سنسنی خیز داستان

163 — **جانشیں** — جمال دستی
دادا کی پوتے کے لیے انتہائی
رہنمائی……ایک انوکھے تحفے کی رونمائی

167 — **شامت** — زہرا بتول
جیت کے نشے میں مست
شاطر محبوب کی سازبازی……

174 — **میلے ہاتھ** — ڈاکٹر عبدالرب بھٹی
غفلت اور عداوت میں گم
ہو جانے والی محبت کی جیت

199 — **موت کے بعد……** — اسما قادری
موت کے بعد سامنے آنے والے ممنوع
موسموں کی دل گداز داستاں

جلد 52 • شمارہ 09 • ستمبر 2022 • زرِ سالانہ 2000 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 150 روپے •
خط وکتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com
پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقامِ اشاعت: C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

عزیزانِ من...... السلام علیکم!

ستمبر کا شمارہ حاضر ہے...... پانی جو زندگی ہے، جب بپھرتا ہے تو اپنے ساتھ سب کچھ خس و خاشاک کی طرح بہالے جاتا ہے۔ اس کی ہولناک اور قہرباریاں آج کل ملک کے گوشے گوشے سے چلی آرہی ہیں۔ گلگت، چترال اور سوات سے لے کر رحیم یار خان، گھوٹکی، شیاری اور حیدرآباد تک آبی تباہی اور بھاری جانی و مالی نقصان کی کہانیاں عام ہیں۔ کچھ اہم سرکاری اہلکار نیاگرا فال کی تفریح کر رہے ہیں۔ کچھ عربوں کی روایتی مہمان نوازی سے فیضیاب ہو رہے ہیں۔ غنیمت ہے کہ موجودہ صورتِ حال کو عام سی تیز بارش سمجھنے والے اب ہوش میں آگئے ہیں اور امدادی سرگرمیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ نقد اور جنس کی امداد کے ایک بڑے حصے کا کیا بن رہا ہے، اس کی ایک بھیانک مثال لاڑکانہ سے سامنے آگئی ہے۔ خدا کے لیے اس آفت میں تو کچھ لوگوں کے لیے مال کی ہوس اور درندگی بھول جاؤ۔ لوٹنے اور کمانے کے مواقع آتے رہیں گے۔ امدادی مال و متاع چُرا کر فروخت نہ کرو۔ اس وقت حق داروں کو ان کا حق پہنچا دو ورنہ ذلت و رسوائی کا طوق تمہاری گردنوں کی زینت بن جائے گا۔ یہ پوری پاکستانی قوم کے لیے کڑا امتحان اور وقتِ دعا ہے۔ ہم دعا گو ہیں کہ باری تعالیٰ اس وقت کو آسانی سے گزار دے۔ جو گزر گئے...... ان کو اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور جو بچے ہوئے ہیں، ان کو زندگی کی تمام تر آسانیاں عطا فرمائے۔ اسی دل گیر دعا کے ساتھ چلتے ہیں اپنی محفل میں ——

ملتان سے انوشے ملک کی مصروفیت سے امید افزا باتیں "میڈیکل اسٹوڈنٹ ہونے کی مصروفیات میں سے جاسوسی پڑھنے کا وقت تو نکال لیتی ہوں لیکن تبصرہ لکھنے کا موقع کبھی کبھی ملتا ہے۔ جشنِ آزادی کا جاسوسی بڑے انتظار کے بعد ملا۔ اتنا نہ تڑپایا کریں کیونکہ جاسوسی کا نشہ صرف جاسوسی سے ہی پورا ہوسکتا ہے اور اس کا متبادل اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ اس دفعہ کا ٹائٹل دیکھ کر ایسا لگا جیسے مصور کوئی انڈین فلم دیکھ رہے تھے جو ایسی بندیا والی حسینہ بنا ڈالی اور اچانک ٹی وی پر ہولی وڈ کی فلم لگ گئی تو ویسٹ اور سن گلاسز والا ہیرو بنا ڈالا۔ ولن کی مونچھیں دیکھ کر یہی لگا کہ کوئی پاکستانی نیوز چینل لگا دیا تھا جہاں سیاست دانوں کی بحث چل رہی تھی۔ ان سیاست دانوں نے تو ملک کا بیڑا ہی غرق کر دیا ہے۔ میرا ملک اور اس کے لوگ ڈوب رہے ہیں اور انہیں کرسی کی جنگ سے فرصت ہی نہیں مل رہی۔ مہنگائی ہے کہ ہاتھ سے نکلتی جا رہی ہے۔ ایسے میں آپ بھی قیمت بڑھ جانے کی بات کر رہے تھے۔ مجھے ذاتی طور پر تو قیمت بڑھنے سے اتنا مسئلہ نہیں ہوگا لیکن بک اسٹال والے انکل کہہ رہے تھے کہ پہلے ہی قیمت بڑھنے کی وجہ سے لوگوں نے جاسوسی خریدنا بہت کم کر دیا ہے۔ اب آپ مزید قیمت بڑھائیں گے تو سرکولیشن میں بھی کمی ہوگی۔ میرا تو مشورہ ہے کہ فی الحال صفحات جو کم کیے ہیں انہی پر اکتفا کریں۔ یاروں کی محفل میں محمد اقبال کا تبصرہ بڑا اچھا تھا لیکن مجھے نجانے کیوں ایسا لگتا ہے کہ وہ اپنے فیورٹ رائٹرز کے علاوہ کسی کو گھاس ڈالنا پسند نہیں کرتے۔ (ہم پوچھ لیں گے باقی گھاس بچا کے کیوں رکھتے ہیں؟) زرینہ، پنا، مادرا، آیت، حمیرا نے خواتین کی بہترین نمائندگی کی۔ عمر اور حسنین کے تبصرے بھی اچھے رہے۔ انجم رئیس کی خونی محافظ پڑھنا شروع کی تو بس پڑھتی ہی چلی گئی۔ ایکشن اور ایڈونچر سے بھرپور کہانی پڑھتے ہوئے ایک دم ہی باقی آئندہ کا جھٹکا لگا تو بہت غصہ آیا۔ بہرحال باقی تبصرہ اگلی بار کے لیے محفوظ رکھتی ہوں۔ خلائی حادثہ پڑھ کر بڑا مزہ آیا اور یہ اتنی مزے دار کہانی تھی کہ میں نے اپنی بہن کو بھی پڑھوائی۔ جبر کا آغاز بہت سلو ہے لیکن ہیرو کی خوبیاں آہستہ آہستہ سامنے آرہی ہیں۔ حیران کن انداز میں وہ دشمنوں کے خلاف جال پھیلا رہا ہے لیکن یہ جاسم نام مجھے کوئی خاص پسند نہیں آیا۔ ہیرو سے زیادہ ولن کا نام لگتا ہے۔ کامیاب مرد پڑھ کر بہت ہنسی آئی۔ سب کچھ اچانک ہی اور اتفاق سے ہوتا چلا گیا۔ اس کامیاب مرد کے پیچھے کسی عورت کا ہاتھ تو نہیں تھا البتہ روڈ میں اول آنے کے لیے گھٹنے نے کامیاب کردار ضرور ادا کیا تھا۔ (بھئی یہ غلام قادر ہیں جس سے چاہیں متاثر ہو جائیں) فاطمہ حسام کی ڈراپ سین بھی جھٹکا لگانے میں کامیاب رہی۔ میں تو کچھ اور ہی سوچ رہی تھی لیکن آخر میں اس کی بیوی نے آ کر حیران ہی کر دیا۔ شطرزن تو اس دفعہ بہت ہی تیز رفتار رہی۔ پچھلے دو ماہ سے جو واقعات چل رہے ہیں، ان سنسنی خیز لمحوں میں قسط گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔ آخر میں بہت سسپنس ڈالا اور اگلی قسط کا شدت سے انتظار رہے گا۔ قاتل مصنفہ ایک پُراسرار کہانی تھی جو بہت پسند آئی۔ وہاں بھی ایڈیٹر صاحب کاغذ کی مہنگائی کا رونا رو رہے تھے لیکن آخر کار ایک کہانی کے انجام کے مطابق فوت ہوئے۔ زندگی اور موت ایک عام سی کہانی تھی لیکن مصنف نے محبت کے جذبے کو دکھا کر اسے خاص بنا دیا۔ مالِ غنیمت

والی بات عجیب تھی لیکن شاید قیامِ پاکستان کے دور میں ایسے حالات ہوتے ہوں۔ آسیب میں زویا صفوان نے وحشی جذبات کے بے قابو آسیب کی بھرپور رسائی کی۔ دورِ حاضر کے حالات پر اس سے بہتر شاید ہی پڑھنے کو ملے۔ یعقوب بھٹی کی فاتح بھی پسند آئی۔ خوب صورت الفاظ کی لڑیوں میں پروئے واقعات نے بہت متاثر کیا۔ یہ تحریر باقی سب سے زیادہ پسند آئی۔ جاسوسی تو ختم ہو گیا ہے اور اب اگلے ماہ کا انتظار شروع۔ امید ہے کہ اگلے ماہ کی کہانیاں اس ماہ سے بھی زیادہ اچھی ہوں گی۔'' (انشاء اللہ)

نامعلوم مقام سے صائمہ حیدر کا خراجِ تحسین ''رسالہ گیارہ تاریخ کو خریدا اور بارہ تاریخ تک تین چوتھائی پڑھ بھی لیا۔ چھوٹا منہ بڑی بات۔۔۔ لیکن عرصے بعد رسالہ اتنا اچھا لگا ورنہ جاسوسی بس عادت کے تحت پڑھ رہی تھی۔ سب سے پہلے زویا صاحبہ کی آسیب پڑھی جس نے نام کی طرح ہی دماغ کو جکڑ لیا۔ منظرکشی اور کردار نگاری بہترین تھی۔ شازیہ کا چھوٹی بچی کو ہی قصوروار ٹھہرانا ہمارے معاشرتی رویوں کی عکاسی کرتا ہے۔ خلائی حادثہ اچھی لگی۔ میں ہمیشہ سوچتی تھی کہ اگر کبھی کہانی لکھی تو خلائی مخلوق پر لکھوں گی پر تخیل کی پرواز ہی اتنی ہے کہ زمین سے تھوڑا اوپر گئے اور ساتھ ہی نیچے۔ خیر قصہ مختصر کہانی اچھی لگی۔ قاتل مصنفہ کا مرکزی خیال بڑا منفرد تھا۔ ہمیں مستقبل کو جاننے کا شوق تو بہت ہوتا ہے پر اس کا پتا چل جانا شاید اچھا نہیں ہوتا۔ زندگی یا موت میں خامی نکالنا تو مشکل ہے پر کچھ خاص نہیں لگی البتہ دلاور کے خلوص نے متاثر کیا، روبینہ رشید صاحبہ بہت اچھا لکھ رہی ہیں، کہانی کے کردار، مقدار اور رفتار سب قابلِ تعریف ہے۔ یعقوب بھٹی کی بہت سی تحاریر فاتح سے بہتر ہیں۔ دہرا اچھی لگ رہی ہے پر تبصرہ کچھ اقساط کے بعد ہی کرنا بہتر ہوگا۔ غلام قادر بہت بڑا نام ہے پر کبھی کبھی ان کی تحریریں منتشر سی لگتی ہیں۔ ڈراپ سین کا آئیڈیا فرسودہ تھا۔ آخر میں چھتر بھی صدف کو نہیں، ان کے شوہر کو پڑنا چاہیے تھا۔ آخر میں آپ کے لیے اور سب پاکستانیوں کے لیے ڈھیروں دعائیں......''

چنڈی کینٹ سے زرمینہ شاہ کی مسرت ''بھیگے موسم میں ملنے والے شمارے پر اپنی رائے بھی ایک بھیگی بھیگی سی صبح میں لکھ رہی ہوں۔ آزاد فضاؤں میں لیا جانے والا ایک ایک سانس ہم سب کو مبارک ہو۔ آپ سے متفق کہ آزادی تو حاصل کر لی لیکن اس کے لیے جو قیمت ادا کرنی پڑی، اس کا حق ادا نہیں ہو سکا۔ دینے والوں نے تو جان و مال اور عزت اس پاک وطن پر قربان کرنے سے دریغ نہ کیا لیکن جن کو یہ لوٹ ورثے میں ملی، وہ قدر شناس نہیں۔ اللہ پاک وطنِ عزیز پر اپنا خصوصی کرم فرمائے آمین۔ سرورق کی بات کروں تو کافی اچھا تھا۔ ماتھے پر بندیا سجائے ہندو دوشیزہ کی زلفوں میں سے پُراسرار تاثرات والے نہ جانے کون صاحب جھانک رہے تھے۔ سب سے پہلے خطوط کی دنیا میں پہنچی جہاں کبھی کبھار کبھی کم اور کبھی زیادہ ہو جاتے ہیں۔ اس بار محمد اقبال کرسیِ صدارت پر رونق افروز تھے۔ بہت مبارک ہو جناب۔ اپنا خط شاملِ محفل دیکھ کر بہت خوشی ہوئی اور مدیر صاحب کے شرارتی جوابات نے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دی۔ جاسوسی اور دیگر ڈائجسٹ بچپن سے ہی پڑھتے آ رہے ہیں۔ اس وقت خطوط کی بیٹھک میں شامل لوگ ہمیں کسی اور ہی دنیا کے باسی لگا کرتے تھے۔ اب خود بھی ان میں شامل ہوں تو دل میں وہی بچپنے والی سرخوشی کی لہر اٹھتی ہے۔ ماشاء اللہ سب نے عمدہ تبصرے کیے۔ پرچے کی ضخامت دیکھ کر دل ملول ہوا۔ بڑھتی ہوئی مہنگائی نے ہر چیز کو متاثر کیا ہے۔ مشورہ یہی ہے کہ اسی قیمت اور ضخامت پر پرچے کو جاری رکھا جائے تاکہ یہ سلسلہ برقرار رہے۔ قیمت میں اضافہ شاید بہت سے لوگوں کے لیے پریشانی کا باعث بنے۔ اس بار کافی عرصے بعد پرانی عادت کے مطابق رسالے کو آخری کہانی سے پڑھنا شروع کیا۔ یعقوب بھٹی نے اپنے منجھے ہوئے قلم سے عمدہ سرورق کہانی تحریر کی۔ آغاز سے اختتام تک زبردست مکالمے اور کردار نگاری سے مزین تحریر نے جکڑے رکھا۔ موت کے چنڈال کی منظرکشی قابلِ تعریف تھی۔ آخری سطور شاندار تھیں۔ واقعی جھکنے والوں کو کوئی نہیں جانتا اور عزت سے اٹھے سر یاد رکھے جاتے ہیں۔ زویا صفوان کی آسیب عجیب احساس کے تحت پڑھتی چلی گئی۔ اگر لگام نہ ڈالی جائے تو برانگیختہ جذبات کا عفریت سب کچھ نگل لینے کے درپے ہو جاتا ہے۔ کم عمر اور کچے ذہنوں پر سوشل میڈیا کا غلط استعمال کیا تباہ کن اثرات مرتب کرتا ہے، اس کی عکاسی اس تحریر میں بہت عمدہ انداز میں کی گئی ہے۔ سمیہ کی کردار نگاری لاجواب تھی۔ انجام بہت سبق آموز اور رنجیدہ تھا۔ زندگی یا موت اچھی کہانی تھی لیکن کچھ زیادہ متاثر کن نہیں لگی۔ قاتل مصنفہ پڑھ کر بے حد لطف آیا۔ کہانی کے مربوط پلاٹ نے شروع سے آخر تک جکڑے رکھا۔ انجام بھی تحریر کی طرح چونکا دینے والا تھا۔ ڈراپ سین کا سین تو کچھ الٹا ہو گیا۔ گوگی! یا تم ہی ہو؟ صدف کے اس جملے نے بڑا اچنبھا یا بھلا گوگی کیسے بتاتی؟ لیکن چالاک مایا نے صورتِ حال سنبھال لی۔ کہانی کا مرکزی خیال بہترین تھا۔ آج کل معاشرے میں ایسے کردار عام ہیں جنھوں نے ظاہراً مذہب کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے لیکن حقیقت اس کے برعکس ہوتی ہے۔ کامیاب مرد کا عنوان پڑھ کر لگا کہ شاید کسی کی انتھک محنت کے بعد ملنے والی کامیابیوں کی داستان ہوگی۔ لیکن کہانی اس کے الٹ تھی۔ عنوان پر لکھی تعارفی سطر ہی اصل کہانی تھی۔ غربت سے نکل کر آنے والا ابھی حلال و حرام کی تمیز بھول کر زندگی میں ہر جائز و ناجائز طریقے سے پیسہ بنانے میں مشغول رہا۔ ہمارے تھانہ کلچر اور اس نظام کی تمام قباحتوں کو عیاں کرتی تحریر تھی۔ پڑھ کر افسوس ہوتا رہا۔ خلائی حادثہ دلچسپ تحریر تھی۔ مصنفہ کی تخیل سازی بہت جاندار تھی۔ جارج اور فیدر کا انجام ٹھیک ہوا۔ جولی کو بچا کر ساتھ لانے کا فیصلہ اچھا تھا۔ اچھی منظرنگاری کے ساتھ شروع ہونے والی کہانی جب عجیب الخلقت پرندے اور خالی مکان تک پہنچی تو زبردست رخ اختیار کر گئی۔ ویرانے میں رہائش پذیر خاندان کے بارے میں یہ خیال تھا کہ شاید یہ آدم خور ہوں گے لیکن عنوان کے مطابق تحریر کو اچھا خلائی موڑ دیا گیا۔ دعا کریں کہ پرچہ وقت پر ملتا رہے اور ہم شریکِ محفل رہیں۔''

رحیم یار خان سے ماورا عالمگیر لکھتی ہیں ''اگست 2022ء کے جاسوسی ڈائجسٹ نے تو تاخیر کے تمام ریکارڈ ہی توڑ دیے۔ فہرست اچھی تھی مگر طاہر جاوید مغل اور اسما قادری مسنگ پرسن بنے ہوئے تھے۔ کتھ کتھی میں آپ کے اٹھائے ہوئے نکتے قابلِ غور تھے۔ آزادی کی مبارک باد پر شکریہ اور خیر مبارک آپ کو بھی مبارک ہو۔ ہر عروج کو زوال ہوتا ہے کہ مصداق ہم کہتے ہیں کہ ہر زوال کو بھی عروج ہوتا ہے، مطلب جب زوال کی انتہا ہو جائے تب عروج شروع ہوتا ہے اور وطنِ عزیز کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے ہم نے ہر ایک کو آزما کر دیکھ لیا صرف زوال ہی حاصل ہوا اب کوئی آئے گا اور عروج پر لے جائے گا نا امید تو ہو نہیں سکتے ہمارے پاس اللہ تعالیٰ موجود ہے۔ (الحمدللہ) خیر یہ تو ایک لمبی ساری بحث ہے ہم تبصروں کی جانب چلتے ہیں۔ سب کے تبصرے بہت اچھے تھے کیونکہ سارے تبصرہ نگار بہت ذہانت سے تبصرہ کرتے ہیں میرے علاوہ ...... ہاہاہا ...... محمد اقبال، بینا راجپوت اور محمد حسنین کا شکریہ کہ ان کو میرا تبصرہ پسند آیا جبکہ آپ لوگوں کے تبصروں کے ہوتے ہوئے میری تو جگہ ہی نہیں بنتی۔ خونی محافظ اچھی رہی، ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی ایکشن مووی دیکھ رہی ہوں، اگلی قسط کا انتظار ہے۔ خلائی حادثہ ایک شاندار کہانی تھی مکمل پُراسرار سیریز ٹاپ کی، مجھے تو بہت مزا آیا اس کے لیے شکریہ بنت رضا۔ مشکل آسان بھی نات بیڈ۔ دہرا اپنی طرف کھینچ رہی ہے ابھی تو ...... کامیاب مرد بہت دلچسپ کہانی تھی اور ڈراپ سین کے اختتام پر تو میرا بھی نعیم کو چھتر لگانے کو دل کر رہا تھا۔ حسام کی طرح، مطلب اتنی بڑی غلطی کر کے معصوم کیسے بنا ہوا تھا۔ شعلہ زن تو اب شعلے اگل رہی ہے۔ کہانی بہت دلچسپ مراحل میں داخل ہو گئی ہے۔ قاتل مصنفہ مزے کی کہانی تھی۔ کہانی میں رائٹر جیسے جزئیات بیان کرتی ہے مجھے ہماری زویا صفوان کی یاد آ گئی میں نے پہلے بھی اس موضوع پر کہانیاں پڑھی ہیں، اس کے باوجود اے آر راجپوت کا انداز دلچسپ تھا۔ عمران قریشی نے بھی بہت اچھا لکھا اور حیرت بھی ہوئی کہ کیا کبھی ایسا بھی ہوا ہوگا؟ مگر یہ محض ایک کہانی تھی۔ اب بات کرتی ہوں رسالے کی سب سے اہم کہانی کی۔ جی جی آسیب کی بات کر رہی ہوں۔ آسیب نے جکڑ لیا جیسے ایک ٹرانس میں ہوں۔ کہانی کا نام بھی بالکل پرفیکٹ تھا اور جتنی مہارت سے کہانی کی بُنت ہے یہ زویا کا ہی کمال ہے۔ زویا ہمیں ہر دفعہ حیران کرتی ہیں۔ فاتح، راجپوت اور مغلوں کے مابین معرکے کی کہانی جس میں اپنے ہی غدار نکل آتے ہیں۔ ایک تو یہ غدار ہر صدی میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ میرے پاس جادو کی چھڑی ہو تو ان غداروں کو ہی ختم کر دوں میں......''

اسلام آباد سے بینا راجپوت کی باریک بینی ''جشنِ آزادی نمبر ہم قارئین کے لیے بہت خاص تھا۔ اس بار ادارے نے ہمیں بالکل مایوس نہیں کیا۔ پچھلے کچھ عرصے سے چند ایک کہانیاں ہی متوجہ کر پاتی تھیں مگر اس بار ساری کہانیاں اپنے اندر دلچسپی کا عنصر سموئے ہوئے تھیں۔ (بہت شکریہ اس بار ہماری کاوش معتبر ٹھہری) سب سے پہلے تو یہ کہ جب ڈائجسٹ لینے گئی تو 150 روپے میں ایک باریک سا ڈائجسٹ دیکھ کر دل کو تھوڑا دھچکا لگا۔ گو مجھے معلوم تھا کہ صفحات کم کر دیے گئے ہیں اور قیمت مزید بڑھ چکی ہے پھر بھی ہر بار صفحات کی کمی کے اس کیمو وار پر دل کو تسلی دینے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ سرورق اچھا تھا۔ سرخ بندیا والی حسینہ اور سبز ہلالی پرچم برصغیر کی تقسیم کے واقعے کو عمدہ طریقے سے بیان کر رہا تھا۔ فہرست میں دو تین نام کافی پسندیدہ تھے خصوصاً امجد رئیس صاحب اپنے مخصوص اور بھرپور انداز کے ساتھ ابتدائی صفحات پر موجود تھے۔ خونی محافظ کے نام سے ہی عیاں ہو رہا تھا کہ کہانی ایکشن سے بھرپور ہوگی۔ ایمانداری کی بات ہے کہ امجد صاحب انگریزی ادب کے تراجم کا جو حق ادا کرتے ہیں وہ کوئی اور نہیں کر سکتا۔ یہ ان کے الفاظ کی ہی جادوگری ہوتی ہے کہ قاری کہانی پڑھنے کے بہت بعد دیر تک اس کے فسوں سے نکل نہیں پاتا۔ پاتیک، لارکن کو کیسے محفوظ رکھ پائے گا، اس کے باقی حالات جاننے کے لیے ستمبر کے شمارے کا شدت سے انتظار ہے۔ بنت رضا کی خلائی حادثہ بھی انگریزی ادب سے درآمد شدہ تھی۔ قلمکار کی شاید جاسوسی میں پہلی آمد ہے۔ زبردست انٹری کرتے ہوئے موصوفہ نے قلم کے جوہر خوب دکھائے۔ انگریزی ترجمہ بہت سے لوگ کرتے ہیں مگر بعض اوقات اچھی بھلی کہانی ترجمے کے بعد بیکار لگنے لگتی ہے۔ خلائی حادثہ بہت عمدگی سے لکھی گئی۔ خلائی مخلوق کے بارے میں ایک دلچسپ کہانی پڑھ کر مزہ آیا۔ جارج اور فیدر کی ہمیشہ زندہ رہنے کی غیر فطری خواہش ہی ان کی تباہی کا باعث بنی۔ ڈولن کے انجام پر افسوس جبکہ جولی کے لیے خوشی محسوس ہوئی۔ عکسِ فاطمہ کی مشکل آسان بھی انگریزی ادب سے ماخوذ تھی۔ پزل کلب کے مالک نے اپنی موت کا راز بھی ایک پزل کی صورت میں چھوڑا جسے ڈیٹیکٹو ایلری کوئین نے چند گھنٹوں میں حل کر لیا، بہت خوب۔ حسام بٹ کی دہرے نے کچھ خاص متاثر نہیں کیا۔ مجھے سمجھ نہیں آتی کہ سارے سلسلے وار ناول ایک ہی انداز میں کیوں لکھے جاتے ہیں؟ پاک پوتر ہیرو بغیر کسی جرم کے جیل جاتا ہے اور وہاں سے باقاعدہ مجرمانہ تربیت لے کر نکلتا ہے لیکن اس کی پوترتا میں کوئی کمی نہیں آتی۔ قلمکار سے معذرت کے ساتھ مجھے تو یہ عجیب ہی لاجک لگتی ہے۔ اے آر راجپوت صاحب کی قاتل مصنفہ لاجواب تھی۔ کہانی دیسی ماحول کی تھی مگر تانے بانے مغربی انداز کی جھلک دے رہے تھے۔ کہانی کے آغاز پر کاغذ کی قیمتوں اور مہنگائی کی شورش کے ذکر سے مجھے لگا کہ کہانی شاید بوریت بھری ہوگی مگر اسرار

ڈائجسٹ کی عمارت اور دو لوگوں پر مشتمل محلے کی تفصیلات نے توجہ کھینچ لی۔ اس پر طرہ یہ کہ مدیر اعلیٰ پی اے عالم اور مدیر فیروز جان پوری نے منہمک ہو کر کہانی پڑھی اور انجام تو مائنڈ بلونگ تھا بہت کی ذہنی کیفیات اور دختر کی کسمپرسی کو کچھ اس انداز سے بیان کیا گیا کہ میں نے ... دلاور کی محبت نے بالآخر سادھنا کا دل پگھلا دیا تھی۔ زندگی یا موت عمران قریشی کی جذبات سے گندھی خوب صورت رومانوی کہانی تھی۔ اس کہانی میں روایتی جنڈال کچھر یا جرگہ کے نظام پر بھی ہلکی پھلکی روشنی ڈالی گئی اور وہ سائرہ کے روپ میں ہمیشہ کے لیے فی پور لوٹ آئی۔ اچھی کاوش تھی۔ زویا اعجاز کو کافی لمبے عرصے اور ساتھ ہی ماضی بعید میں برصغیر پاک و ہند میں عورتوں کی بے توقیری کو بھی موضوع بنایا گیا۔ ان کی موجودہ تحریر آسیب بھی اسی موضوع پر ہے۔ کے قلم کی کاٹ اور تیز دھار بلاشبہ بہت سے معاشرتی ناسوروں کو احاطہ تحریر میں لاچکی ہے مگر جنسی ہراسی خصوصاً بچوں کے ساتھ پیش آئے واقعات اور ان کے محرکات پر انہوں نے بہت لکھا ہے۔ ایک نئی ابھر معصوم کا سید دوسروں کی غلط کاریوں کی بھینٹ چڑھا اور پھر اپنی نوجوانی کے جذبات سے مغلوب ہو کر غلط راستے پر چل نکلا۔ زویا جی نے بہت عمدگی سے بیان کیا کہ اخلاق باختہ ویڈیوز دیکھنا کیسے انسان کے اندر کے سفلی جذبات کو ابھارتا ہے اور انسان اچھے برے کی تمیز بھول کر اخلاقی تنزلی کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ تو ہو گئے اس کہانی کے گڈ پوائنٹس مگر کہانی کار سے ایک درخواست ہے کہ معاشرے میں اور بھی بہت سے چھپے ہوئے موضوعات بکھرے پڑے ہیں جن پر آپ جیسے قلمکاروں کو ضرور لکھنا چاہیے۔ ایک ہی حساس ترین موضوع پر بار بار اور اتنی تفصیل سے تحریر پڑھنا شاید قارئین کی سوچوں کو پراگندہ اور بوجھل کر دے۔ ہم میں سے اکثر صاحب اولاد ہیں اور ایسی تحاریر بار بار پڑھ کے ہمارے اپنے بچوں کو لے کر تحفظات مزید بڑھ جائیں گے جو شاید نارمل رویہ نہ ہو۔ اب آتے ہیں سرورق کے آخری رنگ کی طرف۔ پہلی بات تو یہ کہ یعقوب بھٹی میرے ان چند پسندیدہ قلمکاروں میں سے ایک ہیں جنہوں نے اپنی پہلی تحریر سے ہی جگہ بنالی۔ پھر بطور قاری میری ان سے توقعات بہت زیادہ ہیں اس لیے تحریر میں تھوڑی بہت کی بیشی بھی برداشت نہیں ہوتی۔ ان کی تحاریر کا خاصہ یہ ہے کہ کہانی کے تار کہیں نہ کہیں بارڈر پار سے جڑے ہوتے ہیں اب وہ باقی کتھ پتلی ہو لہولہان رشتے ہو یا سوہنیاں۔ ان کی قابل غور خاص بات یہ ہے کہ یہ متحدہ دور کے ہندوستان سے کشمیر کی ایک عشق کی داستان ہے۔ لیکن یعقوب صاحب نے اس محبت کی کہانی کو بھی ریشمی بھرپور دما جہان کی تحاریر میں لازمی ہوتا ہے۔ تحریر میں خالص اردو زبان و بیاں استعمال کیا گیا۔ کہانی میں ایک فقرہ کچھ یوں تھا کہ ”راجا بخش کا کاکی پر نیم دراز ہو گیا“ الف اتنی ثقیل اردو کے درمیان کا کاکی گڑ وے بادام کی طرح محسوس ہوا۔ کاکی کی جگہ یہاں تخت کے متبادل موجود ہیں جو شاید کہانی لکھتے وقت مصنف کے ذہن میں نہیں آئے۔ دوسری بات جب ہم ہندو یا سکھ کے بارے میں پڑھتے ہیں یا ان کے ڈرامے اور فلمیں دیکھتے ہیں تو کہیں بھی کزن میرج کا تصور نہیں ملتا مثلاً چچا، تایا، پھوپھو، خالہ کے بچوں کی آپس کی شادی کو گناہ سمجھا جاتا ہے۔ پھر راجا سکھ اور اس کی بہن سندھیا کیسے اپنے بچوں پرم اور دیو سنگھ کی شادی کرنے کا سوچ لیتے ہیں؟ کہانی بے حد دلچسپ تھی بس ذہن میں پھنسے اس ایک نقطے نے کہانی کا مزہ تھوڑا اکرکرا کر دیا۔ بحر حال چپنی کی محفل اس بار سب سے آخر میں پڑھی۔ بھی سب خطوط اچھے تھے۔ محمد حسنین کو لگتا ہے میں کہانیوں پر صرف اچھے کمنٹس دیتی ہوں۔ وہ اس لیے کہ میں سمجھتی ہوں ہمیں مصنفین کو تھوڑی گنجائش دینی چاہیے۔ ہر قلمکار مختلف ذہنی کیفیات سے دوچار ہوتا ہے لیکن کہانی ایک تخلیق عمل ہے اور ہر تخلیق کار پوری محنت سے اپنی کہانی وجود میں لاتا ہے۔ ویسے بھی اب سب آپ کے والی عینک لگا کر کہانیاں پڑھنے لگے تو ڈائجسٹ میں پڑھنے کو کچھ ڈھنگ کا نہیں بچے گا اور یہ بھی لگا ہے کہ آپ کی چٹخارے دار تحریر کا سبھی لطف لیتے ہیں، سلامت رہیں۔“

واہ کینٹ سے راحیلہ بھٹی کی دلی کیفیات ”کئی ماہ کے وقفے کے بعد پھر سے حاضر ہوں۔ (کہاں غائب تھیں؟) شمارہ ملتا ہی اتنی دیر سے ہے کہ کہانیاں پڑھنے اور تبصرہ لکھنے تک آخری تاریخ گزر جاتی ہے۔ اب بھی بھیج تو رہی ہوں لیکن شائع ہونے کی امید کم کم ہی لگ رہی ہے۔ اس بار خط لکھنے کی دو تین وجوہات ہیں۔ سب سے پہلی وجہ تو مہنگائی ہے۔ میرے شوہر پہلے ہی میری رسالے پڑھنے کی عادت سے نالاں رہتے ہیں اور آپ نے رسالہ ایک سو پچیس کا کر دیا ہے۔ پہلے گھر میں چھ ڈائجسٹ آتے تھے لیکن اب سسپنس اور سرگزشت بند کروا دیے ہیں۔ پاکیزہ اور جاسوسی کے علاوہ خواتین اور شعاع۔ جاسوسی سب سے مہنگا ہے۔ اب پتا نہیں کون سے رسالے دو سو روپے کے ہو گئے ہیں اور پتا نہیں کون انہیں پڑھتا ہے لیکن پلیز جاسوسی کی قیمت مزید نہ بڑھائیں اور جو لوگ کتاب سے جڑے ہیں انہیں مجبور نہ کریں کہ وہ بھی کسی ویب سائٹ پر جا کر کہانیاں پڑھیں اور رسالے پڑھنا چھوڑ دیں۔ دوسری وجہ اس بار خط لکھنے کی یہ تھی کہ بہت عرصے کے بعد جاسوسی میں شائع ہونے والی ساری کی ساری کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ امجد رئیس نے کمال کر دیا۔ اگلے حصے کا بے چینی سے انتظار ہے۔ عبدالرب بھٹی نے الاؤ کو جلدی میں سمیٹ دیا۔ اب ان کی جگہ حسام بٹ نے سنبھالی ہے لیکن دو قسطیں گزر جانے کے بعد بھی دہرکائی سست اور پھسپھسی لگ رہی ہے۔ اللہ کرے آگے جا کر کچھ بہتر ہو جائے۔ شعلہ زن میں کہانی بالکل ہی بدل چکی ہے۔ سارہ کی کہانی کے بجائے اب سارا فوکس کریم اور اس کی ٹیم پر ہو گیا ہے۔ واقعات بہت دلچسپ ہیں اور بے چینی سے اگلے حصے کا انتظار رہتا ہے لیکن پلیز اب سارہ کی کہانی بھی دکھائیں۔ سونیا کی یادداشت جانے کا سین بالکل ہی ہضم نہیں ہوا۔ زویا اعجاز کی آسیب بہت دردناک کہانی تھی۔ میرے اپنے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اور اس کہانی

نے تو خوف میں مبتلا کر دیا کہ اب کسی رشتے پر بھی اعتبار نہیں کر سکتے۔ آخر میں سمجھ نہیں آیا کہ سید کی موت ہو گئی تھی یا وہ غائب کیا تھا۔ یعقوب بھٹی پہلے مجھے کاسٹ فیلو ہونے کی وجہ سے پسند آتے تھے لیکن اب ان کی کہانیاں بھی بہت اچھی لگتی ہیں۔ مطلب ور کی کہانی ویسے تو بہت اچھی تھی لیکن راجپوتوں میں کزنز کی شادی آپس میں نہیں ہوتی۔ پتا نہیں یہاں بھٹی صاحب کیسے چوک گئے؟ چھوٹی کہانیوں میں اے آر راجپوت کی قاتل مصنفہ بیسٹ تھی۔ ڈراپ سین اور خلائی حادثہ بھی اچھی لگیں۔ کامیاب مرد بھی بہت اچھی تھی۔“

کراچی سے محمد اقبال کی تہنیت ”ڈائجسٹ حاصل کرنے میں واقعی جوتے گھس گئے۔ پھٹ گئے اسٹالیٹ، اُف! مہنگا ڈائجسٹ اتنا چلا، ایسے تو نہ کریں قارئین کے ساتھ۔ ڈائجسٹ سیر مہنگا ہوا ہے تو جوتے سوا سیر مہنگے ہو گئے ہیں جی۔ خیر، ڈائجسٹ تو لینا ہی لینا ہے۔ سرورق بہت عمدہ لگا۔ لہراتا ہوا جھنڈا جشن آزادی مبارک کے ساتھ خوب صورت لگ رہا تھا۔ درمیان میں حسینہ موجود تھیں جس کے ماتھے کی بندیا، ناک اور ہونٹ خوب صورت لگ رہے تھے۔ ایک کان میں جھمکا اور دوسرے کان میں جھمکے کی جگہ جو صاحب جھانک رہے تھے وہ حیرانی سے سامنے دیسی انگریز کو دیکھ رہے تھے جو شاید اپنے آپ کو نام کروز سمجھ رہا تھا۔ فہرست مناسب تھی۔ امجد رئیس کا نام دیکھ کر خوشی ہوئی۔ آخری صفحات پر یعقوب بھٹی موجود تھے۔ ارے۔ یہ کیا دل خوش بلکہ باغ باغ ہو گیا با دولت کو محفل میں پہلے نمبر پر دیکھ کر بہت شکریہ۔ امجد رئیس کی خونی محافظ سے شروع ہوئے جیسا کہ نام نے ہی ظاہر کر دیا کہ فل ایکشن ہوگا۔ امجد صاحب کی تحریروں میں نہ جانے کیا جادو ہے کہ آپ اسٹارٹ کریں تو کہانی ختم کر کے ہی دم لیتے ہیں۔ الفاظ کی بُنت بہترین ہوتی ہے۔ آئندہ ماہ دیکھتے ہیں پاٹیک، لارکن کو کیسے محفوظ رکھ پائے گا۔ زویا صاحبہ آسیب لیے حاضر تھیں جس طرح انہوں نے سوشل میڈیا کے غلط استعمال پر روشنی ڈالی، کیا کہنے۔ کم عمر اور کچے ذہنوں پر اس کے کیا تباہ کن اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ کہانی شروع کی تو ختم کرتے ہی بنی۔ کردار نگاری بہترین تھی۔ آخری صفحات پر یعقوب بھٹی نے ثابت کر دیا کہ ہم کسی سے کم نہیں۔ آغاز سے اختتام تک سب کچھ نہایت عمدہ تھا۔ غلام قادر کی تحریر کامیاب مرد ہمارے معاشرے کی تمام خرابیوں و خامیوں کی نشاندہی کر رہی تھی، بس ٹھیک تھی۔ خلائی حادثہ اچھی لگی۔ اس بار اے آر راجپوت صاحب کی تحریر قاتل مصنفہ نے متاثر کیا۔ فاطمہ حسام کی ڈراپ سین کچھ خاص نہیں لگی۔ روبینہ رشید کی شعلہ زن اب واقعی مزہ آ رہا ہے تحریر کا۔ علی کی چلبلی باتیں، کریم کی سنجیدگی اور سازشیں کرنے والے ابراہام کی ہزیمت پڑھ کر دل باغ باغ ہو جاتا ہے لیکن سارہ کہیں پیچھے چلی گئی ہے، اسے بھی ایکشن میں لائیں جناب۔ حسام بٹ کی دہرکائی، دوسری قسطوں نے زیادہ متاثر نہیں کیا، آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔ امید ہے بٹ صاحب بھی متوجہ کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ فی الحال اتنا ہی پڑھ سکا ہوں۔ دوستوں کی محفل میں سب کے تبصرے پسند آئے، سب سے یہی گزارش ہے کہ اپنی حاضری کو یقینی بنائیں۔“

بورے والا سے راحت قمر کی مدح سرائی ”پہلی بار خط لکھ رہا ہوں امید ہے کہ آپ کو پسند آئے گا اور سب مجھے خوش آمدید کہیں گے۔ (بھیّا... خوش آمدید) جاسوسی کا ٹائٹل زبردست تھا۔ لڑکی دیکھی بھالی سی لگی اور ٹوپی والا بندہ بھی لیکن مجموعی تاثر اچھا لگا جیسے سرچھوں والے انکل نے بالکل بھی نزکل نہیں کیا۔ جشن آزادی والے اگست کے جاسوسی ٹائٹل پر ہندو ناری اپنے حسن کے جلوے دکھا رہی تھی تو امید تھی کہ کوئی را کے خلاف آئی ایس آئی ایجنٹس کی کہانیاں پڑھنے کو ملیں گی لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ آسیب معاشرتی برائیوں پر ایک اچھی کوشش تھی لیکن اس سے ملتی جلتی کہانی زویا صفوان نے چند ماہ پہلے بھی لکھی تھی۔ یہ کہانی پچھلی سے بہت بہتر تھی۔ یعقوب بھٹی کی فاتح ایک خوب صورت کہانی تھی۔ انہوں نے بہت خوبصورتی سے مغل دور کے ماحول کا نقشہ کھینچا۔ کہانی کا اختتام بھی بہت خوب صورت پیرائے میں کیا۔ ڈراپ سین ایک سبق آموز کہانی تھی کہ اپنی بیوی کو کبھی بھی اپنا پرانا نمبر نہیں دینا چاہیے۔ قاتل مصنفہ اور کامیاب مرد شمارے کی بہترین مختصر کہانیاں کہی جا سکتی ہیں۔ خلائی حادثہ اور مشکل آسان کوئی خاص تاثر نہ چھوڑ سکیں۔ ان میں خلائی حادثہ کچھ بہتر تھی۔ عمران قریشی کہانی کا آغاز اچھا کرتے ہیں لیکن آخر تک پہنچتے پہنچتے ان کی کہانی میں جان نہیں رہتی۔ اس بار بھی انہوں نے یہی کچھ کیا۔ شعلہ زن میں روبینہ رشید کا قلم اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ جلوے بکھیر رہا ہے۔ اس وقت ان کی یہ کہانی جاسوسی کی بہترین قسط وار بن چکی ہے۔ یہ قسط اس لحاظ سے بھی منفرد تھی کہ ہیرو سارہ کا ذکر نہ ہونے کے برابر تھا۔ شعلہ زن کے بعد دہرکو شرفِ مطالعہ بخشا۔ حسام بٹ کا قلم اس بار بھی بے پناہ تجسس پیدا کر رہا تھا۔ الفاظ کا انتخاب اس قدر بہترین تھا کہ میں تو کیا کوئی بھی قاری اس کو ایک ہی نشست میں ختم کیے بغیر نہیں رہا ہو گا۔ مصنف نے چھوٹی چھوٹی چیزوں میں گہرائی اور الوکھی سچائی تلاش کر کے پیش کی۔ ابتدائی صفحات میں میرے پسندیدہ مصنف امجد رئیس اس بار خونی محافظ لے کر آئے ہوئے تھے۔ کہانی ادھوری تھی اس لیے اس پر تبصرہ بھی ادھار رہا۔ چٹپٹی چٹکی مجھے میٹھے کی طرح لگتی ہے اس لیے اسے سب سے آخر میں انجوائے کرتا ہوں۔ اقبال صاحب اور حسنین صاحب کے تبصرے پسند آئے۔ بینا راجپوت کا نام اگر محفل میں نظر نہ آئے تو حیرت ہوگی۔ باقی تبصرے بھی اچھے تھے خاص طور پر حمیرا فرام کوٹری کا۔“

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شامل اشاعت نہ ہو سکے۔

ردا سیف، کراچی۔ خالد عزیز، کوٹری۔ فہمیدہ آفتاب، حیدرآباد۔ حسن علی، کراچی۔

خونی محافظ

امجد رئیس

زندگی حادثات کا نام ہے... مگر کچھ حادثات انتہائی غیر معمولی ہوتے ہیں جن کے اثرات تاعمر زندگی کو تہ و بالا رکھتے ہیں... زندگی کی رنگینیوں سے بھرپور ایک نٹ کھٹ لڑکی کا ماجرا... ایک معمولی سے حادثے نے اس کی زندگی کو غیر معمولی بنا دیا... ہر پل... ہر لمحہ اس کے لیے قیامت خیز تھا... سر پر منڈلاتے خطرے نے اسے خوف زدہ کر دیا تھا... مگر اچانک ہی ایک مستحکم، توانا اور بہادر شخص اسے اپنی حفاظت کے مضبوط حصار میں لے چکا تھا... ہر دن ایک نئے دشمن سے سامنا معمول بن چکا تھا... گوشۂ عافیت کی تلاش انہیں مسلسل دوڑا رہی تھی...

رابرٹ کریس کے بہترین ناولوں میں سے ایک کا انتخاب......

وہ گرفتھ پارک کے قریب شاپنگ سینٹر میں جا کے رکا۔ کرائم سین پر خبروں میں اس کا کوئی حوالہ نہیں تھا۔ گولیاں چلے ہونے میں کئی گھنٹے لگ سکتے تھے۔ جورگا اور لوئیس شہر میں روز اور دو قابلِ شناخت لاشوں کا اضافہ ہو گیا تھا۔ قتل کی کھلی واردات لیکن جواب کوئی نہیں۔

پائیک نے پسٹل ری لوڈ کیا اور اشیا چیک کرنا شروع کیں۔ سب سے پہلے اس نے جورگا کے فون کی جانچ پڑتال کی۔ کالنگ ہسٹری دیکھی۔ جس میں ایک ہی نمبر پر تین کالز کی گئی تھیں۔ غالباً کالز لوئیس کی طرف کی گئی تھیں۔ پائیک نے سینڈ کا بٹن دبا کر ری ڈائل کیا۔ اس کے پاس موجود لوئیس کا فون بجنے لگا۔ اب پائیک نے لوئیس کا فون اٹھایا۔ کالز کی لمبی فہرست تھی۔ ایک درجن صرف ایک سے ڈائل کی گئی تھیں۔ پائیک نے دیکھا کہ لوئیس اس نمبر پر ہر روز پانچ سات مرتبہ کال کرتا رہا تھا۔

پائیک نے وہی نمبر ری ڈائل کیا۔ چوتھی رنگ پر جواب آیا۔ "اس مردود کا پتا چلا؟" بولنے والے کی آواز گونج دار تھی لیکن روایتی بدمعاشی سے عاری تھی۔ پائیک کو لہجہ فرنچ محسوس ہوا تھا۔

پائیک نے کہا۔ "ایلیکس میش۔"

"رانگ نمبر۔" فون بند ہو گیا۔

پائیک نے سینڈ کا بٹن پھر دبایا۔

"لوئیس؟"

"لوئیس اور جورگا مر چکے ہیں۔" پائیک نے کہا۔

اس مرتبہ وہ محتاط انداز میں بولا۔ "کون ہو تم؟"

"مردود!"

وہ ہچکچایا۔ "کیا چاہتے ہو؟"

"تمہیں۔" پائیک نے فون بند کر دیا۔

☆☆☆

پائیک کی کال نے جان شین کو حواس باختہ کر دیا۔ پائیک نے جواب کا انتظار بھی نہیں کیا اور کہا۔ "ایک گھنٹے

میں باہر ہو۔''
ایک گھنٹے بعد جان شین لابی سے پارکنگ کو گھور رہا تھا۔ پائیک کی شکل میں اسے ایک خوفناک صورتِ حال کا سامنا تھا۔ پارکنگ میں سرخ چیروکی تھی اور نہ سبز رنگ کی لکسس۔ کیا وہ آ کے چلا گیا۔ یا ابھی آیا ہی نہیں۔ نہیں وہ آ کے جا چکا ہے اور یہ فرار کا بہترین موقع ہے۔ جان شین لابی سے نکل کر اپنی کار کی طرف چل دیا۔ دھڑکن غیر متوازن تھی۔ جرمن قیمتی کار کے قریب پہنچ کر اس نے دروازہ کھولا اور عقب سے پائیک کی آواز آئی۔ ''جان۔'' جان شین اچھل پڑا۔ پائیک نے کار ڈور پر ہاتھ رکھا اور بولا۔ ''اندر بیٹھو۔''
''پلیز، میں بے قصور ہوں۔ میں نے پوری کوشش کی تھی۔''
''اندر بیٹھو۔''
''ڈونٹ کِل می۔''
''کیا حماقت ہے۔ اندر بیٹھو۔'' پائیک نے کہا۔ گھوم کر پائیک خود پسنجر سیٹ پر آ گیا۔ جان شین کی نظر پائیک کے سیاہ بیگ پر گئی۔
''میں قسم کھاتا ہوں۔ مجھے کچھ بھی نہیں ملا۔ ایف بی آئی والے پہلے ہی کھو لے گئے تھے۔''
پائیک نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''تم میرے دوست ہو۔ دوست۔ کام کی بات کرتے ہیں۔''
شین نے سر ہلایا۔ دوست ہیں؟
پائیک نے بیگ کھول کے اس کے سامنے کیا۔ جان شین نے بیگ میں جھانکا۔ ''یہ کیا ہے؟''
''ہتھیار اور فنگر پرنٹس ہیں۔ FBI بے خبر ہے۔''
''کہاں سے لائے ہو؟'' جان شین نے سوال کیا۔
پائیک نے اس کا سوال نظرانداز کر دیا۔ ''وفاق کے جو آدمی کھو لے گئے، کیا تم کو ان کے ناموں کا علم ہے؟''
''ہٹ مین۔ اور بلا ئیچڈ۔''
''بلائیچڈ؟''
''نہیں معلوم، شاید یہی نام ہے۔''
''ان دونوں کو کا مطلب مزید لاشیں؟''
''ہاں دو۔''
''دونوں کا تعلق نالی بو اور اینگل ساک سے بنتا ہے؟''
''ہاں، ایل اے پی ڈی جانے واردات پر ہوئی فائرنگ ہوئی تھی۔ وہ جان جائیں گے کہ کم از کم دو ہتھیار غائب ہیں۔ گولیاں ان کو مل جائیں گی۔ وہ ہتھیاروں سے میچ کریں گے۔''
''اگر ایف بی آئی کو علم ہوا تو وہ کھو طلب کریں گے؟''
''ہاں، لیکن انہیں پتا نہیں چل سکتا۔ صرف میں اور تم جانتے ہیں۔ میں تم کو چانس دے رہا ہوں۔ چاہو تو میرا ساتھ دو۔''
جان شین نے غیر یقینی نظروں سے پائیک کو دیکھا۔
''ہو کیا رہا ہے؟'' وہ بولا۔
''میں بھی جاننا چاہتا ہوں، کیا ہو رہا ہے۔ ایف بی آئی نے تمہاری شہادتوں کو قبضے میں لیا ہے۔ وہ کچھ چھپا رہے ہیں۔ اگر ان کو ان دونوں کھو کا پتا چلا تو وہ ان پر بھی قبضہ جمانا چاہیں گے۔'' پائیک نے واضح کیا۔
''لیکن کیس نمبر کے بغیر میں کچھ نہیں کر سکتا۔''
''جان کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔ یہ بہت اہم ہے۔''
''اور یہ فنگر پرنٹس؟'' جان نے بیگ میں جھانکا۔
''یہ افراد ڈیٹا بیس میں نہیں ہیں۔ یہ لوگ اکیلے دورے آئے تھے۔'' پائیک نے بتایا۔
''انٹرنیشنل سرچ کے لیے مخصوص درخواست کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ بڑا گیم ہے۔'' جان نے سر کھجایا۔
''ہاں، بگ اینڈ بگر۔''
جان شین نے نچلا ہونٹ چبایا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کس حد تک جایا جا سکتا ہے۔ ''ٹھیک ہے میں دیکھوں گا۔'' بالآخر وہ بولا۔
پائیک گاڑی سے اُتر کر چل پڑا۔ جان اس کی پشت کو تک رہا تھا۔ ''تم اتنے برے نہیں ہو'' جان نے سوچا۔ اسے پائیک کا فقرہ یاد آیا۔ ''تم میرے دوست ہو۔''
☆☆☆
پائیک نے دو مرتبہ دستک دی اور دروازہ کھول دیا۔
''میں ہوں۔'' وہ بولا۔ اندر قدم رکھتے ہی اسے خاموشی کا احساس ہوا۔ کول کا آئی پوڈ کافی ٹیبل پر تھا۔ اس کے ساتھ پانی کی کھلی بوتل رکھی تھی۔ لارکن کے سینڈ یز فرش پر پڑے تھے۔ پائیک نے حرکت بند کر دی اور قوتِ سماعت پر زور دیا۔ کیا لارکن اس کے ساتھ کھیل رہی ہے۔ نہیں یہ غلط سوچ ہے۔ خالی مکان کا سکوت اپنی شناخت آپ تھا۔ پائیک نے فوڈ بیگ نیچے رکھا اور کیمبر باہر نکالا۔ اس نے پورا مکان چیک کیا۔ کہیں کسی قسم کی کشمکش کے آثار نہیں تھے۔ شاید کوئی رقعہ چھوڑا گیا ہے لیکن اسے کوئی نوٹ نہیں ملا۔ لارکن کا پرس اور بیگ اس کے بیڈ روم میں تھے۔

''احمق اسے نکالنے کے لیے کس نے کہا ہے یہ تو انجن ہے''

وہ باہر مختصر پورچ کے تاریک کونے میں کھڑا ہو گیا۔ زندگی رواں دواں تھی۔ سب کچھ نارمل لگ رہا تھا۔ غالب امکان یہی تھا کہ بے چین، پارہ صفت حسینہ ٹہلنے کے لیے نکلی ہو گی۔ لیکن کس طرف؟ شاید سن سیٹ بولیوارڈ کے بالائی سرے پر۔ وہ باہر آ گیا۔ کار میں بیٹھ کر دھیمی رفتار سے چل پڑا۔ آنکھیں اطراف کا جائزہ لے رہی تھیں۔ دفعتاً اس نے لارکن کو مخالف سمت سے آتے دیکھا۔ چار افراد اس کے آس پاس تھے۔ وہ اپنی دُھن میں قدم بڑھا رہی تھی۔ پائیک نے بغور جائزہ لیا کہ چار آدمیوں نے اسے گھیرا ہوا ہے یا محض عام مسافر ہیں۔ خطرے کی کوئی علامت نظر نہیں آ رہی تھی۔ پھر بھی وہ ان پانچوں کے قریب سے آگے نکل گیا۔ کچھ دور جا کر اس نے گاڑی گھمائی اور واپس آیا۔ لارکن سے آگے جا کر اس نے گاڑی روک دی۔ سائڈ مرر میں آخری بار دیکھا اور گاڑی سے اُتر گیا اور سڑک پار کر کے کھڑا ہو گیا۔ ذرا دیر میں لارکن اس کے قریب پہنچ گئی۔ پائیک نے اسے بازو سے پکڑ لیا۔ اس نے بدک کر پائیک کو دیکھا۔ وہ چاروں بھی چونکے تھے۔ پائیک اسے لے سڑک پار کر گیا۔ وہ خاموش تھی۔ اسے پسنجر سیٹ پر بٹھ[illegible] وہ ڈرائیونگ سیٹ پر آیا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔ کئی اف[illegible] متوجہ ہوئے تھے لیکن لارکن کی خاموشی کے باعث کسی [illegible] مداخلت نہیں کی۔
پائیک غصے میں تھا لیکن اس نے اظہار نہیں کیا۔
''کہاں گئی تھیں؟''
''کلب۔''
''کیسا کلب؟''
''کلب پری وان۔''
''کیوں؟''
''ڈانس کرنے۔''
پائیک نے کڑوا گھونٹ لیا۔ ''کسی سے بات کی تھی؟''
''ہاں۔''
''کیا؟''
''کچھ خاص نہیں۔'' لارکن نے بوریت سے کہا۔

"تم بھی بتاؤ؟"
"ہونا۔" لارکن نے جواب دیا۔
پاتیک نے اطمینان کی سانس لی، چہرے پر پوچھنے کے بعد اس نے گاڑی ایک طرف روکی اور لارکن کی طرف دیکھا۔
"نشے میں ہو؟" پاتیک نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔
"نہیں۔ یہ چشمہ ہٹاؤ۔ اس وقت سن گلاسز کی کیا تُک ہے۔ میری آنکھیں دیکھ رہے ہو۔ مجھے اپنی آنکھیں دکھاؤ۔" لارکن نے چیخ کر کہا۔
"میری آنکھیں ٹھیک نہیں ہیں۔ تم نے جو حرکت کی ہے، وہ ہم دونوں کو مروانے کے لیے کافی تھی۔" پاتیک نے سرزنش کی۔
وہ پہلے کے برعکس اب پاتیک سے ملی تھی۔ وہ اس کی آنکھیں دیکھنا چاہتی تھی لیکن اب وہ خوف زدہ تھی۔
پاتیک نے نرمی سے اس کا ہاتھ پکڑا۔ "کیا تم مرنا چاہتی ہو؟ یا تم گھر جانا چاہتی ہو؟ میں تمہیں گھر پہنچا دوں گا۔ گھر جاؤ اور آرام کرو۔ اگرچہ میں یہ نہیں چاہتا۔"
"نہیں، میں ایسا نہیں چاہتی۔"
"میں خودکشی یا زندگی ضائع کرنے کے حق میں نہیں ہوں۔ ہاں کسی مقصد کے لیے زندگی داؤ پر لگا سکتا ہوں۔ یہ ایک الگ معاملہ ہے۔"
وہ الجھن سے اسے گھور رہی تھی۔
"گھر جانا ہے یا مرنا ہے تو مرو..."
"نہیں۔"
"میں دونوں کا نہیں۔" پاتیک نے درشتی سے کہا۔
لارکن کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ "میں صرف ایک کار ڈرائیو کرنا چاہتی ہوں۔"
"زندہ رہوگی تو ڈرائیو کروگی۔ اچھی۔ میں تمہیں ہر صورت میں گھر پہنچا دوں گا۔"
"تمہیں نہیں معلوم میری طرح ہونا کیسا ہوتا ہے۔"
"تمہیں نہیں معلوم میری طرح ہونا کیسا ہوتا ہے۔"
پاتیک نے اپنے لہجے میں جملہ دہرا دیا۔
وہ خاموش تھی۔
پاتیک نے نرم لہجے میں کہا۔ "مجھے بتاؤ تم کیا چاہتی ہو؟"
"میں زندہ رہنا چاہتی ہوں۔"
"دوبارہ کہو۔"
"میں زندہ رہنا چاہتی ہوں۔"
پاتیک اس کا ہاتھ چھوڑ کے سیدھا ہوا اور اسٹیرنگ وہیل سنبھالا۔ "ہم دونوں زیادہ مختلف نہیں ہیں۔"
وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔ "او مائی گاڈ۔"
پاتیک نے گاڑی آگے بڑھائی۔ "تم چاہتی ہو کہ تمہیں دیکھا جائے اور میں چاہتا ہوں کہ مجھے کوئی نہ دیکھے۔ بس اتنا فرق ہے۔"

☆☆☆

گھر پہنچ کر انہوں نے کھانا کھایا۔ لارکن جلدی سونے چلی گئی۔ پاتیک جاگ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا، کیا گھر خالی کر دینا چاہیے۔ رات وہیں رکنے کا فیصلہ کر کے وہ کھڑا ہو گیا۔ ہر کھڑکی سے اس نے چاروں اطراف گھر کے باہر جائزہ لیا۔ رات وہ بہت کم سویا۔ اسے یقین تھا کہ میش غصے میں ہے۔ اسے موقع دیے بغیر دباؤ برقرار رکھنا تھا۔ یہاں تک کہ میش غلطیاں کرنے پر مجبور ہو جائے۔ وہ میش کو اسٹریس میں مار رہا تھا۔ میش شکاری نہیں خود ایک شکار تھا۔ پاتیک کو یہ احساس دشمن کے اندر پیدا کرنا تھا۔ پھر وہ غلطی کرے گا۔
صبح اس نے فون کر کے کول کو موٹیل والے واقعے کے بارے میں بتایا۔ لارکن اٹھ گئی تھی۔
"کافی تم نے بنائی ہے؟"
"میں تمہیں بیدار کرنا نہیں چاہتا تھا۔"
لارکن نے یوں نظریں چرائیں گویا وہ رات والی حرکت پر شرمندہ ہو۔
پاتیک اسے ٹیبل پر لایا جہاں پاسپورٹس اور کاغذات کول کا انتظار کر رہے تھے۔ لوئیس کا پاسپورٹ اٹھا کر اس کی تصویر لارکن کو دکھائی۔
لارکن نے نفی میں سر ہلایا۔ "کون ہے یہ؟"
"ان میں سے ایک ہے جنہوں نے تمہارے گھر پر حملہ کیا تھا۔ اس کا اصل نام لوئیس ہے۔ نام کا آخری حصہ نہیں معلوم۔"
"لیکن پاسپورٹ پر جیمس لیون لکھا ہے؟"
"پاسپورٹ نقلی ہیں۔" پاتیک نے بتایا اور دوسرے پاسپورٹ دکھائے۔ لارکن نے کسی کو نہیں پہچانا۔
"تمہیں یہ کہاں سے ملے؟" لارکن نے سوال کیا۔
پاتیک نے سوال نظر انداز کر دیا۔ "کیا تم نے ہیرن کا نام سنا ہے؟"
"نہیں۔"
"اور کارلوس کا نام؟"
لارکن نے پھر نفی میں گردن ہلائی۔
کول آیا تو تیرہ انچ کا چھوٹا ٹی وی اس کے ساتھ تھا۔

حالانکہ کسی نے فرمائش نہیں کی تھی۔ ٹی وی ایک طرف سائڈ ٹیبل پر رکھ کر آن کر دیا۔ لارکن کافی کے ساتھ کاؤچ پر چلی گئی۔ اس کی توجہ بھی ٹی وی پر تھی۔
کول ٹیبل پر پاتیک کے ساتھ بیٹھ گیا۔ کول نے پاسپورٹس کا جائزہ لیا۔ "ٹھیک... بہترین نقل ہے۔" اس نے تبصرہ کیا۔ پاتیک نے اسے اسپائرل نوٹ بک دکھائی۔ نوٹ بک میں خستہ حال نوٹس تھے، جیسے میش ڈرائیونگ کے دوران لکھتا رہا ہو۔ ان کو پڑھنا مشکل تھا۔ البتہ نمبرز واضح طور پر فون کے تھے۔ پھر اس نے گھڑی اٹھائی۔ گھڑی کو دیکھتے ہی وہ چونکا۔
"چارجنگ کے لیے، یعنی چارج جیسے چارج کنگ؟"
"یہ ستر ہزار ڈالرز کی گھڑی ہے۔" پاتیک نے کہا۔
"فون نمبر دکھاؤ۔" کول نے گھڑی ایک طرف رکھ دی۔
پاتیک نے ایک فہرست تیار کی تھی۔ جس میں ہر فون سے کی جانے والی کالز اور وصول شدہ کالز کا ریکارڈ تھا۔ جھنگا نے صرف تین کالز کی تھیں۔ تینوں لوئیس کے نمبر پر۔ لوئیس نے سینتالیس کالز انیس مختلف نمبروں پر کی تھیں۔ کول نے فہرست دیکھی پھر فون آن کیے۔
"ویری بیڈ۔" وہ بولا۔ "اگر پاس ورڈ ہوتے تو میسج بھی سنے جا سکتے تھے۔"
"فون آن رہنے چاہئیں۔ ممکن ہے کوئی کال کرے۔" پاتیک نے کہا۔
"تم نے جسے فون کیا تھا شاید یہ خیال بہت اچھا نہیں تھا۔" کول نے تبصرہ کیا۔ "ممکن ہے اس نے فون ضائع کر کے دوسرا لے لیا ہو۔"
"میں یہ خطرہ اٹھانا چاہتا تھا۔"
"لیکن یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ میش تھا؟"
"ہاں یقین نہیں کیا جا سکتا۔"
"ٹھیک ہے، شاید میں ان نمبرز سے کچھ حاصل کر سکوں۔" کول نے فہرست پر نگاہ ڈالی۔ "لوئیس نے انیس نمبرز پر فون کیا۔ تمام پیچھے نہیں جائیں گے۔ میں فون کمپنی میں اپنے دوست سے بات کرتا ہوں۔ شاید وہ مدد کر سکے۔ وہ دوسری سروس پرووائڈرز سے کال ریکارڈ حاصل کر سکتی ہے۔ جلد یا بدیر یہ کچھ دے گا۔"
پاتیک نے لارکن کی طرف دیکھا۔ وہ ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ "تم ٹھیک ہو؟" پاتیک نے کہا۔
"آئی ایم گڈ۔" وہ پھر ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گئی۔
پاتیک ان کو وہیں چھوڑ کر اٹھ گیا۔ فرنٹ ونڈو سے باہر دیکھا۔ کوئی غیر معمولی بات یا حرکت نہیں تھی۔ کوئی بھی کار نظر نہیں آئی۔
"لوئیس کب یہاں آیا تھا؟"
کول نے تاریخیں دیکھ کر کہا۔ "ٹکٹ کے مطابق لارکن نے جب ایکسیڈنٹ کیا تھا اس کے چار دن بعد۔ یعنی FBI دخل انداز ہو چکی تھی اور لارکن باپ کے ساتھ واپس گھر پر تھی۔ اگر وہ لارکن کے پیچھے ہوتے تو جانے حادثے کے بجائے پہلے ہی گھر میں ہوتے۔ [illegible] کر رہے تھے۔ جو بھی ہوا حادثے کے بعد شروع ہوا۔"
پاتیک، کول کی بات سمجھ رہا تھا۔
"ہمیں ایک بار پھر وہاں جانا چاہیے۔" کول نے تجویز پیش کی اور پاتیک نے لارکن کو اٹھتے دیکھا۔
"کہاں کا پروگرام ہے؟" وہ بولی۔
"تم یہاں رکنا چاہو تو..."
"نہیں، میں ساتھ جاؤں گی۔" لارکن نے بات کاٹی۔
وقفے کے بعد پاتیک نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔"

☆☆☆

انہوں نے سن سیٹ بولیوارڈ کو پار کیا ہی تھا کہ جان شیمن کی کال آئی۔ وہ سرگوشیوں میں بات کر رہا تھا۔
"دو انٹرپول کے ایجنٹ جنوبی امریکن دنیا میں گم ہیں۔" وہ بولا۔ "جھنگا میتوئل بیٹراز اور دوسرا لوئیس ایلیا میڈوزا۔ دونوں ہی متعدد مرڈر کیس میں مطلوب تھے۔"
"وہ کس کے لیے کام کرتے تھے؟"
"کوئی ایسی بات یقین سے نہیں جس کے ساتھ وہ منسلک تھے۔ اکیلے تھے۔ دوسرے باہر ہیرن کولو کارٹل کا حصہ ہے۔ کولو چند گروپس میں سے ایک ہے جو کولمبیا میں میڈیلین اور کالی کارٹلز کے ٹوٹنے کے بعد وجود میں آئے۔"
"کیا ان کے ساتھی یا فیملی یہاں امریکا میں ہیں؟"
"ایسا نہیں لگتا۔ دونوں ہیرن نامی آدمی کے لیے سولجرز کے مانند تھے۔" جان شیمن نے جواب دیا۔
جھنگا سے پاتیک نے جو کچھ معلوم کیا تھا۔ جان شیمن نے اس کی گویا تصدیق کر دی۔ لیکن پاتیک کے لیے کوئی نئی معلومات سامنے نہیں آئی جو اسے میش کے قریب لے جاتی۔
"ایگل راک اور مالی بو سے ملنے والا اسلحہ ایف بی آئی نے اپنے قبضے میں کر لیا۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ اس کا تعلق بھی کولو گروپ سے ہے؟" جان نے سوال کیا۔
"ہاں۔" پاتیک نے جواب میں کہا۔
"میں سوچ رہا ہوں کہ ایف بی آئی کو پہلے سے ان کی

پہچان ہے۔ میرے خیال میں وہ صرف دوسروں کو اس بھیڑ سے الگ رکھنا چاہتے ہیں۔"

"تمہارا تمہارا خیال ٹھیک ہے جان۔"

"میری سمجھ سے باہر ہے۔ اگر ایکوے ڈور کے ایسے مجرموں کی پہچان ہوتی ہے تو ایف بی آئی کو کیا تکلیف ہے؟"

"پاٹیک خود الجھن میں تھا کہ کنگ کے خلاف کیس کو کھلنے سے بچانے کے لیے ایف بی آئی کیوں توانائی صرف کررہی ہے۔ پاٹیک کو یقین تھا کہ پٹ مین کچھ چھپا رہا ہے۔ کیا چھپا رہا ہے؟ وہ بے خبر تھا۔

"فی الحال میں ہر بات سے آگاہ نہیں ہوں۔" پاٹیک نے کہا۔ "مزید علم ہوا تو بتاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ فون بند کررہا ہوں۔"

"اوکے۔" پاٹیک نے لارکن کی طرف دیکھا۔

"جو لوگ تمہاری جان کے دشمن بنے ہوئے ہیں، وہ ایسٹ بان ہیرن کے لیے کام کرتے ہیں۔"

"میں نے سوچا تھا کہ وہ میش کے آدمی ہیں۔" لارکن نے کہا۔

"پٹ مین نے بتایا ہوگا۔ ویسے ہیرن اور میش کا تعلق بنا رہے۔ پٹ مین کے مطابق میش جنوبی امریکا سے رقم یہاں انویسٹ کرتا ہے۔"

"بدقسمتی نے ڈیڈی اور گورڈن کو بتایا تھا تم میری حفاظت کے لیے بہترین ہو۔ میرا خیال ہے کہ ٹھیک کہا تھا۔" لارکن نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

"بدقسمتی نے اور کیا کہا تھا؟"

"یہی کہ ہم تم پر بھروسا کرسکتے ہیں۔ اس نے گارنٹی دی تھی۔"

پاٹیک جواب میں خاموش رہا۔

☆☆☆

جائے حادثہ کے قریب انہوں نے گاڑی روک دی۔ کول نے اپنا تیار کیا ہوا بڑا سا نقشہ نکالا۔ جس پر نشانات، لکیریں، نام اور نمبر لکھے تھے۔ ان آدمیوں کے نام بھی تھے جن کے اس نے انٹرویو لیے تھے۔

"یہ جاسوسی ہے یا ریسرچ؟" پاٹیک نے کہا۔

"ایک جیسی بات ہے۔" جواب آیا۔

دن کا آغاز تھا۔ سائڈ واک پر ورکرز پلاسٹک کے ناشتے دان کے ساتھ چلتے نظر آرہے تھے۔ کول نے نقشے پر ایک جگہ انگلی رکھی۔ یہ ایک گودام کا پتا تھا۔ نمبر کی جگہ 18187 لکھا تھا۔ کول نے نقشہ لپیٹ کر جیب میں رکھا۔

"چلو اُترو۔"

پاٹیک نے لارکن کو دیکھا۔ "کیا خیال ہے؟"

"میں ساتھ ہوں۔" وہ بولی۔

کول نے اُتر کے اطراف کی چھتوں اور کھڑکیوں کو یوں تاڑا جیسے وہ سیکرٹ ایجنٹ ہو اور پریذیڈنٹ کے اترنے سے پہلے راستہ صاف کررہا ہو۔ پھر گھوم کر اس نے عقبی نشست سے نیلے رنگ کا ڈفل بیگ اٹھا کے کندھوں سے گزارا اور پیٹھ پر لٹکا لیا۔ اب اس نے لارکن کی طرف کا دروازہ کھولا۔

"دیکھتے ہیں وزٹ کارآمد ہوتا ہے یا نہیں۔"

"کیا تم غیر قانونی طریقے سے گھسو گے؟" وہ بولی۔

"غیر قانونی طریقہ میں پہلے اختیار کرچکا ہوں۔ گودام ویسے بھی متروکہ اور ویران ہے۔"

وہ تینوں ایک کیٹرنگ ٹرک کے قریب سے گزر کے گلی میں داخل ہوگئے۔ متروکہ گودام دائیں ہاتھ پر تھا۔ بڑے دروازے کو چین سے بند کیا گیا تھا۔ کول رکے بغیر آگے بڑھ گیا۔ آگے کونے پر پارکنگ تھی۔ یہاں دوسرا لوڈنگ ڈاک عمارت کے اندر جارہا تھا۔ آہنی دروازے پر بلڈنگ کی فروخت یا لیز کا اشتہار موجود تھا۔ کول نے جالی سے جھانکا۔

"وہ یہاں تھے۔" اس نے گویا انکشاف کیا اور انگلی سے چھت کی طرف اشارہ کیا۔ جہاں ہلکے نیلے رنگ کا الارم پینل نصب تھا۔ جس کا کور غائب تھا۔ پرانے تار کاٹ کے کسی نے نئے تار جوڑ دیے تھے۔ کول نے پاٹیک کی طرف دیکھ کر آنکھ ماری۔ ڈفل بیگ سے اس نے دو فٹ لمبا بولٹ کٹر نکالا اور وزنی قفل کی رکاوٹ توڑ دی۔ پاٹیک اطراف میں نظر رکھے ہوئے تھا۔ گیٹ کھول کر وہ اندر چلے گئے۔ گیٹ کو واپس اپنی جگہ پر کردیا۔ اسٹاف ڈور پر تین مضبوط تالے موجود تھے۔ کول نے انہیں بھی ٹھکانے لگایا۔ پاٹیک، لارکن کی طرف سے مطمئن تھا۔ وہ بات چیت کررہی تھی نہ ہی کوئی سوال۔ دروازہ کھول کے کول نے فلیش لائٹ نکالی اور پاٹیک کو پکڑا دی۔ ایک لائٹ خود اس کے ہاتھ میں تھی۔ قابلِ تلف ونائل گلوز بھی اس نے دونوں کو پکڑا دیے۔

نیم اندھیرے میں پہلے پاٹیک نے قدم اندر رکھا۔ اندر سے فرنیچر نکال لیا گیا تھا۔ فرش پر گرد کی تہ کے علاوہ پیشاب کی بو تھی۔ یقیناً وہاں چوہے بھی تھے۔ فلیش لائٹ کی روشنی میں پاٹیک الجھ گیا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ گرد میں تازہ قدموں کے نشان نظر آرہے تھے۔

لارکن کا منہ بنا ہوا تھا۔ "بہت بدبو ہے۔" وہ خوشبودار مٹی لی بی ہوئی خوشبوؤں میں رہنے والی خوش خرام وخوش ادا اس کے لیے یہ جگہ بُرے خواب کے مانند تھی۔ کول نے سرگوشی کی۔ پاٹیک نیچے جھکا ہوا تھا۔

"تین آدمی تقریباً ایک ہفتہ قبل۔" وہ کھڑا ہو گیا۔ روشنی میں اس نے قدموں کی سمت دیکھی جو دوسرے کمرے تک گئی تھی۔ اس نے دوسرے کمرے کی کھڑکی سے روشنی اندر ڈالی۔ وہاں اندر مزید قدموں کے نشان تھے۔ کول اور لارکن اس کے دائیں بائیں موجود تھے۔

"وہ یہاں آئے ... لیکن واپس نہیں گئے۔" پاٹیک کی پیشانی پر شکن نمودار ہوئی۔ لارکن نے کھڑکی میں جھانکا۔

"وہ کیا تلاش کررہے تھے؟ اور اس جگہ سے میرا کیا تعلق ہے؟" وہ بولی۔

کول نے دروازے پر ہاتھ رکھا۔ "یہی معلوم کرنا ہے۔" دروازہ کھلتے ہی امونیا کی تازہ بو ناک میں چڑھی۔ لیکن امونیا کے پیچھے ایک اور بو تھی۔ امونیا سے تیز اور ناگوار۔ پاٹیک کے جبڑے بھنچ گئے۔ اس نے کول کی طرف دیکھا۔ لارکن نے ہاتھ منہ پر رکھ لیا۔ "اوخ" کمرے کے پار ایک اور دروازہ تھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ پاٹیک نے آگے بڑھ کر کھلے دروازے سے گودام کو روشن کرنے کی کوشش کی۔ کول اور لارکن ساتھ تھے۔ دو فلیش لائٹس کی روشنی بھی ناکافی لگ رہی تھی۔

"اوہ مائی گاڈ۔" لارکن کی آواز آئی۔ نیم اندھیرے میں اس نے کار پہچان لی تھی۔ مرسیڈیز سیڈان لوڈنگ ڈول/ ڈاک کے قریب کھڑی تھی۔ "یہ وہی کار ہے جسے میں نے ٹکر ماری تھی۔ اس کا عقبی کونا دیکھو۔" وہ کار کے قریب گئی اور اندر جھانکا اور اپنا پیٹ پکڑ لیا۔ بو تیز ہوگئی تھی۔ کول نے اس کا بازو پکڑ کے کار سے دور کیا۔ پاٹیک نے فلیش لائٹ کی روشنی اندر ڈالی۔ پسنجر سیٹ پر ایک مردہ شخص کونسول پر ڈھلکا پڑا تھا۔ دوسری لاش عقبی سیٹ پر تھی۔ وہ کوئی عورت تھی۔ اس کی لاش اس طرح سمٹی پڑی تھی کہ گھٹنے بالائی بدن کی طرف تھے۔ دونوں برہنہ تھے۔ دونوں کے ٹخنے اور کلائیاں رسی سے بندھی تھیں۔ دونوں کے سروں میں پیچھے سے گولی ماری گئی تھی۔ پاٹیک نے رخ لارکن کی طرف کیا۔ "میرا خیال ہے کہ ان دونوں کا تعلق جارج کیلی سے ہے۔ کیا تم دیکھ سکتی ہو؟"

لارکن منہ سے سانس لے رہی تھی۔ چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا لیکن اس نے قریب آ کر اندر جھانکا۔

"اوہ مائی ... یہ وہی ہے۔ جارج کنگ۔"

پاٹیک نے کول کی طرف دیکھا۔ کول نے تفہیمی انداز میں سر کو جنبش دی۔

"تم ایلس کول کے ساتھ جاؤ۔ میں چند منٹ رکوں گا۔" پاٹیک نے لارکن سے کہا۔

"نہیں، میں ٹھیک ہوں۔" لارکن کے چہرے کے تاثرات سخت ہوگئے۔ وہ خود کو مضبوط کررہی تھی۔ پاٹیک نے دل میں تعریف کی۔

"ٹھیک ہے، رومال چہرے پر رکھو۔ رومال نہیں ہے تو قمیص کا دامن استعمال کرو۔" پاٹیک نے کہا۔

لارکن نے شرٹ کا سہارا لیا۔ وہ اور کول دونوں چند قدم پیچھے ہٹ گئے۔

چابیاں ابھی تک اگنیشن میں تھیں۔ اس کا مطلب گاڑی لاک نہیں تھی۔ پاٹیک نے دروازہ کھولا۔ بدبو کا بھبکا آیا۔ پاٹیک ان چیزوں کا عادی تھا۔ افریقہ میں تو کہیں زیادہ بدتر حالات سے گزرا تھا۔ پہلے اس نے جارج کنگ کا جائزہ لیا۔ گولی دائیں کان کے پیچھے ماری گئی تھی جو بائیں کنپٹی سے نکل گئی تھی۔ کار میں خون کا فقدان اشارہ کررہا تھا کہ کنگ کو مار کر بعد میں کار میں ڈالا گیا تھا۔ کیلی فورنیا کی وہیکل رجسٹریشن سلپ اور انشورنس کارڈ جارج کنگ کے نام پر تھا۔ دونوں اشیا سن وائزر کے ساتھ کلپ کی گئی تھیں۔ عورت کو بھی سر کی پشت پر گولی ماری گئی تھی لیکن اسے دو گولیاں ماری گئی تھیں۔ دائیں آنکھ اور رخسار کا ایک حصہ غائب تھا۔ اسے بھی کسی اور لوکیشن پر مارا گیا تھا یا اسی عمارت میں کہیں مارا گیا تھا۔ پھر کار میں ڈال کر مرسیڈیز یہاں کھڑی کی گئی تھی۔ پاٹیک نے کار ڈور بند کیا اور کول کی طرف چل دیا۔ لارکن اس کے ساتھ کھڑی تھی۔

کول نے فلیش لائٹ گودام کی چھت کی جانب کی۔ "وہ اسکائی لائٹ کے ذریعے یہاں آئے تھے اور گودام اندر سے کھولا پھر کار لا کر وہاں کھڑی کردی۔"

"چلو باہر نکلو۔" لارکن بولی۔

باہر آکر انہوں نے گلوز بھی اُتار دیے۔ کول نے لارکن کو مخاطب کیا۔ "پٹ مین اور بلانچیٹ جب پہلی مرتبہ تم سے ملے تو گھر آئے تھے؟"

"ہاں۔"

"ڈاؤن ٹاؤن ملاقات کہاں ہوئی تھی؟"

"رائل بلڈنگ۔ وفاقی دفاتر بھی وہیں ہیں۔"

”ان دونوں کے علاوہ بھی کوئی اور تھا؟“
”کیا فرق پڑتا ہے؟“ لارکن نے سوال کیا۔
”وہ یہ جاننے کی کوشش کر رہا ہے کیا ہٹ مین کا تعلق واقعتاً وفاق سے ہے۔ اس نے جو کچھ تمہیں بتایا وہ سب جھوٹ معلوم ہوتا ہے۔ ہٹ مین کے مطابق میش تمہیں ہلاک کرنے کی کوشش اس لیے کر رہا ہے کہ تم کنگ کے خلاف گواہی نہ دے سکو۔“ پائیک نے واضح کیا۔ ”مطلب یہ کہ اتھارٹی کے سامنے تصویر دیکھ کر تم جارج کو پہچان لو گی۔“
لارکن نے سر ہلا کے انکار کیا۔ ”لیکن جارج مر چکا ہے۔“
”ہاں، یہ میش کے آدمیوں کا کام ہے اور میش جانتا ہے کہ کنگ مر چکا ہے۔“
لارکن بے قراری سے کسمسائی۔ وہ خود کو تاریک اور خطرناک کونے میں کھڑا دیکھ رہی تھی۔
”شاید...... شاید کسی اور نے مارا ہو۔ شاید میش نے نہیں مارا۔“ لارکن نے الجھن سے کہا۔
پائیک نے جواب دیا۔ ”لوگس کی کلائی پر جارج کنگ کی گھڑی تھی۔ یہ میش کی حرکت ہے۔“
”لیکن وہ اب بھی میرے پیچھے کیوں پڑے ہیں؟“
”میں نہیں جانتا۔“
”حیرت ہے کہ جہاں حادثہ ہوا تھا۔ انہوں نے اس کے قریب لاشیں کیوں لا کے رکھیں؟“ کول نے سوال اٹھایا۔
”کچھ اور بتاؤ۔“ پائیک نے کول کو اشارہ کیا۔
کول نے لارکن کو دیکھا۔ ”وہ دونوں حادثے کے دو دن بعد تم سے گھر پر ملے۔ جبکہ دونوں حادثے کے ایک دن بعد یہاں انٹرویو کرتے پھر رہے تھے۔ اور لوگوں کو دو آدمیوں کی تصاویر دکھا رہے تھے۔ ہٹ مین تمہیں ملنے سے قبل ہی جانتا تھا کہ میش کار میں تھا۔ ان دونوں نے تمہارے ساتھ غلط بیانی کی۔“
لارکن نے دونوں ہاتھ سر پر رکھ لیے۔ ”پلیز مجھے بتاؤ کہ مزید خرابی نہیں ہوگی۔“
پائیک نے اسے خود سے قریب کر لیا۔ تاہم یہ قربت زیادہ طویل نہیں تھی۔

☆☆☆

بلڈنگ اور لاشیں کول کے لیے پریشان کن تھیں۔ کسی نے وہاں لاشیں رکھنے کے لیے بڑا خطرہ مول لیا تھا۔ قاتل نے وہ مخصوص جگہ پیغام دینے کے لیے چنی تھی۔ کول یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ پیغام دینے والا کون ہے۔ وصول کرنے والا کون ہے؟ یعنی پیغام کس کو دیا گیا ہے؟
وہ سانتا مونیکا بولیوارڈ کے فری وے پر ٹیم سے الگ ہو گیا تھا۔ وہ ہالی ووڈ کے مغرب میں اپنے آفس کی طرف جا رہا تھا۔ عمارت میں اس کا آفس چوتھی منزل پر تھا۔ آفس سے متصل کمرا جو پائیک کے لیے مخصوص تھا۔ یہ اور بات تھی کہ وہ کمرا کبھی زیر استعمال نہیں رہا۔ سینٹر ٹیبل کے دوسری جانب دو کرسیاں ڈائریکٹرز کے لیے تھیں۔ کبھی کبھار ایک سے زیادہ کلائنٹ کو بھگتانا پڑتا تھا۔ دونوں کرسیوں کے عقب میں فرنچ ڈور ایک بالکونی میں کھلتا تھا۔ جہاں کھڑے ہو کر نیچے تمام سانتا مونیکا بولیوارڈ اور چینل آئی لینڈز کو دیکھا جا سکتا تھا۔ کول نے فرنچ ڈور کھول دیا اور ڈیسک پر واپس آ کے فون اٹھایا۔ وہ فلوریڈا میں مارلا ہنڈرک نامی عورت سے رابطہ کر رہا تھا۔ جو گودام کی ملکیت کی ہسٹری بتا سکتی تھی۔ کول کئی برسوں سے اس کی خدمات سے مستفید ہو رہا تھا۔ مارلا آن لائن ڈیٹا بیسز کو سرچ کرنے کی دسترس اور مہارت سے لیس تھی۔ اگرچہ ملٹری، میڈیکل اور قانون نافذ کرنے والے ادارے اس کی دسترس سے باہر تھے۔ مارلا سے بات کر کے کول نے فون کمپنی میں اپنے دوست کا نمبر ملایا۔ مدعا بیان کرنے کے بعد کول نے اسے تنبیہ کی کہ زیادہ تر نمبر جو وہ دے رہا ہے وہ قابلِ تلف فون کے ہیں اور چار انٹرنیشنل ہیں۔
”انٹرنیشنل نمبرز کے ساتھ پرابلم ہوگی اگر وہ ان لسٹڈ ہوئے۔“ جواب ملا، بولنے والی عورت تھی۔
”غالباً وہ میکسیکو اور ساؤدرن سے ہیں۔“ کول نے کہا۔
”چاہے وہ سائبیریا کے ہوں مشکل ہوتی ہے۔ غیر ملکی تعاون میں ہچکچاتے ہیں جب تک آفیشل چینل استعمال نہ کیا جائے۔ اور اپنے چینل میں استعمال نہیں کر سکتی۔ قابلِ تلف فون اگر کیش پر خریداری ہوئی ہے تو مالکان کا نام معلوم نہیں کیا جا سکتا۔“
”کسی خاص نمبر کا کال ریکارڈ حاصل کر سکتی ہو؟“ کول نے دریافت کیا۔ ”جلد یا بدیر ان نمبروں میں سے کوئی اصل فون پر کال کرے گا اور پھر ایسے فون کے مالک یا مالکان کے نام معلوم کیے جا سکتے ہیں۔“
وہ بولی۔ ”میں کوشش کرتی ہوں۔ نمبرز دو۔“
اس کام سے فارغ ہو کر کول نے ایک بار پھر این سی آئی سی (نیشنل کرائم انفارمیشن سینٹر) کی رپورٹ نکالی جو

میش کے بارے میں تھی۔ ممکن نہیں ہے کہ کہیں کچھ اس نے مس نہ کر دیا ہو۔ دوبارہ پڑھنے پر بھی کوئی نئی بات سامنے نہیں آئی۔ تفتیش کرنے والے ایجنٹس کے ناموں کا جائزہ لینے کے بعد اس نے اسپیشل ایجنٹ ڈیرل ولس کو نوٹ کیا۔ جس کا تعلق کولوراڈو اسٹیٹ جسٹس ڈپارٹمنٹ سے تھا۔ اس کا فون اگرچہ چھ سال پرانا تھا تاہم کول نے ڈائل کیا۔ کسی عورت نے جواب دیا۔ ”انویسٹی گیشن۔“
”ڈیرل ولس پلیز۔“
کول کو پانچ منٹ انتظار کرنا پڑا۔
”ولس بات کر رہا ہوں۔“ مردانہ آواز آئی۔
”سر میں ہیفر ہم ہوں۔ مین ڈیون شائر میں ڈی ٹو کے طور پر ہوی سائنز کے ساتھ ہوں، لاس اینجلس پولیس ڈپارٹمنٹ۔ ایک قتل کے سلسلے میں فون کیا تھا جو چند برس قبل ہوا تھا۔ قاتل فرار ہو گیا۔ اس کا نام الیگزینڈر میش ہے۔“ کول نے فرضی بیج نمبر بھی بتایا۔ اسے کم ہی شک تھا کہ ولس بیج نمبر کاپی کرے گا۔
”او ہاں، لیکن مسئلہ کیا ہے؟“
”ہم نے این سی آئی سی کی بریف حاصل کی ہے۔ تم نے اشارہ کیا تھا کہ وہ کولمبیا فرار......“
”ہاں تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ ان دنوں وہ ایک لڑکے کے ساتھ دھندا کر رہا تھا۔ ڈرگز لانا چاہتا تھا۔ اس نے لڑکے کے ساتھ مل کر منصوبہ بندی کی۔ لڑکے کا نام گونزالو لیڈر تھا۔ جب ہم نے چالان پیش کیا تو وہ کولمبیا بھاگ گیا۔“
”گونزالو سپلائر تھا؟“ کول نے استفسار کیا۔
”وہ ان میں سے ایک تھا جو کالی اور میڈلن کارٹل ٹوٹنے کے بعد ابھرے تھے۔“
”کیا میش کو ایسٹ بان بیرن نامی آدمی نے اپنے ساتھ ملا لیا تھا؟“
”سوری، میں صرف گونزالو کو جانتا ہوں۔“
چھ برس لمبا عرصہ تھا۔ ممکن تھا کہ میش گونزالو سے ہٹ کر بیرن یا کسی اور کارٹل کے ساتھ مل گیا ہو۔
کول نے کہا۔ ”آل رائٹ، میں میش کی طرف آتا ہوں۔ کیا میش لاس اینجلس میں بھی سرگرم رہا تھا؟“
”کہہ نہیں سکتا...... معاملہ کیا ہے؟“
”میش لاس اینجلس میں ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ وہ ایک سے زیادہ مرڈرز میں ملوث ہے۔“
ولس کی آواز آئی۔ ”تم الیگزینڈر میش کے بارے میں بات کر رہے ہو؟“

یہ مکا بھی ضابطے کے خلاف ہے...... مجھے اصول سکھانے والے لڑکا کا یہی انجام ہوتا ہے

”ہاں، بالکل۔“
کچھ دیر کا وقفہ آیا۔ ”پارٹنر، میش وہاں نہیں ہے۔ وہ مر چکا ہے۔“
کول کی کھوپڑی گھوم گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا بولے۔ ولس کی آواز تیقن سے بھرپور تھی۔
کول نے کہا۔ ”ڈپارٹمنٹ آف جسٹس کی جانب سے میش کی شناخت ہمارے پاس کنفرم ہے۔ تم کہہ رہے ہو کہ ڈپارٹمنٹ غلط ہے؟“
”صحیح غلط کی بات نہیں ہے۔ میں صرف میش کی موت کی تصدیق کر رہا ہوں۔ کولمبین اور ڈرگ انفورسمنٹ ایڈمنسٹریشن کتوں کی طرح گونزالو کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ ہمیں وہیں سے معلوم ہوا تھا کہ میش ختم ہو چکا ہے۔ کولمبین نیشنل پولیس نے ڈرگ ایڈمنسٹریشن کو کال کی اور ڈی ای اے نے مجھے کال کی۔ میش نے ایک ڈرگ ڈیل گونزالو اور کسی ویزولان کے درمیان سیٹ کی تھی۔ صرف گونزالو سامنے آیا۔ ویزولان غائب تھا۔ گونزالو نے میش کو ٹھکانے لگوا دیا۔“
”اگر میش مر گیا تو تم لوگوں نے اس کی گرفتاری کے وارنٹ کیوں بند نہیں کیے۔“ کول نے اعتراض کیا۔
”گونزالو کے پیچھے انڈر کور ایجنٹ تھے۔ اگر ہم قاتل

میں۔ وہ بریف کیس لے کر واپس آیا۔ بریف کیس میں بھی۔ وہ بریف کیس لے کر واپس آیا۔ بریف کیس میں لیٹرز، میموز اور کاغذ کے ڈبے پن سے بھری تھیں۔ جن کا تعلق ڈپارٹمنٹ آف جسٹس اور ہوم لینڈ سیکیورٹی سے تھا۔ پائیک نے کہا۔ ''اور کنٹائز ڈکرائم سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے؟''

''ہوم لینڈ سیکیورٹی۔ میرے نوٹس دیکھو۔''

''کچھ اس بند کرو۔'' پائیک نے مالی لین دین اور نگرانی کے میموز دیکھے۔ کنگ کے الگ تھے۔ دیگر میموز واٹش اور بیرن کے تعلق کو ظاہر کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ متعدد نام تھے۔ کچھ بے نام تھرڈ پارٹی کے طور پر جنوبی امریکا میں سرگرم تھے۔ وہ اس وقت تک چھان پھٹک کرتا رہا جب تک کچھ کیس نہیں گیا۔ آخر میں اس نے پٹ مین کو دیکھا۔

''واٹش کالی دہشت گردوں کے لیے رقم پیدا کر رہا تھا۔''

پٹ مین نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''یہ اسمال پارٹ ہے۔ بڑا حصہ جنوبی امریکا سے لگی رہے ہے۔ منظم دہشت گردی کے لیے جہاں فنڈنگ میں ریاستیں بھی ملوث ہیں۔ وہ بہت دولت مند ہیں۔۔۔ واٹش کالی ایسے لوگوں کے لیے بطور انویسٹمنٹ ڈیکر کام کرتا ہے۔ ان کے فنڈز کو انویسٹ کرتا ہے، منافع میں تبدیل کر کے ان کا پیٹ بھرتا ہے۔''

''مرکز کہاں ہے؟''

''میں نہیں جانتا۔ کنگ نے تسلیم کیا تھا کہ غیر ملکی اکاؤنٹ میں رقم ٹرانسفر کی ہے۔ رقم کئی تھی لیکن کہاں؟ ہم بے خبر تھے۔ شاید کالی نے اسی لیے کنگ کو ختم کر دیا۔ شاید اسے رقم واپس چاہیے۔''

''مطلب سب کچھ رئیل اسٹیٹ کے گرد گھوم رہا ہے؟''

''دنیا میں سب کچھ ہو رہا ہے۔ آج رئیل اسٹیٹ بحران ہے۔''

پائیک لوکی کے بارے میں سوچنے لگا جسے فیملی، گھر اور دوستوں سے دور کر دیا گیا تھا۔ کالی جیسا ملعون اس کی جان کا دشمن تھا۔ اسے مردہ دیکھنا چاہتا تھا۔

''کالی کیوں اسے مارنا چاہتا ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم۔ پہلے میں سمجھا کہ میں جان گیا ہوں۔ مجھے یقین تھا کہ سب کچھ کنگ سے متعلق ہے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ کالی لڑکی کو مارنے کی کوشش کرے گا۔''

''تمہیں معلوم ہوا تو پھر متعلقہ افراد کو کیوں نہیں بتایا؟''

''میں نے بتایا تھا اور وہ سمجھ گئے تھے۔ لڑکی کا باپ بھی۔ لیکن اس نے ہمیں منع کیا کہ لارکن کو پتا نہیں چلنا چاہیے۔ اس طرح ہم سب ملوث ہو گئے۔ لڑکی کا باپ، وکیل گورڈن اور میرے آدمی۔ لڑکی نہ جان سکی۔ ہمیں ایک تعاون پر آمادہ گواہ کو الگ نہیں کرنا چاہیے۔ ہمیں اپنا صوابدیدی اختیار بھی استعمال کرنا تھا۔ بارکلے وغیرہ نے ہمیں ایڈوائس دی تھی کہ کالی کو گواہی سے پہلے شناخت نہ کیا جائے۔''

''انہوں نے تم کو ایڈوائس کی؟ اس کے باپ نے بیٹی سے جھوٹ بولا؟ لارکن، کالی کو نہیں جانتی تو تعاون کیا کرے گی؟''

''وہ لڑکی جنونی ہے۔'' پٹ مین نے کہا۔

''وہ صرف غلط کو صحیح کرنا چاہتی ہے۔'' پائیک نے گن اٹھائی۔ ''یہاں میرا تمہارا کام ختم۔''

پٹ مین نے بندشوں کے ساتھ زور آزمائی کی۔ ''مجھے آزاد کرو۔ پائیک اسے واپس لاؤ۔ ہم اس کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ اور تم کالی تک پہنچنے میں ہماری مدد کر سکتے ہو۔''

پائیک نے ڈور کھولا۔ ''تم اپنی مدد نہیں کر سکے۔'' وہ باہر نکل گیا۔ چابیاں اور گن اس کے پاس تھا۔ پٹ کو احساس ہوا کہ وہ جا رہا ہے۔

''کیا کر رہے ہو؟'' وہ بولا۔

پائیک نے چابیاں اور اس کا گن دونوں دریا برد کیں۔

''میرا گن! پائیک۔''

پائیک نے پلٹ کے دیکھنے کی زحمت نہیں کی۔

☆☆☆

لوکی کے ساتھ ٹھہرنے سے پہلے کول نے آفس سے کالنگ لاگ اٹھا لیا تھا۔ فون کمپنی میں اس کی دوست نے نمبروں کے چھبیس صفحات بھیجے تھے۔ آؤٹ گوئنگ اور ان کمنگ کالز۔۔۔۔ ان میں سے چھ جانی پہچانی تھیں۔

وہ قیام گاہ پر پہنچا تو لارکن کاؤچ پر نیم دراز ٹی وی دیکھ رہی تھی۔

''تھوڑی مدد کرو۔'' کول نے اسے اشارہ کیا۔

وہ آنکھوں میں حیرت لیے اٹھ بیٹھی۔ ''کیا؟''

''فون نمبرز۔ ہمیں فون فری بنانا ہے۔ ہم فون ٹو فون کال نہیں کریں گے۔ واٹش کالی تک پہنچنے سے یہ کوئی اشارہ مل سکتا ہے۔ یہ اسی طرح ہوگا جیسے ڈاٹس کو ملایا جاتا ہے۔'' کول نے بتایا۔

وہ دونوں نمبروں کی فہرست کے ساتھ ٹیبل پر آ گئے۔ کول نے اسے سمجھایا، کیا کرنا ہے۔ ایسے نمبرز پہچانتے ہیں جو جورگا، لوئیس اور اس آدمی کے ہیں جسے واٹش کالی کہا جا رہا ہے۔ لارکن کو کام پر لگا کے وہ اپنے فون کے ساتھ کاؤچ پر آ گیا۔

صبح مارلا ہینڈرک کا میسج آیا تھا۔ اطلاع تھی کہ 18187 گودام میئر فیملی ٹرسٹ کی ملکیت تھا۔ ٹرسٹ کی ملکیت میں بھی بڑی کمرشل پراپرٹیز ڈاؤن ٹاؤن میں تھیں۔ سب کی سب برائے فروخت تھیں۔ 18187 ڈاکٹر ولیم میئر نے 1968ء میں خریدی تھی۔ 1975ء میں گودام ٹرسٹ کی تحویل میں چلا گیا۔ ڈاکٹر کی بڑی بیٹی مس الزبتھ لل ٹرسٹ کی ایگزیکیوٹر تھی۔ جائداد کی فروخت کے معاملات وہی دیکھ رہی تھی۔ مارلا نے الزبتھ کا نمبر فراہم کیا تھا۔ نمبر جینٹ ووڈ کا تھا۔ کول نے پہلا قدم اٹھاتے ہوئے نمبر ملایا۔

''یس، دس از الزبتھ لل۔''

''میرا نام ایلوس کول ہے۔ میں نے جائداد برائے فروخت کے سلسلے میں کال کی ہے۔ میں ایک ممکنہ خریدار کی نمائندگی کر رہا ہوں۔''

''کون سی جائداد؟''

''18187 ڈاؤن ٹاؤن۔''

''او شیور۔ وہ گودام میرے ڈیڈ کا ہے۔ ہم ٹرسٹ کو تحلیل کر رہے ہیں۔ میں سوالات کے جواب دینے کی کوشش کروں گی۔ لیکن تمہیں ہمارے بروکر سے بات کرنی چاہیے۔''

''درست بات ہے۔''

''تو یہ سمجھو کہ ہم آفرز کا خیال کریں گے۔ لیکن کوئی بھی آفر بیک اپ میں رہے گی۔ کیونکہ ہمارے پاس ایک موقع ہے کہ تمام سات جائدادوں کو بیک وقت فروخت کیا جائے۔ میرا نہیں خیال کہ تمہارا خریدار پریشان ہوگا۔ ممکن ہے کہ موقع ہمارے ہاتھ سے نکل جائے۔''

''مطلب یہ کہ کوئی ساتوں خرید رہا ہے؟''

''مارکیٹ اوپر جا رہی ہے۔ اچھے مواقع موجود ہیں۔ کیا تمہارا خریدار ساتوں میں دلچسپی لے گا؟''

''ہم کس قیمت پر بات کر رہے ہیں؟'' کول نے سوال کیا۔

''دو سو ملین۔ بڑا سودا ہے۔ دیر سویر ہو سکتی ہے۔ دوسرے آپشن بھی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ہمیں جائداد الگ الگ بیچنی پڑے۔''

''میں خریدار کو بتا دوں گا، کتنا وقت ہے؟''

''زیادہ سے زیادہ چار مہینے۔'' الزبتھ نے جواب دیا۔

''ایک آخری سوال اگر برا نہ منایا جائے۔ کیا میں موجودہ ممکنہ خریدار کا نام پوچھ سکتا ہوں؟''

''کیوں نہیں۔۔۔۔ اسٹین تورم رئیل ہولڈنگ۔ جیسا کہ وہ لوگ آفرنہیں بڑھا رہے ہیں۔ شاید تمہارا خریدار آگے آ جائے۔ ورنہ ہم الگ الگ فروخت کریں گے۔'' کول نے نام نوٹ کر لیا اور شکریہ کے ساتھ فون بند کر دیا اور اس وقت پائیک اندر داخل ہوا۔ لوکی اور کول دونوں نے ہائے کہا لیکن وہ خاموش رہا پھر باتھ روم میں چلا گیا۔ وہ عجیب تھا لیکن کول عادی ہو گیا تھا۔ تاہم لڑکی الجھن زدہ نظر آئی۔

کول نے پھر فون اٹھایا اور انفارمیشن آپریٹر سے اسٹین تورم ہولڈنگ کا نمبر مانگا۔

لارکن نے نام سن کر نظر اٹھائی۔ ''وہ ڈیڈی کی ملکیت میں ہے۔''

''کیا، اسٹین تورم۔۔۔۔'' کول واپس ٹیبل پر آ گیا۔

''بیلیکلی وہ فیملی ہولڈنگز کا حصہ ہے۔ بلکہ میں بھی اس کی شراکت دار ہوں۔''

پائیک نے لیونگ روم میں قدم رکھا۔

''تمہاری ضرورت ہے۔'' کول نے کہا۔

پائیک ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ کول نے نئی اطلاع سے اسے آگاہ کیا۔ لارکن نے نفی میں سر ہلایا۔ ''کیا مطلب ہے؟ ڈیڈی اس جگہ کو خریدیں گے جہاں لاشیں دریافت ہوئی تھیں؟''

پائیک نے لارکن کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ لارکن نے ہاتھ تھام لیا۔ پائیک نے ہاتھ دبا کر کہا۔ ''میرے ساتھ رہو۔ اوکے! مضبوط بنو کیونکہ حالات مزید خراب ہونے والے ہیں۔''

لارکن نے کول کی طرف اور پھر دوبارہ پائیک کو دیکھا۔ اثبات میں سر ہلایا۔ ''میں تمہارے ساتھ لڑوں گی۔''

''تمہارے ڈیڈی اور گورڈن دونوں جانتے تھے کہ وہ مجرم نہیں واٹش کالی تھا۔ ان دونوں نے منصوبہ بندی کے تحت پٹ مین سے ڈیل کی اور تمہیں اندھیرے میں رکھا

گیا۔ یہ تمہی سے میں نے کافی کچھ اگلوالیا ہے۔ یہ آئیڈیا
تمہارے ڈیڈی کا تھا۔"
لارکن کی گرفت پاٹیک کے ہاتھ پر از خود سخت ہو
گئی۔ تاہم چہرہ سپاٹ رہا۔ "ایسا کیوں کیا گیا؟"
"میں نہیں جانتا۔"
"کیا سب مجھ سے کاروبار میں ملوث ہیں۔ میرے
ڈیڈی بھی؟"
جواب کول نے دیا۔ "حتمی جواب کے لیے انتظار
کرنا پڑے گا۔"
"میں ان معاملات کے ساتھ پلی بڑھی ہوں۔ میں
کاروباری تقاضے سمجھ سکتی ہوں۔ ڈیل مکمل نہ ہونے پر کوئی
رقم کا طلبگار ہے۔ کالی نے کنٹریکٹ کو ختم کیا۔ اب وہ مجھے اور
ڈیڈی ..." وہ اچانک چپ ہوگئی۔ "کیا میرے ڈیڈی؟"
اس کی آنکھوں میں کھلا سوال تھا۔
کول نہیں سمجھا کہ وہ کیا جاننا چاہ رہی تھی۔ لیکن یوں لگا
جیسے پاٹیک جان گیا تھا۔
"میں سراغ لگاؤں گا۔" پاٹیک نے کہا۔
لارکن کا رنگ بدلا۔ آنکھوں میں اذیت تھی۔ گویا
کسی نے اس کے دل پر پتھر رکھ دیا ہو۔
"نہیں سراغ لگاؤ۔ نہیں معلوم کرو، پلیز۔ میں نہیں
جاننا چاہتی۔"
تب کول پر خوفناک انکشاف ہوا کہ لارکن نے
پاٹیک سے کیا سوال کیا تھا۔ کیا واٹنش کالی کو لارکن کا باپ
اطلاع دیتا تھا کہ وہ کہاں ملے گی۔ آخر شوٹرز ہر بار بسرعت
لارکن تک کیسے پہنچ جاتے تھے۔ پاٹیک نے لارکن کو بچانے
کے لیے سب کو سائڈ پر کر دیا تھا۔ کیوں؟
"یہ اندازے ہیں۔" کول نے غیر واضح بات کہی
اور اٹھ کر باہر کی طرف چل دیا۔ پاٹیک نے وقفہ لیا، پھر وہ
بھی کول کے پیچھے چل پڑا۔
لارکن نے پاٹیک کو جاتے دیکھا۔ باہر قدم رکھنے سے
قبل وہ دروازے کے فریم میں پل بھر کے لیے رکا۔ ...
بہت بڑا ... دیوزاد۔ پورے فریم میں سما گیا۔ لارکن کو ایسا
ہی لگا تھا۔ دیکھنے میں وہ عام آدمی تھا لیکن نہیں تھا۔ دل توڑ
دینے کی حد تک نارمل تھا۔ اس صفت نے لارکن کے دل
میں اس کا قد اور بہت بڑھا دی۔ سپرمین کسی قسم کا رسک نہیں
لیتا۔ لیکن وہ ایک عام آدمی ہر رسک لے رہا تھا۔ اس کے
لیے ہر طرف رسک تھا۔
پل بھر رکا تو پلٹ کے دیکھا۔ لارکن نے دیکھا کہ
اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ پھر دروازہ بند ہوگیا، وہ
تنہا رہ گئی۔
"ٹھیک کردو...... سب درست کردو...... پلیز۔" اس
نے خالی کمرے میں سسکی لی۔ وہ ہمیشہ سے زیادہ خوف زدہ
تھی۔ شوٹرز کے حملوں سے زیادہ ہراساں تھی۔ نہیں
نہیں، وہ غلط سوچ رہی تھی۔ دلِ مضطرب اندیشۂ فردا سے لرز
رہا تھا۔
وہ واپس ٹیبل پر آئی اور نمبرز کی فہرستوں کا جائزہ لیا۔
جورگا اور لوئیس کے نمبرز عیاں تھے۔ کچھ دیر میں واٹنش کالی
کا نمبر بھی ٹریس ہوگیا۔ لارکن نے ری چیک کیا۔ اس کے
بعد چھبیس صفحات میں ملا کر دیکھا۔ ہر مرتبہ اسے کامیابی ملی۔
وہ نشان لگاتی گئی۔ پھر نئے سرے سے آغاز کیا۔ اور وہ نمبر
نوٹ کرنے شروع کیے جن پر کالی نے بات کی تھی۔
دوسرے صفحے کے نچلے حصے میں جو نمبر دیکھا وہ بے حد شناسا
تھا۔ واٹنش کالی نے کمپنی کے کارپوریٹ ہیڈکوارٹر کال کی
تھی اور یہ لارکن کی کمپنی تھی ... بار کلے کمپنی۔
لارکن کی نگاہ دھندلا گئی۔ اس نے خود کو روتے ہوئے
دیکھا۔ لیکن آنسو تھے نہ آہ و زاری۔ یوں لگا کہ کوئی اور رو رہا
ہے اور وہ دیکھ رہی ہے۔
پاٹیک اور کول سچ تھے۔ اس کا اپنا باپ ان لوگوں
کے ساتھ ملوث تھا اور اب دونوں مصیبت میں تھے۔ خود وہ
اور ......
واٹنش کالی، لارکن کے ذریعے اس کے باپ سے
کچھ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ناکامی کی صورت میں سزا ... اس
طرح یا دوسری طرح۔ واٹنش کالی کا پلہ بھاری تھا۔

☆☆☆

سنچری سٹی کی بالائی تینوں منزلوں پر سیاہ شیشوں کے
پیچھے بارکلے کمپنی کا قلعہ تھا۔ مسلح گارڈز، سیکیورٹی اسٹیشنز اور
میٹل ڈیٹیکٹرز ......
پاٹیک خود نہیں جانتا تھا کہ اس نے ادھر کا ارادہ کیوں
کیا۔ لارکن کے سوا اور کوئی وجہ نہیں تھی۔
پہلی مڈبھیڑ بڈفلین سے ہوئی۔ وہ بولا۔
"پاٹیک، کوئی ہتھیار نہیں ہونا چاہیے۔ میں مجبور
ہوں۔"
پاٹیک نے کہا۔ "بے فکر رہو۔"
اہلکاروں نے دونوں کے نام اور شناخت معلوم کی۔
کول نے پاٹیک سے کہا۔ "اگر ہمیں ہنگامی حالت
میں نکلنا پڑا تو خاصی دشواری ہوگی۔"

جی ہاں یہ کینوس بالکل سادہ ہیں کیونکہ آج کل میں چھٹی پر ہوں

پاٹیک نے اس کی بات کو لطیفہ نہیں گردانا۔ وہ لارکن
کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ جنہوں نے لارکن کو دکھ دیا وہ
ان کو تڑپانا چاہتا تھا۔ اس نے لارکن کی آنکھوں میں کرب و
اذیت کو پڑھ لیا تھا۔ ایسا دکھ کوئی شیئر نہیں کر سکتا تھا اور وہ کبھی
اس اذیت سے نکل نہ پائے گی۔ وہ ذمے داران کو تڑپتے،
بلکتے اور گڑگڑاتے دیکھنا چاہتا تھا۔
"تمہاری خاموشی غیر معمولی ہے۔ خود تمہارے لیے
بھی۔" کول نے تبصرہ کیا۔
"میں ٹھیک ہوں۔"
بڈفلین نے لابی میں ان کو دو وزیٹر پاس دیے جن پر
بڈ نے دستخط کر دیے تھے۔ دونوں نے وہ گلے میں لٹکا لیے۔
"اوپر جانے سے پہلے اگر تم مجھے آنے کا مقصد بتا
دو؟"
"نہیں۔" پاٹیک نے بڈفلین کو جواب دیا۔
اسپیشل ایلیویٹر کے ذریعے وہ ٹاپ فلور تک گئے۔
ایلیویٹر میں بڈ نے سوال کیا۔ "اس کا کیا حال ہے؟"
"زیادہ اچھا نہیں ہے۔"
"بس اس کی حفاظت کرو۔ میرا خیال ہے کہ یہ
باسٹرڈز ہمیں کچھ خاص نہیں بتا رہے۔" بڈ نے کہا اور دونوں
کی ریسپشن تک رہنمائی کی۔ وہاں ایک عمر رسیدہ عورت
بیٹھی تھی۔ اس نے بڈفلین کو پہچان کر اشارہ کیا۔
"وہ یہاں ہے۔ کوئی مسئلہ چل رہا ہے۔" بڈفلین
نے آہستہ سے کہا۔
کول نے پاٹیک کو ٹہوکا دے کر سرگوشی کی۔ "لفڑا
پہلے چل رہا ہے اور ہم بھی اسی وقت پہنچ گئے؟"
وہ بڈفلین کے پیچھے ایک کشادہ ہال میں پہنچے جو ایک
آرٹ گیلری کا نمونہ پیش کر رہا تھا۔ قیمتی ملبوسات میں
عورتوں اور مردوں کا ایک گروپ وہاں موجود تھا۔ پاٹیک کی
نظر سیدھی بارکلے پر گئی۔ اس کا حلیہ بتا رہا تھا جیسے وہ ابھی
بستر سے نکل کر وہاں پہنچا ہو۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ وہ
نروس تھا، آنکھوں میں سرخی تھی۔ انہیں دیکھ کر وہ چونکا اور
بڈفلین کو گھور کے دیکھا۔
"مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم انہیں یہاں لا رہے ہو۔"
قبل اس کے کہ بڈفلین کچھ بولتا، پاٹیک نے جھپٹ

کر بارکلے کے حلقوم پر ہاتھ ڈال دیا اور اسے اٹھا کے ہال
میں آفس کی دیوار سے لگا دیا۔ بڈفلین سمیت ہر ایک کے لیے
یہ قطعی غیر متوقع تھا۔

"پائیک کیا پاگل ہو گئے ہو؟" بڈفلین بوکھلا گیا۔

افراد شور شرابازی ہی بھی اور شاک میں آتے ہوئے پائیک کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ بڈفلین، بارکلے کو چھڑانے کی کوشش کر رہا
تھا۔ پائیک نے بارکلے کا گلا دباتے ہوئے کہا۔

"اسٹین لورم رئیل ہولڈنگ۔"

بارکلے کی آنکھیں مزید لال ہو گئیں۔ وہ کھرکھراتی آواز میں بولا۔ "مجھے نہیں معلوم تم کیا چاہتے ہو؟"

بڈفلین نے پائیک کا بازو پکڑا ہوا تھا۔ وہ دہائیاں دے رہا تھا۔ "او گاڈ تم چاہتے ہو کہ پولیس آ جائے؟"

پائیک ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ بارکلے اپنا گلا مسل رہا تھا۔ اس نے کھانستے ہوئے فرش پر تھوکا۔ "ایسا کیوں کیا۔ کس بات کا غصہ ہے؟"

اس کے ردعمل نے پائیک کے ذہن میں حیرت کے عنصر کو بیدار کیا۔ کول، پائیک کے پہلو میں آیا۔ "اسٹین لورم، بارکلے گروپ کی ملکیت ہے۔ جو اس بلڈنگ کو توڑنے کی کوشش کر رہی ہے جہاں تکرکی لاشیں دریافت ہوئی تھیں۔ وہی بلڈنگ جس کے قریب لارکن کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ یعنی تکر اور واہنش کالی کے ساتھ مڈبھیڑ ہوئی تھی۔"

وہ ابھی تک گلا سہلا رہا تھا۔ "کیا بات کر رہے ہو؟ ہاں اسٹین لورم میری ہے۔ لیکن تمہاری باتیں میری سمجھ سے بالاتر ہیں۔"

پائیک گہری نظر سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ اسے یہ سمجھنے میں مشکل پیش نہیں آئی کہ بارکلے سچ بول رہا تھا۔ اس کا چہرہ، آنکھیں اور حرکات و سکنات بتا رہی تھیں۔

پائیک نے کہا۔ "تم جانتے تھے کہ ریش کی کہانی ایک جھوٹ تھا۔"

بارکلے کے چہرے پر ندامت نظر آئی۔ اس نے شپٹا کر ادھر اُدھر دیکھا۔ "ہم سمجھے تھے کہ واہنش کی نشاندہی نہیں کرنی چاہیے۔"

"کیوں؟"

"بتاتا ہوں۔"

بڈفلین دخل انداز ہوا۔ "جیسس، تمہیں واہنش کے بارے میں علم تھا۔" بڈ برافروختہ نظر آیا۔

"جائداد کی خریداری کا کیا معاملہ ہے؟" کول نے کہا۔ "ٹرسٹ کی ایگزیکٹیو سے میری بات ہوئی تھی۔ اس کے پاس اسٹین لورم کی جانب سے آفر ہے۔"

"میں ان معاملات پر توجہ نہیں دیتا۔ میرے آدمی بروقت دیکھتے ہیں۔"

"تمہارے آدمی، وکیل گورڈن؟" پائیک نے طنزیہ انداز میں کہا۔ بارکلے نے پیشانی سے بال ہٹائے۔

"گورڈن جا چکا ہے۔ میں دکھاتا ہوں۔" وہ ہال اور آفس سے نکل کر انہیں گورڈن کے آفس میں لے گیا۔ وہاں چند افراد فائلز اور کمپیوٹر کی چھان بین کر رہے تھے۔

"ہمارے خیال میں وہ گزشتہ شب نکل گیا۔ کچھ نہ کچھ گڑبڑ ہے۔ کوئی چیز غائب ہے۔"

بڈفلین نے رائے دی۔ "پیسے کا مسئلہ؟"

"ہاں، غالباً ایسا ہے۔ لیکن ریئل میں ہیر پھیر ہے۔"

کول، گورڈن کی ڈیسک پر گیا۔ وہاں دو آدمی اس کے کمپیوٹر پر کام کر رہے تھے۔ "کیا وہ کوئی جائداد خریدنے کے لیے اسٹین لورم کو استعمال کر سکتا ہے یا کر چکا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ تمہارے علم میں لائے بغیر؟"

"ہاں، اس کے پاس اختیارات تھے۔ میں اس پر بھروسا کرتا تھا۔"

کول نے بلند آواز میں کہا۔ "فون لاگ کس کے پاس ہے؟ کسی نے چیک کیا؟"

کاؤنٹر پر موجود دو عمر رسیدہ خواتین نے ایک دوسرے کو دیکھا...... یوں جیسے جواب دیا جائے یا نہیں۔ لیکن نظر آ رہا تھا کہ کول اور پائیک مسٹر بارکلے کے ساتھ ہیں یا بارکلے ان کے ساتھ ہے۔ بالآخر ان میں زیادہ عمر والی نے ہاتھ بلند کیا۔ کول آگے گیا۔

"تین ہفتے پہلے کا کوئی بھی دن...... اس کا نمبر لے گا۔"

"یس سر۔" خاتون نے گورڈن کی کالز کا ریکارڈ نکالا اور صفحات پلٹنے شروع کیے۔ کول بھی شریک ہو گیا۔ ایک صفحے پر وہ رکا اور انگلی رکھی۔

"یہ وہی نمبر ہے جو ہم نے لوکیس کے فون سے ٹریس کیا تھا۔ واہنش کالی۔"

پائیک، بارکلے سے قریب تر ہو گیا۔ "گورڈن نے مشورہ دیا تھا کہ واہنش کے بارے میں لارکن سے جھوٹ بولا جائے؟" اس کی آواز دھیمی تھی۔

بارکلے نے سر کو مثبت جنبش دی۔ اچانک اسے ادراک ہوا کہ درحقیقت پائیک نے کیا پوچھا تھا۔ "کیا گورڈن، واہنش کے لیے مخبری کر رہا تھا جو ہر مرتبہ لارکن کے

... غیر متوقع حملہ ہوتا رہا۔

بڈفلین معاً خود کو بیمار محسوس کرنے لگا۔ بارکلے کا بھی یہی حال تھا۔ وہ اچانک مڑا اور صوفے پر بیٹھ گیا۔ دونوں ہاتھ فضا میں پھینکے۔ سب متوجہ ہوئے لیکن ایک شخص جس کے چہرے پر چینک تھی حرکت میں آیا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ وہ فوراً ہی واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں بیئر کا گلاس تھا۔

"آئی ایم سوری۔" بارکلے نے گلاس لے کر کہا۔

پائیک نے اسے افسردہ دیکھا، پائیک اس کی اداسی پر متلال تھا۔

"واہنش نے کنگ کے ساتھ ایک سو بیس ملین ڈالرز کی سرمایہ کاری کی تھی۔ ایک سو بیس میں ساٹھ ملین الگے دور کی ڈرگ کارٹل کے تھے اور ساٹھ ملین اس نے اپنے ذرائع سے لگائے تھے۔ ڈیل میں کنگ بروکر تھا دوسری طرف دہشت گرد۔ کنگ نے سوچا کہ رقم یا جائداد کے لیے وہ لوگ تمہاری طرف آئیں گے۔"

"میری طرف کوئی نہیں آیا۔ میں کچھ بھی نہیں جانتا۔" بارکلے نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

"تم نہیں، تمہاری کمپنی...... اور کمپنی کا مطلب گورڈن۔"

کول نے اضافہ کیا۔ "انہیں جائداد کی خریداری کے لیے دو سو ملین درکار تھے۔ غالباً گورڈن نے منصوبہ بنایا کہ بقیہ رقم وہ تمہاری کمپنی سے لگائے گا۔ یا پھر سودے بازی کے لیے کمپنی کی ساکھ کو استعمال کرے گا۔ لیکن کنگ کے ساتھ سرمایہ کار کے طور پر نہیں۔ اسے ضرورت تھی کہ وہ خریداری تمہاری کمپنی کے ذریعے کرے یوں حقیقت چھپی رہے گی کہ اصل میں وہ کیا کر رہا ہے۔ لہٰذا کنگ نے اسے واہنش کے ایک سو بیس ملین ڈالرز گورڈن کو دیے لیکن گورڈن ایک سو بیس کو دو سو تک لے جانے میں ناکام رہا۔ شاید واہنش کالی بھڑک گیا، وقت زیادہ لگ چکا تھا۔ اسے اپنی رقم واپس چاہیے تھی۔ گورڈن نے ممکنہ طور پر تمہیں الزام دیا۔"

بارکلے ایسے کتے کے مانند سن رہا تھا جسے لات پڑنے والی ہو۔ سب سن رہے تھے۔

"دیگر وکلا نے مجھے مشورہ دیا ہے کہ پولیس اور بینکنگ کمیشن کو کال کروں اور یہاں فورنسک اکاؤنٹنٹس کی ضرورت بھی ہے۔" بارکلے نے کہا۔

پائیک نے کہا۔ "تمہیں اس سے بڑی مصیبت کا سامنا ہے۔ واہنش اپنی رقم نہیں چھوڑ سکے گا۔"

بارکلے اشارہ سمجھ گیا۔ "لارکن ٹھیک ہے؟"

"وہ ٹھیک ہے۔"

"کیا وہ جان گئی کہ میں نے اسے اندھیرے میں رکھا؟"

"ہاں۔"

بارکلے کا رنگ بدل گیا۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ "مجھے ملنا ہے۔ اسی وقت ملنا ہے۔"

☆☆☆

وہ لوگ ہمر (Hummer) اور لیکسس میں روانہ ہوئے۔ بڈفلین ہمر ڈرائیو کر رہا تھا جبکہ پسنجر سیٹ پر پائیک اور عقب میں بارکلے تھا۔ کول لیکسس میں ان کے پیچھے اکیلا تھا۔ بارکلے نے زیادہ وقت فون پر منیجرز اور وکلا سے بات کرتے ہوئے گزارا۔ پائیک، بڈفلین کو بریف کر رہا تھا۔ خاص طور پر وہ معلومات جو اس نے جان کین کے ذریعے حاصل کی تھیں۔ اگلے ڈور اور اسٹریٹ گینگ MS-13 کا بھی ذکر کیا۔ بڈ نے اپنے ایک دوست کو فون کیا جو لاس اینجلس پولیس کے گینگ یونٹ سے منسلک تھا۔ وہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ آیا لاس اینجلس کے MS-13 میں کارلوس نام کا کوئی آدمی ہے یا نہیں۔

پائیک اسے راستہ بتا رہا تھا جہاں لارکن کو رکھا تھا۔ وہ خفیہ پناہ گاہ پر پہنچے تو چھوٹے سے گھر کے قریب پائیک نے آرمینین بھائیوں کی بی ایم ڈبلیو دیکھی۔ وہ دونوں کار چمکانے میں مشغول تھے۔ ہاتھ روک کر انہوں نے ہمر اور لیکسس کو آگے پیچھے رکتے دیکھا۔ پائیک کی ملاقات دونوں بھائیوں سے اس وقت ہوئی تھی جب لارکن اچانک گھر سے نکل کر ڈانس کرنے کلب چلی گئی تھی۔ پائیک نے تلاشی کے بعد باہر آ کر دونوں آرمینین بھائیوں سے پوچھ گچھ کی تھی۔ لارکن کو اس نے بہن بتایا تھا۔ جس کا بظاہر ان دونوں نے یقین نہیں کیا تھا۔

"یہاں ٹھہرے ہو۔" بارکلے نے کہا۔ "یقیناً لارکن نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہوگا۔"

پائیک جواب دیے بغیر اُتر گیا۔ کول اتر کے آیا تو دونوں آگے بڑھے۔ پائیک نے دروازہ زور سے بجایا۔

"میں ہوں۔" اس نے بلند آواز میں کہا۔ اور دروازے کو دھکا دیا۔ دروازہ کھلا اور وہ سمجھ گیا کہ وہ ایک خالی مکان میں ہے۔ کول، بڈ اور بارکلے پورچ میں تھے۔

"لارکن؟" پائیک نے اس کا نام پکارا۔ "پھر تیز چھا ہو کر کول پر نظر ڈالی۔ بارکلے نے بھی بیٹی کا نام لیا۔ کول،

...دونوں الگ ہوتے۔ وہ ...

پائیک کے قریب آیا اور دونوں الگ ہوتے۔ پھر باقی روم کی طرف اور پائیک کمروں کی جانب۔ پھر ہاتھ روم۔ کچھ کوشش لارکن کی اشیا اور استعمال کی چیزیں جوں کی توں تھیں۔ کے کوئی آثار نہیں تھے۔ دو دن پہلے بھی وہ اسی طرح غائب ہو گئی تھی۔

پائیک نے باہر کا رخ کیا تب ہی آواز آئی۔

''تم، برو اب رو!''

ان دونوں میں سے ایک بھائی مکان کے سامنے تھا۔ پائیک کی چھٹی حس پھڑکی۔ ''لڑکے نے کچھ دیکھا ہے اور جو دیکھا ہے وہ اچھا نہیں ہے۔''

''سب یہاں ٹھیک ہے، یو؟ مونا، او کے؟''

''وہ یہاں نہیں ہے۔ تم نے کیا دیکھا ہے؟''

''وہ اس کے ساتھ چلی گئی۔''

''کس کے ساتھ؟''

''وہ ٹھیک لگ رہی تھی، یو۔ وہ ان کے ساتھ آرام سے کار میں بیٹھ گئی تھی۔''

''کتنی دیر پہلے؟'' پائیک نے سوال کیا۔

''شاید آدھا گھنٹا۔ برو، کیا ہوا؟''

''تم دونوں نے انہیں ٹھیک طرح دیکھا تھا؟''

''یو، یو... وہ لاطینی تھے، ایک سفید فام۔''

''کار کا نمبر؟ کون سی کار تھی؟''

''سوری برو...'' تاہم کار کا حلیہ اس نے بتا دیا۔

پائیک نے وانش کا اصل یول والا فوٹو نکالا۔

''یہ آدمی تھا؟''

''یس برو۔''

''کیسے؟ کیوں کر؟'' کول نے سوال اٹھایا۔

پائیک کو ناکامی کا احساس ہوا۔ خیال ڈانس کلب کی طرف گیا۔ شاید وہاں لارکن کو دیکھ لیا گیا تھا۔ بعد میں وہ اسے کھو بیٹھے۔

بار کلے نے پورچ سے آواز لگائی۔ ''کوئی بتا سکتا ہے اس کے بارے میں؟''

پائیک نے آنکھیں بند کر لیں۔ پانچ دن سے وہ اس کے پاس تھی۔ اب وہ اسے کھو بیٹھا تھا۔ وہ جا چکی تھی۔ نہیں اسے لے جایا گیا تھا۔ ایک ہی بات تھی۔ لارکن کو زبار کلے وہاں نہیں تھی۔ کسی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ پائیک نے آنکھیں کھول دیں۔

''ہم ڈھونڈ لیں گے۔'' کول نے کہا۔

دفعتاً پائیک کا سیل فون جاگا۔ پائیک نے نمبر چیک

''مجھے پتا ہے پیسا کہاں ہے۔''

پائیک لہجہ پہچان گیا۔ آواز وہ پہلے بھی سن چکا تھا جب وہ بیش کے پیچھے تھا۔ جبکہ بیش سرے سے ناپید تھا۔ کال وانش کالی نے کی تھی۔

☆☆☆

پائیک کا دل زور سے دھڑکا۔ لیکن نہ صرف اس نے خود کو قابو میں رکھا بلکہ آواز بھی متوازن تھی۔ فون بار کلے کو جانا چاہیے تھا، اسے کیوں کیا گیا؟ ایک لمحے کے لیے سوال نے سر اٹھایا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وانش کو احساس ہو کہ وہ ہراساں ہے۔

''میری دوست زندہ ہے اور اسے کوئی نقصان تو نہیں پہنچا ہے؟''

''فی الحال ایسا ہے۔ آگے کا پتا نہیں۔'' کالی نے جواب دیا۔ ''میں کس کے ساتھ بات کر رہا ہوں؟''

پائیک اس سوال پر پھر چونکا تھا۔ اس نے کول کو اشارے سے بتایا کہ فون پر کون ہے۔ ساتھ ہی وہ مکان کی طرف لپکا۔ قلم اور کاغذ لازم تھے۔ گھبراہٹ اور غلطیوں کا نتیجہ لارکن کی موت کی شکل میں سامنے آتا۔

پائیک نے کہا۔ ''میری بات کراؤ۔'' اندر پہنچ کر وہ سیدھا ٹیبل پر گیا اور کال کرنے والے کا نمبر نوٹ کیا۔

وانش برہم ہو گیا۔ ''وہ ٹھیک ہے۔ مجھے پیسا نہیں ملا تو اسے مار دوں گا۔''

''مجھے اس کی زندگی کا ثبوت نہیں ملا تو فون بند کر دوں گا۔''

کول نے خوف محسوس کیا۔ اس طرح، ایسے حالات میں، پائیک ہی ایسا انداز اپنا سکتا تھا۔

''فون اسے دو۔'' پائیک نے کہا۔ کول اور بار کلے بھی اس کے پیچھے مکان میں آ گئے تھے۔

''کیا لارکن کی بات ہے؟ وہ زندہ ہے؟'' بار کلے بدحواس تھا۔ پائیک نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش کیا۔ کول نے اپنا ہاتھ بار کلے کے منہ پر رکھ دیا۔

''میں فون بند کر دوں گا۔'' پائیک نے پھر کہا۔ کول شپٹا گیا۔

پائیک کی حسیات، سماعت میں سمٹ گئی تھیں۔ وہ دوسری جانب کی دیگر آوازیں سننے کی کوشش کر رہا تھا۔ پائیک نے ایک ہاتھ سے اپنا دوسرا کان بند کر دیا۔ لیکن ایسی آواز سنائی نہ دی جس سے وہ لوکیشن کا اندازہ لگا

سکتا۔ پھر لارکن لائن پر آئی۔ ''جو...!'' اس نے پائیک کے نام کا پہلا حصہ استعمال کیا۔ بظاہر اس کی آواز نارمل تھی۔

''میں آ رہا ہوں۔''

''آئی ایم او کے...''

بعد ازاں فون اس سے چھین لیا گیا۔ پھر وہ چیخی تھی۔ چیخ ادھوری رہ گئی۔ یقیناً کسی نے اس کا منہ بند کر دیا تھا۔ وانش لائن پر آیا۔

''اب تم خوش ہو؟ وہ زندہ ہے۔ یہی چاہتے تھے؟''

پائیک ہچکچایا۔ آواز کو متوازن رکھنا مزید مشکل ہو گیا۔

''ہاں، وہ زندہ رہی تو ہم بات کریں گے۔''

''میں کس سے بات کر رہا ہوں؟''

''میں اس کا باڈی گارڈ ہوں۔''

''مجھے اس کے باپ سے بات کرنی ہے۔'' اس نے مطالبہ کیا۔

پائیک اس کی دونوں باتیں سمجھنے سے قاصر رہا۔ کیا وہ نہیں جانتا کہ اس نے کسے کال کی ہے۔ لارکن نے اسے ''جو'' کیوں کہا۔ وانش کو کیا پتا کہ بار کلے وہاں تھا۔ پائیک کا دماغ برق رفتاری سے کام کر رہا تھا۔

''تم صرف مجھ سے بات کر سکتے ہو۔ ہر بات میرے ذریعے سے آگے جاتی ہے۔''

''ٹھیک ہے، یوں ہی سہی۔ اس کا باپ رقم ٹرانسفر کرے گا۔ مسئلہ ختم ہو جائے گا۔ میں اکاؤنٹ نمبر اور رسائی کا کوڈ دوں گا۔''

''رک جاؤ... سنو... تمہاری رقم وکیل گورڈن کے پاس ہے۔ اس نے پیسا ملک سے باہر بھیج دیا ہے اور ہم نہیں جانتے کہ وہ اس وقت کہاں ہے۔''

''یہ میرا مسئلہ نہیں ہے۔'' وانش نے بے نیازی سے کہا۔ اسی وقت اچانک بیرونی دروازہ کھلا اور بڈ فلیمی دندناتا ہوا اندر آیا۔ کول نے پھرتی سے اسے خاموشی کا اشارہ کیا۔ اس نے منہ نہیں کھولا لیکن ٹیبل کی طرف بھاگا اور کچھ لکھنے لگا۔ پائیک دیکھ رہا تھا لیکن اس کی توجہ کال پر تھی۔

''ڈیل گورڈن نے کی تھی۔ بار کلے بے خبر تھا اس کا کوئی تعلق نہیں۔''

''وہ پیسا میرا نہیں ہے۔ خطرناک لوگوں نے بھروسے پر میرے حوالے کیا تھا... مجھے بڑھا کر واپس کرنا تھا۔ انہیں پروا نہیں ہے کہ پیسا کون واپس کرے گا... کہاں سے آئے گا۔''

پائیک نے تجزیہ کیا۔ وانش غلطی کر رہا تھا۔ اس قسم کے مذاکرات میں یہ غلطی لے ڈوبتی ہے۔ وہ ضرورت سے زیادہ بول رہا تھا۔ وہ مقصد حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مطلب یہ کہ اسے احساس تھا کہ وہ کمانڈنگ پوزیشن میں نہیں ہے۔ پائیک پہلے غلطی پر تھا۔ وانش اور اس کے شوہز نے کبھی بھی لارکن کو ہلاک کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ اسے صرف اغوا کرنا چاہتے تھے۔ تاکہ اس کے ذریعے پیسا نکلوایا جائے۔ پیسا جن کا تھا ان سے خود وانش کی زندگی کو خطرہ تھا۔ وانش اپنی جان بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وانش کا یہی خوف پائیک کی مدد کر سکتا تھا۔ پائیک وقت حاصل کر کے اسے دوسری غلطی پر مجبور کر سکتا تھا۔

بڈ نے جو لکھا تھا وہ پائیک کی آنکھوں کے سامنے کیا۔ مختصر جملہ تھا۔ جو کہہ رہا تھا کہ لارکن نے پڑوسی کے فون سے وانش کو کال کی تھی۔

پائیک کے جبڑے بھنچ گئے۔ وہ سمجھ گیا، بے وقوف لڑکی نے کیا کر دیا تھا۔ وانش وہاں کیسے پہنچا تھا— پائیک، بارکلے کو دیکھ رہا تھا۔

"وانش، اس کا باپ بہت محبت کرتا ہے بیٹی سے۔ اور بیٹی اس کی پرستش کرتی ہے۔ ہم یہ مسئلہ حل کر لیں گے۔"

بڈفلیں کے سیل فون کی موسیقی اُبھری۔ وہ منہ کو ڈھانپتا ہوا تیزی سے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

"ہم مل کر حل نکالتے ہیں، ٹرانسفر ہو جائے گا۔ مجھے بتاؤ کہ ہم کہاں ملیں؟"

وانش ہنسنے لگا۔ "کیا کیش لاؤ گے؟ ٹرک میں بھر کر؟ بارکلے سے کہہ دو کہ پیسا ٹرانسفر ہوتے ہی میں لڑکی کو رہا کر دوں گا۔"

"وہ احمق نہیں ہے۔ بیٹی کو حاصل کیے بغیر ٹرانسفر نہیں کرے گا۔"

"ایسی صورت میں ہم دونوں ہی محروم رہیں گے۔ دونوں کو نقصان پہنچے گا۔"

پائیک اسے ویٹنگ لائن پر رکھنا چاہتا تھا۔ اگر ملنے پر تیار نہ ہوا تو خود سراغ لگانا پڑے گا۔

"ٹھیک ہے میں بارکلے سے بات کروں گا۔ وہ بیٹی کو محفوظ دیکھنا چاہتا ہے۔ یہ نہیں بتا سکتا کہ اسے قائل کرنے میں کتنا وقت لگے گا۔"

وانش نے بات کاٹی۔ "نمبر لکھو پھر پڑھ کر مجھے سناؤ۔"

پائیک نے نمبر لکھے اور پڑھ کر سنا دیا۔

"ٹھیک، دو گھنٹے میں رقم ٹرانسفر نہ ہوئی تو لڑکی کی [illegible] کاٹ دوں گا۔ اور تیس منٹ بعد اس کا سر [illegible] کبھی بات نہیں کریں گے۔"

"وانش ..."

لیکن رابطہ منقطع ہو چکا تھا۔ بڈ دوسرے کمرے میں تھا۔ کول اور بارکلے، پائیک کو تک رہے تھے۔ پائیک نے صورتِ حال دونوں کے گوش گزار کر دی۔

بارکلے کا وجود پر گویا گر سا گیا۔ چہرے پر مایوسی تھی۔

"اس نے خود کو اس کے حوالے کر دیا؟" بارکلے کی آنکھوں میں وحشت ناچ رہی تھی۔

"تمہارے لیے ... تمہیں بچانے کے لیے۔ اس نے یہ بھی سوچا ہوگا کہ شاید میں اس طرح وانش تک جا پہنچوں۔"

"ٹھیک ہے پیسے میں دوں گا۔ دو گھنٹے میں ممکن نہیں ہے۔ لیکن میں کر لوں گا۔ اسے فون کرو۔"

"پیسا حل نہیں ہے۔" کول نے کہا۔ "ادائیگی کر دینا عقلمندی نہیں ہے۔ رقم ملتے ہی وہ اسے ہلاک کر دے گا۔"

"اسے رقم چاہیے، میں دے سکتا ہوں۔ اور کیا کیا جا سکتا ہے؟"

"اسے تلاش کرنا پڑے گا۔" کول نے کہا۔

بڈفلیں بات ختم کر کے ان کے پاس آ گیا تھا۔

"MS-13 سے کام بن سکتا ہے۔ گینگ کے دو افراد سے رابطہ کیا جا سکتا ہے۔ ایک قید میں ہے۔ لیکن دوسرا برسوں سے جنوبی امریکا سے یہاں منشیات پہنچا رہا ہے۔ کارلوس ماراٹو کی بات کر رہا ہوں۔ "مارا" گروپ جس علاقے کو کنٹرول کرتا ہے۔ اس کے پڑوس کے مرکز میں کارلوس رہتا ہے۔ اس تک پہنچنا دشوار ہے اور تعاون پر آمادہ کرنا دشوار تر۔"

پائیک باخبر تھا کہ بڈ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ وقت کم تھا اور کسی گینگسٹر تک اس کے علاقے میں پہنچنا پیچیدہ عمل تھا۔ ان کی دنیا میں پرائڈ اور فیملی ہی سب سے اوپر ہوتے ہیں۔ لاطینی گینگسٹر اپنے دوستوں سے دغا نہیں کرتے۔ اس وقت رفتار زندگی تھی۔

پائیک نے کہا۔ "ممکن تو ہے اگر گیج بندو چنا جائے۔"

بڈ کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ وہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

کول نے کہا۔ "فریک گارشیا۔ ہاں وہ کر سکتا ہے۔"

☆☆☆

وہ روانہ ہو گئے۔ کار میں ہی فریک کو فون کر دیا تھا۔ بارکلے ضد کر کے ساتھ مل گیا۔ اس کی بیٹی کا معاملہ تھا۔ وہ بوائل ہائٹس اور سٹی ٹیرس کے درمیان تنگ سڑک پر تھے۔ وہ مخصوص علاقے میں داخل ہو چکے تھے۔ چھوٹے چھوٹے مکان ایک جیسے تھے۔ پائیک کو اندازہ تھا کہ بڈفلیں نروس ہے۔ وہاں مختلف جگہوں پر جارح مزاج کرخت تاثرات والے مرد گروپس کی شکل میں موجود تھے۔ چاروں میں سے کوئی گاڑیوں سے باہر نہیں نکلا۔

کول نے بارکلے سے کہا۔ "ایسے بیٹھے رہو جیسے ٹی وی دیکھ رہے ہو۔"

ایک سیاہ رنگ کی لنکن دور سڑک کے کونے سے نمودار ہوئی۔ دھیمی رفتار سے وہ ان کی جانب آ رہی تھی۔ لنکن کو دیکھ کر سڑک پر موجود گروپ سرگوشیاں کرنے لگے۔ ہمر اور لیکسس کی طرف سے وہ غافل نہیں تھے۔ پائیک سوچ رہا تھا کہ ایک مشکل مرحلہ سامنے ہے۔ بڈ نے پائیک کی طرف دیکھا لیکن پائیک نے کوئی ردِعمل نہیں دیا۔

کول نے بارکلے کو بتایا کہ فریک اب بوڑھا ہو چکا ہے۔ یہاں کے بہت سے لڑکے حالتِ اسیری میں ہیں۔ فریک ان کی فیملیز کا خرچا اٹھاتا ہے۔ یہ لوگ فریک گارشیا کو پیٹھ نہیں دکھائیں گے۔ لنکن عین سامنے ہمر سے منہ جوڑ کر کھڑی ہو گئی۔

"پائیک تم اس کو کیسے جانتے ہو؟" بارکلے نے سوال کیا۔

پائیک دروازہ کھول کے باہر نکل گیا۔ وہ ماضی میں جب پٹرول آفیسر تھا تو برسوں پہلے فریک سے ملا تھا۔ اس وقت فریک کی بیٹی کا مرڈر ہوا تھا۔ پائیک اور کول نے مل کر قاتل کو پکڑا تھا۔ پائیک نے فریک کے باہر آنے کا انتظار کیا۔ وہ گاڑی سے باہر آیا تو سو سالہ ضعیف بوڑھا لگ رہا تھا۔ سر پر تھوڑے سے سفید بال تھے۔ جلد لٹک رہی تھی۔ ایک آدمی نے اسے سہارا دیا تھا۔ اگرچہ وہ خود قدم اٹھا رہا تھا۔ وہ پائیک کو دیکھ کر مسکرایا۔

"ہیلو، مائی ہارٹ۔"

پائیک ہاتھ تھام کر جواباً مسکرایا۔ پھر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ رسمی لیکن دوستانہ مکالموں کے بعد پائیک نے کارلوس کے بارے میں استفسار کیا۔

فریک گارشیا ایک بوڑھا لیکن ہوشیار آدمی تھا۔ اس نے باڈی گارڈ کو اشارہ کیا۔ ڈرائیور اور باڈی گارڈ نے دائیں بائیں سے اس کا بازو تھاما۔ اور پائیک کی توقع کے برخلاف وہ لنکن میں بیٹھنے کے بجائے سائڈ واک پر چلنے لگے۔ فریک نے پائیک کی طرف دیکھا۔ وہ بھی ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔ وہ یہی سمجھا کہ کارلوس آس پاس ہے۔ بہت جلد وہ ایک مکان کے سامنے رکے۔ ایک ننھے کٹے آدمی نے دروازہ کھولا۔ اس کا قد لمبا نہیں تھا لیکن جسم چوڑا تھا۔ سینڈویٹ لفٹرز کے مانند تھا۔ بازوؤں پر ٹیٹوز کے نشان تھے۔ اس نے پائیک کا جائزہ لیا پھر فریک کو دیکھا اور دروازہ پورا کھول دیا۔

"سر، میرے گھر میں خوش آمدید۔ میرا نام آلفڈو سانز ہے۔ میری ماں نے مونتویا کے کزن سے شادی کی تھی۔"

فریک نے گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔ "شکریہ مسٹر سانز، تم نے مجھے عزت کے قابل سمجھا۔"

پائیک ان کے پیچھے چھوٹے سے لیونگ روم میں آ گیا۔ یہ جگہ گھر جیسی تھی۔ دیواروں پر بچوں اور بڑوں کے فوٹو آویزاں تھے۔ ان میں ایک آدمی مرین کور کی یونیفارم میں تھا۔ پائیک نے گنا۔ وہاں چھ آدمی بیٹھے تھے۔ پائیک کے پہنچتے ہی سب کی آنکھیں اس پر جم گئیں۔ پائیک نے محسوس کیا جیسے ان میں سے دو نروس ہو گئے تھے۔ آلفڈو سانز نے فریک کو کرسی پیش کی۔ پہلے فریک نے اپنا تعارف کرایا۔ حالانکہ یہ غیر ضروری تھا۔ پائیک خاموش رہا۔ پھر اس نے پائیک کو قریب بلا کر اس کا ہاتھ پکڑا۔

"یہ میرا دوست ہے۔" وہ بولا۔ "جب میری بیٹی کا مرڈر ہوا تھا تب اس آدمی نے اس جانور کو پکڑا تھا۔ یہ میرے دل کے قریب ہے... بیٹے جیسا ہے۔ اس کی مدد کرنا میری مدد کرنے کے مترادف ہے۔ میری خواہش ہے کہ تم لوگ یہ بات سمجھ لو۔ اب بتاؤ کیا میں مسٹر ماراٹو سے بات کر سکتا ہوں؟"

سانز نے ایک آدمی کی طرف اشارہ کیا۔ وہ جوان تھا۔ عمر تیس برس سے زیادہ نہیں تھی۔ بارسوخ طاقتور افراد کے حکم پر ماراٹو وہاں تھا۔ وہ لوگ ضرورت پڑنے پر آدمی کو بیمار کتے کی طرح ہلاک کر دینے میں عار محسوس نہیں کرتے تھے۔ کارلوس ماراٹو تناؤ کا شکار ہو گیا۔ فریک نے کہا۔

"کارلوس ماراٹو آف مارا سلواترا؟"

کارلوس کی آنکھیں کمرے میں گھوم گئیں۔ وہ بظاہر خوف زدہ نظر آیا لیکن پائیک جانتا تھا کہ کارلوس خود کو لڑنے کے لیے تیار کر رہا ہے... ضرورت پڑنے پر۔

بالآخر وہ بولا۔ "میں کارلوس ماراٹو ہوں۔"

"یہ آدمی میرا بیٹا ہے۔" فریک نے پائیک کا ہاتھ دبایا۔ "یہ کچھ معلوم کرنا چاہتا ہے۔ یہاں گھر کے افراد کے سامنے۔ میں سمجھتا ہوں یہ حساس معاملات ہوتے ہیں۔ ہم گول مول بات نہیں کریں۔ سیدھے سوالات۔" بوڑھے آدمی نے پائیک کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ "پوچھو۔"

پائیک نے کارلوس کو دیکھا۔ "وانش کالی کہاں ملے گا؟"

کارلوس کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ اس نے دھیرے سے انکار میں سر ہلایا۔

"نو آئیڈیا۔ کون ہے وہ؟"

پائیک نے وانش کا فوٹو نکال کے آگے بڑھایا۔

کارلوس نے فوٹو نہیں لیا۔ مطلب وہ کالی کو جانتا تھا۔

"تمہارے بندے ایسٹ بان بیرن کے ساتھ دھندا کرتے ہیں۔ تم ایک دوست کی مدد کر رہے ہو۔ میں سمجھ سکتا ہوں۔" پائیک نے کہا۔ کارلوس برہم دکھائی دیا۔

"ہاں ٹھیک کہہ رہے ہو۔ ہم بھی جانتے ہیں کہ تمہارا تعلق پولیس سے ہے۔ مجھے کچھ نہیں معلوم۔"

سانز نے ہاتھ جوڑ کے سینے پر باندھ لیے۔ وہ خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ پائیک نے بھی تاڑ لیا۔

"تم یہاں میرے مہمان ہو۔" سانز نے کارلوس کو مخاطب کیا۔ "مہمان کی حیثیت سے تم عزت کے مستحق ہو لیکن میرے گھر میں مسٹر فریک کی توہین مت کرو۔"

"میرا ایسا کوئی عندیہ نہیں ..... لیکن میرا گروپ برسوں سے بیرن کے ساتھ منافع بخش کاروبار کر رہا ہے۔ یہ ایک چھوٹا سا احسان ہے جو ہم اس کے کہنے پر کر رہے ہیں۔"

"وانش کالی، بیرن آپس میں دوست ہیں۔ لیکن بات صرف اتنی نہیں ہے۔" پائیک نے انٹرپول شیٹ سانز کے حوالے کی۔ سانز نے شیٹ کا نیچے تک جائزہ لیا۔ اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

"کیا مطلب؟ یہ دہشت گردوں کی واچ لسٹ ہے؟ اس میں یہاں کے بھی چند نام ہیں۔ کالی سب سے اوپر ہے۔"

فریک، پائیک کے سہارے کھڑا ہو گیا۔ "مطلب وہ ہمارا دشمن ہے۔ وہ ان لوگوں کو رقم فراہم کرتا ہے جو ہمیں مارنا چاہتے ہیں۔ بیرن نے اس لیے کارلوس کو یہاں بھجوا دیا کہ اس کے ذریعے وانش تک نہ پہنچا جا سکے۔ کارلوس کے علاوہ چند اور بھی باخبر ہوں گے۔ لیکن اصل بات یہ لسٹ ہے۔ خود وہ لاس اینجلس میں مزے کر رہا ہے۔"

سانز خاموش تھا۔ اس کا سینہ اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ اس نے شیٹ قریب ترین آدمی کو پکڑا دی۔ ایک ہاتھ سے ہاتھ منتقل ہوتی شیٹ کارلوس تک پہنچی۔

سانز نے کھنکھار کے گلا صاف کیا۔ فریک کو دیکھا۔ "معاف کیجیے، برا نہ منائیے گا۔ ایک منٹ دیں گے؟"

باڈی گارڈز اور ڈرائیور فریک کو لے کر باہر چلے گئے۔ پائیک بھی ان کے پیچھے تھا۔ ابھی وہ کار تک پہنچے تھے کہ سانز نے انہیں آلیا۔

وانش کالی کی خبر دے کر وہ واپس چلا گیا۔

☆☆☆

گینڈل فری وے جہاں ایل اے ریور سے ملتا ہے وہاں قریب میں وہ چھوٹا سا گھر تھا۔

"ممکن ہے وہ کہیں اور چلا گیا ہو۔" بارکلے نے خدشے کا اظہار کیا۔

"ایسی صورت میں سانز کے گھر میں آج کی رات کارلوس کے لیے مصیبت بن جائے گی کہ اس نے جھوٹ بولا۔" پائیک نے کہا۔ علاقہ اونچا نیچا تھا۔ گھروں کے آس پاس زیتون اور بتول کے درخت بھی تھے۔ بڈ ملین نے لاس اینجلس پولیس کو بلانے کی رائے دی۔

"پہلے یہ دیکھنا ہے کہ لارکن ہے یا نہیں۔" پائیک نے کہا۔

"کیا کرو گے؟"

"تم لوگ اسٹریٹ پر رہو۔ میں جاتا ہوں۔ کال کر دوں گا۔" پائیک پہاڑی علاقے میں داخل ہو گیا۔ اس کا رخ ٹارگٹ کے پڑوس کی ڈرائیو وے کی طرف تھا۔ وہ گھر قدرے بلندی پر تھا۔ اس کے برابر میں مزید اونچا گھر تھا۔ پائیک محتاط تھا۔ وہ گھر کی دیوار کے ساتھ عقب میں چلا گیا۔ اس نے صبر کے ساتھ بیک یارڈ کے خالی ہونے کا یقین کیا۔ دیوار پھلانگ کر وہ اندر چلا گیا۔ اس کی تمام حسیات پوری طرح بیدار تھیں۔ پیچیدہ اور طویل کھیل کا کلائمیکس سر پر تھا۔ بیک یارڈ میں تین نارنگی کے درخت تھے۔ وہ درختوں میں ساکت کھڑا غور کر رہا تھا۔ یقین پختہ ہوتا گیا کہ گھر خالی تھا یا مکین باہر گئے ہوئے۔ تاہم اس نے رسک نہیں لیا اور پائپ کے سہارے چھت پر پہنچ گیا۔ دوسرے پڑوسی پر بھی اس کی نظر تھی۔ اوپر پہنچ کر وہ دبک گیا۔ کونے میں اسٹور نما چھوٹی کوٹھری تھی۔ قسمت یاوری کر رہی تھی۔ وہ جھکا جھکا کوٹھری کے دروازے پر پہنچا۔ کنڈی میں تالا نہیں تھا۔ احتیاط سے کنڈی کھول کر وہ اندر گیا۔ کوٹھری میں دائیں بائیں دیواروں

نہیں ممّا! ڈیڈ صبح سویرے نہیں اٹھے بلکہ بے خوابی میں
ٹہلتے ٹہلتے رات کو اس کرسی پر ڈھیر ہو گئے ہوں گے

میں جالی نما سوراخ تھے۔ اس نے دائیں طرف کی جالی سے آنکھ لگائی۔ وانش کا گھر جزوی طور پر سامنے تھا۔ ایک کھڑکی اور فرنٹ دکھائی دے رہا تھا۔ گیٹ کے اندر جو گاڑی کھڑی تھی۔ اس کا حلیہ اور رنگ وہی تھا جو آرمینین بھائیوں نے بتایا تھا۔ گاڑی کے ساتھ دو آدمی کھڑے تھے۔ پائیک نے کمرے کی کھڑکی کے پار دیکھا۔ کمرا خالی تھا۔ وہاں سے دوسری کھڑکی نظر نہیں آرہی تھی۔ پائیک نے جگہ بدل کے جھانکا لیکن ناکام رہا۔ سوچ میں پڑ گیا۔ اسے مکان کے عقب میں جانا پڑے گا۔ مطلوبہ مکان میں پہرے داری کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ کم از کم چھت پر کسی کو ہونا چاہیے تھا۔

وہ جیسے آیا تھا ویسے نکل گیا۔ پہاڑی نما علاقے کی اونچ نیچ اور درخت مددگار بن گئے تھے۔ عقب سے دیوار پر چڑھنا یا جھانکنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ علاقے میں ہر مکان کی چار دیواری کی اونچائی کم تھی۔ اس نے منہ پھیر کر درختوں کی طرف دیکھا۔ پھر توجہ بھربھری مٹی کے ٹیلے پر جم گئی۔ ٹیلا عقبی دیوار سے دس فٹ کے فاصلے پر تھا۔ وہ چاروں ہاتھ پیروں کے بل ادھر گیا۔ کیونکہ ٹیلا ترچھی اونچائی پر تھا۔ اس کے عقب میں پہنچ کر وہ ٹیلے پر چڑھا اور لیٹ گیا۔ احتیاط سے گردن اٹھا کر مکان کے عقب میں دیکھا۔ اسے دو شیشے نظر آئے، ایک کھڑکی میں اور دوسرا سلائڈنگ گلاس ڈور تھا۔ گلاس ڈور کے پیچھے لارکن فرش پر بیٹھی تھی۔ ایک آدمی اس کے پاس سے گزر کر مکان کے سامنے والے حصے کی طرف گیا۔ وہ وانش نہیں تھا۔ پائیک نے اندازہ لگایا کہ وانش کو ملا کر کم از کم چھ آدمی وہاں تھے۔ تین کو وہ دیکھ چکا تھا۔

لارکن کو دیکھ کر اس نے اطمینان کی گہری سانس لی۔ لارکن نے دونوں گھٹنے جوڑے ہوئے تھے۔ ہاتھ کمر کے پیچھے تھے۔ کمرا خالی تھا۔ غالباً اس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے لیکن وہ غیر آرام دہ یا زخمی حالت میں نہیں تھی۔ اس کا سر اٹھا ہوا اور آنکھیں کھلی تھیں۔ پائیک کو وہ بے خوف نظر آئی۔ وہ کسی سے بات کر رہی تھی۔ بات کرنے والا پائیک کی نگاہ کی دسترس سے باہر تھا۔ لارکن غصے میں تھی۔ پائیک نے سر نیچے کیا اور مٹی پر پیٹھ کے بل لیٹ گیا۔ تم ایک بہادر لڑکی ہو۔ وہ بڑبڑایا۔ اس نے فون نکال کر وانش کو کال کی۔

"یس؟"

"وہ رقم ٹرانسفر کرنے والا ہے۔" پائیک نے کہا۔

"وہ سمجھدار ہے۔ اس نے درست فیصلہ کیا ہے۔"

[illegible] کوئی نقصان نہیں [illegible]
[illegible]
[illegible]

واہنش [illegible] دونوں کو [illegible] سے بھاگ کر [illegible] نظر آیا [illegible] لارکن [illegible]

"[illegible] تمہیں [illegible] نقصان نہیں [illegible] کہا۔

"میں [illegible] کوئی [illegible]" پاٹیک نے کہا۔

[illegible] واہنش [illegible] کے ساتھ نظر آیا۔

پاٹیک [illegible] کا [illegible] کھول سکتا تھا لیکن وہاں لارکن کے ساتھ اور لوگ بھی تھے۔ واہنش کے ساتھ وہ تین کو تو دیکھ چکا تھا۔ [illegible] تھے۔

واہنش کی آواز آئی۔ "مطمئن ہو؟ میں نے اپنا وعدہ نبھا دیا۔"

"بس چند منٹ کی بات ہے۔ پھر بٹن دبے گا اور رقم ٹرانسفر ہو جائے گی۔ میں مطمئن ہوں۔ اس کا باپ آواز سننا چاہتا ہے۔" پاٹیک نے کہا۔

"میں سمجھ سکتا ہوں۔ نو پرابلم۔"

کیا شائستہ اور نرم دل دہشت گرد ہے۔ پاٹیک فون بند کر کے پھر لیٹ گیا۔ اب اس نے کول سے رابطہ کیا۔

"لارکن یہاں ہے۔" پاٹیک نے بتایا۔ "دو آدمی فرنٹ پر کار کے پاس ہیں۔ کم از کم تین اور آدمی ہیں لیکن پتا نہیں کدھر۔"

"واہنش کہاں ہے؟"

"وہ یہیں ہے۔"

"بڈفلین پولیس بلا رہا ہے۔" کول نے کہا۔

"بلانے دو۔ تم فرنٹ پر آؤ۔ بڈفلین تمہیں کور کرے گا۔ میں عقب میں واہنش کو دیکھتا ہوں۔"

پاٹیک نے ایک نئے قد آور آدمی کو دیکھا۔ وہ اندرونی جانب کہیں سے آیا تھا۔ اس نے لارکن کو کھڑا کیا۔

"وہ لارکن کے ساتھ حرکت میں ہیں۔ میں جا رہا ہوں۔" پاٹیک نے فون بند کر دیا۔

وہ ٹیلے سے اتر کر گویا ڈھلوان پر لڑھکتا چلا گیا۔ دیوار کے قریب اس نے گن نکالی، خطرہ مول لے کر اندر جھانکا۔ گلاس ڈور والی جگہ سے متصل بیڈ روم میں واہنش اور لارکن موجود تھے۔ دراز قامت لارکن کے سر پر کھڑا تھا۔ وہ خودکشی پہ تلی تھی۔ بیڈ پر واہنش کا لیپ ٹاپ کھل رہا تھا۔ لارکن باپ سے بات کرتی۔ واہنش لیپ ٹاپ پر ٹرانسفر چیک کرتا اور لارکن کو ختم کر دیتا۔ فوراً بعد وہ ملک چھوڑ جاتے۔ پاٹیک نے اندر جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ پہلے اس نے کول کو فون کیا۔

"کہاں ہو؟" اس نے سرگوشی کی۔

"مکان کے سامنے، اور تم؟"

"بس میں اندر جا رہا ہوں۔ تم نے دونوں کو دیکھا؟"

"وہ گیٹ کے اندر ہیں۔ میرا فاصلہ بیس فٹ ہے۔"

"محتاط رہنا، پانچ یا چھ ہیں۔ واہنش سمیت چار کو میں دیکھ چکا ہوں۔" پاٹیک نے فون بند کیا، گلاس ڈور کی سمت سے دیوار پھلانگی اور ڈور سے ہٹ کر دیوار سے چپک گیا۔ یوں وہ لارکن والے بیڈ روم سے دور اور گیٹ سے قریب تھا۔ ڈرائیو وے میں اس نے معاً حرکت محسوس کی۔ پاٹیک گلاس ڈور کے ذریعے بیڈ روم میں جانا چاہتا تھا۔ اس کی توجہ گیٹ کی طرف ہو گئی۔

کول بار کلے گیٹ پر تھا۔ وہ دونوں آدمی آگے گئے وہ کنفیوز تھے۔ کول نے لعنت بھیجی۔ پاٹیک نے دوڑ لگائی۔ ان دونوں کی کنفیوژن جلد ختم ہو جاتی۔ صورت حال بگڑنے والی تھی۔ دونوں نے پاٹیک کی آہٹ محسوس کی اور پلٹے۔ پاٹیک کے انگ انگ میں برق دوڑ رہی تھی۔ وہ گیٹ کھول چکے تھے۔ بار کلے کو وہ نظر انداز کر چکے تھے۔ پاٹیک نے قریبی آدمی کو گن سے ہٹ کیا۔ لیکن دوسرے نے گاڑی کی آڑ لی۔ پاٹیک کے پیچھے داخلی دروازہ دھڑ سے کھلا، کوئی چیز زن سے گزری۔ کار کی آڑ لینے والا بھی چلا یا تھا۔ کول گیٹ میں تھا۔ دو آدمی دروازے میں تھے۔ ایک نے گن نکالی اور کول نے اس کے سینے میں گولی اتار دی۔ ہنگامے کا آغاز تھا۔ پاٹیک کے ذہن کے ایک گوشے میں لارکن بیٹھی تھی۔ دوسرے آدمی نے مرتے ہوئے ساتھی کے پیچھے دروازہ کر لیا۔ پاٹیک جانتا تھا کہ اسے بیڈ روم میں ہونا چاہیے۔

بڈفلین گیٹ کے قریب نظر آیا۔ کول نے ہاتھ میں پکڑ کر گن دونوں ہاتھوں میں لی۔ وہ کار کی آڑ میں آدمی کے پاس تھا۔ جو گھٹنوں کے بل کھڑا تھا۔ پھر اس نے ہاتھ اٹھا دیے۔

پاٹیک بیڈ روم کی طرف بھاگا۔ واہنش کے پاس دو راستے تھے۔ پہلا یہ کہ مغوی یعنی لارکن کو گولی مار دے دوسرا راستہ فرار کا تھا۔ واہنش بے خبر تھا کہ کتنے آدمی مکان میں ہیں۔ کیا اسے گھیر لیا گیا؟ کیا پولیس بھی ہے؟ اگر وہ رکتا تو ٹریپ ہو جائے گا۔ اس کے لیے بہترین چانس تھا کہ وہ نکل جائے۔ پڑوس میں چلا جائے، کار چھین لے یا چھپے اور سلامتی کی دعا کرے۔ بری چانس تھی لیکن فی الحال یہی بہتر تھا۔

پاٹیک تیز ہوا کے جھونکے کی طرح گیا اور فائرنگ کی آواز سنی۔ ایک فائر کا مطلب تھا کہ لارکن کو ختم کر دیا گیا ہے لیکن ایک سے زیادہ شاٹس، امید افزا تھے۔ وہ داخلی دروازے کی سمت فائرنگ کر رہے تھے۔ اس کا مطلب انہوں نے فرار ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔

پاٹیک کو یقین ہو گیا کہ واہنش لارکن کو نہیں مارے گا۔ وہی اس کی امید تھی۔ پچویشن سے وہ لاعلم تھا۔ راہ فرار تھی ہوتے ہی وہ بار کلے کو سزا دینے کے لیے لارکن کو ختم کرے گا۔

کھڑکی میں شیشے کا ایک پٹ سلائڈ ہوا اور دراز قامت باہر کودا۔ پھر لارکن کو باہر دھکیلا گیا۔ آخر میں واہنش نکلا۔ اس کے پیچھے ایک اور پستہ قد نظر آیا جس نے سر پر رومال جیسی چیز لپٹی ہوئی تھی۔ کول اس اثنا میں مکان کی دوسری جانب سے گھوم کر آیا۔ پستہ قد اور کول کے درمیان گولیوں کا تبادلہ ہوا۔ بڈفلین نے اندر سے سلائڈنگ گلاس ڈور ایک طرف کیا۔ گن اس کے ہاتھ میں تھی۔ پاٹیک نے بھاگتے ہوئے دوسری گن بھی نکال لی تھی۔

"پولیس۔" وہ چلایا۔ پستہ قد نے رخ پھیرا اور پاٹیک نے گولی اس کے سر میں اتار دی۔ واہنش نے لارکن کو اپنے سامنے جکڑ لیا۔ دراز قامت بھی واہنش کے قریب تھا۔ اس نے دونوں طرف فائرنگ کی۔ بڈفلین اور کول کی جانب۔ بدحواسی میں چلائی گولیوں نے کوئی نتیجہ پیش نہیں کیا۔ ویسے بھی بڈفلین اندر تھا۔ اسے پاٹیک کو نشانہ بنانا چاہیے تھا۔

بڈفلین انہیں ہتھیار ڈالنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ دراز قامت نے پہلو بدل کر پاٹیک کا رخ کیا۔ پاٹیک نے بہ آسانی اس کا سر کھول دیا۔ وہ وزنی بوری کی طرح گرا۔

"میری بیٹی کو چھوڑ دو۔" بار کلے بھی اندر آیا۔ وہ چیخ رہا تھا۔ بڈفلین نے اسے دھکیل کر پیچھے کیا۔

واہنش نے گن نکال کر لارکن کی گردن پر رکھ دی۔ بڈفلین متواتر ہتھیار ڈالنے کے لیے کہہ رہا تھا۔

پاٹیک نے ایک گن گرا دی۔ پاٹیک کے دائیں ہاتھ والی گن کی آنکھ واہنش کی آنکھ پر تھی۔ آنکھ سے آنکھ ملی تھی۔ آنکھ اور گن ایک وجود میں ڈھل گئی تھیں۔ پاٹیک نے اس کی آنکھ کا تاثر پڑھ لیا تھا۔

"ڈیڈ مین۔" پاٹیک [illegible] سے بولا۔

دور سے سائرن کی آواز [illegible] رہا۔

"مارے مروں گا۔" واہنش ان میں سے نہیں تھا۔

پاٹیک، لارکن کو نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہ صرف واہنش کی آنکھ پر تھی۔ وہ لارکن کو دیکھتا تو وہ پاٹیک کا خوف پڑھ لیتی۔ خوف اس کے اندر تھا۔ اپنے لیے نہیں اس کے لیے۔ وہی پڑھ سکتی تھی۔ "چھوڑ دو، کوئی راستہ نہیں ہے۔" پاٹیک نے کہا۔

"ماردوں گا۔" وہ بولا۔

"ماردو۔" پاٹیک نے جواباً کہا۔ ان دونوں کے پیچھے پاٹیک نے کول کو دیکھا۔ لیکن براہ راست وہ صرف واہنش کو گھور رہا تھا۔

واہنش نے گن پھینک دی۔

"سرنڈر۔" وہ بولا۔

بڈفلین نے مخصوص ہدایات دینا شروع کر دیں جو پولیس سروس کے دوران پاٹیک ان گنت بار سن چکا تھا۔

"ہاتھ اوپر کرو، سر پر رکھ لو۔ ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے کے اندر ڈالو ......"

واہنش نے ایسا ہی کیا۔ لارکن بے حرکت تھی، نہ پاٹیک نے حرکت کی۔ وہ بولا۔ "ڈیڈی کے پاس جاؤ۔"

لارکن نے پاٹیک کی طرف قدم بڑھائے۔

"ڈیڈی کو دیکھو۔"

وہ رک گئی۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ اندر سے بار کلے کی آواز آئی۔ لارکن باپ کی طرف بھاگی۔ بڈ اور بار کلے باہر آ گئے۔ پاٹیک، لارکن اور واہنش کے درمیان آ گیا۔ گن کی آنکھ مستقل واہنش کو گھور رہی تھی۔

"جو تم نہیں مارو گے۔" بڈفلین نے کہا۔

"جو......"

اور پاٹیک نے ٹریگر پر دباؤ بڑھا دیا۔ جیسے غبارہ پھٹنے کی آواز آئی اور واہنش منہ کے بل گرا۔ کول نے تینوں کے مرنے کا یقین کیا اور ان کے ہتھیار سمیٹ لیے۔ بڈفلین تکتا رہ گیا۔ اس کا چہرہ اتر گیا تھا۔

بار کلے نے بیٹی کو لپٹایا ہوا تھا۔ پاٹیک مڑا۔ اس نے بار کلے کو روتے دیکھا۔ بلینئر کے آنسو بھی عام آدمی کے آنسوؤں کے مانند تھے۔ معاً لارکن پلٹ کر پاٹیک کی طرف بھاگی اور لپٹ گئی۔ پاٹیک نے اپنی ٹھوڑی اس کے سر پر ٹکا دی۔ "کوئی تمہیں ہرٹ نہیں کر سکتا۔ میں کسی کو ایسا نہیں کرنے دوں گا۔"

پولیس پہنچی تو لارکن، پاٹیک کے بازوؤں میں تھی۔

☆☆☆

سمندر کے کنارے اوشین ایونیو پر صبح کی سنہری دھند تھی۔ اس کے بیچ بیچ ہی تھی۔ چو بج رہے تھے۔ نیم اندھیرے میں دھند کے اندر سے کار نمودار ہوئی۔ سفید موتی جیسی پسٹن ہارن کنورٹیبل۔ وہ کار بھاگتے ہوئے پائیک کے قریب سے گزر گئی۔ پھر گھوم کر آئی اور دوسری جانب سے گزر گئی۔ پائیک بھاگتا رہا۔ اس مرتبہ عقب سے آئی تو دھیمی رفتار تھی۔ گویا وہ پائیک کے ساتھ بھاگ رہی ہو۔ کار کی چھت اس نے گرائی ہوئی تھی۔ ہونٹوں پر دلکش مسکراہٹ تھی۔

''کوئی دیوانہ ہی اس وقت دوڑنے کے لیے نکلے گا۔'' وہ بولی۔

''کوئی دیوانی ہی اس وقت ڈرائیونگ کے لیے نکلے گی۔'' اس نے کہا۔

''میں نے کول سے معلوم کیا تھا۔ تم میری کالز ریٹرن نہیں کر رہے تھے۔''

''ہم... سمجھ میں نہیں آیا وہ کیا بولے۔

وہ بولی۔ ''تم دوڑتے ہوئے بات کر سکتے ہو؟''

''کیوں نہیں۔''

''میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ تمہیں پریشان نہیں کروں گی۔ اور میں کال نہ کروں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم کال نہیں کر سکتے۔ تم جب چاہو کال کر سکتے ہو۔ حالانکہ میں سمجھ رہی ہوں کہ تم چاہتے ہو کہ میں کال نہ کروں۔ تو میں تمہاری خواہش کے مطابق چلوں گی۔''

''لو کے۔''

''اتنی خشکی اور صاف گوئی۔ تھوڑی اداکاری کر سکتے ہو۔'' اسے غصہ آگیا۔

''تمہارے ساتھ اداکاری نہیں کر سکتا۔''

''میں کال اس لیے نہیں کروں گی کہ تم ایسا چاہتے ہو، جبکہ میں ایسا نہیں چاہتی۔ شاید تم سوچتے ہو کہ تم مجھ سے عمر میں بڑے ہو۔ یا یہ سوچتے ہو کہ میں کم عمر ہوں۔ یہ بھی شرط لگا سکتی ہوں کہ تم امرا اور رؤسا کو پسند نہیں کرتے۔''

''کسی مالدار کو چن لو۔''

لارکن دوبارہ مسکرائی۔ اس چہرے پر وہ مسکراہٹ اسے بہت پسند تھی۔ کوئی دیکھے اور مسکرا کے دیکھے۔ لیکن دفعتاً اس کی مسکراہٹ دھندلی ہوتی چلی گئی۔ پائیک نے تکلیف محسوس کی۔ وہ رکا۔ گاڑی رکی۔ پائیک نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہ کہہ رہی تھیں... پامالیٔ شوق کا احساس نہیں تجھ کو... کیوں نہیں کرم آمادہ... محرومیٔ کیف و غم کا بھی پاس نہیں تجھ کو۔

''مسکراؤ۔'' وہ بے ساختہ بولا۔

''نہیں۔''

''اداکاری کرلو۔''

''تمہارے ساتھ نہیں کر سکتی۔''

پائیک نے بے ساختہ اپنا سر سہلایا۔

وہ بولی۔ ''تم سمجھے میرا مسئلہ ختم اور تعلق بھی ختم۔ ایسا نہیں ہے۔ آئی لو یو...... بہت، بہت... زیادہ۔ میں تمہارے لیے کچھ بھی کر سکتی ہوں۔''

''مجھے علم ہے۔''

''حتیٰ کہ کال بھی نہیں کروں گی۔'' انجن آہستہ سے غرایا اور پسٹن ہارن دور ہوتی گئی۔ اس کی آواز اذیت ناک انسانی چیخ کے مانند لگی تھی۔ وہ اوجھل ہوگئی۔ پائیک دھند کو گھورتا رہا۔

''آئی لو یو۔'' اس نے سرگوشی کی۔

دلدوز ترنم کے سوا کچھ بھی نہیں...... دوست میری قیمت پرکار تبسم کے سوا کچھ بھی نہیں......

☆☆☆

دن ہفتوں میں بدل گئے۔ لارکن نے اس دوران کئی بار فون اٹھایا اور واپس رکھ دیا۔ ''وہ تو کرے گا نہیں۔'' اس نے خود سے کہا۔ اور میں وعدہ کر چکی ہوں۔

تین ہفتے بعد لارکن کو ایک لفافہ موصول ہوا۔ بھیجنے والا نامعلوم تھا۔ لارکن نے الٹ پلٹ کر لفافہ دیکھا اور ایک طرف ڈال کر پھر بستر پر لیٹ گئی۔ دفعتاً ذہن میں جھماکا ہوا۔ لفافے پر گھر کا پتا درست لکھا تھا لیکن اس کا نام نام کی جگہ صرف لارکن لکھا تھا۔ جبکہ اسے موصول ہونے والی ہر خط و کتابت پورے نام کے ساتھ ہوتی تھی۔ لارکن کوزر بار کلے۔ اس نے جھپٹ کر سائڈ ٹیبل سے لفافہ اٹھا کر چاک کیا۔ اندر سے ایک فوٹو برآمد ہوا۔ وہ پلک جھپکائے بغیر فوٹو کو تک رہی تھی۔ پھر دہرے تکیے پر نیم دراز ہوگئی۔ نگاہ تصویر پر تھی۔

وہ پائیک کی تصویر تھی۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ اس کی سبز آنکھوں پر چشمہ بھی نہیں تھا۔ وہ عالم بے خبری میں خود بھی مسکرا رہی تھی۔ نظریں اوپر نیچے ہو رہی تھیں۔ پائیک کی مسکراہٹ پر اور اوپر اس کی آنکھوں پر۔

دفعتاً وہ کھلکھلا کے ہنس پڑی۔ اس کے ہونٹوں نے تصویر پر دستخط کیے۔ تصویر دراز میں رکھ دی گئی۔

''ایک بار تو فون کروں گی۔ کسی اور نمبر سے...... کسی اور طریقے سے... اور ہاں، پتھر دل تیرا شکریہ۔ میں سمجھ گئی۔''

سرغنہ

فاطمہ خام

مفلوک الحالی کو خیرباد کہہ کر عیش و آسائش کی زندگی گزارنا آسان نہیں... کمانے والوں کو گھر والوں کی لمبی جدائی سہنا پڑتی ہے... تب سماجی حیثیت کا پلڑا بلند ہوتا ہے۔ ایک دلچسپ... تجربہ کار... مفلوک الحال بوڑھے کا ماجرا... اس کی زندگی تجربے کا نچوڑ تھی... اور اس نچوڑ سے فائدہ اٹھانا اس نے بہت پہلے سیکھ لیا تھا۔

چونکا دینے والے انجام سے بھرپور ایک دلچسپ کہانی......

ستر سالہ تجربہ کار، سرد و گرم چشیدہ پال گروسری اسٹور کے سامنے ہشاش بشاش کھڑا تھا۔ ''سیون۔ الیون'' نامی یہ گروسری شاپ اپنے نام کی لاج رکھتے ہوئے صبح سات بجے سے رات کے گیارہ بجے تک کھلی رہتی تھی اور اس وقت رات کے ساڑھے دس بجے تھے لیکن موسم سرما کی وجہ سے ایسا محسوس ہوتا تھا، رات آدھی سے زیادہ گزر چکی ہے۔

بوڑھے پال نے اگرچہ گرم لباس زیب تن کر رکھا تھا لیکن سردی کی زیادتی کے باعث اس کا وجود ہلکے ہلکے کانپ

رہا تھا۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اپنے سر کو دائیں سے بائیں گھما کر دونوں جانب دور تک اسٹریٹ کا بغور جائزہ بھی لے رہا تھا۔ اس کی ان محتاط حرکات و سکنات کو دیکھ کر یہی سمجھ میں آتا تھا کہ اسے کسی کا انتظار ہے۔ شاید اس گروسری شاپ کے دروازے پر کوئی اس سے ملنے آنے والا تھا۔

یخ بستہ موسم کے باعث اسٹریٹ ویران پڑی تھی بلکہ وہاں کی فضا کو ہولناک کہنا زیادہ مناسب تھا۔ کافی دیر سے کوئی ادھر سے نہیں گزرا تھا تاہم پال کی ثابت قدمی دیکھنے لائق تھی۔ وقت گزاری کے لیے وہ گروسری شاپ کے بیرونی شیشوں پر چسپاں پوسٹرز کو پڑھنے لگا۔ یہ دراصل اس شاپ کی جانب سے کی جانے والی مختلف آفرز کے اشتہارات تھے جن پر درج دلچسپ اور پرکشش جملوں کی مدد سے، کسٹمرز کو اکسانے اور زیادہ سے زیادہ خریداری کرنے پر مجبور کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ وہ پوسٹرز پہلو بہ پہلو اور اوپر تلے اس طرح شاپ کے شیشوں پر چسپاں کیے گئے تھے کہ اندر کا منظر باہر سے نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ بہرکیف، یہ پتا تو چل رہا تھا کہ گروسری شاپ کے اندر لائٹس آن ہیں، یعنی وہاں کا کاروبار بہ خوبی رواں دواں ہے۔

سردی لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ بوڑھے پال کے لیے موسم کی شدت کو برداشت کرنا خاصا مشکل ثابت ہو رہا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں کو ملتے ہوئے، ادھر ادھر ٹہلنے لگا تاہم اس کی یہ ٹہل قدمی "سیون۔ الیون" کے سامنے ہی تک تھی جیسے اسے اس بات کا ڈر ہو کہ اگر وہ تھوڑا آگے نکل گیا تو اس کا انتظار کسی کام کا نہیں رہے گا۔ اس مختصر گشت کے دوران میں وہ محتاط نگاہ سے اس اسٹریٹ کی نگرانی کرنا ایک لمحے کے لیے بھی نہیں بھولا تھا۔

اچانک پال کی آنکھیں چمک اٹھیں اور اس کے چہرے پر چوکنا پن نمودار ہوا۔ اس کی نگاہ کا مرکز ایک دراز قامت شخص تھا۔ اس کی عمر بیس سے تیس کے درمیان ہوگی۔ وہ اسٹریٹ پر سبک قدموں سے چلتے ہوئے گروسری شاپ کی طرف آ رہا تھا۔

"کیا یہ بندہ کوئی خریداری کرنا چاہتا ہے؟" پال نے سرگوشیانہ انداز میں خود کلامی کی۔

"نہیں!" اس نے خود کو منطق بھرا جواب دیا۔ "اس بندے نے ماسک نہیں پہنا ہوا۔ بغیر ماسک کے یہ شاپ کے اندر داخل نہیں ہو سکتا... نو ماسک نو انٹری!"

چند لمحات کے بعد پال کا اندازہ صد فیصد درست ثابت ہوا۔ مرد مذکور نے گروسری شاپ کے اندر جانے کے بجائے ایک رحم بھری نظر پال پر ڈالی اور چپ چاپ اس کے پاس سے گزر کر آگے بڑھ گیا۔

پال کو اس کی نگاہ کے مفہوم تک رسائی حاصل کرنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی۔

"یہ کم بخت مجھے کوئی بھکاری سمجھ رہا ہے۔" اس نے دھیمی آواز میں اپنی ناگواری کا اظہار کیا۔ "اسے معلوم نہیں کہ میں کون ہوں اور یہ بھی ٹھیک ہی ہے۔" اس نے سردی سے بچانے کے لیے اپنے دونوں ہاتھوں کو کوٹ کی جیبوں میں ڈال لیا اور بے ساختہ خود کلامی کی۔ "یہ کہاں جا رہی ہیں؟"

آخری سوالیہ جملہ پال نے دو لڑکیوں کو دیکھ کر ادا کیا تھا۔ وہ دونوں خوب صورت اور جوان تھیں۔ پال گروسری شاپ کے دروازے کے نزدیک آ گیا اور نگاہ اس سمت مرکوز کر دی جہاں سے وہ حسینائیں آ رہی تھیں۔ وہ بہ آواز بلند باتیں بھی کر رہی تھیں۔ وقفے وقفے سے ان کے کھور قہقہے بھی فضا میں بکھر رہے تھے۔ وہ خاصی مطمئن اور خوش نظر آتی تھیں۔

"ان کے چہرے بھی ماسک سے عاری ہیں۔" پال دھیمے لہجے میں بڑبڑایا۔ "مطلب یہ کہ ان کا بھی شاپنگ کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔"

وہ گہری نظر سے ان مہ جبینوں کا جائزہ لینے لگا۔ "ان کی خمار آلود آواز اور لڑکھڑاتے قدموں سے صاف پتا چل رہا ہے کہ یہ دونوں کسی بار سے خوب چڑھا کر آئی ہیں۔" وہ خود سے ہم کلام تھا۔ "ان کے بیچ لگاؤ اور پسندیدگی بھی نظر آ رہی ہے۔ میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ ایک ساتھ ہی رہتی ہوں گی اور یہ روم میٹ تو پکی ہیں اور... اور شاید بیڈ میٹ بھی۔" اس نے عجیب سے انداز میں سر کو جھٹکا اور طنزیہ لہجے میں بولا۔ "پتا نہیں، آج کی نوجوان نسل کو ہو کیا گیا ہے۔ یہ تباہی کے قریب ہیں۔"

اسی دوران میں وہ دونوں دلکش لڑکیاں باتوں میں مگن، پال کی طرف دیکھے بغیر اس کے پاس سے گزر کر تاریکی کا حصہ بن گئیں۔ تاہم ان کے بے فکرے قہقہوں کی مخصوص آواز کچھ دیر تک وقفے وقفے سے سنائی دیتی رہی تھی۔

"شاید یہ عمر کا تقاضا ہے کہ میں ان نوجوان حسیناؤں کے بارے میں الٹا سیدھا بول گیا۔" اس نے خود کو ملامت

کی۔ "بڑھاپے میں سب بھری عورت کی سوچ والے ہو جاتے ہیں دونہ جوانی میں، میں بھی کسی سے کم نہیں ہوا کرتا تھا۔ میری بدمعاشیوں اور آوارگیوں پر ایک ضخیم ناول لکھا جا سکتا ہے۔"

ایسا سوچتے ہوئے پال کے بدن میں ایک کرنٹ سا دوڑ گیا۔ اگلے ہی لمحے اس کے چہرے پر تشویش ابھر آئی۔ یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ ان معنا تاثرات کے پیچھے کوئی ندامت چھپی ہوئی تھی یا یہ اس کا اظہار تفاخر تھا جو بے ساختہ اس کے چہرے پر نمودار ہو گیا تھا۔

پانچ منٹ کے بعد ایک ادھیڑ عمر شخص اپنے پالتو کتے کے ساتھ وہاں سے گزرا۔ کتے اور اس کے مالک نے ماسک نہیں پہن رکھا تھا لہٰذا ان کا گروسری اسٹور کے اندر جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

"گورنمنٹ نے سوشل ڈسٹنس (سماجی فاصلے) اور ماسک کی پابندی عائد کر کے ٹھیک کیا یا غلط، اس کے بارے میں کبھی میں نے سنجیدگی سے سوچا نہیں۔"

وہ خود سے مخاطب تھا۔ "لیکن ماسک کے استعمال والی پابندی اس وقت خاصی مفید ثابت ہو رہی ہے۔ میں دور سے آتے ہوئے بندے کو دیکھ کر سمجھ جاتا ہوں کہ وہ شاپنگ کے لیے گروسری اسٹور میں جائے گا یا نہیں۔" وہ ایک مرتبہ پھر شیشوں پر چسپاں دل فریب اشتہاری پوسٹرز کے نزدیک چلا گیا اور چہرے کو ان کے ساتھ لگا کر اسٹور کے اندر کا احوال جاننے کی کوشش کرنے لگا مگر پہلے ہی کی طرح اس بار بھی یہ کوشش ناکام ہی رہی۔ ان رنگین اور سنگین پوسٹرز کی دوسری جانب، اسٹور کے اندر جھانکنا ممکن نہیں تھا۔

کسی گاڑی کی آواز سن کر پال اندر کا خیال چھوڑ کر مڑا۔ اسی وقت گروسری شاپ کے سامنے، اسٹریٹ کی دوسری طرف ایک کار آ کر رکی۔ وہاں پہلے ہی سے ایک بند وین پارکڈ تھی۔ اس سیاہ وین کے اندر نہیں دیکھا جا سکتا تھا مگر وین نشین بہ آسانی بیرونی مناظر دیکھ سکتا/سکتے تھے۔ مذکورہ وین کم و بیش آدھے گھنٹے سے وہاں کھڑی تھی۔ ایک دم خاموش اور ساکت۔

نووارد کار کے اندر سے ایک میانہ قد شخص برآمد ہوا۔ اس کی عمر پچیس کے ارد گرد رہی ہوگی۔ اس نے سیاہ لیدر جیکٹ پہن رکھی تھی۔ وہ اسٹریٹ کو عبور کرتے ہوئے گروسری شاپ کی سمت بڑھنے لگا۔ اس دوران میں اس نے اپنی لیدر جیکٹ کی جیب میں سے ایک ماسک بھی نکال لیا تھا۔ اس نے دوسرے ہاتھ میں سیل فون تھام رکھا تھا اور

ناظرین! یہ ہے آج کے مقابلے کا بے داغ فاتح

اس کے قدموں کا رخ عین شاپ کے دروازے کی جانب تھا۔

"یہ بندہ یقیناً اس اسٹور سے کچھ خریدنے آیا ہے۔" پال دھیمی آواز میں بڑبڑایا اور دروازے کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔

لیدر جیکٹ والے شخص نے اس کے پاس پہنچ کر گروسری شاپ کے دروازے کی طرف ہاتھ بڑھایا تو پال نے شائستہ لہجے میں کہا۔

"ایکسکیوز می!"

وہ بندہ رک گیا اور پلٹ کر سوالیہ نظر سے پال کو تکنے لگا۔ ان دونوں کے بیچ تین سے چار فٹ کا فاصلہ رہا ہوگا۔ اس شخص کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ بوڑھا اس سے کیا چاہتا ہے۔ چند لمحات تک تذبذب میں رہنے کے بعد اس نے کہا۔

"یس؟"

"کیا تم شاپ کے اندر جانا چاہتے ہو؟" پال نے رسانیت بھرے لہجے میں پوچھا۔

لیدر جیکٹ والا یہاں تک پہنچتے ہوئے اپنے چہرے

پہ ماسک لگا چکا تھا۔ اس نے ماسک کو ذرا سا نیچے کھسکایا اور جذبات سے عاری لہجے میں پال سے دریافت کیا۔ ''تمہیں کوئی پرابلم ہے؟ کیونکہ میرے اندر جانے سے...''

''نہیں... بالکل نہیں۔'' پال نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''میں تو بس ایسے ہی پوچھ رہا تھا۔ پال ڈی وے، میرا نام پال ہے۔''

لیدر جیکٹ والا سمجھ نہ پایا کہ ایک بوڑھا شخص اس طرح خود کو کیوں متعارف کرا رہا ہے۔ بہرکیف اپنے والد کی عمر کے شخص کو پریشان دیکھ کر اس کے دل میں ہمدردی کے جذبات جاگ اٹھے۔

پال نے اس کے چہرے پر ابھرنے والے تاثرات کو بہ آسانی پڑھ لیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے فدویانہ انداز میں استفسار کیا۔ ''کیا تم میرا ایک کام کر سکتے ہو؟''

''کیا کام؟'' لیدر جیکٹ والا بے ساختہ متفسر ہوا۔ ''تھوڑی دیر پہلے میں نے تمہیں ان پیٹرز کے ساتھ منہ لگا کر کھڑے دیکھا تھا جیسے تم گروسری شاپ کے اندر روشن لائٹس سے خارج ہونے والی توانائی کو اپنے بوڑھے بدن میں جذب کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔'' لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔ ''مسٹر پال! کیا تمہیں بہت زیادہ ٹھنڈ لگ رہی ہے... کیا تم مجھ سے میری جیکٹ مانگنا چاہتے ہو...؟''

''اس موسم میں، کوئی بوڑھا ہو یا جوان، سب کو ٹھنڈ لگتی ہے۔'' پال تلخ کلامی کرتے ہوئے فلسفیانہ انداز میں بولا۔ ''کسی لائٹ سے خارج ہونے والی حرارت ہو یا کسی لیدر جیکٹ کا خوشگوار گرم ساتھ، یہ سب بدن کو اچھا لگتا ہے لیکن... مجھے تمہاری اس گرم جیکٹ کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے لیے اپنے کوٹ کی جیبیں ہی کافی ہیں۔''

پال بات پوری کرنے کے بعد اپنے دائیں ہاتھ کو کوٹ کی جیب میں ڈال کر ''گرم'' کرنے کا عملی نمونہ پیش کرنے لگا۔ لیدر جیکٹ والا الجھن زدہ نظر سے اسے دیکھتا رہا پھر پوچھا۔

''تو پھر میں تمہارا کون سا کام کروں۔ کیا تم بھی شاپ کے اندر جانا چاہتے ہو اور تمہارے پاس فیس ماسک نہیں ہے اور تم مجھ سے یہ ماسک مانگنے کے بارے میں سوچ رہے ہو... ہیں نا؟''

''نہیں۔ ایسی بات نہیں ہے۔'' پال نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔ ''یہ ٹھیک ہے کہ میں گروسری شاپ کے اندر جا کر اپنے لیے تھوڑی خریداری کرنا چاہتا ہوں مگر میرے باہر کھڑے ہونے کا سبب یہ نہیں ہے کہ میرے پاس ماسک یا شاپنگ کے پیسے نہیں ہیں۔''

''اوہ...'' لیدر جیکٹ والے شخص نے آنکھیں سکیڑ کر پال کو دیکھا اور پوچھا۔ ''تو تمہارے اندر نہ جا پانے کا سبب کیا ہے؟''

''اس شاپ کا منیجر۔'' پال نے جواب دیا۔

''میں سمجھا نہیں؟''

''وہ مجھے دیکھتے ہی میری ضرورت کا سامان دینے سے صاف انکار کر دے گا۔'' پال نے بتایا۔ ''وہ مجھے اچھی طرح جانتا ہے۔''

''تم ایسا کیا خریدنا چاہتے ہو جو اس گروسری شاپ میں ''برائے فروخت'' تو ہے مگر تمہیں نہیں مل سکتا؟'' لیدر جیکٹ والے نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔ ''ڈرگز...؟''

''کیا؟'' پال نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''کیا امریکا نے اتنی زیادہ ''ترقی'' کر لی ہے کہ اب ہمارے پڑوسی اسٹورز پر ڈرگز بھی فروخت ہونے لگی ہیں؟''

''میرا یہ مطلب نہیں تھا مسٹر پال۔'' پال کی خفگی بھری آواز کے جواب میں وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ ''ڈرگز کا لفظ بس ایسے ہی میرے منہ سے نکل گیا تھا۔''

''بس ایسے ہی کچھ بھی منہ سے نہیں نکل جاتا۔'' پال نے متولی نظر سے اسے دیکھا اور رازدارانہ انداز میں پوچھا۔ ''کیا تم ڈرگز لیتے ہو؟''

''نن... نہیں۔'' وہ ہڑبڑائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں نے یہ بھی ٹرائی نہیں کیا... میں تو یہاں برانڈی کی ایک بوتل لینے آیا تھا۔''

''ہوں۔'' پال نے اُسے شک زدہ نظر سے دیکھا ضرور مگر اس کا اظہار نہیں کیا۔ ''اچھی چوائس ہے۔'' وہ سراہنے والے انداز میں بولا۔ ''اس ٹھنڈے ٹھار موسم کا سب سے موزوں توڑ برانڈی ہی ہے۔ اس کا ایک ہی پیگ بدن میں آگ سی بھر دیتا ہے... آہ۔''

''تم نے بتایا نہیں۔'' لیدر جیکٹ والا واپس پرانے موضوع پر آتے ہوئے مستفسر ہوا۔ ''ایسا کیا ہے کہ گروسری کا منیجر تمہیں فروخت نہیں کرے گا؟''

''مجھے اس وقت ''سکس۔ پیک'' کی اشد ضرورت

ہے۔''

لیدر جیکٹ والے کی ہنسی نکل گئی۔ ''بس، اتنی سی بات کے لیے تم پریشان ہو رہے ہو؟'' اس نے پال کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''چھ بیئر کینز کی پیکنگ ''سکس پیک'' میں ایسی کیا خاص بات ہے جو تم نہیں خرید سکتے۔ ناقابلِ یقین... بیئر کا نن الکحلک ہو یا نان الکحلک... اس کی خرید و فروخت پر کوئی پابندی نہیں ہے۔''

پال خاصے بھیانک انداز میں کھانسا۔ ''بات بیئر کی پابندی کی نہیں، اس گروسری شاپ کے منیجر کی ہے۔'' اس نے اُلجھی ہوئی سانس کے ساتھ بتایا۔ ''میں نے کہا نا، وہ مجھے اچھی طرح جانتا ہے اور... وہ میرا سچا خیر خواہ بھی ہے۔''

''کیا تمہیں کوئی ایسی بیماری ہے جس میں پینا سختی سے منع ہو؟'' لیدر جیکٹ والے نے پال کی حالت کے پیشِ نظر ہمدردی بھرے لہجے میں دریافت کیا۔

''مجھے پھیپھڑوں کا کینسر ہے۔'' پال نے انکشاف انگیز لہجے میں بتایا۔ ''اور وہ بھی اسٹیج فور کا... میری دونوں اولادیں، یہ منیجر اور دیگر مخلص دوست مجھے ڈرنک سے دور رکھنا چاہتے ہیں۔ میرے پاس قوتِ خرید ہے مگر... میں آج بھی خود کو بچپن، ساٹھ سال پیچھے، کئی بار گروسری اسٹور کے سامنے اسی طرح کسی کی مدد کا محتاج کھڑا دیکھ رہا ہوں۔''

''مجھے تمہاری بیماری کا سن کر بہت افسوس ہوا۔'' لیدر جیکٹ والے نے اپنائیت بھرے لہجے میں کہا۔ ''آئی ایم سوری مسٹر پال۔ میں نے تم سے برانڈی کے حوالے سے غلط بیانی کی تھی۔ ایسے اسٹورز پر برانڈی یا دوسری شرابیں فروخت نہیں کی جاتیں۔ تمہاری طرح میں بھی یہاں سکس پیک ہی خریدنے آیا ہوں۔ تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ تمہارا یہ کام میں کر دوں گا... ایک لاسٹ اسٹیج کے کینسر پیشنٹ کی آخری خواہش سمجھ کر۔''

''میں نے کم عمری میں پینا شروع کر دیا تھا اور بیئر سے مجھے خاص لگاؤ ہے۔'' بوڑھا پال اپنی ہی دُھن میں بولتا چلا گیا۔ وہ لیدر جیکٹ والے شخص سے بات کرتے ہوئے ماضی کے دُھندلکوں میں جیسے کھو سا گیا تھا۔ ''میں تیرہ سال کا تھا تو مجھے ایک لڑکی سے محبت ہوگئی۔ کارشیا مجھ سے پانچ سال بڑی تھی۔ وہ بھی مجھے ٹوٹ کر چاہتی تھی۔ کارشیا سے ملاقات سے پہلے مجھے بیئر کے حصول کے لیے اپنے، بڑی عمر کے دوستوں کی منت کرنا پڑتی تھی کیونکہ بارہ تیرہ سال کے ایک لڑکے کو کوئی بھی بار بیئر دینے کو تیار نہیں ہوتا تھا۔ میں نے اس

مسئلے کے حل کے لیے اپنی ایک جعلی یا دو عمر کی تھپ آئی ڈی بھی بنا لی تھی لیکن میں پکڑا گیا کیونکہ علاقے کے زیادہ تر بارز اور اسٹورز کے مالکان مجھے اور میرے والدین کو جانتے تھے۔ پھر جب کارشیا میری زندگی میں آئی تو یہ مسئلہ خود بہ خود سیدھا ہو گیا۔ وہ اپنی عمر کے لحاظ سے ہر قسم کا لیکوئر (شراب) خریدنے کا حق رکھتی تھی۔'' لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی اور کھانسنے کا ایک سیشن مکمل کرنے کے بعد اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بتانے لگا۔

''کارشیا کی معیت میں گزرا ہوا ایک ایک پل میری زندگی کا بیش قیمت سرمایہ ہے۔ اس نے مجھے زندگی کی اُن لذتوں سے روشناس کرایا جن کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کیف و سُرور کی اس فضا نے مجھے وقت سے پہلے بڑا، ایک بھرپور مرد بنا دیا تھا لیکن پھر یکایک سب کچھ ختم ہو گیا۔''

پال نے ڈرامائی انداز میں اپنا بیان ادھورا چھوڑا تو لیدر جیکٹ والے شخص نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔ ''سب کچھ ختم ہو گیا... اس کا کیا مطلب ہوا؟''

''کارشیا مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔'' وہ سپاٹ آواز میں بولا۔ ''ہمیشہ کے لیے۔''

بات پوری کرنے کے بعد وہ چوکنا انداز میں اسٹریٹ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک نگاہ دوڑانے لگا۔ لیدر جیکٹ والے بندے سے گفتگو کرتے ہوئے وہ گاہے بگاہے کڑی نظر سے گردوپیش کا جائزہ بھی لے رہا تھا جیسے کسی خاص شخص کا انتظار ہو۔

''کارشیا ہمیشہ کے لیے کہاں چلی گئی تھی؟'' لیدر جیکٹ والے نے تشویش بھرے لہجے میں استفسار کیا۔ ''کیا اسے کوئی اور مرد پسند آ گیا تھا۔''

''نہیں۔'' پال نے پوری قطعیت سے جواب دیا۔ ''ایک حادثے میں وہ چل بسی تھی۔''

''اوہ... آئی ایم سوری۔'' لیدر جیکٹ والا افسوس ناک انداز میں گردن ہلا کر رہ گیا۔

''کارشیا جسمانی طور پر مجھے چھوڑ کر جا چکی ہے لیکن میں نے اس کے بدن کی مسحور کن خوشبو کو اپنی سانسوں میں بسا رکھا ہے۔ اس کے ساتھ بتائے ہوئے شب و روز کی ریشمیں یادیں میرے دل و دماغ میں جاگزیں ہیں۔ یہ کارشیا کی محبت کا اعجاز ہے کہ میں نے ستر کا ہندسہ عبور کر لیا ہے مگر کسی عورت سے شادی نہیں کی۔''

''اور تمہارے وہ بچے...؟'' لیدر جیکٹ والے نے شپٹائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''تھوڑی دیر پہلے تم نے

بیان حلفی

جو احتیاط کے ساتھ
...اس حالت کو نہایت ہی ... کرنے کے لیے۔
جہازی اور فرصت کی اس ... اپنے کام
کرتا تھا اور وہ بھی اپنے کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا اپنے کام
میں ... کی میں ... خوش اور رحمتی
میں مصروف ... طوفان ... خدا کی پتہ ... ساحل
طوفان میں نے اس سے پہلے بھی نہیں دیکھے حالانکہ ساحل
... سے ہمارا
سمندر پر ... ہونے کے باعث ... طوفان ... محفوظ ... بنانے کی
... لیے ہمیں اس گھر کو "طوفان محفوظ" بنانے کی
... کوشش کامیاب بھی رہی تھی۔ مل
کوشش کی تھی اور ہر ... سمندری خطرے سے
ہر صورت گھر ... خوب صورت ...
آج ... رات مجھے کافی بھاری اور جان لیوا
... محفوظ تھا مگر آج کی رات ... گھر میں اکیلا تھا
محسوس ہو رہی تھی۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ میں ... بھی تھی۔ مجھے ہر
... ایک بھاری ذمے داری ...
اور ہر ... کہ اس بوجھ کا نادر ... تھا
صورت آج رات اپنے دل و دماغ کے اس ... ہوا تھا۔
اور میں ... سوچ میں ... آئی۔
یا یک ... میری سوچ میں ... آئی۔
یا یک بیٹ میری زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی تھی۔ بہت ہی
بیٹ میری زندگی ... کرنے والی۔ اس نے ٹوٹ
بھولی بھالی ... اور ... محبت کرنے والی۔ اس نے ٹوٹ
کر مجھے چاہا تھا لیکن ہمارا ساتھ ... ثابت نہ ہو سکا۔ اس
... کی یاد دلا دی تھی۔ اس
طوفان نے مجھے ایک ... طوفانی رات کی یاد دلا دی تھی۔ اس
... ہم ... کے چٹانی ساحل پر
... کہ وہ ساحلی ... اور ... ہی
... سے ... کے ... سے ... ہموار
... تھا کہ وہاں ... ہوئے سمندر کا
کرکے اس قابل بنایا گیا تھا کہ وہاں ... ہوئے سمندر کا
... کیا جا سکے۔
میں اور بیٹ ... میں ... خوش گوار موڈ میں اس
... ہوئے پیار بھری باتیں کر رہے تھے اور
... کی بالکل پروا نہیں کی۔ وہ رات کا وقت
... سمندر بھی ... اس کی ... ساحل
... کی گھلاوٹ پر ... کر ... آواز پیدا کر رہی تھیں۔ اس پر
... شور ... پر ہیبت طاری کر رہا تھا
مگر ہم پیار کے ... اپنے سمندری طوفانوں کو خاطر میں
لانے والے نہیں تھے۔ اس وقت ہمارے ... جذبات کا ...
... عروج پر تھا۔ اس ... اور شدت کے سامنے وہ
طوفان ... ایک ... کا حال نہیں تھا۔
اس ... چٹانی ... پر موجود خشک ... ریت تیز ہواؤں کے
... سے ... ہمارے قدموں
... کی گھری میں ایک دوسرے کا
... کنارے پر ... چل رہے تھے

کہ بیٹ کے وجود میں لڑکھڑاہٹ پیدا ہوئی۔ شاید اس کا پاؤں
کسی آڑی ترچھی جگہ پر پڑ گیا تھا۔
میں نے بیٹ کو سنبھالنے کی کوشش کی لیکن وہ ایسے بے
ڈھبے انداز میں لڑکھڑائی تھی کہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکی۔ اسی
دوران میں اس کا ہاتھ میرے ہاتھ سے نکل گیا اور وہ ... چٹان
کی بلندی سے نیچے گر گئی تھی۔
آہ! اس منحوس طوفانی رات میں بیٹ کے لیے کچھ نہیں
کر سکا تھا، سوائے اس کی دل خراش چیخ سننے کے ... وہ
دردناک چیخ جو بیٹ کا جسم نکیلی چٹانوں سے ٹکرانے کے باعث
اس کے حلق سے خارج ہوئی تھی۔ زندگی کے آخری لمحات میں
اس وفا کی پتلی کی زبان پر میرا ہی نام تھا۔ اس نے بڑی بے بسی
سے مجھے پکارا تھا۔
"ٹونی بی بی...."
یہ منحوس طوفانی رات بھی کم کم اذیت ناک نہیں ہے بلکہ
یہ اس رات سے کچھ زیادہ ہی بھیانک ہے جب بیٹ ایک
حادثے کا شکار ہو کر مجھ سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئی تھی۔ اس
قاتل رات کی سفاک یادیں مجھے ہر پل بے چین رکھتی ہیں۔
معاف کیجیے گا... اس وقت میرا دماغ قابو میں نہیں ہے اسی
لیے میں کبھی ماضی کا صیغہ استعمال کرتا ہوں اور کبھی حال میں
لوٹ آتا ہوں۔ آپ میری ذہنی کیفیت کو سمجھ سکتے ہیں۔ جس
نے اپنے کسی وفادار اور جاں نثار کو کھویا ہو، اس کی ایسی ہی
حالت ہو جاتی ہے، بالکل میرے جیسے ... ماضی، حال اور
مستقبل کی فکر سے بے نیاز....
یہ بھی اچھا ہی ہے کہ میں اس وقت گھر میں اکیلا ہوں۔
اگر موزا یہاں موجود ہوتی تو بھلا وہ مجھے اتنا اہم کام کرنے
دیتی، ہرگز نہیں۔ وہ تو الٹے سیدھے سوال کر کے میرا دماغ ہی
خراب کر ڈالتی۔ اس کا مزاج حاکمانہ اور فطرت غاصبانہ ہے۔
وہ جس چیز کی ضد پکڑ لے، اسے کر کے ہی چھوڑتی ہے اور توقع
کرتی ہے کہ سامنے والا اس کی بات مان لے۔ میں اس کے
چھوٹے بڑے احکامات کی تعمیل کرتے کرتے خود کو کاٹھ کا الو
اور سرکس کا بندر سمجھنے لگا ہوں۔ وہ اگر بہت امیر باپ کی بیٹی ہے
تو اس کا یہ مطلب تھوڑی ہے کہ میں اس کا زرخرید غلام ہوں جو
وہ مجھے اپنی انگلیوں پر نچاتی رہے گی۔ میں اس کا شوہر ہوں اور
یہ حقیقت موزا کو بہت پہلے سمجھ لینا چاہیے تھی۔
او مائی گاڈ ... یہ طوفان تو میری جان ہی لے لے گا۔
میں اس گھر کے اندر بالکل محفوظ بیٹھا ہوں مگر سرپھری ہوا کی
جنونی آوازیں کہیں نہ کہیں سے راستہ بنا کر میری اسٹڈی تک
پہنچ رہی ہیں اور میری سماعت میں گھس کر مجھے یہ احساس کرا

کرنے سے روکنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ یہ ماتمی اور دردناک
... کی بازگشت محسوس ہو رہا ہے
لیکن میں ہمت ہارنے والوں میں سے نہیں ہوں اور اسی
صورت میں جب میں نے زندگی میں پہلی بار ہمت سے کام
لینے کا فیصلہ کیا ہو ... میں جو کچھ ٹائپ کر رہا ہوں وہی بیان بھی
کر رہا ہوں بلکہ میں اپنے کمپیوٹر کے اسکرین کو دیکھ کر یہ سب
بتا رہا ہوں اور ایسا کرنے کے لیے اخلاقی جرأت کی ضرورت
ہوتی ہے۔
میں نے ناہنجار طوفانی ہواؤں کے شور کو کم کرنے کے
لیے اپنے کانوں پر ہیڈ فون چڑھا لیا ہے اور دماغ کو لائن پر
رکھنے کی خاطر وہسکی کا تازہ پیگ بھی بنا لیا ہے۔ یہ میرا چوتھا پیگ
ہے۔ میں نہیں جانتا، یہ سلسلہ کہاں جا کر تھمے گا۔ مجھے ہر قیمت
پر آج ہی یہ اسائنمنٹ مکمل کرنا ہے اسی لیے میری انگلیاں
کمپیوٹر کے کی بورڈ پر برق رفتاری سے مصروف عمل ہیں اور
مزے کی بات یہ کہ جب میرا کام ختم ہو جائے گا تو میں ایک
ڈلیٹ مار کر سب کچھ اڑا دوں گا۔ یہ ساری "بک بک" صرف
میرے لیے ہے۔ دنیا والوں کا اس سے کیا لینا دینا؟
☆☆☆
میں یہ نہیں کہتا کہ دولت سب کچھ ہے۔ اس کی مدد سے
ہر مسئلہ حل کیا جا سکتا ہے لیکن اس کلی حقیقت سے انکار ممکن نہیں
کہ انسان کے پاس دولت ضرور ہونا چاہیے۔ دراصل زندگی کے
بہت سے مسائل کا حل ہے۔ آپ میری اس سوچ کو چاہے جو
بھی سمجھیں، مجھے اس کی قطعا پروا نہیں ہے کیونکہ میں نے سچ
بولنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور سچ وہی ہے جو میں اپنے کمپیوٹر پر
ٹائپ کر رہا ہوں۔ میرے خیال میں میری ناقدری پر ستانہ سوچ
کے پیچھے میرے ماضی کا ہاتھ ہے...... وہ ماضی جو عسرت اور
محرومی میں گزرا تھا۔
سینٹ جونز کے ایک غریب گھرانے میں، میں نے آنکھ
کھولی۔ میرا بچپن بھی دوسرے بچوں کی طرح کھیلوں میں گزرا تھا
اور ہمارے کھیل بھی ہماری حیثیت کے مطابق ہی ہوا کرتے
تھے جن میں لڑائی جھگڑا اور مار پیٹ ایک لازمی عنصر کے مانند
شامل تھا۔ ہاں البتہ، دوسرے بچوں کی بہ نسبت مجھے دو
معاملات میں بڑی آسانی اور فراوانی حاصل تھی۔ نمبر ایک،
میری صحت عمدہ اور جسمانی ساخت کسی ریسلر کی طرح مضبوط
اور متاثر کن تھی۔ نمبر دو، میں پڑھنے میں بہت اچھا تھا۔
دوسرے بچوں کا دل کھیل کود میں زیادہ لگتا تھا اور میرا رجحان
لکھنے پڑھنے کی جانب تھا۔ ایسا نہیں ہے کہ میں کھیل کے میدان
میں ایک دم پھسڈی تھا۔ میں اپنی شان دار صحت اور قد و قامت کی
بدولت سب کو ٹف ٹائم دیا کرتا تھا اور مجھے ہمیشہ ان پر سبقت
حاصل رہی تھی لیکن میں گھر آ کر کتابوں کے ساتھ مصروف ہو
جاتا تھا اور رات گئے تک ان میں سے کچھ نہ کچھ کھوجنے کی تگ و
دو میں لگا رہتا تھا۔
مطالعے کے اسی ذوق و شوق نے مجھے دوسرے بچوں
سے ممتاز کر دیا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ مجھے قیمتی لباس پہننا بھی
نصیب نہیں ہوئے تھے۔ میرے پاس کار بھی ایک دم ٹیچری
تھی اور دوسری نعمتوں کا بھی کچھ ایسا ہی معاملہ رہا تھا حتیٰ کہ تعلیم
کے میدان میں بھی سب سے پچھلے ہوئے اسکول اور کالج
میرے حصے میں آئے تھے اور ان معمولی حیثیت کے تعلیمی
اداروں کو افورڈ کرنے کے لیے بھی مجھے اپنے ہاتھوں ہی سے
کمانا پڑتا تھا۔ اچھی صحت اور مناسب قد کاٹھ کا سب سے بڑا
فائدہ یہ تھا کہ محنت مزدوری کا کام بہت آسانی سے مل جاتا تھا۔
میں کماتا رہا اور میری تعلیم کا سفر جاری رہا۔
میں میتھ میں اچھا تھا اور سائنس کے مضامین میں بھی
میرا دل خوب لگتا خصوصاً فزکس میں مجھے خاص مہارت حاصل
تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کئی سال کی پڑھائی کے بعد میں بالآخر
مکینیکل انجینئر بننے میں کامیاب ہو گیا۔
انجینئرنگ کی ڈگری ہاتھ میں آئی تو میں یہی سمجھا کہ میں
نے دنیا کو فتح کر لیا ہے بلکہ میں نے چاند اور مریخ پر بھی اپنی
کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیے ہیں لیکن یہ میری بھول تھی۔
زندگی قدم قدم پر انسان کا امتحان لیتی ہے، چاہے انسان کے
ہاتھ میں میڈیسن، انجینئرنگ یا کسی اور شعبے کی ڈگری ہی کیوں
نہ ہو۔
مکینیکل انجینئرنگ کی ڈگری کے ساتھ نہایت ہی
معمولی تنخواہ پر جاب ایک کمپنی میں ملی تھی۔ میں پوری دلجمعی سے
سر جھکا کر ان تھک محنت کرتا رہا۔ کم تنخواہ کی اس کڑی جاں فشانی
کے نتیجے میں پہلے دو سال میں، میں کارپوریٹ کے زینے پر
قدم رکھنے میں کامیاب ہو گیا۔ میری ترقی کی رفتار اگرچہ
کچھوے سے بھی زیادہ گئی گزری تھی لیکن میں کچھوے ہی کی
طرح رک کر سانس لینے کے بجائے اپنی مخصوص رفتار سے
مسلسل آگے بڑھتا چلا گیا اور آئندہ تین سال میں مینیجر لیول کے
لیول تک پہنچ گیا۔ میں قدرے مطمئن تو تھا مگر اسے خوش ہونا
نہیں کہہ سکتے تھے۔ اگر میری ترقی کی یہی رفتار برقرار رہتی اور
قسمت بھی میرا ساتھ دیتی تو میں چالیس سال کی عمر میں
ڈپٹی جنرل مینیجر بن سکتا تھا۔ پچاس سال کی عمر میں اسسٹنٹ منیجر
آف مونٹگمری پولیمر۔
لگی بات تو یہ ہے کہ اسسٹنٹ منیجر کے عہدے تک پہنچ

"میری پرینٹ کا حق تمہاری ذمہ داری سے ... ہم حقیقت بیان کر رہے ... [illegible]

... [illegible] ... حقیقت سے تمہاری کیا مراد ہے؟" میں نے

[illegible]

"میں نے جو کہا تھا ... تمہارے سامنے بیان ... جواب ... [illegible]

[illegible]

"... میں اس حالت میں پہلے سے 'کہانی' کا ... [illegible]

... [illegible] ... تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" ضمیر نے

سرزنش کرنے والے انداز میں کہا۔ "ڈیلیٹ والی 'کی' سے بچ نکلی ہے نا۔"

"میں نے شروع ہی میں کہہ دیا تھا کہ اسائنمنٹ مکمل کرنے کے بعد میں اسے ڈیلیٹ کر دوں گا۔" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"تم ایسا نہیں کرو گے۔"

"کیوں نہیں کروں گا؟" میں بھی ضد پر اتر آیا۔ "میں نے تمہارا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے سب لکھ دیا ہے۔ اب تمہیں کیا پرابلم ہے؟"

"میرا بوجھ ہلکا ضرور ہوا ہے مگر پوری طرح اترا نہیں۔"

"اب تم مجھ سے اور کیا چاہتے ہو؟" میں نے بگڑ کر پوچھا۔

"میں چاہتا ہوں تمہاری یہ آپ بیتی منظر عام پر آئے۔" وہ عجیب سے انداز میں بولا۔ "اگر تمہاری خواہش ہے کہ میں تمہیں دل سے معاف کر دوں تو تمہیں یہ کرنا ہوگا۔"

"اس سے تمہیں کیا فائدہ پہنچے گا؟"

"میں اپنی نہیں، اس دنیا کے فائدے کی بات کر رہا ہوں۔"

"میں سمجھا نہیں۔" ضمیر کی یہ بات واقعی میرے پلے نہیں پڑی تھی۔ "جو بھی کہنا ہے صاف الفاظ میں کہو۔"

"اگر تمہارے اس 'بیان حقی' کو پڑھ کر کوئی ایک شخص بھی راہِ راست پر آ گیا تو اس دنیا کی بدصورتی میں تھوڑی سی کمی ضرور واقع ہو جائے گی۔" اس نے گمبھیر انداز میں کہا۔ "ہر انسان کا ضمیر اس کرۂ ارض کو خوب صورت دیکھنا چاہتا ہے۔"

میں اپنے ضمیر کی دلیل کے سامنے لاجواب ہو گیا ہوں لہٰذا مجھے اس کی یہ خواہش بھی پوری کرنا ہوگی۔ سو میرا اسائنمنٹ مکمل ہو گیا۔

میں
لوئی والٹر...
پیشہ ور قاتل...
سائن آف کرنے کے بعد خود کو شوٹ کرنے والا ہوں...

اس کے بعد میری انگلیوں نے کی بورڈ پر حرکت کرتے ہوئے دو اہم کمانڈ زدیں۔

سیو!

پرنٹ!

کمپیوٹر میرے احکامات کی تعمیل میں مصروف ہو گیا۔

◆◆◆

لنگے باری نبھاتے ہوئے بعض لوگ اپنے اردگرد کے ماحول کو یکسر فراموش کر دیتے ہیں... اور کچھ افراد کی طبیعت میں چستی اور متحرک مزاجی کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے... وہ معمول سے ہٹ کر کسی بھی ردوبدل کو فوراً بھانپ لیتے ہیں... ایک ایسے متجسس... جرأت مند نوجوان کی کارگزاری جو اپنے تئیں ذمہ داری نبھاتے ہوئے دوسروں کی لنگے باری بھی اپنے کندھوں پر اٹھا لیتا تھا... تیز رفتاری سے رونما ہونے والے واقعات کی سنسنی خیز روداد...

مجرم کے تعاقب میں دوڑتے بھاگتے نوجوان کی کارگزاری کا انجام.....

کارگزار

سیریناراض

بے روزگاری کے عذاب نے اچھے اچھوں کا حال بے حال کر رکھا تھا۔ تعلیم یافتہ نوجوان بالخصوص اس عفریت کی جکڑ میں تھے۔ انہیں اپنا حال ابتر اور مستقبل تاریک نظر آ رہا تھا۔ اگر اقبال کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس کے "شاہین" کس ذہنی اذیت سے گزر رہے ہیں تو شاید...

اس شاید کاش لیکن اور اگر مگر کے بعد ہی غافر نے وہ قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اگرچہ یہ اپنی انا، خودداری اور مقام کو پاؤں تلے روندا لنے کے مترادف تھا لیکن انسان کو اپنی بقا کی خاطر ایسے فیصلے لینے ہی پڑتے ہیں۔ وہ بھی سب کچھ بھول بھال کر پی ڈی بی (پزا ڈیلیوری بوائے) بن گیا تھا۔

غافر نے ڈبل ماسٹرز کر رکھا تھا۔ سائیکالوجی اور کرمنالوجی اس کے فیورٹ مضمون رہے تھے مگر پچھلے دو سال سے وہ متعلقہ ڈپارٹمنٹس میں جاب کے لیے جو کوشش کر رہا تھا اس کا نتیجہ صفر سے آگے بڑھ کر نہیں دے رہا تھا۔ سو پے در پے ناکامی کے بعد بالآخر اس نے یہ کڑوا گھونٹ حلق سے نیچے اتار لیا تھا جس نے اس کے تن بدن میں یہاں سے وہاں تک تلخی بھر دی تھی۔

اس نے اپنی بائیک کو اپارٹمنٹ بلڈنگ کے سامنے دیوار کے ساتھ پارک کیا اور ہاٹ پاٹ (ڈیلیوری باکس) میں سے ایک رگولر پزا نکال کر... بلڈنگ کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

اس کی منزل سیکنڈ فلور پر واقع میڈم فرزانہ کا اپارٹمنٹ تھا۔ وہ پہلے بھی کئی بار یہاں پیزا ڈیلیور کرنے آچکا تھا۔ میڈم فرزانہ اس کے لیے پرائم کسٹمر کی حیثیت رکھتی تھی۔ کافر اسے پسند کرنے لگا تھا۔ اس پسندیدگی میں عزت احترام کے جذبے غالب تھے۔ وہ ایک خوش مزاج اور مہربان خاتون تھیں اور دریا دل بھی کیونکہ وہ ٹپ دینے کے معاملے میں ہمیشہ سے مشہور سردار حاتم کو مات دینے کی کوشش میں رہتی تھیں۔

اس اپارٹمنٹ بلڈنگ میں کل چھ فلیٹس تھے، ہر فلور پر آمنے سامنے دو فلیٹ یعنی گراؤنڈ پلس ٹو فلورز۔ کافر نے میڈم فرزانہ کے فلیٹ کے سامنے پہنچ کر اطلاعی گھنٹی بجادی۔ اپارٹمنٹ کے اندر ہلکی موسیقی سنائی دی۔ کافر، میڈم فرزانہ کے نمودار ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

دو منٹ گزر گئے مگر دروازہ کھلا اور نہ ہی وہاں میڈم کا مسکراتا ہوا چہرہ جسے وہ دیکھنے کا عادی ہو چکا تھا۔ اس نے ایک بار پھر اطلاعی گھنٹی کا بٹن دبایا اور سوچنے لگا۔

"ممکن ہے کہ میڈم اس وقت واش روم میں ہوں۔ ورنہ دروازہ کھولنے میں اتنی دیر نہیں لگاتیں۔"

اس کے بیگ میں دو اور بھی "آرڈرز" رکھے ہوئے تھے جو اس نے پانچ کلومیٹرز کے اندر ہی ڈیلیور کرنے تھے۔ دوسری مرتبہ بھی گھنٹی کی صدا نے میڈم فرزانہ کو کافر کی آمد کی اطلاع تو دے دی تھی مگر کافر کا انتظار رنگ نہیں لا رہا تھا۔

"وہ اتنی دیر کیوں لگا رہی ہے۔" اس نے خود کلامی کی اور اپارٹمنٹ کے داخلی دروازے سے کان لگا کر اندر کی صورت حال دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔

اپارٹمنٹ کے اندر مہیب سناٹے کا راج تھا۔ واش روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ نہ کچن کے اندر کسی قسم کی ہلچل سنائی دے رہی تھی، نہ ہونے کی کوئی اور نقل و حرکت۔ اس پُراسرار خاموشی نے کافر کے ذہن میں فطری تجسس کو اجاگر کردیا اور یہ مادہ تو اس کے اندر حد سے زیادہ موجود تھا اسی لیے اس نے سائیکالوجی کے علاوہ کرمنالوجی میں بھی ماسٹرز کر رکھا تھا۔

اس نے میڈم فرزانہ کا سیل نمبر ملایا۔ نمبر سوئچڈ آف آرہا تھا۔ کئی بار کی کوشش کے باوجود بھی جب ریکارڈنگ ہی سے اس کا واسطہ پڑا تو اس کے ذہن میں ایک آئیڈیا چمکا۔ اپنی اس سوچ کو عملی جامہ پہنانے سے پہلے اس نے سامنے والے اپارٹمنٹ کی طرف دیکھا۔ مذکورہ اپارٹمنٹ کے دروازے پر تالا جھول رہا تھا۔ یہ دیکھ کر اسے خاصا اطمینان محسوس ہوا۔ وہ پلٹا اور اس نے اپنی ایک آنکھ آئی گلاس پر لگادی۔

اکثر اپارٹمنٹس کے داخلی دروازے کے وسط میں ایک آئی گلاس نصب ہوتا ہے جس کے توسط سے اندر موجود شخص جھانک کر دیکھ سکتا ہے کہ باہر کون موجود ہے۔ یہ گلاس صرف ایک طرف ہی کا منظر دکھاتا ہے۔ دوسری جانب سے دیکھنے والے کو اس میں اپنا ہی چہرہ نظر آتا ہے اور وہ بھی خاصا مضحکہ خیز......

کافر نے اضطراری انداز میں اس آئی گلاس پر آنکھ تو دی تھی مگر جلد ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی میڈم فرزانہ کے لیے اس کی فکرمندی میں کئی گنا اضافہ ہوگیا۔ اب اس کے پاس ایک آخری طریقہ ہی بچا تھا... دروازے پر دستک دینے کا دیسی طریقہ!

کافر کی جگہ اگر کوئی اور ڈیلیوری بوائے ہوتا تو موجودہ صورت حال میں وہ اپنی برانچ کو یہ بتا کر واپس چلا جاتا کہ کسٹمر کا فون آف ہے اور وہ اپنے گھر میں بھی موجود نہیں مگر میڈم فرزانہ، کافر کے لیے کوئی عام کسٹمر نہیں تھی لہٰذا اس کا ردِعمل دوسرے ڈیلیوری بوائز جیسا نہیں ہوسکتا تھا۔

دو تین بار کی دستک کا بھی جب کوئی جواب نہ آیا تو وہ میڈم کی جانب سے گہری تشویش میں مبتلا ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی ڈیٹیکٹو والی فطری صلاحیت بھی انگڑائی لے کر بیدار ہوگئی تھی۔ وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ میڈم کے ساتھ آخر ایسا کون سا معاملہ ہوگیا ہے کہ وہ اپنا آرڈر ریسیو کرنے کے لیے دروازے پر نہیں آرہی......؟

قبل اس کے کہ وہ میڈم کی خبرگیری کے لیے کوئی اور راستہ اختیار کرتا، اس کے ذہن میں ایک خاصا جاندار اور معقول خیال ابھرا۔

"میرے پاس دو اور آرڈرز بھی ہیں جو میں نے اسی علاقے میں ڈیلیور کرنا ہیں۔" اس نے سوچا۔ "میں پہلے ان آرڈرز کو نمٹا آتا ہوں۔ پھر واپس آکر میڈم کو چیک کروں گا۔"

وہ بلڈنگ کے زینے طے کرکے نیچے اترا اور اپنی بائیک پر بیٹھ کر کام سے لگ گیا تاہم اس کا ذہن مسلسل میڈم کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

"یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ میڈم کو اچانک کسی ضروری کام کے لیے بلڈنگ سے باہر جانا پڑ گیا ہو اس لیے وہ اپنے آرڈر کو بھول کر ایمرجنسی میں کہیں نکل گئی ہو۔"

ایک دوسرے خیال نے اس خیال کی تردید کردی۔

"کام کتنا بھی ضروری کیوں نہ ہو، ان کا نمبر تو سوئچڈ آف نہیں آنا چاہیے نا۔"

"کہیں وہ کسی مشکل میں تو نہیں پھنس گئیں؟" یہ خیال پہلے دونوں خیالات سے زیادہ فکرانگیز اور تشویشناک تھا۔

آئندہ بیس پچیس منٹ میں اس نے دونوں آرڈرز کو ان کی منزل تک پہنچایا اور پلٹ کر پھر اسی اپارٹمنٹ بلڈنگ میں پہنچ گیا جہاں میڈم رہائش پذیر تھیں۔

کافر اپنی اس پرائم کسٹمر کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں رکھتا تھا۔ تاہم اس سے ہلکی پھلکی بات ہوجاتی تھی۔ بس، وہ اتنا ہی جانتا تھا کہ اس اپارٹمنٹ میں میڈم فرزانہ اپنے شوہر نجیب اللہ کے ساتھ رہتی تھیں۔ نجیب اللہ ایک جیلر تھا۔ ان کا صرف ایک ہی بیٹا تھا جو کمپیوٹر سائنس میں ماسٹرز کرنے امریکا گیا ہوا تھا۔ اس کا نام نبیل تھا۔ نبیل امریکی ریاست "اوہائیو" کی کولمبس یونیورسٹی میں پڑھتا تھا۔ جب فرزانہ کو یہ پتا چلا تھا کہ کافر نے ڈبل ماسٹرز کر رکھا ہے تو اس نے کہا تھا۔

"بیٹا! ہمارے ملک کا تو اللہ ہی حافظ ہے۔ یہاں چاہے کتنی بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کرلو، کوئی قدر کرنے والا نہیں ہے۔ اچھی جابز صرف رشوت اور سفارش ہی سے ملتی ہیں، چاہے آپ اس جاب کے اہل ہوں یا نہ ہوں۔ پڑھے لکھے ذہین اور قابل انسان تو کلرکی کرتے پھر رہے ہیں۔ اسی لیے ہم نے نبیل کو یہاں سے سافٹ ویئر انجینئر بنایا اور ماسٹر ڈگری کے لیے امریکا بھیج دیا ہے... آپ باہر کے کسی ملک سے ایک آدھ ڈگری لے کر آجائیں تو یہاں آپ کی قدر و قیمت میں کئی گنا اضافہ ہوجاتا ہے۔"

"میڈم! یہ بات مجھ سے زیادہ اور کون سمجھ سکتا ہے۔" کافر نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ "دو لیڈنگ سبجیکٹ میں ماسٹرز کرنے کے باوجود بھی پیزا ڈیلیوری بوائے کی جاب کرنے پر مجبور ہوں۔"

"نبیل بتاتا رہتا ہے کہ امریکا میں کون کون سے سبجیکٹ کی بہت زیادہ ویلیو ہے۔" فرزانہ نے مشورہ دینے والے انداز میں کہا۔ "سائیکالوجی اور کرمنالوجی بھی انہی سبجیکٹ میں شامل ہیں۔ میں تو کہتی ہوں کہ آپ بھی کوشش کرکے باہر نکل جاؤ۔"

"آپ بالکل ٹھیک کہتی ہیں میڈم......" کافر نے اپنی اندرونی کیفیت پر قابو رکھتے ہوئے کہا۔ "میں آپ کے مشورے پر عمل کرنے کی کوشش کروں گا۔"

مشورہ دینا دنیا کا سب سے آسان کام ہے۔ شاید اسی لیے مشورہ دینے والوں کی کبھی کمی نہیں رہی مگر کسی بھی مشورے کو عملی جامہ پہنانے کے اپنے کچھ تقاضے ہوتے ہیں جنھیں پورا کیے بغیر کوئی نتیجہ برآمد نہیں کیا جاسکتا۔ میڈم نے اسے جو زریں مشورہ دیا تھا اس کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے لاکھوں نہیں، کروڑوں کی ضرورت تھی۔ اگر اس کے پاس اتنی رقم ہوتی تو وہ اپنے ملک ہی میں رہ کر بہت کچھ کرسکتا تھا۔

کافر میڈم کے بارے میں سوچتے ہوئے، ریگولر پزا اٹھائے زینے چڑھ رہا تھا کہ ٹھٹک کر رک گیا۔ اس وقت وہ فرسٹ فلور کے زینے پر تھا کہ اس نے سیکنڈ فلور سے ایک شخص کو نیچے کی طرف آتے دیکھا۔ مذکورہ شخص نے ایک سفری بیگ بھی اٹھا رکھا تھا۔ وہ کرخت چہرے والا ایک دراز قامت شخص تھا اور اس نے سر پر پی کیپ پہن رکھی تھی۔

کافر کے جاسوس ذہن میں خطرے کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس شخص پر نگاہ پڑتے ہی کافر کے ذہن میں پہلا خیال یہی پیدا ہوا کہ تھرڈ فلور پر کوئی گڑبڑ ہے۔ وہ بندہ نپے تلے قدم اٹھاتے ہوئے نیچے اتر رہا تھا۔ کافر فرسٹ فلور کے

بینکار

فرلبے کو بینک میں نوکری ملی تو خوشی سے پھولے نہ سمائے۔ عمدہ کپڑا خرید کر شہر کے ایک مشہور ٹیلر کو بہترین سوٹ سینے کا آرڈر دیا۔ چند روز بعد ٹیلر نے کچے سوٹ کی ٹرائل کے لیے بلایا۔ فرلبے تراش خراش سے بہت متاثر ہوئے لیکن ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تو جیبیں ندارد۔

انہوں نے خفگی کا اظہار کیا تو ٹیلر نے رسانیت سے کہا۔

"سر! آپ ہی نے تو کہا تھا کہ آپ بینک افسر ہیں۔"

"ہاں... کہا تھا۔" انہوں نے غصے سے اپنا سر ہلایا۔ "اس سے مطلب کیا ہے تمہارا؟"

"سر! آپ کو جیبوں کی کیا ضرورت ہے... بینکاروں کے ہاتھ تو ہمیشہ دوسروں کی جیب میں رہتے ہیں۔"

(کراچی سے بلال حلیم کی سوغات)

مینشن کے دروازوں کو ایسی نظر سے دیکھنے لگا جیسے وہ کوئی ایڈریس تلاش کر رہا ہو۔ دراصل وہ پی کیپ والے شخص کو یہ تاثر دے رہا تھا کہ اس نے اسے دیکھا ہے اور نہ ہی اس کے بارے میں سوچ رہا ہے تاہم اس کا دھیان اسی مشکوک شخص پر لگا ہوا تھا۔

مذکورہ شخص ظافر کے پاس سے گزرتے ہوئے اسے گھورا مگر زبان سے ایک لفظ ادا نہیں کیا اور سیڑھیاں طے کرتے ہوئے نیچے کی طرف جانے لگا۔ وہ گیا اور ظافر پہلی فرصت فلور کو چھوڑ کر اوپر کی طرف جانے لگا، ظافر سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے تھرڈ فلور پر پہنچ گیا۔ اس فلور کے کوریڈور میں مکمل خاموشی تھی۔ میڈم فرزانہ کے سامنے والے اپارٹمنٹ کے دروازے کے قریب بدستور تالا موجود تھا۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہ شخص اس اپارٹمنٹ سے تو نہیں نکلا ہوگا۔

"تو کیا وہ بندہ میڈم کے اپارٹمنٹ سے نکل کر گیا ہے؟" اس خطرناک سوال نے ظافر کے ذہن میں متعدد خدشات کو جنم دیا۔

"کیا میڈم اپنے شوہر سے بے وفائی کا ارتکاب کر رہی ہے؟"

"کیا پی کیپ والا یہ شخص میڈم کا کوئی دوست ہے جو شوہر کی غیر موجودگی میں اس کے ساتھ وقت گزارنے آتا ہے؟"

"میں سمجھ گیا۔ میڈم اسی شخص کے ساتھ مصروف تھی اسی لیے وہ بیل سن کر دروازے تک نہیں آئی۔"

یہ تمام تر خیالات چند سیکنڈ کے دورانیے میں اس کے ذہن سے گزرے اور اگلے ہی لمحے اس نے اپارٹمنٹ کی اطلاعی بیل پر انگلی رکھ دی۔ پہلے کی طرح اندر گھنٹی کی سریلی آواز سنائی دی مگر نتیجہ پہلے سے قطعی مختلف نہیں تھا۔ وہ جس حد تک میڈم فرزانہ کو جانتا تھا اس کی روشنی میں وہ اس عورت کے کردار پر شک نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا کہ میڈم کسی مصیبت میں تھی اور اس مصیبت کا سبب وہی پی کیپ والا دراز قامت شخص تھا۔

ظافر اپارٹمنٹ کا دروازہ توڑ کر اندر داخل نہیں ہو سکتا تھا البتہ ایک مرتبہ پھر وہ میڈم کا سیل نمبر ٹرائی کرنے لگا۔ مذکورہ نمبر مسلسل سوئچ آف آرہا تھا۔ اس نے ایک فوری خیال کے تحت نیچے کی راہ لی۔ ان لمحات میں اس کا ذہن تشویش ناک خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

وہ بلڈنگ سے باہر آیا تو اس نے اپنی بائیک کو الٹا ہوا دیکھا۔ وہ شام سے پہلے کا وقت تھا قریب ہی چند بچے ٹینس بال سے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ اس نے ان بچوں کی طرف دیکھتے ہوئے فیصلے انداز میں استفسار کیا۔

"میری بائیک کو کس نے گرایا ہے؟"

"ہم میں سے کسی نے نہیں۔" ایک بچے نے بتایا۔

دوسرا بولا۔ "ٹوپی والے لمبو نے لات مار کر گرایا ہے اس بائیک کو۔"

"تم اس پی کیپ والے بندے کی بات کر رہے ہو۔" ظافر نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔ "جس کے ہاتھ میں ایک بیگ بھی تھا؟"

"ہاں، ہاں...... وہی۔" ایک بچے نے ٹھوس انداز میں بتایا۔ "اس نے تمہاری بائیک کو لات مار کر نیچے گرایا پھر اپنی گاڑی میں بیٹھ کر یہاں سے روانہ ہو گیا۔"

اس دوران میں ظافر اپنی بائیک کو زمین سے اٹھا کر اس پر سوار ہو چکا تھا۔ اس نے پوچھا۔ "وہ منحوس کس طرف گیا ہے؟"

مذکورہ بچے نے ایک جانب اشارہ کر دیا۔

"اس کے پاس کون سی گاڑی ہے؟" ظافر نے بائیک اسٹارٹ کرنے کے بعد اضطراری لہجے میں دریافت کیا۔

"گرے ہائی روف۔" بچے نے جواب دیا۔ "گاڑی کی نمبر پلیٹ پر کیچڑ لگی ہوئی تھی۔ نمبر صحیح طور پر پڑھا نہیں جا رہا تھا۔"

ظافر کو یاد آگیا کہ جب وہ اس بلڈنگ میں داخل ہو رہا تھا تو اس نے چند گز کے فاصلے پر ایک گرے ہائی روف کھڑی دیکھی تھی جس کی پچھلی نمبر پلیٹ پر کیچڑ لگی ہوئی تھی۔ وہ جب دوبارہ یہاں آیا تو تب بھی مذکورہ ہائی روف اپنی جگہ پر کھڑی تھی۔

"تو وہ ہائی روف اسی ٹوپی والے کی تھی۔" اس نے عجیب سے انداز میں خود کلامی کی۔

"انکل! اس بندے نے تمہاری بائیک کو دھکا دے کر کیوں گرایا ہے؟" ایک بچے نے حیرت اور الجھن کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ پوچھا۔

"وہ میرا بدتمیز سالا تھے۔" بے ساختہ ظافر کے منہ سے نکلا۔ "وہ اکثر اس قسم کی گھٹیا حرکتیں کرتا رہتا ہے۔ تم لوگ اپنے کھیل پر توجہ دو۔"

بات ختم کرتے ہی ظافر نے اپنی بائیک آگے بڑھا دی۔ بچوں نے اسے گرے ہائی روف کی سمت کے بارے میں بتا دیا تھا۔ وہ بائیک کو آندھی اور طوفان کی رفتار سے بھگاتے ہوئے مذکورہ ہائی روف کے تعاقب میں نکل کھڑا ہوا۔

پانچ منٹ کی ڈرائیو کے بعد ظافر اپنی مطلوبہ گاڑی کو کھوجنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ ایک مین روڈ پر اس سے سو گز آگے دوڑی چلی جا رہی تھی۔ مزید تصدیق کے لیے وہ اپنی بائیک کو گرے ہائی روف کے کافی نزدیک لے گیا تا کہ وہ اس کی عقبی نمبر پلیٹ کا جائزہ لے سکے۔ مذکورہ نمبر پلیٹ پر لگی ہوئی کیچڑ نے صورت حال واضح کر دی، پھر اس نے ہائی روف کی ڈرائیونگ سیٹ پر اس دراز قامت پی کیپ والے کو بھی بیٹھے دیکھ لیا۔

وہ نہایت ہی نازک اور سنسنی خیز لمحات تھے۔ ظافر ایک اجنبی فرد کا تعاقب کر رہا تھا جو مشکوک تو تھا ہی، اس کے خطرناک ہونے میں بھی کسی شک و شبہے کی گنجائش نہیں تھی۔ ظافر کو میڈم کی فکر ہو رہی تھی۔ پتا نہیں، وہ کمینہ اس کے ساتھ کیا کر آیا تھا۔

ظافر کا ضمیر اسے ملامت کرنے لگا۔ "تمہیں اس لفنگے کا پیچھا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ تم اسے جانے دیتے اور کسی طرح میڈم فرزانہ کی خیریت دریافت کرنے کی کوشش کرتے۔"

اندر کی آواز میں وزن تھا۔ اس کی جاسوسانہ سوچ نے درحقیقت گرے ہائی روف کا تعاقب کرنے پر مجبور کیا تھا۔ اس نے کرمنالوجی کے ذیل میں کرمنلز کے بارے میں جو کچھ پڑھ رکھا تھا، یہ سب اس تھیوری کا پریکٹیکل تھا لیکن ذہن کے ایک گوشے میں میڈم فرزانہ کی فکر بھی بہرحال موجود تھی اور اسی فکر نے اسے ساجد سے رابطہ کرنے پر مجبور کر دیا۔

ڈرائیونگ کے دوران میں ظافر اپنے سیل فون کو جیب میں رکھتا تھا البتہ وہ سیل فون سے منسلک ہینڈز فری کے ذریعے اپنا کام چلایا کرتا تھا۔ اس نے گرے ہائی روف کا تعاقب جاری رکھتے ہوئے ساجد کو کال لگائی۔

ساجد کا تعلق محکمۂ پولیس سے تھا اور وہ ظافر کا انتہائی بے تکلف دوست تھا۔ رابطہ ہونے پر ساجد نے سرسری انداز میں کہا۔

"ہاں بھائی ڈیلیوری بوائے! تمہارے پزا کیسے بک رہے ہیں؟"

"ساجد! ایک جاب ہے۔" ظافر نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"سوری یار! میں تمہارے لیے ابھی تک کوئی ڈھنگ کی جاب تلاش......"

"ابے! میری بات دھیان سے سن......" ظافر نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ "میں اپنی نہیں، تمہاری جاب کی بات کر رہا ہوں۔"

"میری جاب تو ٹھیک ٹھاک چل رہی ہے۔" ساجد نے کہا۔

"کیا ساری زندگی اے ایس آئی ہی رہو گے؟" ظافر نے گرے ہائی روف کو برابر اپنی نگاہ میں رکھتے ہوئے ساجد سے کہا۔ "کیا تمہارے دل میں یہ خواہش نہیں ہے کہ اسسٹنٹ سب انسپکٹر سے سب انسپکٹر اور پھر فل انسپکٹر بن جاؤ؟"

"ترقی کی تمنا ہر کسی کو ہوتی ہے۔" ساجد نے معتدل انداز میں کہا۔ "لیکن اس وقت میں تم سے زیادہ بات نہیں کر سکتا۔ میں ایک مشن پر روانہ ہو رہا ہوں۔"

"میں بھی ایک مشن ہی کی بات کر رہا ہوں۔" ظافر نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "سنو گے تو تمہارے ہوش اڑ جائیں گے۔"

"میرے پاس تمہاری سننے اور اپنے ہوش اڑوانے کے لیے بالکل ٹائم نہیں ہے۔" ساجد نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا۔ "بعد میں بات کریں گے۔"

"بعد میں تو بہت دیر ہو جائے گی۔" ظافر نے جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں کہا۔ "تم دو منٹ کے لیے میری بات تو سن لو۔"

"صرف دو منٹ......" ساجد نے سپاٹ انداز میں کہا۔ "جو بھی کہنا ہے، جلدی سے کہہ ڈالو۔ میں ایک ڈکیتی کی واردات کو کور کرنے جا رہا ہوں۔"

ظافر نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں اسے صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ ساجد نے اس کی بات سننے کے بعد معتدل انداز میں کہا۔

"ٹھیک ہے، میں کسی کو میڈم فرزانہ کی طرف بھیجتا ہوں۔ تم ہائی روف والے کا تعاقب جاری رکھو۔ جب وہ اپنی منزل پر پہنچ جائے تو مجھے بتا دینا۔"

"اور تم......؟" ظافر نے شاکی لہجے میں پوچھا۔

"بتایا تو ہے کہ میں ڈکیتی کی ایک واردات کے معاملے کو دیکھنے جا رہا ہوں۔" ساجد نے سرسری انداز میں کہا۔ "میں وہاں سے فارغ ہونے کے بعد تم سے رابطہ کروں گا۔"

قبل اس کے کہ ظافر مزید کوئی سوال کرتا، لائن ڈیڈ ہو گئی۔ ساجد نے اپنی بات کے بعد سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔

"دھت تیرے کی......" ظافر نے برہمی بھری خود کلامی کی۔ "یہ پولیس والے بھی ایک الگ ہی مخلوق

ہوتے ہیں۔ اگر ان کا اپنا کوئی کام ہو تو خوشامد درآمد پر اُتر آتے ہیں اور اگر ان سے کوئی کام پڑ جائے تو ان کے تیور ہی بدل جاتے ہیں۔"

ساجد سے تمام تر گفتگو اس نے ہینڈ فری کے توسط سے کی تھی۔ اس دوران میں ایک لمحے کے لیے بھی اس نے گرے ہائی روف کو اپنی نگاہ سے اوجھل نہیں ہونے دیا تھا۔ اس نے اپنی بائیک اور ہائی روف کے درمیان اتنا فاصلہ رکھا ہوا تھا کہ اسے یقین تھا، پی کیپ والے اس شخص کو تعاقب کا احساس نہیں ہوا ہوگا۔ اس نے کرمنالوجی کی موٹی موٹی کتابوں میں بہت سے سنسنی خیز مناظر کے بارے میں پڑھ رکھا تھا۔ اس وقت وہ اسی نوعیت کے عملی تجربے سے گزر رہا تھا۔

گرے ہائی روف ایک سے دوسری سڑک پر رواں دواں تھی اور اس وقت وہ یونیورسٹی روڈ سے گزر رہی تھی۔ ظافر پوری احتیاط اور مستقل مزاجی کے ساتھ اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ جوہر کے علاقے میں داخل ہونے کے بعد ہائی روف کی رفتار میں قدرے کمی آگئی تھی لہٰذا ظافر اور زیادہ محتاط ہو گیا تھا۔

اب سورج ڈھلنے لگا تھا۔ دھوپ رخصت ہو چکی تھی اور شام کا ملگجا اُجالا، رات کی گہری تاریکی کی سمت اپنا سفر شروع کر چکا تھا۔ اسے اپنی "منزل" تک رسائی حاصل کرنے میں ڈیڑھ سے دو گھنٹے لگ سکتے تھے۔

ظافر کا ٹارگٹ وہ ہائی روف "سنگاپور سینٹر" سے جوہر کے دور افتادہ حصے کی جانب مڑ گئی۔ اس علاقے میں بیشتر بنگلوز کی تعمیر کا کام ابھی جاری تھا۔ بعض بنگلے تیار بھی ہو چکے تھے مگر آباد بنگلوز کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ دو تین گلیاں مڑنے کے بعد گرے ہائی روف ایک ایسے بنگلے کے سامنے جا کر رک گئی جس کی تعمیر کا کام تو مکمل ہو چکا تھا لیکن اس کے اندر اور باہر چھائے ہوئے سناٹے کو دیکھ کر یہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ "مکان" ابھی "گھر" کا اعزاز حاصل نہیں کر سکا۔

ظافر، ہائی روف سے ایک محتاط اور محفوظ فاصلے پر رک گیا تھا۔ اس مقام سے وہ ہائی روف اور مذکورہ نوتعمیر شدہ بنگلے کے گیٹ کو بہ آسانی دیکھ سکتا تھا۔ تاہم پی کیپ والا شخص پلٹ کر اسے نہیں دیکھ سکتا تھا کیونکہ اسے گلی کے نکڑ کی اوٹ میسر تھی۔ ظافر کا خیال تھا کہ پی کیپ والا ہائی روف سے نیچے اتر کر بنگلے کا گیٹ کھولے گا اور پھر وہ اکیلا یا ہائی روف کے ساتھ بنگلے کے اندر داخل ہو جائے گا لیکن ہوا اس کے برعکس۔

پی کیپ والا ہائی روف کے اندر ہی بیٹھا ہوا تھا کہ بنگلے کا گیٹ کھل گیا۔ اگلے ہی لمحے گیٹ کھولنے والا ظافر کی نظر میں آگیا۔ وہ ایک پستہ قد اور گیم قیم شخص تھا۔ اسے دیکھ کر ذہن میں کسی گینڈے کا تصور اُبھرتا تھا۔ شکل سے وہ ایک چھٹا ہوا بدمعاش دکھائی دیتا تھا۔ درندگی اور سفاکی کا چلتا پھرتا اشتہار۔

گیٹ کھلنے پر پی کیپ والا ہائی روف کو بنگلے کے اندر لے گیا۔ پستہ قامت شخص نے محتاط انداز میں، گلی میں دائیں بائیں جھانک کر دیکھا اور مطمئن ہونے کے بعد گیٹ بند کر دیا۔

اس بات کا ظافر کو بہ خوبی اندازہ ہو چکا تھا کہ اس نوتعمیر شدہ بنگلے کے اندر کوئی گھناؤنی سازش بُنی جا رہی ہے۔ پی کیپ والا اور اس کا ساتھی شکل ہی سے جرائم پیشہ نظر آتے تھے۔ اس بات کے روشن امکانات تھے کہ بنگلے کے اندر اسی قماش کے اور لوگ بھی ہو سکتے تھے۔ اس نے اپنے دوست ساجد کو فون لگایا کیونکہ موجودہ سچویشن کو ہینڈل کرنا اس اکیلے کے بس کی بات نہیں تھی۔

دوسری جانب گھنٹی بجتی رہی مگر ساجد نے اس کی کال پک نہیں کی۔ "پتا نہیں، ساجد کن چکروں میں مصروف ہے جو میرا فون اٹینڈ نہیں کر رہا۔" اس نے جھنجلاہٹ بھرے انداز میں خودکلامی کی۔ "ضرورت کے وقت یہ کبھی میرے رابطے میں نہیں آیا۔" پھر ایک فوری خیال کے تحت وہ بڑبڑایا۔ "یہاں زیادہ دیر کھڑے رہنا ٹھیک نہیں ہوگا۔ میں ساجد کو وائس میسج کر دیتا ہوں۔"

اس نے پہلے ساجد کو مذکورہ بنگلے کی پن لوکیشن سینڈ کی پھر یہ وائس نوٹ بھیج دیا۔

"گرے ہائی روف والا وہ مشکوک بندہ، ایک ویران بنگلے میں داخل ہو چکا ہے۔ یہ بنگلا جوہر کے آخری حصے میں واقع ہے۔ میں نے تمہیں اس بنگلے کی لوکیشن بھیج دی ہے۔ بنگلے کے اندر میں نے ایک اور آدمی کو بھی دیکھا ہے۔ ہوسکتا ہے یہاں ان کے مزید ساتھی بھی اندر موجود ہوں۔ اس علاقے میں مکمل خاموشی اور سناٹا ہے۔ میں بنگلے کے اندر داخل ہونے کی کوشش کرتا ہوں۔ تم بھی جلد از جلد یہاں پہنچو۔"

ظافر کے رگ و پے میں سنسنی خیزی موج زن تھی۔ وہ بنگلے کے اندر داخل ہونے کا اٹل فیصلہ کر چکا تھا۔ ان لمحات میں وہ خود کو ایک ہیرو سمجھ رہا تھا جو کسی خطرناک خفیہ مشن پر ہو۔ ساجد کا تعلق چونکہ پولیس ڈپارٹمنٹ سے تھا اس لیے ظافر نے اس کے ساتھ ہونے والے رابطے کا ریکارڈ مکمل طور پر ڈیلیٹ کر دیا تاکہ اگر بنگلے کے اندر اس کا سیل فون ان لوگوں کے ہتھے چڑھ جائے تو انہیں کسی قسم کا شک نہ ہو۔

اس نے اپنی بائیک کو دیوار کی اوٹ ہی میں "پارک" کیا اور دبے قدموں بنگلے کی سمت بڑھنے لگا۔ سیل فون کو اس نے ہینڈ فری پر ڈال کر دوبارہ جیب میں رکھ لیا تھا۔ وہ آدھے راستے ہی میں تھا کہ اس کے نمبر پر کال آنے لگی۔ وہ یہی سمجھا کہ ساجد نے رنگ بیک کیا ہوگا لیکن جب اس نے کال اٹینڈ کی تو دوسری جانب اس کا برانچ منیجر تھا۔

"ظافر! تم کہاں ہو؟" اس کے "ہیلو" کے جواب میں برانچ منیجر نے استفسار کیا۔ "تم جتنے آرڈرز لے کر نکلے تھے، اس حساب سے تو آدھا گھنٹا پہلے تمہیں واپس آجانا چاہیے تھا۔ سب ٹھیک تو ہے نا......؟"

"سر! میرے پاس کل تین آرڈرز تھے۔" اس نے سچ میں جھوٹ کا بگھار لگاتے ہوئے کہا۔ "میں نے دو آرڈرز تو ڈیلیور کر دیے ہیں مگر تیسرا، میڈم فرزانہ والا آرڈر ڈیلیور کرنے جا رہا تھا کہ دو ڈاکو میرے پیچھے لگ گئے۔ وہ کینیے بائیک پر تھے۔ میں رواں ٹریفک کے بیچوں بیچ کسی طرح انہیں جل دینے میں کامیاب ہو گیا۔ جب میں ان سے چھٹکارا حاصل کر چکا تو ایک اور افتاد مجھ پر ٹوٹ پڑی......"

"کیسی افتاد......؟" برانچ منیجر نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی پوچھ لیا۔

"ٹائر برسٹ سر......" ظافر نے اپنے ٹارگٹ بنگلے کی سمت پیش قدمی جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "اس وقت میں اپنی بائیک کی مرمت ہی کرا رہا ہوں۔"

"اوہ......" برانچ منیجر ایک آسودہ سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ "شکر ہے، تم صحیح سلامت ہو۔ جب تمہاری بائیک ٹھیک ہو جائے تو سیدھا اپنی برانچ آجانا......"

"اوکے سر...... تھینک یو سر......" وہ جلدی سے بولا۔ پھر ایک فوری خیال کے تحت پوچھ لیا۔ "سر! میں میڈم فرزانہ کا پزا ڈیلیور نہیں کر سکا۔ ان کی طرف سے کوئی فون، کوئی کمپلین تو نہیں آئی؟"

"بالکل نہیں۔" برانچ منیجر نے جواب دیا۔ "اس طرف مکمل خاموشی ہے۔ لگتا ہے، میڈم فرزانہ پزا کھانے سے بھی زیادہ اہم کام میں مصروف ہیں۔"

"جی سر...... مجھے بھی کچھ ایسا ہی محسوس ہو رہا ہے۔" ظافر نے بنگلے کے گیٹ کو اپنی نگاہ میں رکھتے ہوئے سرسری انداز میں کہا۔

"ٹھیک ہے۔ تم اپنا خیال رکھنا۔" برانچ منیجر کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

"اوکے سر!" ظافر نے مختصر جواب دیا۔

پھر ان کے درمیان سیلولر رابطہ موقوف ہو گیا۔

ظافر نے مطلوبہ بنگلے کے نزدیک پہنچ کر گلی میں دور تک نگاہ دوڑائی۔ وہ محض نام کی گلی تھی۔ وہاں پر کسی قسم کی رونق یا چہل قدمی کے آثار دکھائی نہیں دیتے تھے۔ گلی میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک سناٹے اور خاموشی کا قبضہ تھا۔ اب تو باقاعدہ اندھیرا پھیلنا بھی شروع ہو گیا تھا۔ اس نے کافی فاصلے سے گرے ہائی روف کو بنگلے کے اندر جاتے اور گینڈا نما شخص کو گیٹ بند کرتے دیکھا تھا۔ اس نے گیٹ بند کرنے سے پہلے اتنی احتیاط کے ساتھ گلی میں جھانک کر اپنا اطمینان کیا تھا جس سے لگتا تھا، اس نے محض گیٹ کو اندر سے کنڈی لگانے پر اکتفا نہیں کیا ہوگا بلکہ اندرونی کنڈی پر لازماً تالا بھی ڈالا ہوگا۔

اسی سوچ کے پیشِ نظر ظافر نے بنگلے کی دیوار پھلانگ کر اندر جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ مذکورہ دیوار لگ بھگ چھ فٹ بلند تھی۔ ظافر جوان اور صحت مند ہونے کے علاوہ چالاک اور چست بھی تھا۔ اتنی بلندی کو پھلانگنا اس کے لیے قطعی مشکل نہیں تھا۔

بنگلے میں کودنے سے پہلے اس نے گیٹ کے قبضوں اور ستون کے درمیانی خلا سے آنکھ لگا کر اندر جھانکنے کی کوشش کی۔ بنگلے کے اندر تو اسے کچھ نظر نہ آیا مگر بیرونی صورتِ حال نے اسے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ ان لمحات میں ظافر کا ایک ہاتھ پلر (ستون) پر اور دوسرا ہاتھ گیٹ کے پٹ پر تھا۔ ستون تو اپنی جگہ جوں کا توں استادہ رہا لیکن گیٹ کے پٹ پر پڑنے والے اس کے ہاتھ کے دباؤ نے گیٹ کو اندر کی جانب تھوڑا سا کھول دیا تھا۔ اس سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ گیٹ کو اندر سے تالا تو کیا، کنڈی بھی نہیں لگائی گئی تھی۔

"ناممکن!" وہ خودکلامی کے انداز میں بڑبڑایا۔ "یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ گیٹ کو کھلا چھوڑ دیا گیا ہو۔"

اس محتاط شخص سے ایسی کوتاہی کی توقع تو نہیں کی جا سکتی تھی مگر ظافر اس حقیقت کو بھی جھٹلا نہیں سکتا تھا کہ وہ گیٹ کھلا ہوا تھا۔ وہ وقت زیادہ سوچ بچار کا نہیں تھا۔ اس نے اللہ کا نام لے کر گیٹ کو تھوڑا سا اور کھولا پھر بہ آہستگی اندر داخل ہو کر گیٹ کو ویسے ہی بھیڑ دیا جیسے وہ پہلے تھا۔

بنگلے کے اندر بھی ہر طرف خاموشی کا راج تھا۔ کم و بیش بیس گز کے فاصلے پر اسے وہ گرے ہائی روف کھڑی نظر

آئی جس کا تعاقب کرتے ہوئے وہ یہاں تک پہنچا تھا۔ بنگلے کے اندرونی حصے میں لائٹ آن تھی۔ غافر کے محتاط اندازے کے مطابق، وہ پی کیپ والا اور اس کا گینڈا نما ساتھی اسی روشن کمرے میں موجود تھے۔ وہ دبے پاؤں بلی کے مانند اسی سمت بڑھنے لگا۔

وہ چند گام ہی چلا ہوگا کہ اس کے سر کے عقبی حصے پر قیامت سی ٹوٹ پڑی۔ وہ چوٹ اتنی فوری اور کاری لگائی گئی تھی کہ اسے رات میں طلوعِ آفتاب کا منظر دکھائی دیا۔ یہ احساس لمحے بھر کا تھا کیونکہ اگلے ہی لمحے وہ کٹے ہوئے شہتیر کے مانند زمین بوس ہو گیا تھا۔

☆☆☆

غافر کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ایک چوبی کرسی پر بندھا ہوا پایا۔ اس کے دونوں بازوؤں کو کرسی کے ہتھوں پر رکھ کر مضبوط رسّی سے باندھ دیا گیا تھا۔ ایک ایسی ہی رسی کو اس کی کمر کے گرد گھما کر کرسی کی پشت گاہ کے ساتھ فکس کر دیا گیا تھا البتہ اس کی ٹانگوں کو کرسی کے پایوں کے ساتھ باندھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی تھی۔ بازوؤں اور کمر کی جکڑ بندی تو اپنی جگہ تکلیف دہ تھی ہی لیکن اس کے سر کے عقبی حصے پر جو عذاب نازل ہوا تھا وہ اذیت ناک اور ناقابلِ برداشت تھا۔ وہاں سے اٹھنے والی ٹیسیں اس کی روح کو تڑپا رہی تھیں۔ اسے بس اتنا یاد تھا کہ وہ محتاط قدموں سے بنگلے کے اندرونی حصے کی جانب بڑھ رہا تھا کہ اس کے سر پر ایٹم بم آ گرا تھا۔

دانت پر دانت جمائے، تکلیف کو برداشت کرنے کی کوشش میں اس نے نگاہ اٹھا کر سامنے والی دیوار کو دیکھا۔ وہاں موجود وال کلاک آٹھ بجے کا وقت بتا رہا تھا۔ گویا وہ کم و بیش ایک گھنٹے تک بے ہوش رہا تھا۔ اس کمرے میں غافر کے سوا کوئی بندہ بشر موجود نہیں تھا۔ ایک دیوار کے ساتھ دو، تین کرسیاں پڑی نظر آ رہی تھیں۔

غافر کا ذہن سوچنے کے قابل ہوا تو گیٹ کو کھلا رکھنے کی حکمت اس کی سمجھ میں آ گئی۔ یہ دراصل ان کی ایک چال تھی۔ انہیں یقین تھا کہ وہ بنگلے میں گھسنے کی ضرور کوشش کرے گا لہٰذا اسے بہ آسانی شکار کرنے کی غرض سے گیٹ کو محض بھیڑ کر چھوڑ دیا گیا تھا۔ اس کا یہی مطلب تھا کہ پی کیپ والے اس لم ڈھینگ کو غافر کے تعاقب کرنے کا پتا چل گیا تھا۔

وہ انہی سوچوں میں ڈبکیاں لگا رہا تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور وہ پی کیپ والا کرخت چہرہ شخص اندر داخل ہوا۔ غافر کو اس کے ہاتھ میں ایک گن بھی دکھائی دی جس پر سائلنسر فٹ تھا۔ وہ بدبخت ایک کرسی کھینچ کر غافر سے دو گز کے فاصلے پر براجمان ہو گیا اور خاصے کڑوے لہجے میں پوچھا۔

''کیا تم نے مجھے اتنا ہی گدھا سمجھ لیا تھا کہ میرے تعاقب میں نکل کھڑے ہو گے اور مجھے پتا ہی نہیں چلے گا... ہیں؟''

''گدھا نہیں زرافہ......'' غافر نے اپنے سر کی تکلیف کو فراموش کر کے ہمت سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''کیونکہ گدھا اتنا لمبا تڑنگا نہیں ہوتا۔''

''بکواس بند کرو۔'' وہ گن کو خطرناک انداز میں حرکت دیتے ہوئے دہاڑا۔ ''لگتا ہے، تمہیں مرنے کا کچھ زیادہ ہی شوق ہے جو اپنے پزا ڈلیوری کے کام کو چھوڑ کر سراغ رسانی کرنے چل نکلے۔ میں نے اس بڑھیا کے اپارٹمنٹ کے داخلی دروازے پر آئی گلاس میں تمہارا منحوس تھوبڑا دیکھ لیا تھا اور اسی وقت سے تمہاری شکل میرے ذہن میں محفوظ ہو گئی تھی۔ پھر جب میں نے تمہیں اپنی گاڑی کا تعاقب کرتے پایا تو اسی لمحے میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ تمہیں سبق سکھانا ضروری ہے۔ پرائے پھڈے میں ٹانگ پھنسانے کا کیا انجام ہوتا ہے، یہ تمہیں پتا چلنا چاہیے نا؟''

وہ مردود میڈم فرزانہ کے لیے ''بڑھیا'' کا لفظ استعمال کر رہا تھا جو غافر کو بالکل اچھا نہیں لگا۔ یہ ٹھیک ہے کہ فرزانہ کی عمر پچاس سے متجاوز تھی لیکن وہ ایک اسمارٹ خاتون تھی اور انتہائی مہربان بھی۔ غافر کو یہ سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ جب وہ آئی گلاس سے آنکھ لگا کر میڈم کے اپارٹمنٹ کے اندر جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا تو اس دراز قامت شیطان نے اسے بہ غور دیکھ لیا تھا۔

''تم آخر ہو کون ......؟'' غافر نے جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''تم میڈم کے اپارٹمنٹ میں کس نیت سے گھسے تھے؟ تم نے ان کے ساتھ کیسا سلوک کیا ہے؟ اور تم وہاں سے کیا لے کر آئے ہو؟ میں نے تمہارے ہاتھ میں ایک بڑا سا سفری بیگ بھی دیکھا تھا۔''

''ارے باپ رے باپ ......'' گن بردار استہزائیہ انداز میں بولا۔ ''تم تو بالکل پولیس والوں کے انداز میں سوال کر رہے ہو، حالانکہ میں نے تمہارا سیل فون اچھی طرح چیک کیا ہے۔ تم ایک پزا ڈلیوری بوائے سے زیادہ اور کچھ بھی نہیں ہو۔ کیا تم پولیس کے لیے مخبری کا کام بھی کرتے ہو؟''

اس پی کیپ والے کے بیان میں بہ یک وقت ایک سنسنی خیز انکشاف اور ایک سنگین استفسار شامل تھا۔ وہ پولیس کی مخبری والے سوال کو نظر انداز کر کے اپنے سیل فون کے لیے بے چین ہو گیا۔ اگرچہ غافر کے ہاتھ اور کمر رسی کی جکڑ میں تھے لیکن اس کے چہرے پر نمودار ہونے والے تاثرات اور آنکھوں میں موجود بے قراری نے گن بردار کو اس کی سوچ تک رسائی دلا دی۔

''یہ رہا تمہارا سیل فون۔'' پی کیپ والے نے اپنی جیب میں سے غافر کا سیل فون برآمد کرنے کے بعد اسے دکھاتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں اٹھا کر تمہیں منتقل کرنے کے بعد میں نے تمہارے لباس کی تلاشی لی تو یہ مجھے مل گیا۔ میں نے اسے چیک کرنے کے بعد آف کر دیا تھا اور تمہاری بائیک کو بھی بنگلے کے اندر پہنچا دیا گیا ہے۔ اسے باہر چھوڑنا ٹھیک نہیں تھا اس لیے میں ''عزت و احترام'' کے ساتھ اندر لے آیا ......''

''تم نے ابھی تک میرے ایک بھی سوال کا جواب نہیں دیا۔'' غافر اس کی یاوہ گوئی کو نظر انداز کرتے ہوئے قدرے درشت لہجے میں مستفسر ہوا۔ ''میڈم فرزانہ سے تمہاری کیا دشمنی ہے؟ تم نے ان کے اپارٹمنٹ سے کیا چرایا ہے؟ شکل سے تو تم مجھے ایک ڈکیت ہی لگتے ہو۔''

ان لمحات میں غافر کے اندر کا نفسیات داں اور سراغ رساں پوری طرح بیدار تھا۔ اگرچہ ان خبیثوں نے اسے ایک کرسی پر باندھ رکھا تھا تاہم اس کے ذہن میں کسی قسم کا ڈر خوف نہیں تھا۔ اس بات کا اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ اس کی جان کے دشمن تو بہرحال نہیں تھے۔ اگر ایسا کچھ ہوتا تو اب تک وہ اسے شوٹ کر چکے ہوتے۔ اس اطمینان نے غافر کو خاصا پُراعتماد اور بہادر بنا دیا تھا۔

قبل اس کے کہ گن بردار اس کے کسی سوال کے جواب میں کچھ کہتا، اس کا گینڈا نما ساتھی کمرے میں داخل ہوا اور خاصے بے پروا انداز میں بولا۔ ''سلیم! اس کے ساتھ وقت برباد کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں اپنے کام پر توجہ دینا چاہیے۔ تم جانتے ہو، وقت کم اور مقابلہ سخت ہے۔''

''میں جانتا ہوں فدا ......'' پی کیپ والے نے کہا۔ ''یہ بندہ بہت زیادہ سوالات کرتا ہے۔ لگتا ہے، آج صبح ناشتے میں اس نے دو، چار کوّے کھائے ہیں۔ کائیں کائیں کیے جا رہا ہے۔''

''تم لوگ کس قسم کے مشن پر ہو؟'' غافر نے ایک اور سوال داغ دیا۔ ''وہ کون سا خاص کام ہے جس پر توجہ دینے کی بات کر رہے ہو؟''

''ہم ایک پُراسرار خفیہ میرج بیورو چلاتے ہیں۔'' پستہ قامت فدا نے غافر کی طرف دیکھتے ہوئے انکشاف انگیز

لہجے میں جواب دیا۔ ''جس میں صرف عمر رسیدہ افراد کی شادیاں کرائی جاتی ہیں۔''

''تم جس بڑھیا کے اپارٹمنٹ پر پزا ڈلیور کرنے گئے تھے، آج اس کا نکاح ایک بہت امیر ستار سے ہونے والا ہے۔'' سلیم نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''اور اس شادی کے اکلوتے براتی تم ہو گے ...... سمجھ گئے نا!''

''لیکن میڈم تو ایک شادی شدہ خاتون ہیں اور ان کا شوہر بھی ایک جیولر ہے۔'' غافر نے الجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔ ''میڈم نکاح پر نکاح کیسے کر سکتی ہیں؟''

''مطلب ...... پرائے معاملات میں گھسنا تمہاری فطرت میں شامل ہے۔'' دراز قد سلیم نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''تم محض پزا ڈلیوری بوائے ہی نہیں بلکہ ایک جاسوس بھی ہو۔ تم اپنے کسٹمرز کے ذاتی معاملات پر بھی گہری نظر رکھتے ہو۔ اسی لیے تمہیں معلوم ہے کہ وہ بڑھیا پہلے سے شادی شدہ ہے اور اس کے شوہر کا نام نجیب اللہ ہے جو ایک جیولر ہے۔''

سلیم کی بات سن کر غافر کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ بے ساختہ سرسراتی ہوئی آواز میں مستفسر ہوا۔ ''میں نے تمہیں کب بتایا کہ میڈم کے شوہر کا نام نجیب اللہ ہے؟''

''کیا فرق پڑتا ہے۔'' سلیم بے پروائی سے کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ''تم ہمیں بتاؤ یا ہم اپنے ذرائع سے معلوم کر لیں، بات تو ایک ہی ہے نا۔ اگر اس جیولر کا نام نجیب اللہ نہیں تو پھر تم اعتراض کر سکتے ہو۔''

''میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم لوگ کس قسم کی اوٹ پٹانگ باتیں کر رہے ہو۔'' غافر نے برہمی آمیز لہجے میں کہا۔ ''پہلے تم نے مجھے پولیس کا مخبر گردانا اور اب کوئی جاسوس سمجھ رہے ہو۔ کیا آگے چل کر تم مجھے امریکا کا صدر نامزد کرنے والے ہو؟''

''تم صرف شکل ہی سے جوکر نظر نہیں آتے بلکہ درحقیقت ہو بھی۔'' سلیم نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''اس سنگین صورتِ حال میں بھی تمہیں گھٹیا مذاق کرنے کی پڑی ہے۔''

''سلیم! اگر اس مسخرے کے ساتھ تمہارا تھیٹر ہو چکا ہے تو چلو کام پر لگ جائیں۔'' فدا نے اپنے ساتھی سے کہا۔ ''ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔''

سلیم نے اثبات میں گردن ہلائی اور فدا کی ہمراہی میں چلتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔ ان لفنگوں نے کمرے کا دروازہ بند کرنا ضروری نہیں جانا تھا۔ غافر کو انہوں نے ایک کرسی پر باندھ رکھا تھا لہٰذا وہ اس کی طرف سے بے فکر

اور مطمئن ہو گئے تھے۔

ان کے جانے کے بعد ظافر پیش آمدہ حالات پر سنجیدگی سے غور کرنے لگا۔ یہ تو روزِ روشن کے مانند عیاں تھا کہ وہ دونوں خبیث جرائم پیشہ افراد تھے۔ ان کے چہروں کی کرختگی اور انداز کی سفاکی انہیں انتہائی خطرناک اور درندہ صفت ظاہر کرتی تھی۔ فدا پہلے سے اس زیرِ تعمیر شدہ بنگلے میں موجود تھا۔ وہ گرے ہائی روف کا تعاقب کرتے ہوئے جب یہاں آیا تو بنگلے کا گیٹ فدا ہی نے کھولا تھا۔ بہر حال، سلیم نے اس امر کی تصدیق کر دی تھی کہ جب ظافر میڈم فرزانہ کے اپارٹمنٹ کے آئی گلاس سے آنکھ لگا کر اندر جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا تو اس وقت سلیم اپارٹمنٹ کے اندر موجود تھا۔

میڈم کی جانب سے کسی بھی قسم کا رسپانس نہ پا کر ظافر نے پہلے پہل یہی سوچا تھا کہ شاید میڈم اپنے شوہر سے بے وفائی کا ارتکاب کرتے ہوئے کسی آشنا کے ساتھ وقت گزار رہی ہے..... اپنی اس سوچ پر اسے ندامت کا احساس بھی ہوا تھا۔ خیر..... اب تو یہ صاف ہو گیا تھا۔ میڈم کی مجبوری اور لاچاری کا سبب صرف اور صرف پی کیپ والا شخص سلیم ہی تھا۔

اگرچہ ظافر کرسی پر بندھا ہوا تھا تاہم ان لوگوں نے اس کے سوچنے پر کسی قسم کی کوئی پابندی عائد نہیں کی تھی۔ اس کا شاطر ذہن گرمنلوکی مخصوص نفسیات کی روشنی میں اس امر کا اندازہ تو لگا چکا تھا کہ سلیم ڈکیتی کی نیت سے کسی طرح میڈم کے اپارٹمنٹ میں گھسا تھا۔ اغلب امکان تھا کہ اس نے میڈم کو بے بس کر کے اس کے اپارٹمنٹ میں موجود نقدی اور قیمتی زیورات کا صفایا کر کے ایک ''بڑی'' کامیابی حاصل کر لی تھی۔

انہی سوچوں سے الجھتے ہوئے ظافر کا دھیان اپنے دوست ساجد کی طرف چلا گیا۔ اس منحوس بنگلے کی جانب پیش قدمی کرنے سے قبل اس نے ساجد سے رابطہ کرنے کی حتی الامکان کوشش کی تھی لیکن ساجد نے اس کی کال پک نہیں کی تھی۔ ناچار اس نے ساجد کے لیے وائس نوٹ چھوڑ دیا تھا اور اس بنگلے کی لوکیشن بھی اسے سینڈ کر دی تھی اور اس بات کو ڈیڑھ گھنٹے سے زیادہ گزر چکا تھا مگر ابھی تک ساجد کی طرف سے کسی قسم کی کارروائی نہیں ہوئی تھی۔

''یہ ساجد کا بچہ کہاں مر گیا ہے؟'' ظافر نے جھنجلاہٹ آمیز انداز میں خود کلامی کی۔ ''ٹھیک ہے، میرا نمبر اسے آف مل رہا ہو گا لیکن میں نے اسے جس قدر معلومات فراہم کر دی ہیں ان کی بنیاد پر اب تک اسے اس بنگلے کا محاصرہ کر لینا چاہیے تھا لیکن یہاں تو حال یہ ہے کہ یہ دونوں شیطان میرا بُرا حشر کرنے والے ہیں۔''

اچانک اسے یاد آیا کہ ساجد سے ہونے والی مختصری سیلولر ٹاک میں ساجد نے اسے بتایا تھا کہ وہ ڈکیتی کی کسی واردات کو کور کرنے جا رہا تھا۔ اس نے ظافر سے دو وعدے کیے تھے۔ نمبر ایک، ڈکیتی والے معاملے کو نمٹاتے ہی وہ ظافر سے رابطہ کرے گا۔ نمبر دو، وہ میڈم فرزانہ کا حال جاننے کے لیے اپنے بندوں کو اس کے اپارٹمنٹ کی جانب روانہ کرے گا۔ ساجد نے یہ دونوں وعدے نبھا دیے تھے یا نہیں، یہ تو آنے والا وقت ہی بتا سکتا تھا۔

☆☆☆

وقت اپنی مخصوص رفتار سے آگے بڑھ رہا تھا۔ دیوار گیر کلاک کی سوئیاں آٹھ تیس کا اعلان کر رہی تھیں۔ گویا، رات نے پَر پھیلا کر ماحول کو اپنی تاریک گرفت میں لے لیا تھا۔ جب سے ظافر کی آنکھ کھلی تھی، اس نے میڈم فرزانہ، ساجد اور ان دو مردودوں سلیم اور فدا کے بارے ہی میں سوچا تھا۔ اسے خود پر دھیان دینے کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔ بہر کیف پہلی مرتبہ جب اس نے خود پر توجہ دی تو چونک اٹھا۔

اس کے دونوں بازوؤں کو کرسی کے ہتھوں کے ساتھ اور کمر کو کرسی کی پشت گاہ کے ساتھ باندھا گیا تھا لیکن اس کی دونوں ٹانگیں آزاد تھیں یعنی وہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے اپنے دونوں پاؤں کو محدود فاصلے تک حرکت دینے کے قابل تھا۔ یہ ایک ایسی ''حرکت'' تھی کہ وہ مختصر قدموں کے ساتھ کرسی سمیت اپنی بیٹھنے کی پوزیشن کو برقرار رکھتے ہوئے آگے بڑھ سکتا تھا۔

یہ خاصا صحت مند اور توانا خیال تھا۔ ایسا سوچتے ہی اس کے رگ و پے میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ ان لمحات میں اس کا جاسوس ذہن دگنی رفتار سے مصروفِ کار تھا۔ اس نے بے حد احتیاط کے ساتھ، دو، دو اور چار، چار انچ کے بے آواز قدم اٹھانا شروع کر دیے۔ اس کا رخ کمرے کے کھلے ہوئے دروازے کی جانب تھا جہاں سے فدا اور سلیم گزرنے کے بعد اس کی نگاہ سے اوجھل ہو گئے تھے۔ اس ننھی منی پیش قدمی کے دوران میں اس نے حتی الامکان اس بات کا خیال رکھا تھا کہ اس کی اس ''نائٹ واک'' کے نتیجے میں کرسی کے پایوں کے فرش پر گھسٹنے کی آواز پیدا نہ ہو۔ اگرچہ وہ اس کوشش میں صد فیصد کامیاب تو نہیں رہا تھا تاہم کرسی کے گھسٹنے کی آواز اتنی دھیمی تھی کہ یقیناً اس کمرے سے باہر نہیں گئی تھی۔

ظافر کرسی ''مشقت'' کے بعد کمرے کے دروازے

کے نزدیک پہنچ گیا۔ اسی لمحے ایک خیال بجلی کے کوندے کے مانند اس کے ذہن میں لپکا۔ وہ اچھوتا خیال دراصل ایک فنتاسٹک آئیڈیا تھا۔ اس نے خود کو بھی سنا ڈالی کہ یہ خیال اسے پہلے کیوں نہیں آیا تھا... خیر، اس فوری خیال کے تحت وہ بہ آہستگی کرسی کو اپنی تشریف پر لادے رکوع کے بل ''کھڑا'' ہو گیا۔ اس کے بازو اور کمر کرسی کے ساتھ بندھے ہوئے تھے۔ نئی پوزیشن کو دیکھ کر یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں تھا کہ وہ کرسی اس کی کمر پر بندھی ہوئی تھی۔ اس کے پاؤں حرکت کے لیے آزاد تھے لہٰذا وہ حالتِ رکوع میں رہتے ہوئے دبے قدموں کمرے سے باہر نکل آیا۔

وہ فی الوقت دوڑنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ بہر حال اس کی اس لولی لنگڑی کوشش نے اسے بنگلے کے ایک دوسرے کمرے تک پہنچا دیا۔ مذکورہ کمرے کا دروازہ نیم وا تھا جہاں سے روشنی چھن کر باہر آ رہی تھی۔ وہ دونوں رذیل کمرے کے اندر موجود تھے اور کسی بات پر بحث و تکرار میں مصروف تھے۔ ظافر دروازے کے نزدیک ہی ایک تاریک مقام پر رک گیا تاکہ سلیم اور فدا کے مابین ہونے والی گفتگو کو سن سکے۔ نیم وا دروازے کے توسط سے ان کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ ظافر نے کرسی پر ''بیٹھنے'' کے بعد اپنی سماعت کو ان کی بات چیت پر لگا دیا۔

''سلیم! ہم دونوں نے اپنے حصے کا کام خوش اسلوبی سے نمٹا دیا ہے۔'' فدا اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا۔ ''اس مشن کی کامیابی پر بیس لاکھ کیش اور پچاس سے ساٹھ لاکھ روپے مالیت کے طلائی زیورات ہمارے ہاتھ لگ چکے ہیں۔ میری مانو تو ہم اس سونے اور کیش کو آپس میں برابر بانٹ کر الگ الگ سمت میں نکل جاتے ہیں۔ ہمارا ایک ساتھ رہنا ہم دونوں کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔''

''اس بات میں تو کسی شک کی گنجائش نہیں کہ لوٹ کا مال ہم دونوں میں برابر ہی تقسیم ہو گا۔'' سلیم کی جوابی آواز ظافر کی سماعت سے ٹکرائی۔ ''لیکن میں سمجھتا ہوں، آج کی رات ہمیں اسی بنگلے پر گزارنا چاہیے۔ باہر معاملہ خاصا گرم ہے۔ فی الحال یہ بنگلا ہمارے لیے ایک محفوظ پناہ گاہ ہے۔''

''باہر کے معاملات کس قدر گرم ہیں، اس کا اندازہ بھی لگا لیتے ہیں۔'' فدا نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تم ٹی وی آن کر کے کوئی نیوز چینل لگا دو۔ صورتِ حال خود ہی واضح ہو جائے گی۔''

''ہاں..... یہ تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' سلیم نے جلدی سے کہا۔

ظافر کے دل کی دھڑکن یکایک بڑھ گئی۔ جیسے میں بند بلی والی ''بوگی'' تو اس کے سامنے رہی تھی۔ بس، اب تب میں وہ بلی تھیلے سے باہر آنے کو تھی۔ ظافر کے بیشتر اندازے درست ثابت ہو چکے تھے لیکن ان واقعات کے بکھرے ہوئے موتیوں کو ایک دھاگے میں پرونا باقی رہ گیا تھا۔ ان دونوں نامراد ڈاکوؤں نے خاصا لمبا ہاتھ مارا تھا۔ ظافر ان کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ کمرے کے اندر سے ٹی وی کی آواز آنے لگی۔ وہ ہمہ تن گوش ہو گیا۔

''آج سرِ شام شہر میں ایک میگا ڈکیتی کی واردات ...'' کسی نیوز چینل سے رپورٹ کیا جا رہا تھا۔ خبر پڑھنے والی خاتون کا لب و لہجہ بے حد سنسنی خیز تھا۔ ''پولیس کے اندازے کے مطابق، وہ دو شاطر ڈاکو تھے اور دونوں ہی مسلح... ایک ڈاکو نے شہر کے معروف جیولر نجیب اللہ کی بیوی فرزانہ کو اس کے اپارٹمنٹ میں کرسی پر باندھ کر گن پوائنٹ پر رکھا ہوا تھا اور سیل فون کے ذریعے اس کی ڈری سہمی آواز کو اس کے شوہر تک پہنچا رہا تھا۔ دوسرا ڈاکو گن بدست نجیب اللہ کی شاپ میں موجود تھا اور وہاں پر رکھے ہوئے اصلی طلائی زیورات اور نقدی کو سمیٹ رہا تھا۔ نجیب اللہ اپنی اہلیہ کو کسی قسم کا نقصان پہنچتے نہیں دیکھ سکتا تھا اس لیے اس گن بردار ڈاکو کا ہر مطالبہ پورا کر دیا۔ اپارٹمنٹ میں فرزانہ کو یرغمال بنانے والا ڈاکو بھی بہ وقتِ رخصت گھر کا صفایا کر گیا تھا۔ نجیب اللہ کی اطلاع پر پولیس نے اپارٹمنٹ پر جا کر فرزانہ کو ریسکیو کر لیا ہے۔ اس سانحے نے فرزانہ کے دل و دماغ پر بڑا گہرا اثر ڈالا ہے۔ وہ اس وقت ایک پرائیویٹ اسپتال کے آئی سی یو میں زیرِ علاج ہے۔ پولیس ان دونوں چالباز ڈاکوؤں کو پورے شہر میں ڈھونڈ رہی ہے۔''

ٹی وی کی آواز آنا بند ہو گئی۔ ان دونوں میں سے کسی نے ٹی وی کو آف کر دیا تھا۔ اس پورے واقعے کا پس منظر اور پیش منظر ظافر پر عیاں ہو چکا تھا۔ یہ جان کر اسے قدرے اطمینان ہوا تھا کہ میڈم ڈاکٹروں کی زیرِ نگرانی زندہ تھی۔ وہ مہربان عورت ظافر کی کچھ بھی نہیں لگتی تھی لیکن نہایت ہی مختصر عرصے میں وہ اس کے دل و دماغ میں ایک خاص اور محترم مقام بنا چکی تھی۔ وہ فرزانہ کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ فدا کی گمبھیر آواز نے اس کی سماعت تک رسائی حاصل کر لی۔

''سلیم! تم بالکل سچ کہہ رہے ہو۔ باہر کے حالات ہماری موافقت میں نہیں ہیں۔ کم از کم آج کی رات تو ہمیں اس بنگلے پر قیام کرنا چاہیے لیکن.....''

فدا نے پُراسرار انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو سلیم

نے اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔ ''لیکن کیا؟''

''باہر کے خطرات کا تو ہم نے ذکر کر لیا...'' فدا ٹھیرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''ایک خطرہ اس بنگلے کے اندر بھی موجود ہے۔''

''تم کس خطرے کی بات کر رہے ہو؟''

''وہ پڑا ڈلیوری بوائے ...'' فدا نے سرسراتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ''جو کہیں سے بھی بوائے نظر نہیں آتا۔''

''میں نے اس بندے کو کرسی پر کس کر باندھ رکھا ہے۔'' سلیم نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''وہ ہلنے جلنے کے قابل نہیں ہے۔ وہ ہمیں کسی بھی طرح کا نقصان نہیں پہنچا سکتا۔''

''اس کا کرسی پر بندھے ہونا اور کسی بھی طرح ہمارے لیے نقصان دہ ثابت ہونا دو الگ باتیں ہیں سلیم۔'' فدا نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''وہ فرزانہ اور اس کے شوہر نجیب اللہ کو جانتا ہے۔ وہ ہم دونوں کے ناموں سے واقف ہو چکا ہے اور اس نے ہماری صورتیں بھی دیکھ لی ہیں اور... اور اگر میں غلط نہیں تو وہ بڑی حد تک ہمارے کردار سے بھی آگاہ ہو گیا ہے۔ وہ تمہارا تعاقب کرتے ہوئے فرزانہ کے اپارٹمنٹ سے یہاں تک پہنچا ہے۔ اگر کسی بھی طرح وہ اپنی بندشیں کھول کر آزاد ہو گیا تو وہ ہمارے لیے دردناک موت کا پیامبر ثابت ہو سکتا ہے۔''

''تمہاری بات میں وزن ہے فدا...'' سلیم کی تشویش بھری آواز ابھری۔ ''پھر بتاؤ، اس کم بخت اندرونی خطرے کا کیا کریں؟''

''وہ جب تک زندہ ہے، ہمارے سروں پر تیز دھار شمشیر کے مانند لٹکا رہے گا۔'' فدا نے سفاک لہجے میں جواب دیا۔ ''اس کا کام تمام کرنا ناگزیر ہے۔''

دروازے کے باہر ایک تاریک گوشے میں موجود کافر کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد لہری دوڑ گئی۔ فدا نے اس کی موت کا اعلان کر دیا تھا۔ وہ بے بسی اور بے کسی کی موت مرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھا لہٰذا اپنے بچاؤ کے بارے میں سوچنے لگا۔

''میرے ذہن میں ایک آئیڈیا ہے۔'' سلیم نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔ ''لیکن اس کام کی تکمیل کے لیے تمہیں میرا ساتھ دینا ہوگا۔''

''میں ضرور ساتھ دوں گا۔'' فدا ایک ایک لفظ پر دباؤ ڈالتے ہوئے بولا۔ ''بتاؤ، کرنا کیا ہے؟''

''ہم دونوں مل کر اس کرسی سمیت کمرے کے واش روم میں لے جاتے ہیں۔'' سلیم اپنے آئیڈیا کی وضاحت کرتے ہوئے بتانے لگا۔ ''اور پھر ایک بے آواز گولی اس کی کھوپڑی میں آر پار۔ اس کے بعد واش روم کا دروازہ لاک...'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''اس بنگلے کو آباد ہونے میں ابھی کچھ عرصہ لگے گا۔ جب اس بنگلے میں آکر بسنے والے واش روم کھول کر ''مسٹر پزا'' کی کرسی پر بندھی ہوئی گلی سڑی یا کم از کم اکڑی ہوئی لاش کو دریافت کریں گے، ہم اس بنگلے بلکہ اس شہر سے سیکڑوں میل دور ایک نئی زندگی کی شروعات کر چکے ہوں گے۔''

''تمہارے آئیڈیا میں جان ہے سلیم۔'' فدا نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''اور مجھے یہ خاصا نیک بھی لگ رہا ہے۔ میں نے سن رکھا ہے کہ نیکی کے کام میں سستی یا غفلت نہیں دکھانا چاہیے۔ تم اس بارے میں کیا کہتے ہو؟''

''اس پوائنٹ پر میں تم سے کامل اتفاق کرتا ہوں۔'' سلیم نے توانا لہجے میں جواب دیا۔ ''آؤ، نیک کام پر لگ جاتے ہیں۔''

کافر کے بدن پر سر تا پا چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ آنے والے لمحات انتہائی سنگین اور مہلک ثابت ہو سکتے تھے۔ اس نے ان دونوں ڈاکوؤں کو اپنے قتل کا پروگرام فائنل کرتے سُن لیا تھا۔ اس کا پورا جسم ٹھنڈا پڑ چکا تھا تاہم سب سے اچھی اور امید افزا بات یہ تھی کہ اس خطرناک صورتِ حال میں بھی کافر نے ہمت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔ اس کے اندر ان لٹیروں سے دو، دو ہاتھ کرنے کی خواہش ابھی تک بیدار اور جوان تھی۔ کافر نے سچویشن کے تقاضوں کو نظر میں رکھتے ہوئے سانس روک لی اور کسی بھی فوری کارروائی کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو گیا۔

سلیم اور فدا کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ دونوں جس شخص کو شوٹ کرنے جا رہے تھے وہ دروازے کے پہلو میں دم سادھے ''بیٹھا'' تھا۔ وہ اپنی ہی دھن میں کمرے سے نکلے اور دائیں بائیں دیکھے بغیر آگے بڑھ گئے۔ کافر نے سکون کی سانس لی کہ ان میں سے کسی کی اس پر نگاہ نہیں پڑی تھی۔

دونوں کمروں کے درمیان ایک مستطیل لاؤنج تھا۔ وہ دونوں جیسے ہی مذکورہ لاؤنج کے آخری حصے میں پہنچے، کافر ''حرکت'' میں آ گیا۔ اسے جو بھی کرنا تھا، ایک منٹ کے اندر ہی کرنا تھا۔ اس کے پاس اس سے زیادہ وقت نہیں تھا۔ وہ دونوں کافر کو اس کمرے میں نہ پا کر پہلے تو حیران ہوتے اور پھر پریشان۔ اس کے بعد انہوں نے اس کی

تلاش کا کام شروع کر دینا تھا اور وہ بھی اس نیت کے ساتھ کہ کرسی پر بندھا ہوا یرغمالی جہاں بھی اور جس بھی حالت میں دکھائی دے، اسے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔

کافر نے میکانکی انداز میں، رکوع کے بل جھک کر ''چلتے'' ہوئے اس کمرے کے اندر رسائی حاصل کر لی جہاں اس نے فدا اور سلیم کو باتیں کرتے سنا تھا۔ وہ انتہائی نازک اور جان لیوا لمحات تھے۔ کمرے کے اندر داخل ہوتے ہی اس نے پشت پر بندھی ہوئی کرسی سے دھکا دے کر دروازے کو بند کر دیا۔ ڈاکوؤں نے بے ہوشی کی حالت میں کافر کو کرسی پر بٹھا اس کے بازوؤں اور کمر کو کرسی کے ساتھ باندھ دیا تھا۔ تکنیکی اعتبار سے کافر کو کرسی کے ساتھ باندھا گیا تھا لیکن کافر کی جاسوسانہ سوچ نے ''اپ سائڈ ڈاؤن'' کا فارمولا استعمال کر کے اس تکنیک کو الٹا کر رکھ دیا تھا۔ اسے رکوع کی حالت میں جھکا دیکھ کر بادی النظر میں یہی کہا جا سکتا تھا کہ کرسی کو اس کی کمر پر باندھا گیا تھا۔

کمرے کے دروازے کو بند کر دینا کافی نہیں تھا۔ وہ دونوں کافر کو اس کمرے میں نہ پا کر سب سے پہلے ادھر ہی کا رخ کرتے لہٰذا ان کی جانب سے خود کو محفوظ کرنا سب سے زیادہ ضروری اور اہم تھا۔ کافر کے شاطر ذہن نے موجودہ صورتِ حال کو ازاپٹ کر لیا تھا۔ اس نے دروازے کے لٹو نما ہینڈل کی جانب پشت کی۔ دروازے اور کافر کے درمیان اس کی کمر پر لدی ہوئی کرسی تھی جس کے چاروں پائے دروازے سے چند سوت کے فاصلے پر تھے۔ وہ رکوع کی پوزیشن میں کچھ اور جھکا تو کرسی کا پچھلا دائیں طرف کا پایا لٹو کے عین سامنے آ گیا۔ اس نے ذہن میں سوچے ہوئے منصوبے کے عین مطابق، مذکورہ پائے سے دروازے کے لٹو (ہینڈل) پر ''کاری'' ضرب لگائی۔ اگلے ہی لمحے ایک سریلی ''کلک'' کی آواز ابھری اور لٹو کے وسط میں موجود ننھی سی ناب، لاک کے پیٹ میں گھس گئی۔ اب چابی کے بغیر باہر سے اس دروازے کو کھولنا ممکن نہیں رہا تھا۔

کافر نے ایک آسودہ اور اطمینان بخش سانس خارج کی اور اس کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ وہ ایک بیڈ روم تھا۔ ایک دیوار پر ایل ای ڈی لگا ہوا تھا جو آف تھا۔ دو منٹ پہلے کافر نے یقیناً ایل ای ڈی اسکرین پر نجیب اللہ کی جیولری شاپ میں ہونے والی میگا ڈکیتی کی خبر سنی تھی اور مذکورہ ڈکیتی میں لوٹا جانے والا سونا اور کیش اس وقت کافر کی نگاہ کے سامنے بیڈ پر پڑا تھا لیکن یکایک اس کی توجہ کا مرکز، بیڈ سائڈ ٹیبل بن گئی۔ اس گلاس ٹاپ چھوٹی سی ٹیبل پر کافر کا سیل فون اور ایک تیز دھار والا کھلا ہوا چاقو رکھا تھا۔

ان دونوں چیزوں کو دیکھ کر کافر کی آنکھوں میں پرجوش چمک نمودار ہوئی اور اس کا دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ اس نے ایک خطیر نقد رقم اور لاکھوں روپے مالیت کے طلائی زیورات کو یکسر نظرانداز کرتے ہوئے، بیڈ سائڈ ٹیبل کا رخ کیا۔ ان لمحات میں کافر کی نگاہ میں آزادی کی نعمت ہر مادی شے پر بھاری تھی۔

وہ رکوع کے بل چلتے ہوئے اپنی منزل پر پہنچا اور آگے کو جھک کر اس نے کھلے ہوئے چاقو کے دستے کو اپنے دانتوں میں دبا کر میز پر سے اٹھا لیا۔ اس کے ذہن نے فوری طور پر جو سوچا تھا وہ کوئی حلوا کام ہرگز نہیں تھا لیکن کافر کے پاس اور کوئی آپشن بھی نہیں تھا۔ وہ اپنے دائیں ہاتھ کے اوپر جھکا اور دانتوں میں دبے ہوئے تیز دھار چاقو کی خطرناک دھار کو بہ احتیاط بازو کی رسی پر آزمانے لگا۔ اس عمل کے دوران میں وہ اپنے سر اور کمر کی تکلیف کو بالکل فراموش کر بیٹھا تھا۔ سلیم نے اس کے سر کے عقبی حصے میں ایک کاری ضرب لگائی تھی جس کے نتیجے میں وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا تھا۔ اب آگے جھک کر بازو والی رسی کاٹتے ہوئے اس کی کمر میں کھنچاؤ کے باعث بے پناہ تکلیف بھی ہو رہی تھی۔

صبر آزما اور وقت طلب کوشش کے بعد وہ اپنے دائیں بازو کو رسی کی جکڑ سے آزاد کرانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے نہایت ہی احتیاط اور مہارت کے ساتھ بائیں بازو اور کمر والی رسیوں کو بھی کاٹ ڈالا اور بیڈ سائڈ ٹیبل پر سے اپنا سیل فون اٹھا کر آن کر لیا۔ اسی لمحے کمرے کے باہر ان منحوس ڈاکوؤں کے قدموں کی آواز ابھری۔

''وہ حرام زادہ کرسی سمیت کہاں غائب ہو گیا...؟'' سلیم کی جھنجلاہٹ بھری آواز کافر کی سماعت سے ٹکرائی۔

کمرے کا دروازہ اگرچہ لاک تھا لیکن سلیم کی جھنجلاہٹ اتنی بلند آہنگ تھی کہ کافر کو اس کی بات سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ فدا نے سلیم کے استفسار کے جواب میں چونکے ہوئے لہجے میں کہا۔

''سلیم! ہم نے یہاں سے جاتے ہوئے کمرے کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا مگر اب یہ بند دکھائی دے رہا ہے۔ مجھے یقین ہے، وہ خبیث اسی کمرے میں چھپا ہوا ہے۔''

''سارا کیش اور جیولری بھی تو اسی کمرے کے اندر ہے۔'' سلیم نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ ''ہمیں فوراً

کمرے کے اندر پہنچا ہوگا۔ کہیں وہ کمینہ ہماری ''محنت کی کمائی'' پر ہاتھ صاف نہ کردے۔''

''ایسا کرنے سے پہلے میں اس کی گردن توڑ ڈالوں گا۔'' فدا کی غراہٹ بھری آواز سنائی دی۔ ''وہ کل کا بچہ ہمیں چونا لگائے گا... نہیں میں اسے پورے کا پورا اٹھا کر اوون میں ڈالوں گا اور اس کا پڑا بنا کر فریج میں تقسیم کردوں گا۔''

ان دونوں کی اس ہوائی دھمکی آمیز گفتگو کے دوران میں عافر نے ساجد کو کال لگا دی تھی اور عافر کی خوش قسمتی کہ ساجد نے پہلی ہی گھنٹی پر اس کا فون اٹینڈ بھی کرلیا تھا۔ عافر، ساجد کی طرف سے اچھا خاصا بھرا بیٹھا تھا۔ اس کے ''ہیلو'' کے جواب میں عافر اس پر برس پڑا۔

''تم انسان ہو یا حیوان......'' عافر نے تپے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں کب سے تمہارا نمبر ٹرائی کررہا تھا اور تم......''

''میں پہلے پولیس والا ہوں۔ اس کے بعد انسان ہوں اور حیوان کا نمبر انسان کے بعد آتا ہے۔'' ساجد اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ ''اور جہاں تک نمبر ٹرائی کرنے کی بات ہے تو یہ کام میں بھی کافی دیر سے کررہا ہوں مگر تمہارا نمبر سوئچڈ آف آرہا تھا۔ جب پہلے میری تم سے بات ہوئی تو اس وقت میں نجیب اللہ کی جیولری شاپ کی طرف جارہا تھا۔ ہمیں وہاں ڈکیتی کی واردات کی اطلاع ملی تھی اور ہاں...... تم نے جس میڈم فرزانہ کے بارے میں بتایا تھا، اسے ریسکیو کرلیا گیا ہے...... وہ نجیب اللہ کی بیوی ہے اور......''

''مجھے یہ سب معلوم ہوچکا ہے۔'' اب کی بار عافر نے قطع کلامی کی۔ ''صرف اتنا بتادو کہ اس وقت تم کہاں ہو؟''

''تمہاری بھیجی ہوئی لوکیشن کے انتہائی قریب......'' ساجد نے جواب دیا۔ ''بس ہم بنگلے والی گلی میں داخل ہورہے ہیں۔ تم خیریت سے ہو نا؟''

''ابھی تک تو زندہ ہوں۔'' عافر نے ایک آسودہ سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے ڈاکوؤں کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر خود کو لوٹے ہوئے مال والے کمرے میں بند کرلیا ہے اور وہ دونوں بدمعاش سائلنسر لگی گن کے ساتھ کمرے کے دروازے پر کھڑے ہیں۔ وہ کسی وقت بھی دروازے کے لاک کو گولی سے اڑا کر کمرے میں گھس سکتے ہیں۔ جانتے ہو... ان کا اگلا نشانہ کون ہوگا؟''

''ہمت رکھو یار... تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔'' ساجد نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''ہم نے بنگلے سے چند گز کے فاصلے پر موبائل کو روک لیا ہے۔ میرے ساتھ آٹھ مسلح پولیس والے ہیں۔ تم حوصلہ رکھو۔ ہم تمہارا ایک بال بھی بانکا نہیں ہونے دیں گے۔''

''میں نے ہمت اور حوصلے سے کام لیا ہے تو اب تک زندہ اور سلامت ہوں۔'' عافر نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ ''میری کہانی سنو گے تو دنگ رہ جاؤ گے۔''

''ضرور سنوں گا۔'' یہ کہتے ہوئے ساجد نے لائن کاٹ دی۔ ''ہم بنگلے کا محاصرہ کرنے جارہے ہیں۔ تم کسی بھی طرح خود کو دو، تین منٹ تک زندہ رکھنے کی کوشش کرو۔ اس کے بعد میں سب سنبھال لوں گا۔''

ادھر ساجد کی بات ختم ہوئی، ادھر کمرے کے دروازے پر تیز دستک سنائی دی، پھر سلیم کی کرخت آواز ابھری۔

''تم یہ ٹھیک نہیں کررہے ہو۔ دروازہ کھول دو، ورنہ ہم ہنڈرڈ پرسنٹ تمہیں بھی دے دیں گے۔''

''ہمیں پتا ہے، تم کمرے کے اندر موجود ہو۔'' فدا نے کہا۔ ''تم نے خود کو کرسی کی جکڑ بندی سے کیسے آزاد کرایا، یہ سمجھ میں نہیں آرہا لیکن ایک بات اچھی طرح اپنی کھوپڑی میں بٹھا لو کہ میرے تین گننے تک اگر تم نے دروازہ نہیں کھولا تو میں لاک پر فائر کرکے اسے توڑ ڈالوں گا۔ اس کے بعد میں تمہارے جسم میں اتنے سوراخ کروں گا کہ دنیا کا کوئی بھی کیلکولیٹر انہیں شمار نہیں کرسکے گا...... ایک!''

عافر نے سیل فون کو جیب میں رکھا، چاقو کو پینٹ کی بیلٹ میں اڑسا اور کرسی کو دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے تھام کر حملہ کرنے والی پوزیشن میں دروازے سے ذرا ہٹ کر کھڑا ہوگیا۔ دروازہ کھلنے پر ان میں سے جو بھی اندر داخل ہوتا، عافر بازوؤں کی پوری قوت سے کرسی کو اس کے سر پر توڑ ڈالتا۔ بعد کی بعد میں دیکھی جاتی۔

''دو......!'' فدا غصیلے لہجے میں دہاڑا۔ ''دروازہ کھولو...... ابھی کے ابھی......'' اس کی گنتی کے دوران میں دروازے پر مسلسل دستک کا عمل بھی جاری تھا۔ سلیم کی تشویش سے بھری آواز عافر کی سماعت تک پہنچی۔ وہ فدا سے کہہ رہا تھا۔

''یہ کمینہ کہیں سارا مال سمیٹ کر کھڑکی کے راستے فرار نہ ہوجائے۔ ہم میں سے ایک کو بنگلے کے عقبی حصے میں جانا چاہیے۔''

کسی عقبی کھڑکی کا ذکر سن کر بے ساختہ عافر نے اپنے پہلو میں نگاہ دوڑائی اور مذکورہ کھڑکی اسے نظر آگئی۔ اسی لمحے فدا کی جھلائی ہوئی آواز ابھری۔ وہ اپنے ساتھی سے مخاطب تھا۔

''سلیم! لگتا ہے، تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے۔''

''کیوں...... میں نے ایسا کیا کہہ دیا؟'' سلیم نے پوچھا۔

''تم جس کھڑکی کی بات کررہے ہو، اس پر آہنی گرل نصب ہے۔'' فدا نے کہا۔ ''اس کمرے میں آمدورفت کا صرف ایک ہی دروازہ ہے جو اس احمق نے لاک کردیا ہے۔ وہ ہمارے مال کے ساتھ یا پھر خالی ہاتھ یہاں سے فرار نہیں ہوسکتا۔ اس کم بخت کی دردناک موت میرے ہی ہاتھوں لکھی ہے۔''

عافر نے ایک بار پھر عقبی کھڑکی کی جانب دیکھا اور اسے کھڑکی کے باہر کسی پُراسرار حرکت کا احساس ہوا۔ یہ اس کا وہم نہیں تھا۔ اگرچہ کھڑکی کے اس پار تاریکی کا راج تھا مگر اسی تاریکی میں عافر نے ایک انسانی ہیولا اِدھر سے اُدھر جاتے دیکھا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے سلیم نے بنگلے کے عقبی حصے میں جانے کی بات کی تھی لیکن فدا نے اس کی تجویز کو یکسر مسترد کردیا تھا۔ تو...... تو پھر عافر نے جو سایہ سا ادھر سے ادھر جاتے دیکھا تھا، وہ یقیناً ساجد کا کوئی آدمی تھا۔ گویا...... پولیس نے بنگلے کے اندر گھس کر اپنی کارروائی کا آغاز کردیا تھا۔

''میں دو تک گن چکا ہوں......'' فدا کی بیزار کن آواز عافر کی سماعت سے ٹکرائی۔ ''اس کے بعد ہے تین...... اور تین کے بعد تمہاری موت...... تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ دروازہ کھول دو...... میں تین کہنے کے بعد دروازے کا لاک توڑ ڈالوں گا۔ پھر تم مجھ سے کسی رعایت کی امید نہیں رکھنا۔''

یہ دیکھ کر کہ پولیس کے مستعد جوان بنگلے میں داخل ہوچکے تھے، عافر ہر فکر و غم سے بے نیاز ہوگیا تھا۔ وہ سانس روک کر دروازے کا لاک ٹوٹنے کا انتظار کرنے لگا۔

''تین......!'' فدا نے سنسناتی ہوئی آواز میں کہا۔

''فدا لاک کو اڑا دو۔'' سلیم کی تحکمانہ آواز ابھری۔ ''یہ گھی سیدھی انگلی سے نکلنے والا نہیں ہے۔''

فدا نے فوراً سے پیشتر سلیم کے مشورے کو عملی جامہ پہنا دیا۔ فدا کی گن سے نکلنے والی گولی اگرچہ سائلنسر کی وجہ سے بے آواز تھی لیکن اس نے دروازے کے لاک پر جو قیامت ڈھائی اس کی آواز پورے بنگلے میں سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی فدا نے ایک خوفناک دھکے سے دروازہ کھول دیا۔

کمرے کے اندر فدا کو عافر کے سوا سب کچھ جوں کا توں دکھائی دیا۔ یہ وہ آخری منظر تھا جو اس نے آج کی تاریخ میں دیکھا کیونکہ اگلے ہی لمحے عافر نے کھلے ہوئے

دروازے کی اوٹ سے نکل کر اس کے سر پر کرسی کو توڑ ڈالا تھا۔ عافر کے اس وار میں جسم و جاں کی طاقت کے علاوہ بے پناہ غم و غصہ بھی شامل تھا۔

فدا کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا پھیل گیا۔ عافر کا حملہ اتنا اچانک اور زوردار تھا کہ فدا کو چیخنے یا چلانے کی مہلت ہی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ اس نے میکانکی انداز میں دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھاما اور اناج سے بھری ہوئی بوری کے مانند ''دھب'' سے کمرے کے فرش پر جاگرا۔

فدا کے زمین بوس ہونے کا منظر سلیم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور اسی منظر کے فریم میں اسے عافر کرسی بدست بھی نظر آیا تھا۔ عافر کی ہنگامی کارروائی سلیم کی نگاہ سے چھپی نہیں رہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے تو اس کے دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ وہاں جو کچھ بھی ہوا تھا اس کی سلیم کو توقع نہیں تھی۔

لمحے بھر کی غائب دماغی کے بعد جب سلیم کے حواس بحال ہوئے تو بہت دیر ہوچکی تھی۔ وہ یکایک دوطرفہ مصیبت میں گھر گیا تھا۔ سامنے سے عافر نے زخم خوردہ کرسی سے اس پر وار کیا اور عقب سے ایک تحکمانہ آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ ساجد کے لہجے میں بلا کا اعتماد پایا جاتا تھا۔

''گن پھینک دو۔ تم اس وقت پولیس کے گھیرے میں ہو......''

''پائے رفتن نہ جائے ماندن'' ایسی صورت حال نے سلیم کو بوکھلا کر رکھ دیا اور اسی بوکھلاہٹ میں اس نے عافر پر گولی چلا دی۔ یہ وہی لمحہ تھا جب عافر کرسی سے اس پر وار کرچکا تھا۔

سلیم کی گن سے فائر ہونے والی بے آواز گولی عافر کے دائیں کندھے کو چھیلتے ہوئی گزر گئی اور...... عافر کی گھمائی ہوئی گھائل کرسی نے سلیم کے چہرے کا ستیاناس مار کر رکھ دیا۔ وہ زخمی درندے کے مانند چلایا اور دونوں ہاتھوں میں اپنے چہرے کو چھپا کر زمین پر بیٹھ گیا۔ اس کے منہ سے عافر کے لیے مغلظات کا گٹر ابل رہا تھا۔

ساجد کے حکم پر سلیم اور فدا کو ہتھکڑی پہنا دی گئی۔ سلیم کا چہرہ بُری طرح زخمی ہوچکا تھا اور فدا بے ہوش تھا۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ ان دونوں ڈاکوؤں کو اس حال میں پہنچانے والا عافر تھا جو اپنا گھائل کندھا تھامے ایک طرف کھڑا تھا۔ قبل اس کے کہ ساجد، عافر کی خیریت دریافت کرتا، اس کا فون بج اٹھا۔

''ہیلو سر!'' ساجد نے فوراً کال پک کرلی۔ دوسری

جانب اس کا سینئر آفیسر تھا۔ وہ رپورٹ دینے والے انداز میں بولا۔ ”حالات ہمارے قابو میں ہیں سر۔ آپ کب تک پہنچیں گے؟“

”مجھے جائے وقوعہ پر پہنچنے میں پندرہ سے بیس منٹ لگیں گے۔“ آفیسر نے جواب دیا۔ ”ان ڈاکوؤں کے بارے میں بتاؤ۔ وہ دونوں زندہ تو ہیں نا......؟“

”یس سر! وہ دونوں زندہ ہیں لیکن ان میں سے ایک بے ہوش اور دوسرا بری طرح زخمی ہے۔“ ساجد نے اپنے سینئر آفیسر کو بتایا۔ ”اور ان ڈاکوؤں کا یہ حشر نشر اسی پزا ڈلیوری بوائے نے کیا ہے جس کا میں نے آپ سے ذکر کیا تھا۔“

”اچھا وہ...... ڈبل ایم اے بے روزگار جوان!“

”جی سر وہی۔“ ساجد نے اثبات میں جواب دیا۔

”اسے روک کر رکھو۔ میں تمہارے دوست سے ملنا چاہوں گا۔“ آفیسر نے سرسری انداز میں کہا پھر گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ ”مال مسروقہ کی کیا رپورٹ ہے؟“

”سر! وہ لوٹے ہوئے تمام طلائی زیورات اور کیش میری آنکھوں کے سامنے ہے۔“ ساجد نے جواب دیا۔ ”بس، آپ کی آمد کا انتظار ہے۔“

”میں پہنچنے ہی والا ہوں۔“ آفیسر نے کہا۔ ”تم کھلی آنکھوں کے ساتھ چاق و چوبند رہنا۔ کوئی چیز ادھر سے ادھر نہیں ہونا چاہیے۔ سمجھ گئے نا، میں کیا کہہ رہا ہوں؟“

”سمجھ گیا سر!“ ساجد نے معتدل انداز میں کہا۔ ”آپ بے فکر ہو جائیں اور مجھ پر بھروسا رکھیں۔“

”تم پر بھروسا ہے اسی لیے تو تم اتنے بڑے مشن کو لیڈ کر رہے ہو۔“ آفیسر نے گمبھیر آواز میں کہا۔ ”یہ اسائنمنٹ کم از کم انسپکٹر لیول کے افسر کا تھا لیکن میں تمہاری کارکردگی اور فرض شناسی سے خوش ہوں اور دل کی گہرائی سے چاہتا ہوں کہ تمہارا پروموشن ہو...... اور وہ بھی ایک شاندار کارنامے کے ساتھ......“

”تھینک یو سر۔“ ساجد نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور اپنے آفیسر کا تصور کر کے ایک سیلوٹ بھی دے مارا۔

اس دوران میں ظافر اپنا زخمی شانہ تھامے دھیمے قدموں سے ایک طرف چل پڑا تھا۔ ساجد کی اس پر نگاہ پڑی تو اس نے بہ آواز بلند استفسار کیا۔

”ظافر...... تم کہاں چل دیے؟“

ظافر زیرِ حراست سلیم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”اس رذیل کی جیب میں میری بائیک کی چابی ہے۔ وہی نکالنے جا رہا ہوں۔“

ساجد نے ایک کانسٹیبل سے کہا کہ وہ ظافر کی بائیک کی چابی، گرفتار شدہ ڈاکو کی جیب سے نکال لے پھر ظافر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”تمہیں اچانک اپنی بائیک کا خیال کیوں آ گیا؟“

”اس بدذات نے میری بائیک کو کاٹھ کباڑ کی طرح گرے ہاؤس روف کے پیچھے پھینک دیا تھا۔“ ظافر، سلیم پر نفرت بھری نگاہ ڈالتے ہوئے کڑوے لہجے میں بولا۔ ”ویسے بھی یہاں میرا کام تو ختم ہو چکا ہے۔ میں جا کر کسی ڈاکٹر سے اپنے زخمی کندھے کی مرہم پٹی کراتا ہوں۔“

”تمہارے گھائل شانے کا علاج معالجہ ہماری ذمے داری ہے۔“ ساجد نے کہا۔ ”اس لیے تمہیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہارے زخم کا جائزہ لے چکا ہوں۔ گولی تمہارے کندھے کو بس چھو کر گزر گئی ہے، خطرے والی کوئی بات نہیں اور...... یہ کس نے کہہ دیا کہ یہاں تمہارا کام ختم ہو گیا ہے۔ کیا تمہیں پتا ہے، ابھی میں فون پر کس سے بات کر رہا تھا؟“

”مجھے نہیں معلوم۔“ ظافر نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

”ڈی ایس پی صاحب تھے......“ ساجد نے بتایا۔ ”وہ یہاں پہنچنے ہی والے ہیں۔ میں نے انہیں تمہارے بارے میں بتا رکھا ہے۔ وہ تم سے ملنا چاہتے ہیں اس لیے تمہیں رکنا پڑے گا۔“

”اوہ......!“ ظافر ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

☆☆☆

آئندہ روز ظافر، ساجد کی معیت میں ڈی ایس پی صاحب کے آفس میں موجود تھا۔ گزشتہ رات اس کے گھائل شانے کی تسلی بخش ڈریسنگ کر دی گئی تھی اور پین کلر وغیرہ کھا لیا تھا جس کی وجہ سے وہ خاصا آرام محسوس کر رہا تھا۔ پچھلی رات جائے وقوعہ سے واپسی پر ظافر کی ڈی ایس پی سے مختصر بات ہوئی تھی اور تفصیلی گفتگو کے لیے ڈی ایس پی نے اسے آج اپنے آفس بلایا تھا۔ ظافر اپنی کہانی سنا چکا تو ڈی ایس پی نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ کہ تم نے نجیب اللہ کو کتنے بڑے نقصان سے بچایا ہے؟“

”میں درست اندازہ نہیں لگا سکتا سر......“ ظافر صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے بولا۔ ”میرے خیال میں زیورات اور نقدی ملا کر لگ بھگ پچاس لاکھ......“

”اس سے کہیں زیادہ......“ ڈی ایس پی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ”پچیس لاکھ تو کیش ہے اور نجیب اللہ کے مطابق، طلائی زیورات کی مالیت پچھتر لاکھ سے اوپر ہے۔ یعنی کل ملا کر کم و بیش ایک کروڑ روپے...... تمہارے محتاط اندازے سے ڈبل......“

”جی سر!“ ظافر نے معتدل انداز میں کہا۔

”ساجد نے تمہارے بارے میں مجھے بہت کچھ بتا رکھا ہے اور تم نے اپنی کہانی بھی مجھے سنا دی ہے۔“ ڈی ایس پی نے کہا۔ ”میرے مطابق، ایک اچھے پولیس والے میں تین خصوصیات لازمی ہونا چاہئیں۔ نمبر ایک، ذہانت...... نمبر دو، ایمان داری اور نمبر تین، جرأت و بہادری۔ تم میں یہ تینوں صفات پائی جاتی ہیں...... علاوہ ازیں تم اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی ہو اور تعلیم بھی وہ جو پولیس ڈپارٹمنٹ سے میل کھاتی ہے......“ لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”تم نے میڈم فرزانہ کے اپارٹمنٹ میں گڑبڑ محسوس کرتے ہی گرے ہاؤس روف کا تعاقب کیا۔ یہ تمہاری ذہانت اور قوتِ فیصلہ کا ثبوت ہے۔ دورانِ تعاقب تم نے ساجد کو صورتِ حال سے آگاہ کیا جو تمہاری حاضر دماغی کو ظاہر کرتا ہے۔ تم نے جرأت سے کام لیا اور اس بنگلے میں داخل ہو گئے پھر ان لوگوں نے ایک چال کے ذریعے تمہیں بے ہوش کر کے ایک کرسی پر باندھ دیا۔ تم نے ہمت نہیں ہاری اور کمال بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے، پولیس کی آمد سے پہلے ہی انہیں کسی کام کا نہیں چھوڑا اور سب سے بڑی بات یہ کہ ڈھیروں طلائی زیورات اور ایک خطیر نقد رقم کو دیکھ کر تمہاری نیت خراب نہیں ہوئی۔ ان کھلے حقائق کے پیشِ نظر تم ایک کامل کارگزار ہو......“

”سر! آپ کے یہ ستائشی الفاظ میرے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں ہیں۔“ ظافر نے احسان مندانہ انداز میں کہا۔

”کسی چیز کا اعزاز حاصل کر لینا کافی نہیں ہوتا ظافر......“ ڈی ایس پی نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”اس اعزاز کو جسٹیفائی بھی کرنا پڑتا ہے۔“

ظافر نے سوالیہ نظر سے ڈی ایس پی کو دیکھا اور کہا۔ ”میں سمجھا نہیں سر؟“

”میں نے جس جس حوالے سے تمہاری تعریف کی ہے اسے ثابت کرتے رہنا اب تمہاری ذمے داری ہے۔“ ڈی ایس پی اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

”اس ذمے داری کو نبھانے کے لیے مجھے کیا کرنا ہو گا سر؟“ ظافر پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

”کیا تم پولیس ڈپارٹمنٹ کے لیے انڈر کور کام کرنا پسند کرو گے؟“ ڈی ایس پی نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے استفسار کیا۔

ایک لمحہ سوچے بغیر ظافر نے بے ساختہ جواب دیا۔ ”یس سر!“

”گڈ......“ ڈی ایس پی کے ہونٹوں پر خوش گوار مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے معتدل انداز میں کہا۔ ”تمہارا کوڈ نیم ہے ”کارگزار“ اور تمہارا کور ہے...... ”پزا ڈلیوری بوائے“...... تم معمول کے مطابق اپنی یہ جاب جاری رکھو گے۔ ہمیں جب بھی تمہاری ضرورت ہو گی، تمہیں بتا دیا جائے گا...... کوئی سوال؟“

”نو سر!“ ظافر نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

”ہوں!“ ڈی ایس پی نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنی میز کی دراز میں سے ایک پھولا ہوا لفافہ نکال کر ظافر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”پولیس کے ساتھ کام کرتے ہوئے تمہیں باقاعدہ کوئی تنخواہ نہیں دی جائے گی۔ بس، اسی طرح کے لفافوں پر گزارہ کرنا پڑے گا۔ اسے رکھ لو کارگزار...... یہ تمہاری گزشتہ رات والی جاب کا گفٹ ہے۔“

ظافر نے لفافہ کھول کر دیکھا۔ لفافے میں تیس ہزار کے کرنسی نوٹ رکھے ہوئے تھے۔ ظافر نے حیرت آمیز الجھن سے ڈی ایس پی کی جانب دیکھا۔

”نجیب اللہ نے پولیس کی کارکردگی سے خوش ہو کر پانچ لاکھ روپے مٹھائی کی مد میں ساجد کو تھمائے تھے۔“ ڈی ایس پی وضاحت کرتے ہوئے بتانے لگا۔ ”ساجد مجھ سے کچھ نہیں چھپاتا۔ اس آپریشن میں جتنے پولیس اہلکاروں نے حصہ لیا، ان کی ”مٹھائی“ بہ قدر مرتبہ انہیں دے دی گئی ہے۔ یہ رقم تمہارے لیے ہے۔“

”لیکن میں تو پولیس اہلکار نہیں ہوں سر......“ ظافر نے نیم احتجاجی لہجے میں کہا۔

”کارگزار!“ ڈی ایس پی نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ”تم سادہ لباس پولیس والے ہی ہو۔ یہ حصہ تمہارا حق ہے۔ سمجھ میں آئی بات......؟“

ظافر نے بڑی فرماں برداری سے تیس ہزار روپے والے لفافے کو اپنی جیب میں رکھ لیا۔ یہ اس امر کا ثبوت تھا کہ ڈی ایس پی کی بات اس کی سمجھ میں اپنی جگہ بنا چکی تھی......!

❖❖❖

دہر

حسام بٹ

زندگی آزمائشوں کا نام ہے۔ کامیابی اسی کو ملتی ہے جو ثابت قدم اور مستقل مزاجی سے اپنی منزل کی جانب گامزن رہتا ہے۔ وقت کی ایک بے رحم، سفاک کروٹ نے اس کے جیون میں بھی زہر گھول دیا تھا۔ ناکردہ جرم کی پاداش میں اس کا لڑکپن اور جوانی دونوں قید و بند کی صعوبتوں کی نذر ہوگئیں۔ زمانہ اسیری نے ایک طرف اس کے دل و دماغ پر صدمات کے اَن مٹ نقوش چھوڑے تو دوسری جانب اس نے علم و ہنر کا ایسا بحرِ بے کنار اپنے وجود میں سمیٹ لیا جس کے حصول کے لیے آزاد فضاؤں کے تعلیمی و تربیتی ادارے ناکافی ثابت ہوتے ہیں۔ اس نے آزاد عملی میدان میں قدم رکھا تو نت نئے دشمنوں سے اس کا سابقہ پڑا۔ جلد ہی اس پر منکشف ہوا کہ خالق نے اسے زمینی خداؤں کی سرکوبی کے لیے تخلیق کیا ہے۔ مقصدِ حیات واضح ہوا تو اس نے خود کو منشائے قدرت کے سامنے سرنگوں کردیا۔ اس کارزارِ فنا و بقا کی آبلہ پا جدوجہد میں ایک دل نشیں مہ جبیں اس کی رفیقِ سفر ٹھہری۔ اپنے اطراف میں پھیلی شوریدہ لہروں کو برداشت کرتے ہوئے اس کا سفر جاری تھا جہاں یہودیوں کا سازشی ٹولہ دنیا پر حکمرانی کا اپنا خواب شرمندۂ تعبیر کرنا چاہتا تھا۔

عروس البلاد کراچی سے شہرِ ظلمات "تل ابیب" تک دراز
ایک سنسنی خیز اور تحیر آمیز ناقابلِ فراموش سلسلہ

قسط :3

زندگی ہر انسان کو پیاری ہوتی ہے کیونکہ یہ صرف ایک ہی بار ملتی ہے۔ ان لمحات میں جامی ایسی پوزیشن میں پھنسا ہوا تھا کہ جاسم کے حکم کی تعمیل کے سوا اس کے پاس کوئی چارۂ کار ہی نہیں بچا تھا۔

"میں اندھیرے کے باعث ایک بس سے ٹکرا گیا تھا۔" جامی نے بہ آواز بلند کہا۔ "فکر والی کوئی بات نہیں۔ تم جلدی گاڑی کے پاس پہنچو۔"

ادھر جامی کی بات مکمل ہوئی، ادھر جاسم نے کھینچ کر پوری قوت سے گن کا دستہ اس کی کھوپڑی پر رسید کر دیا۔ جامی کے حلق سے ایک گھٹی گھٹی سی "اونہہ" خارج ہوئی پھر اس کی گردن ایک جانب ڈھلک گئی۔ جاسم کو کچھ اندازہ نہیں تھا کہ جامی عارضی طور پر دنیا و مافیہا سے غافل ہوا ہے یا وہ مستقل دنیا ہی چھوڑ کر چلا گیا ہے۔

جاسم کو جامی کی "سرونگیشر" سے مطلب تھا اور نہ ہی اس کے "ٹرانسفر" سے کوئی دلچسپی... اس نے تو "حساب آں فوراً" کی فلاسفی پر عمل کرتے ہوئے آج کا حساب، آج ہی چکتا کر دیا تھا۔

صفدر کی آمد سے قبل ہی جاسم، کہیں نہ جانے والی بس پر "سوار" ہو گیا اور آواز کو دھیما رکھتے ہوئے معتدل انداز میں بولا۔

"ناجیہ! چپ چاپ لیٹی رہو۔ پریشانی والی کوئی بات نہیں۔ میں نے جامی کو لوری سنا دی ہے۔ اب صفدر کی باری ہے، پھر ہم یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔ تم بس، تماشا دیکھتی جاؤ... اوکے"

"اوکے بے بی..." ناجیہ نے توانا لہجے میں کہا۔

جاسم، صفدر کے انتظار میں، بس کے کھلے ہوئے دروازے کی اوٹ لے کر کھڑا ہو گیا۔ یہ ایک مختصر سی جگہ تھی جہاں دو سیٹ فرنٹ والی آخری سیٹ لگی ہوتی ہے اور عموماً مسافر اس کے نیچے ہی اپنا بھاری سامان رکھ دیتے ہیں۔ جاسم جانتا تھا کہ صفدر کے ہاتھ میں سائلنسر لگی ایک گن بھی ہے لہٰذا وہ اس سے نمٹنے کے لیے چوکس تھا۔ جامی کی گن کو اس نے اپنی کمر کی بیلٹ کے اندر اڑس لیا تھا۔ بہ وقت ضرورت وہ اس گن کو بہ آسانی استعمال کر سکتا تھا۔

صفدر بس کے دروازے کے دائیں اور بائیں نصب ڈنڈوں کو تھام کر اندر داخل ہوا اور پچھلی سیٹ پر پڑی ہوئی ناجیہ کی جانب بڑھا۔ اس کی پشت جاسم کی طرف تھی۔ وہ جاسم کی وہاں موجودگی سے واقف نہیں تھا۔ صفدر کی اسی غفلت کا فائدہ جاسم نے اٹھایا۔

صفدر نے بس کے اندر بہ مشکل ایک ہی قدم بڑھایا تھا کہ جاسم نے ایک زوردار کک اس کے پچھواڑے پر رسید کر دی۔ صفدر ایسے کسی "تحفے" کی وصولی کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں تھا۔ جاسم کی لات کھا کر وہ منہ کے بل، ناجیہ سے ایک فٹ کی دوری پر، ٹو پسنجرز والی سیٹ سے ٹکرایا۔ اگلے ہی لمحے اس کے حلق سے ایک دردناک چیخ خارج ہوئی۔

آہنی سیٹ کے بالائی حصے اور صفدر کے منہ کے بیچ ہونے والا یہ تصادم خاصا ہولناک اور تکلیف دہ تھا۔ اس ناگہانی کے دوران میں صفدر کی گن اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر ناجیہ کے اوپر جا گری تھی۔ جاسم نے سائلنسر لگی وہ بے آواز گن اٹھا لی اور صفدر کو اپنے نشانے پر رکھتے ہوئے کراہت آمیز لہجے میں کہا۔

"اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ... ہری اپ۔"

جاسم کی بارعب تحکمانہ آواز نے صفدر پر واضح کر دیا کہ بازی پلٹ چکی ہے۔ اس نے کراہتے ہوئے استفسار کیا۔ "تم آزاد کیسے ہوئے؟"

"جس طرح متحدہ ہندوستان انگریز بہادر کے تسلط سے آزاد ہوا تھا۔" جاسم نے زہر میں بجھے ہوئے الفاظ میں کہا۔ "طاغوتی قوتوں کے استبداد کے خاتمے کے لیے اس نوعیت کے اقدامات ناگزیر ہو جاتے ہیں۔"

"لعنت ہو تمہاری شکل پر..." صفدر نے اٹھتے ہوئے نفرت بھرے انداز میں کہا۔ "تم ہماری توقعات سے زیادہ شاطر ثابت ہوئے ہو۔"

"قبل اس کے کہ میں تمہاری توقعات کے تاریخ اور جغرافیے کی ایسی تیسی کر کے رکھ دوں، میری ساتھی کی بندشوں کو کھولنے کا انتظام کرو۔" جاسم نے خوفناک انداز میں کہا۔ "اگر زندہ رہنے کا ارادہ ہے تو مجھے گن کے استعمال پر مجبور نہیں کرنا۔ تم جانتے ہو کہ اس وقت میرے ہاتھ میں تمہاری ہی گونگی گن ہے۔ یہ ہلکا سا کھانسے گی اور تمہاری زندگی کا چراغ گل ہو جائے گا۔"

بس کے اندر اگرچہ باقاعدہ روشنی کا کوئی بندوبست نہیں تھا لیکن وہ سب لوگ ایک دوسرے کو بہ آسانی دیکھ پا رہے تھے اور بس کا اندرونی ماحول بھی ان کی آنکھوں کے سامنے خاصی حد تک اجاگر تھا۔ صفدر، جاسم کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ تو نہیں لے سکا تھا تاہم اس کی آواز سے جھلکتی سفاکی نے صفدر کو باور کرا دیا کہ اس سرپھرے لڑکے کو بے وقوف بنانا آسان ثابت نہیں ہوگا۔ پھر بھی وہ کوشش کرنے سے باز نہ آیا۔

"تت... تم نے جامی کے ساتھ کیا، کیا ہے؟" صفدر نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ تمہیں دائیں بائیں کی کہانیاں سناؤں۔" جاسم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "لگتا ہے، تمہاری نظر میں اپنے سے زیادہ جامی کی زندگی کی اہمیت ہے اسی لیے تم اپنی جان کی پروا کیے بغیر اس کے بارے میں استفسار کر رہے ہو۔ ٹھیک ہے، میں تمہیں بھی اسی دنیا میں پہنچا دیتا ہوں جہاں پر جامی اس وقت موجود ہے۔"

"نن... نہیں... گولی مت چلانا۔" صفدر نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔ "میں تمہاری ساتھی کی ساری بندشیں ابھی کاٹ دیتا ہوں لیکن اس کے لیے مجھے ڈرائیونگ سیٹ تک جانا ہوگا۔"

"کیوں... ناجیہ تو یہاں ہے..." جاسم نے کڑے لہجے میں پوچھا۔ "تم ادھر کیا کرنے جا رہے ہو... کہیں تم کوئی چال چلنے کے بارے میں تو نہیں سوچ رہے؟"

"ایسی کوئی بات نہیں... تم میرا یقین کرو۔"

"میں کسی ولدالحرام کا یقین کیسے کر لوں؟"

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔" صفدر نے اضطراری انداز میں کہا۔ "ڈرائیونگ سیٹ پر ایک بیگ رکھا ہوا ہے۔ اس بیگ کے اندر ایسے آلات موجود ہیں جن کی مدد سے تمہاری ساتھی کی رسیوں کو بڑے آرام سے کاٹا جا سکتا ہے۔"

جاسم کو یاد آ گیا کہ جامی نے بھی چند منٹ پہلے اس بس کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک بیگ کی موجودگی کا ذکر کیا تھا۔ جاسم نے تصدیق طلب انداز میں سوال کیا۔

"کیا تم اس بیگ کی بات کر رہے ہو جس کے اندر تم لوگوں نے ہمارے سیل فونز رکھے ہوئے ہیں؟"

"ہاں، وہی بیگ..." وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "تم دونوں کے سیل فونز کو آف کر کے ہم نے بیگ کی بیرونی پاکٹ میں رکھ دیا تھا اور وہ آلات بیگ کے اندر ہیں جن کا ابھی میں نے تذکرہ کیا ہے۔"

صفدر کے جواب نے جاسم کے رگ و پے میں ایک اطمینان بھری لہر دوڑا دی۔ "ٹھیک ہے، تم وہ بیگ لے کر آؤ..." جاسم نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ "لیکن کوئی ہوشیاری نہیں۔ میں تم سے دور نہیں ہوں۔ سمجھ گئے نا؟"

صفدر نے جاسم کے استفسار کا باقاعدہ کوئی جواب نہیں دیا اور ڈرائیونگ سیٹ کی سمت چل پڑا۔ جاسم تین فٹ کا فاصلہ رکھ کر اس کے عقب میں پیش قدمی کرنے لگا۔ گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے والے ان خطرناک صفت افراد کا کچھ بھروسا نہیں ہوتا، خاص طور پر جب ان کی جان پر آ پڑی ہو۔ جاسم بھی صفدر کی طرف سے بے حد محتاط تھا۔

جاسم کی احتیاط کام آ گئی کیونکہ صفدر نے ڈرائیونگ سیٹ پر رکھے ہوئے بیگ کو اٹھانے کے بعد ایک شرانگیز حرکت کر ڈالی تھی۔ اس نے سیدھا ہوتے ہی مذکورہ بیگ کو کمر کی پوری طاقت سے جاسم کے منہ پر دے مارا تھا۔

جاسم اس بدبخت کی جانب سے غافل نہیں تھا۔ اس نے صفدر کا ہاتھ حرکت میں آتے دیکھا تو بڑی سرعت سے ایک بیٹھک لگائی جس کے نتیجے میں وہ بیگ جاسم کے منہ پر پڑنے کے بجائے اس عمودی پائپ سے جا ٹکرایا جسے بس میں کھڑے ہوئے مسافر عموماً سہارے کے لیے پکڑ کر رکھتے ہیں۔

اٹھک اور بیٹھک کا جنم جنم کا ساتھ ہے لہٰذا جاسم نے اس "ساتھ" کی تجدید کے لیے ایک برقی اٹھک لگائی اور اس کی طوفانی ٹکر نے صفدر کی ٹھوڑی کی مزاج پرسی کر ڈالی۔ اگلے ہی لمحے صفدر ایک دل دوز چیخ مارتے ہوئے اپنی گھائل ٹھوڑی کو تھام کر پیچھے کو الٹ گیا۔ اسی اثنا میں بیگ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر اس لیڈیز سیٹ پر جا گرا جو ڈرائیونگ سیٹ کے عقب میں ہوتی ہے۔

"میں نے کہا تھا نا، کوئی چالاکی نہیں۔" جاسم کے لہجے سے بے پناہ خشونت کا اظہار ہو رہا تھا۔ "لیکن تم کسی خارش زدہ کتے کی دم ہو۔ تمہیں سیدھا کرنے کے لیے مجھے کوئی اور طریقہ اپنانا پڑے گا۔ تم منہ کی نہیں، ہاتھ پاؤں کی زبان بہ خوبی سمجھ جاؤ گے۔"

جاسم کے لیے صفدر کی زبان سے مغلظات کا گٹر ابل پڑا۔ جاسم اس کھیل کو طول نہیں دینا چاہتا تھا لہٰذا اس نے صفدر کو اپنے ہاتھ اور پاؤں کی قیامت خیز ٹھوکروں سے ایک منٹ کے اندر ادھ موا کر کے رکھ دیا۔ صفدر، بس کے زنگ آلودہ فرش پر اوندھا پڑا نچلے سروں میں کراہ رہا تھا۔

جاسم نے اس پر نگاہ رکھتے ہوئے بیگ کو کھول لیا۔ پھر اپنا سیل فون آن کر کے اس کی ٹارچ لائٹ میں بیگ کا اندرونی جائزہ لیا تو اس کا دل خوشی سے جھوم اٹھا۔

فلیش لائٹ کے توسل سے اس نے مذکورہ بیگ کے اندر دو سلم ماڈل تیز دھار چھریاں، چند سرجیکل بلیڈز، ایک لوڈڈ ماؤزر پستول اور نائیلون کی مضبوط رسیوں کو دیکھا۔ وہ ان چھریوں اور سرجیکل بلیڈز کی مدد سے ناجیہ کی بندشوں کو بہ آسانی کاٹ کر اسے آزاد کر سکتا تھا۔ اب صفدر اس کے لیے

کسی کام کا نہیں رہا تھا۔ چنانچہ جاسم نے اسے فی الحال کسی اور کے کام کا بھی نہ چھوڑنے کا فیصلہ کرنے کے بعد تیز ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

"تو انی آلات کی مدد سے وہ تمہارا پارٹ ٹائم باپ کلو قصائی ناجیہ کے پاؤں کی حساس رگیں، اور نسیں کاٹ کر اسے زندگی بھر کے لیے وہیل چیئر کا محتاج بنانا چاہتا تھا؟"

صفدر نے کراہنے کا عمل جاری رکھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے جاسم کا سوال اس کی سماعت تک پہنچا ہی نہیں تھا۔ جاسم کو بھی اس کا جواب سننے کا کوئی خاص شوق نہیں تھا۔ اس کی نظر میں اس وقت ناجیہ کو آزاد کرانے اور راجو کی آمد سے پہلے یہاں سے چھوٹ لینے کی سب سے زیادہ اہمیت تھی۔ حفاظت وہاں سے صفدر کی سائیلنسر لگی گن جاسم کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے نہایت ہی سفاکی کے ساتھ، بس کے فرش پر اوندھے پڑے ہوئے صفدر کی تحریف کے اعجاز الطرفین میں ایک ایک بے آواز گولی اتار دی۔ تکلیف کی شدت نے اسے کسی ذبح ہوتے ہوئے جانور کے مانند ڈکرانے پر مجبور کردیا تھا۔

جاسم نے ایک حقارت بھری نظر اس خبیس شخص پر ڈالی اور بیگ اٹھا کر ناجیہ کی سمت بڑھ گیا۔

تیز دھار چھری اور سرجیکل بلیڈ کی مدد سے جاسم نے ایک، ڈیڑھ منٹ میں ناجیہ کے ہاتھوں اور پاؤں کی بندشوں کو نہایت ہی صفائی کے ساتھ کاٹ ڈالا۔ پھر بس سے نکل کر کوڑے تک پہنچنے میں انہیں کسی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

جب جاسم اپنی وہائٹ کوڑے کو وہاں سے نکال رہا تھا تو اسے اندازہ ہوا کہ وہ مقام اس بس اسٹینڈ سے کم و بیش سو گز کے فاصلے پر تھا۔ یہاں پرنا کارہ اور کھٹارا بسیں کھڑی تھیں یا پھر آئل ٹینکرز۔ یہی وجہ تھی کہ جاسم کی طرف سے کی جانے والی کارروائی کی صدا، بس ڈپو میں موجود کسی شخص کی سماعت تک نہیں پہنچی تھی۔

☆☆☆

جب وہ دونوں جائے وقوعہ سے کافی دور نکل آئے تو ناجیہ نے اپنا سیل فون آن کرلیا۔ جاسم نے اپنا سیل فون بس کے اندر ہی آن کرلیا تھا تاہم فلیش لائٹ کے فنکشن کے سوا اس نے اور کسی شے پر توجہ نہیں دی تھی۔

"جے بی! پاپا کی بہت ساری مس کالز آئی ہیں۔" ناجیہ نے بتایا۔ "وہ میرے فون کے آف ہونے کی وجہ سے پریشان ہو رہے ہوں گے۔"

"تو انہیں کال کر کے اپنی خیریت سے آگاہ کردو۔"

جاسم نے ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔

گاڑی میں بیٹھنے کے بعد جاسم نے بھی اپنا سیل فون چیک کرلیا تھا۔ اس کے پاس سر دصدیقی کی تین چار مس کالز آئی ہوئی تھیں۔ ناجیہ نے کہا

"پاپا کے علاوہ سر بھی کئی بار مجھے کال کرنے کی کوشش کر چکے ہیں لیکن میں پہلے پاپا کو فون لگاتی ہوں۔"

ادھر ناجیہ کی بات ختم ہوئی، ادھر اس کے پاپا کی کال آگئی۔ اس نے کال اٹینڈ کرتے ہی معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

"سوری پاپا..... میں آپ کو بتانا بھول گئی تھی کہ..."

"صدیقی صاحب نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے لہٰذا سوری کی ضرورت نہیں۔" اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی غفار داؤد نے شفقت بھرے لہجے میں کہا۔ "تم جاسم کے ساتھ ہی ویو والے ڈبنگ اسٹوڈیو میں معروف تھیں..... ہیں نا؟"

"جج ..... جی پاپا....." وہ الجھن زدہ لہجے میں بس اتنا ہی کہہ پائی۔

"صدیقی صاحب نے کہا تھا کہ ایمرجنسی میں ڈبنگ کا کچھ کام نکل آیا تھا اس لیے تم دونوں کو آنا تھا.... اسٹوڈیو جانا پڑا۔" غفار داؤد نے بتایا۔ "کیا کام ختم ہوگیا؟"

"جی پاپا..... ابھی فارغ ہوئے ہیں۔" وہ صورت حال کو خوب صورتی سے سنبھالتے ہوئے بولی۔ "ابھی ہم سر کے آفس جارہے ہیں۔ وہاں سے نمٹنے کے بعد سیدھی آپ کے پاس آؤں گی۔"

"او کے میری جان! اپنا خیال رکھنا۔"

"شیور پاپا....." یہ کہتے ہوئے ناجیہ نے سیلولر رابطہ موقوف کردیا پھر جاسم کی طرف دیکھتے ہوئے حیرت بھرے لہجے میں بولی۔ "یہ سر نے کیا چکر چلایا ہوا ہے؟"

"میں سمجھا نہیں۔" جاسم نے کہا۔ "مجھے بتاؤ، آخر ہوا کیا ہے؟"

ناجیہ نے جاسم کو اپنے پاپا سے ہونے والی گفتگو سے آگاہ کرنے کے بعد سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

"سر کو ایسا جھوٹ بولنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟"

"سر کی کئی ایک مس کالز میرے سیل فون پر بھی لگی ہوئی ہیں۔" جاسم نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔ "میں سمجھتا ہوں، سیل فون مسلسل آف ملنے کی وجہ سے انکل غفار تمہاری طرف سے فکر مند ہو گئے ہوں گے اور انہوں نے

صدیقی سر سے رابطہ کیا ہوگا۔ جواب میں سر نے تمہارے پاپا کے اطمینان کی خاطر یہ غلط بیانی کردی ہوگی۔" لمحاتی توقف کر کے اس نے کہا۔ "تم نے اپنے پاپا سے یہ کیوں کہا کہ ابھی ہم سر کے آفس جارہے ہیں؟"

"ہم واقعی سر کے پاس جارہے ہیں جے بی۔" وہ چٹانی لہجے میں بولی۔ "آج والے واقعے کے بعد میں تمہارے حوالے سے کوئی رسک لینے کو تیار نہیں ہوں۔ راجو آسانی سے تمہاری جان چھوڑنے والا نہیں ہے۔ میں ابھی اور اسی وقت صدیقی سر کو تمام تفصیلات سے آگاہ کرنے کا ارادہ رکھتی ہوں، چاہے اس کے نتائج کچھ بھی برآمد ہوں، مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔ سر کے تعلقات بہت اوپر تک ہیں۔ وہ تمہارے مسئلے کو بڑی آسانی سے ہینڈل کرلیں گے۔"

"ہینڈل تو میں خود بھی کرلوں گا ناجیہ۔"

"نہیں جے بی۔" وہ قطع کلامی کرتے ہوئے اٹل لہجے میں بولی۔ "تم وہی کرو گے، جو میں نے سوچ لیا ہے..... تمہیں میری قسم!"

آخری جملہ ناجیہ نے ایسے جذباتی انداز سے ادا کیا تھا کہ جاسم کے پاس مزاحمت کا کوئی جواز نہیں بچا تھا۔ وہ سرنڈر کرتے ہوئے بولا۔ "او کے میم! میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

اسی وقت جاسم کے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی لیکن یہ جاسم کا ذاتی فون نہیں تھا۔ وہ جائے وقوعہ پر جامی کو ادھ موا کرنے کے بعد اس کا سیل فون اور پسٹل اٹھا لایا تھا۔ جامی اور صفدر کی گن کو اس نے گاڑی میں بیٹھتے وقت، آئل ٹینکرز کی جانب اچھال دیا تھا تاہم جامی والا سیل فون اس نے اپنی جیب میں رکھ لیا تھا۔ ابھی کال اسی سیل فون پر آرہی تھی۔

جاسم نے سیل فون جیب سے نکال کر اس کے ڈسپلے پر نگاہ ڈالی تو وہاں "بھائی" لکھا دکھائی دیا۔ "تو یہ راجو کا فون ہے۔" زیرلب بڑبڑاتے ہوئے اس نے کال اٹینڈ کرلی۔

اگلے ہی لمحے ایک غصیلی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ "کہاں مر گئے ہو تم لوگ..... میں دس منٹ میں وہاں پہنچ رہا ہوں۔ صفدر کو تین چار بار ٹرائی کیا مگر کال پک نہیں کر رہا۔ اس کے بعد تمہیں فون کیا ہے۔ سب خیریت تو ہے نا.....؟"

"جی بھائی.....!" جاسم نے جامی کے لہجے کی نقالی کرتے ہوئے مختصر جواب دیا۔

"وہ کمینہ اور اس کی ساتھی لڑکی تم لوگوں کے قبضے میں ہیں نا؟" راجو نے اضطراری لہجے میں دریافت کیا۔

"جی بھائی!" جاسم نے اپنی لائن کو دہرا دیا۔

"کیا "جی بھائی، جی بھائی" لگا رکھی ہے....." راجو نے ڈانٹ آمیز انداز میں کہا۔ "مجھے ٹھیک سے بتاؤ تم لوگوں کو اس لڑکے کی آنکھوں میں بھائی کی دہشت نظر آئی کہ نہیں..... اس نے منت، خوشامد کی کہ نہیں..... وہ اپنے انجام سے خوف زدہ ہوا کہ نہیں؟"

"نہیں بھائی....." جاسم نے جامی کے لہجے میں جواب دیا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا.....؟" راجو نے بھناتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"آپ بڑے ہیں بھائی....." جاسم نے جامی کی نقل میں تفریح کا عمل جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "مطلب تو آپ ہی کو پتا ہوگا۔"

"ابے او گدھے.....!" راجو آپے سے باہر ہوگیا۔ "میں پوچھ رہا ہوں، اس حرام زادے نے کچھ منہ سے پھوٹا کہ نہیں؟"

"اس نے آپ کے بارے میں ایک بات بولی بھائی....."

راجو نے تیکھے لہجے میں استفسار کیا۔ "کون سی بات؟"

"وہ بات انگریزی میں ہے بھائی!"

"اس انگریز کی اولاد نے کیا بولا میرے بارے میں؟" راجو کا غصہ بڑھ رہا تھا۔ "مجھے اس کے الفاظ بتاؤ؟"

"وہ بولا....." جاسم نے اس کھیل کو کلائمیکس پر لاتے ہوئے کہا۔ "بھائی ویڈلاک کے بغیر پیدا ہوا ہے۔"

"یہ ویڈلاک کیا ہوتا ہے؟" راجو کی سرسراتی ہوئی آواز جاسم کی سماعت تک پہنچی۔

"ویڈلاک ..... مطلب شادی کا بندھن .....!"

"اس کتے نے مجھے ناجائز اولاد کہا اور تم لوگوں نے چپ چاپ سن لیا؟" راجو نے طیش کے عالم میں پوچھا۔

"جی بھائی..... یہ سن کر مجھے تو بہت مزہ آیا۔" جاسم نے کہا۔ "آپ بھی انجوائے کر رہے ہیں نا؟"

آخری جملہ جاسم نے اپنے لب و لہجے میں ادا کیا تھا۔ راجو نے زخمی سانپ کے مانند پھنکارتے ہوئے سوال کیا۔ "کون ہو تم.....؟"

"جاسم باری سن آف قاسم باری، مرحوم۔" جاسم نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے جواب دیا۔ "واپس گھر لوٹ جاؤ۔ اگر تم ادھر سائٹ پر گئے تو تمہیں کلو قصائی کے سامنے بڑی شرمندگی اٹھانا پڑے گی کیونکہ میں نے صفدر اور

جالی کا جو حشر کیا ہے اسے دیکھ کر تمہارے گرگوں پر اچھا اثر نہیں پڑے گا۔"

"سر.... میں تمہیں ایسی موت دوں گا کہ تم ..."

"زندگی اور موت کی باتیں تمہاری توتلی زبان پر جچتی نہیں ہیں راجو!" جاسم نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہا۔ "مجھے مجبور نہ کرو کہ تمہاری ہکلاہٹ کا علاج کرنے بھی پہنچ جاؤں۔ میں اپنی طرف سے آج اس معاملے کو دفن کر رہا ہوں۔ آئندہ میں تمہارے راستے میں نہیں آؤں گا اور تم بھی ... کسی منحوس کالے باگڑ بلے کے مانند میری راہ کھوٹی کرنے کی کوشش نہیں کرنا۔"

"یہ نہیں ہو سکتا....." راجو دہاڑا۔

"تو بھاڑ میں جاؤ۔" جاسم نے کہا اور جالی والے سیل فون کو گاڑی سے باہر پھینک دیا۔

اگلے ہی لمحے جاسم کے اپنے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ جاسم نے دیکھا، وہ سرمد صدیقی کی کال تھی۔ اس نے فون ناجیہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "لو بات کرو ..... سر لائن پر ہیں۔"

"ہیلو سر....." ناجیہ نے کہا۔

"اوہ... تو تم ابھی تک جے پی کے ساتھ ہو۔" صدیقی نے ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ "اگر تمہیں ایک دوسرے سے فرصت مل گئی ہو تو اپنے پاپا کو کال کر لینا۔ وہ تمہارے لیے بہت زیادہ پریشان ہو رہے تھے۔"

"سر، پاپا سے میری بات ہو گئی ہے۔" ناجیہ نے بتایا۔ "ٹھیک کیا سر آپ نے انھیں ڈبنگ اسٹوڈیو کا بتا کر معاملے کو سنبھال لیا۔ اصل میں ہم ایک بہت بڑی مصیبت میں پھنس گئے تھے ....."

"کیسی مصیبت ....!" صدیقی نے چونکے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ "کیا پھر کسی کافی شاپ یا ریسٹورنٹ میں جے پی نے تمہیں بدتمیز غنڈوں سے بچانے کے لیے کوئی نیا ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا جس کے نتیجے کے طور پر تم لوگ کسی مشکل میں گرفتار ہو گئے اور بہ حالت مجبوری تمہیں اپنے سیل فونز آف کرنا پڑے؟"

سرمد صدیقی کے استفسار میں خفگی اور سرزنش کا خوب صورت امتزاج پایا جاتا تھا۔ ناجیہ جلدی سے بولی۔

"نہیں سر ... ہم پہلے مصیبت میں مبتلا ہوئے۔ اس کے بعد جے پی کی مار پیٹ نے ہم دونوں کو اس رونگٹے کھڑے کر دینے والی سچویشن سے نکالا ہے۔ کلفٹن کے علاقے میں دو گن بردار غنڈوں نے ہمیں اغوا کر لیا تھا سر .....!"

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو ناجیہ؟" صدیقی نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

"بڑی سنسنی خیز اور مار دھاڑ سے بھرپور کہانی ہے سر....." ناجیہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اس کی تفصیل میں آپ کو فون پر نہیں بتا سکتی۔"

"تم نے اپنے اغوا کا ذکر کر کے مجھے بے چین کر دیا ہے ناجیہ۔ سمجھ لو کہ میرے ہوش اڑ گئے ہیں۔" صدیقی نے اضطرابی لہجے میں کہا۔ "میں ابھی اور اسی وقت تمہاری چاسم چاہتا ہوں۔ تم خیریت سے تو ہو نا؟"

"جی سر! ہم دونوں اللہ کے فضل سے ٹھیک ٹھاک ہیں۔"

"مجھے بتاؤ تم لوگ کہاں پر ہو؟" صدیقی نے پوچھا۔ "میں آتا ہوں تمہارے پاس۔"

"آپ کو زحمت کرنے کی ضرورت نہیں ہے سر......" ناجیہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ہم دو منٹ میں آپ کے سامنے ہوں گے۔ جے پی اپنی کار کو پارک کر رہا ہے۔"

"آ جاؤ۔" صدیقی نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔

"آئندہ تیس منٹ میں ناجیہ اور جاسم نے اپنے باس کو آج والی کارروائی کی تفصیل سے آگاہ کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ ابھی تک جن باتوں کو صدیقی سے چھپا کر رکھا گیا تھا، وہ سب بھی ناجیہ نے باس کے گوش گزار کر دیں۔ اسی ذیل میں ڈیوڈ کی ری ایجنسی ٹی وی کا ذکر بھی آیا اور مارکو پولو والے واقعے کا وہ حصہ بھی جتنا جاسم نے ناجیہ کو بتایا تھا۔ جاسم نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے صدیقی کو مراد علی عرف دادا، راجو اور شعیب چاچا، علاوہ ازیں انور بیگ المعروف "بہ کا مرغا" کے حوالے سے بھی سب کچھ بتا ڈالا۔

سرمد صدیقی نے حیرت آمیز دلچسپی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پورے انہماک کے ساتھ ان دونوں کی باتیں سنیں اور آخر میں گہری سنجیدگی سے کہا۔

"راجو کا نام آج میں نے پہلی مرتبہ سنا ہے اور ڈیوڈ نام کا کوئی شخص ہماری انڈسٹری میں موجود نہیں لیکن شعیب چاچا کو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ ایک وائٹ کالر، ہائی پروفائل کاروباری ہے۔ اس کے تین چار بزنس تو بالکل اوپن اینڈ کلیئر ہیں لیکن بہت کم لوگ اس کے ایک انتہائی خطرناک خفیہ کاروبار کے بارے میں جانتے ہوں گے۔ ان

معدودے چند میں ایک میں بھی ہوں۔"

"مجھے تو صرف یہی معلوم ہے کہ شعیب چاچا کوئی گینگسٹر ہے۔" جاسم نے کہا۔ "ڈرگز اور وپنز اس کے بنیادی دھندے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ قتل و غارت گری کے لیے بھی بہت مشہور ہے۔"

"تمہاری معلومات اپنی جگہ درست مگر نامکمل ہیں جے پی۔" صدیقی نے گمبھیر انداز میں کہا۔ "ڈرگز (منشیات فروشی) وپنز (ناجائز اسلحے کی ترسیل) اور قتل و غارت گری ..... یہ تو اس کا انڈر گراؤنڈ بزنس ہے۔ میں نے جس خطرناک کاروبار کا ذکر کیا ہے وہ اتنی صفائی سے کیا جاتا ہے کہ سب کچھ سامنے ہونے کے باوجود بھی کسی کو کچھ دکھائی نہیں دیتا۔"

"ایسا کون سا بزنس ہے سر ....؟" ناجیہ نے سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔

"ہیومن آرگنز کا بزنس!" صدیقی نے انکشاف کرتے ہوئے بتایا۔ "شعیب چاچا انسانی جسم کے اندر پائے جانے والے اہم اعضا مثلاً دل، جگر، گردے، آنکھیں ... وغیرہ کی فروخت کا کام کرتا ہے۔ یہ اس کا سب سے زیادہ منافع بخش بزنس ہے کیونکہ اس کے کلائنٹس میں کوئی بھی ارب پتی سے کم نہیں۔ دل اور جگر کا ریٹ ایک کروڑ روپے کے آس پاس چل رہا ہے، آنکھیں پچاس لاکھ تک اور ایک گردہ دس سے چالیس لاکھ روپے میں فروخت کیا جاتا ہے اور اس گھناؤنے کھیل میں اس کے دو بزنس پارٹنر بھی ہیں۔ ایک شخص مہنگے پرائیویٹ اسپتال کا مالک ڈاکٹر اور دوسرا اس شہر کا چوٹی کا وکیل۔ آرگنز کی ٹرانسپلانٹیشن کا کام اسی ڈاکٹر کے اسپتال میں کیا جاتا ہے اور ایڈووکیٹ صاحب عدالتی معاملات کو دیکھتے ہیں۔ مجھے یہ بھی پتا چلا ہے کہ شعیب کو ایک بہت ہی بااثر اور طاقتور سیاسی شخصیت کی سرپرستی بھی حاصل ہے۔"

"سر! جب یہ کام انتہائی خفیہ طریقے سے کیا جا رہا ہے تو پھر یہ لوگ ڈونرز کہاں سے لاتے ہیں۔" ناجیہ نے نہایت ہی اہم سوال کیا۔ "یہ تو سننے میں آتا ہے کہ لوگ انتہائی مجبوری کی حالت میں، اپنی کوئی ضرورت پوری کرنے کے لیے خون یا ایک گردہ فروخت کر دیتے ہیں کیونکہ انسان خون کی کمی اور ایک گردے کے ساتھ زندہ رہ سکتا ہے لیکن اپنا دل اور جگر کون ڈونیٹ کرتا ہوگا۔ یہ تو سراسر پاگل پنا ہے..... اپنی زندگی کے ساتھ مذاق ہے۔"

"تم نے درست کہا، یہ اپنے ہاتھوں سے خود کو ختم کرنے والی بات ہے۔" صدیقی نے معتدل انداز میں کہا۔

"لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ ان لوگوں کے کلائنٹس میں ایک بھی ڈونر نہیں ہے۔"

"تو پھر یہ لوگ ہیومن آرگنز کہاں سے لاتے ہیں؟" جاسم نے پوچھا۔ "کیا آپ مصنوعی اعضا کی پیوند کاری کی بات کر رہے ہیں؟"

"نہیں جے پی! میں اوریجنل آرگنز کا ذکر کر رہا ہوں۔ تم لوگ اپنے ذہنوں کو مت الجھاؤ۔ میں سمجھاتا ہوں۔" صدیقی نے دھیمے انداز میں بولنا شروع کیا۔ "شعیب چاچا کے سرکل میں سب لوگ انتہائی امیر و کبیر ہیں جن کے پاس پیسے کی کوئی کمی نہیں۔ شعیب ان میں سے صرف انہی لوگوں کو ٹارگٹ کرتا ہے جنہیں کسی آرگن کی اشد ضرورت ہوتی ہے کیونکہ ان کا اپنا وہ آرگن اپنی عمر اور صحت پوری کر چکا ہوتا ہے۔ وہ مذکورہ ضرورت مند کو بتاتا ہے کہ ایک ڈاکٹر ان کے اس ضعیف اعضا کو ایک صحت مند اعضا سے بدل سکتا ہے۔ کلائنٹ کے اوکے کرتے ہی اس کے بلڈ گروپ اور دیگر میچنگ کے حساب سے جوان اور صحت مند ڈونرز کی تلاش شروع ہو جاتی ہے۔ اس مقصد کے لیے ان تینوں کی ایک ٹیم ہر وقت سرگرم عمل رہتی ہے اور زیادہ تر ان کا نشانہ لاوارث لوگ ہی بنتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی ضرورت کے بندے کو بہلا پھسلا کر اغوا کر لیتے ہیں اور بعض اپنی مرضی سے بھی ان کے ساتھ چل پڑتے ہیں۔ یہ شقی القلب کارندے سرکاری اسپتالوں کے باہر بھی گھومتے رہتے ہیں اور مفت پرائیویٹ علاج کا خواب دکھا کر بعض سادہ لوح افراد کو اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ ان کے مختلف لیبارٹری ٹیسٹ کرنے کے بعد انہیں پتا چل جاتا ہے کہ کون بندہ ان کے کام کا ہے ... بس، وہی شکار ان کا ڈونر ثابت ہوتا ہے۔ دو چار روز کے بعد اس بدنصیب کی کٹی پھٹی لاش کسی گندے نالے میں پڑی ملتی ہے۔ ایک آدھ روز تک یہ خبر میڈیا کی نظر میں رہتی ہے۔ اس کے بعد سب کچھ معمول کے مطابق چلنے لگتا ہے۔ یہاں پر کسی خبر، کسی واقعے کا فالو اپ نہیں ہے کیونکہ ....." اس نے رک کر ایک افسردہ سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"اس ملک کے عوام پر ہر روز ایک نئی مصیبت نازل ہو جاتی ہے لہٰذا ہم گزشتہ روز کی ٹریجڈی کو بھول کر آج کی مشکل کو حل کرنے میں لگ جاتے ہیں۔ ہمارا کوئی قابل فخر ماضی ہے اور نہ ہی اُمید افزا مستقبل۔ ہم تو محض امروز کے ہو کر رہ گئے ہیں۔"

آج سرمد صدیقی انہیں ایک بدلا ہوا انسان نظر آ رہا تھا۔ اس کا یہ روپ انہوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ جاسم

پوچھے بنا نہ رہ سکا۔
"سر! آپ مسٹر آرگھر کے اس مذموم کاروبار کے بارے میں یہ ساری سنسنی خیز اور خطرناک معلومات آپ نے کہاں سے حاصل کی ہیں؟"
"کیا یہ نہیں جاننا چاہو گے کہ میں یہ تمام باتیں تم دونوں سے کیوں کر رہا ہوں؟" صدیقی نے باری باری جاسم اور ناجیہ کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔
وہ یک زبان ہو کر بولے۔ "جی سر — یہ بھی بتا دیں۔"
"حفظِ ماتقدم کے طور پر —" صدیقی نے کہا۔
"ناجیہ! تم میرے دوست کی بیٹی ہو اس لیے تمہاری حفاظت کا خیال رکھنا میری ذمے داری ہے اور جاسم تمہاری زندگی کا ایک اہم حصہ ہے لہٰذا تمہاری خوشی کی خاطر مجھے اس کی حفاظت کرنا ہوگی۔ میں تم دونوں کو کوئی دکھ، کوئی تکلیف پہنچتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ بس، یہی دعا کرو کہ جاسم کی دشمنی والا معاملہ جو تک ہی محدود ہو۔ اگر اس میں شعیب چاچا بھی کود پڑا تو پھر بڑی مشکل ہو جائے گی۔ باقی جہاں تک معلومات کی بات ہے تو —" وہ سانس ہموار کرنے کے لیے تھما پھر باری باری ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "وعدہ کرو کہ تم یہ باتیں کسی سے نہیں کرو گے۔"
ان دونوں نے صدیقی کے حسبِ منشا اسے یقین دلا دیا۔ وہ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ "میرے ایک بہت ہی گہرے دوست ہیں جو محکمۂ پولیس میں ایس پی ہیں۔ وہ انتہائی ایمان دار اور فرض شناس پولیس آفیسر ہیں، صرف اپنی تنخواہ پر گزارہ کرنے والے۔ کسی پولیس والے کے بارے میں ایسی باتیں فکشن یا قلمی محسوس ہوتی ہیں مگر وہ ایک جیتا جاگتا اور مثالی کردار ہے۔ میں اسے بچپن سے جانتا ہوں۔ یہ ساری باتیں اسی نے مجھے بتائی ہیں۔ پچھلے سال انسپکٹر لیول کا ایک پولیس آفیسر شعیب چاچا کے اس مکروہ کاروبار کے بارے میں خفیہ طور پر تحقیق کر رہا تھا اور اس کے ہاتھ کچھ ثبوت بھی لگ گئے تھے لیکن اس سے پہلے کہ وہ ثبوت ایس پی صاحب تک پہنچتے، وہ انسپکٹر اور تمام ثبوت اچانک غائب ہو گئے۔ اب اس انسپکٹر کا شمار مسنگ پرسنز میں ہوتا ہے۔ جانے نہیں، ان جلادوں نے اس انسپکٹر کے آرگھر کے ساتھ کیا کیا ہوگا؟"
مسٹر صدیقی کے آخری جملے نے ان دونوں پر سراسیمگی طاری کر دی۔ چند لمحات بوجھل اور گمبھیر خاموشی میں گزر گئے، پھر ناجیہ نے پوچھا۔
"سر! جاسم کو فوری طور پر کون سے حفاظتی اقدامات کرنا چاہئیں؟"
"آؤٹنگ کم سے کم —" صدیقی نے کہا۔ "بلکہ انتہائی اور اشد ضرورت کے بغیر گھر سے باہر نکلنا ہی نہیں چاہیے۔ میرا مشورہ تو یہ ہے کہ استنبول روانگی تک جے پی کو ادھر میرے آفس ہی میں ڈیرا ڈال لینا چاہیے۔ یہاں کھانے پینے، شاور، سونے، آرام کرنے وغیرہ کا بھرپور بندوبست ہے۔ خواہ مخواہ کوئی رسک لینا عقل مندی نہیں ہوگی۔ تم کیا کہتے ہو؟"
بات کے اختتام پر صدیقی نے سوالیہ نظر سے جاسم کی طرف دیکھا تو اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "میں آپ کی تجویز سے اتفاق کرتا ہوں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ راجو یا شعیب چاچا کے خوف سے میں کسی بل میں چھپ کر بیٹھ گیا ہوں۔ شعیب نے میرے گرو مراد علی اور ان کی بیوی و بیٹی کو بیدردی سے موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ اس حساب سے شعیب کے سامنے ڈٹ کر کھڑے ہونا اور اس کے دانت کھٹے کرنا مجھ پر واجب ہو چکا ہے۔ آپ میرا ایک کام کر دیں سر۔"
"میں نے کب کہا کہ تم کوئی بزدل اور ڈرپوک انسان ہو۔" صدیقی نے سپاٹ آواز میں کہا۔ "میں نے احتیاط پسندی کے پیشِ نظر تمہیں یہ مشورہ دیا ہے۔ جب معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے گا تو تم آزادانہ گھومنا پھرنا —— خیر، بتاؤ میں تمہارا کون سا کام کر دوں؟"
"آپ مجھے اپنے اس فرض شناس اور ایمان دار ایس پی دوست سے ملوا دیں۔" جاسم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "یہ آپ کا مجھ پر احسان ہوگا۔"
"میں تم پر یہ احسان ضرور کروں گا۔" جواب میں صدیقی نے بھی دوٹوک انداز اختیار کر لیا۔ "لیکن اس سے پہلے تمہیں بھی میرا ایک کام کرنا ہوگا۔"
"بتا دیں..... آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟"
"مشن استنبول کی تکمیل اور وہ بھی بغیر کسی بدمزگی کے۔" صدیقی نے اس کے چہرے پر نگاہ گاڑ کر کہا۔ "تم استنبول والی شوٹنگ مکمل کرا کے واپس آؤ، میں تمہاری ایس پی کے ساتھ میٹنگ ارینج کروا دوں گا۔ اس کے بعد تمہارا ہنر ہے کہ تم انہیں کس طرح اپنے شیشے میں اتارتے ہو۔"
"ڈن سر!" جاسم نے حتمی انداز میں کہا۔
ناجیہ الجھن زدہ حیرت اپنی آنکھوں میں بھر کر کبھی جاسم اور کبھی مسٹر صدیقی کو دیکھتی رہ گئی۔

☆☆☆

اگر کسی ایکشن ہیرو کو ہفتہ، دس دن کے لیے ایک گھر کے اندر معتکف کر دیا جائے تو اس گوشہ نشینی کا مقصد چاہے کتنا بھی اہم کیوں نہ ہو، وہ بہت جلد اس پابندی سے بیزار ہو جائے گا۔ کچھ ایسا ہی حال جاسم کا بھی تھا۔
مسٹر صدیقی کے آفس میں قیام پذیر ہوئے ابھی تین دن ہی گزرے تھے کہ آزاد فضا میں سانس لینے کے لیے وہ بُری طرح مچلنے لگا۔ ناجیہ روزانہ دن میں اس سے ملنے وہاں آ جاتی تھی اور تھوڑی گپ شپ کے بعد وہ شام سے پہلے ہی واپس لوٹ جاتی تھی کیونکہ شام میں صدیقی کی آمد ہوتی تھی اور کبھی وہ سہ پہر میں بھی آ جاتا تھا۔
ایک روز ناجیہ اس سے ملاقات کرنے آئی ہوئی تھی کہ جاسم نے ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد کہا۔ "ناجیہ! میں نے جیل میں پورے آٹھ سال گزارے ہیں لیکن اتنا بور نہیں ہوا جتنا ان تین دن میں ہو چکا ہوں۔ بس، سارا دن اسکرپٹ پڑھتے رہو یا پھر سوتے رہو۔ بھلا یہ بھی کوئی لائف ہے۔ نہ کوئی ہلا گلا اور نہ ہی کوئی موج مستی!"
"تمہارے من میں کیا چل رہا ہے؟" ناجیہ نے ٹٹولتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔
"میرا جی چاہ رہا ہے کہ تمہارے ساتھ باہر نکلوں۔" جاسم نے کہا۔ "ہم کھلی فضا میں تھوڑا گھومیں پھریں..... کافی پئیں... آئس کریم کھائیں۔"
"لیکن سر نے تو تمہاری آؤٹنگ پر پابندی عائد کر رکھی ہے۔" ناجیہ نے اسے یاد دلایا۔
"جس طرح بعض ریاکار اور فتنہ پرور مولوی اپنی مطلب برآری کے لیے آدھی، ادھوری بات بتاتے ہیں، تم میرے ساتھ ویسا سلوک تو نہ کرو ——" جاسم نے شاکی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ "سر نے پابندی والی بات کے ساتھ یہ بھی تو کہا تھا کہ کسی اشد ضرورت کے تحت میں آؤٹنگ پر جا سکتا ہوں۔"
"ہاں، مجھے یاد ہے لیکن یہ سمجھ نہیں آ رہا کہ اس وقت تمہیں کون سی شدید حاجت درپیش ہے جس کے لیے باہر جانا ناگزیر ہو؟" ناجیہ نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔
"انسان کی زندگی میں اس کی خوشیاں سب سے زیادہ اہم ہوتی ہیں۔" جاسم نے کہا۔ "میں بھی اگر تھوڑا وقت باہر گزار لوں گا تو مجھے اس سے بے انتہا خوشی حاصل ہوگی اور ابھی تو سر کے آنے میں کافی دیر ہے۔ ان کی آمد سے پہلے ہی ہم لوٹ آئیں گے۔"
"او کے۔" ناجیہ نے اس کی ضد کے سامنے پسپائی

"التجا"

بیگم کار لے کر روانہ ہونے لگیں تو شوہر نے التجائیہ لہجے میں کہا۔ "اگر تم محسوس کرو کہ گاڑی قابو سے باہر ہونے لگی ہے تو کم از کم اتنی کوشش ضرور کرنا کہ کسی سستی سی چیز کو ٹکر مارنا۔"

"حل"

لبنیٰ ایک روز دفتر سے گھر پہنچیں تو خاصا بڑا ایک کارٹن اٹھائے ہوئے تھیں جس میں چھوٹے چھوٹے سوراخ تھے۔
"یہ کیا اٹھا لائی ہیں؟" بہن نے پوچھا۔
"تمہیں معلوم ہے مجھے خواب میں چوہے نظر آتے ہیں۔ انہیں پکڑنے کے لیے بلی لائی ہوں۔" لبنیٰ نے بتایا۔
"لیکن خواب میں نظر آنے والے چوہے تو خیالی ہوتے ہیں۔" بہن نے حیرت سے کہا۔
"کوئی بات نہیں... بلی بھی خیالی ہے۔" لبنیٰ نے اطمینان سے جواب دیا۔

"راہنمائی"

گاڑی میں سفر کرتے ہوئے ایک صاحب راستہ بھول گئے۔ انہوں نے ایک سائیکل سوار کو روک کر پوچھا۔ "بھائی گلستانِ جوہر کی طرف کون سی سڑک جاتی ہے؟"
"مجھے معلوم نہیں۔" سائیکل سوار نے جواب دیا۔
"اچھا... یونیورسٹی روڈ کس طرف ہے؟"
"مجھے معلوم نہیں۔"
"تمہیں کچھ معلوم بھی ہے؟" کار والے صاحب ذرا جل کر بولے۔
"مجھے یہ معلوم ہے کہ میں اپنے راستے پر صحیح جا رہا ہوں اور راستہ نہیں بھولا ہوں۔" سائیکل سوار نے اطمینان سے جواب دیا۔

نظارہ

ایک جہاز سمندر پر سے اڑتے ہوئے فضا میں ہچکولے کھانے لگا۔ جس پر مسافروں نے چیخنا چلانا شروع کر دیا اور ہر طرف بھگدڑ سی مچ گئی۔ اسی دوران اسپیکر پر جہاز کے کپتان کی آواز سنائی دی۔ "خواتین و حضرات! گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں، یہ ایک بہترین ساؤنڈ جہاز ہے۔ غیر ملکی ماہرین روزانہ اس کی دیکھ بھال کرتے ہیں، لہٰذا آپ بالکل مطمئن ہو کر سفر کریں۔ آپ کھڑکی سے باہر دیکھیں نہایت خوب صورت نظارہ ہے۔ شام ہونے کو ہے سورج کا سرخ گولا سمندر میں غروب ہو رہا ہے۔ لوگ رنگ برنگی کشتیوں میں سمندر کی سیر کر رہے ہیں۔ آپ ایک لال رنگ کی کشتی دیکھ رہے ہیں... میں اسی کشتی سے بول رہا ہوں!"

(محمد محمود احمد آکاش کی سوغات، صادق آباد سے)

اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے ایک چھوٹے سے کام کے لیے دہلی کالونی تک جانا ہے۔ تم بھی میرے ساتھ چلو۔ میں تمہیں ایک آدھ گھنٹے میں واپس یہاں ڈراپ کردوں گی۔“

”یہ ہوئی نا بات۔“ جاسم نے پُرجوش انداز میں کہا۔

”وہ دونوں سرمد صدیقی کے آفس سے نکل آئے۔“ ناجیہ اسے دہلی کالونی لے آئی پھر اس نے ایک دکان کے سامنے گاڑی روک دی۔

جاسم نے مذکورہ دکان کی پیشانی پر لگے ہوئے بورڈ پر نگاہ ڈالی تو ناجیہ سے پوچھا۔ ”تم پاک الیکٹرونکس“ پر کیا لینے آئی ہو؟“

”پاک الیکٹرونکس والے گھریلو استعمال کی اشیا آسان اقساط پر دیتے ہیں۔“ ناجیہ نے بتایا۔ ”میں نے اس دکان سے زریا کو ایک فریج اور واشنگ مشین دلوائی تھی۔ اسی سامان کی قسط جمع کرانے آئی ہوں۔ تم گاڑی ہی میں بیٹھو گے یا میرے ساتھ آرہے ہو؟“

”گھر میں بیٹھو یا آفس میں اور یا پھر کار میں، ایک ہی بات ہے۔“ جاسم نے اپنی جانب کے دروازے کی سمت ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”میں بھی تمہارے ساتھ دکان کے اندر جاؤں گا۔“

وہ دونوں گاڑی سے باہر نکل آئے پھر پہلو بہ پہلو چلتے ہوئے ”پاک الیکٹرونکس“ میں داخل ہو گئے۔ مذکورہ دکان کے اندر گھریلو استعمال کی مختلف چیزیں فریج، ایل سی ڈی، ایل ای ڈی، مائیکروویوز، واشنگ مشین، گیزر وغیرہ بڑے سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں اور دکان کے آخری حصے میں ایک ادھیڑ عمر شخص اپنی میز کرسی لگائے بیٹھا تھا۔

جاسم کی نظر جیسے ہی مذکورہ شخص کے چہرے پر پڑی، اس کے دماغ کو ایک جھٹکا لگا اور وہ پتھر کا بت بنا اسے دیکھتا رہ گیا۔

بعض لوگوں کے لیے آپ کے دل میں اتنی شدید نفرت پنہاں ہوتی ہے کہ ان کی شکل دیکھتے ہی آپ کا خون کھول اٹھتا ہے۔ ان لمحات میں جاسم بھی اسی نوعیت کی ذہنی کیفیت سے گزر رہا تھا۔ تاہم اپنے جذبات کی برافروختگی کو قابو میں رکھتے ہوئے اس نے چہرے سے یہ نہیں جھلکنے دیا کہ وہ ”پاک الیکٹرونکس“ کے مالک، اس رذیل شخص کو پہچان چکا ہے۔ جاسم کی اسی دوراندیشی نے جلیل کو ایک لمحے کے لیے بھی کسی قسم کے شک میں مبتلا نہیں ہونے دیا تھا۔

جلیل ماموں نے آخری بار جاسم کو کم و بیش ساڑھے آٹھ سال پہلے جیل کے ملاقات والے حصے میں دیکھا تھا جب وہ ایک نوعمر دبلا پتلا لڑکا ہوا کرتا تھا۔ اس وقت کے جاسم اور اب کے جاسم میں قد کاٹھ، وزن، جسامت، نقش و نگار اور اسٹائل کے حوالے سے زمین آسمان کا فرق پیدا ہو چکا تھا۔ جلیل کو ذرا سا بھی احساس نہیں ہوا کہ ناجیہ کے ساتھ اس کی دکان میں داخل ہونے والا یہ کڑیل جوان اس کا وہی اکلوتا بھانجا ہے جسے کئی سال پہلے اس نے کہیں کا نہیں چھوڑا تھا۔

جتنی دیر میں ناجیہ واشنگ مشین اور فریج کی قسط ادا کرنے کے کاغذی مرحلے سے گزری، جاسم اپنے اندرون کی برانگیختگی سے نبرد آزما، وہاں رکھے ہوئے گھریلو استعمال کے مختلف سامان کا اس طرح جائزہ لیتا رہا جیسے وہ بھی کوئی ضرورت مند ہو اور وہاں سے قسطوں پر کچھ خریدنے کا ارادہ رکھتا ہو۔

وہ لوگ گاڑی میں آکر بیٹھے تو ناجیہ نے پوچھا۔ ”اب کدھر کا ارادہ ہے... گھر یا آفس؟“

”آفس...“ جاسم نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

”آفس بھی کوئی کھانے پینے کی چیز ہے بھلا... ؟“

”آفس کھانے پینے کی جگہ تو ہے نا...“ جاسم نے بہ دستور سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”تم آفس چلو۔ ہمیں جو بھی کھانا پینا ہوگا، آن لائن منگوا لیں گے۔“

”اوکے...“ ناجیہ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے بولی۔

ان کا واپسی کا سفر شروع ہو گیا۔ جب سے جاسم نے جلیل ماموں کو دیکھا تھا اس کے دماغ میں ایک آتش فشاں بیدار ہو گیا تھا۔ یہ کمینہ شخص اس کے باپ کی دردناک موت اور اس کی اپنی بربادی کا بلاشک و شبہ ذمے دار تھا۔ اس بدذات نے دولت کے لالچ میں ایک طرف جاسم کے باپ قاسم باری کو مرنے کے لیے چھوڑ دیا تھا اور دوسری جانب جاسم کو جرمِ بے گناہی میں جیل بھجوا کر اس کی زندگی کے قیمتی آٹھ سال چھین لیے تھے۔ علاوہ ازیں اس کی مرحوم ماں رخشندہ بیگم کے طلائی زیورات اور ان کے گھر کا قیمتی سامان فروخت کرکے پانچ لاکھ کی تگڑی رقم کے علاوہ بھی کافی مال بنا لیا تھا۔ جاسم کی نظر میں مقدس رشتوں کا قاتل یہ شخص کسی بھی رعایت کا مستحق نہیں تھا بلکہ اس کا حشر راجو سے کہیں زیادہ بھیانک اور عبرت ناک ہونا چاہیے تھا۔

ناجیہ، جاسم کے موڈ اور مزاج کو اچھی طرح جانتی اور سمجھتی تھی لہٰذا اس نے راستے بھر جاسم کی کیفیت میں رونما ہونے والی اس اچانک تبدیلی کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا۔ آفس پہنچنے کے بعد جب وہ سیٹل ہو گئے اور انہوں نے

اپنے لیے ریفریشمنٹ کا آرڈر دے دیا تو ناجیہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

”ہاں... اب بتاؤ، تمہارے ذہن میں کیا چل رہا ہے؟“

جواب دینے کے بجائے جاسم نے سوال کر دیا۔ ”تمہیں میرے چہرے اور آنکھوں میں کیا دکھ رہا ہے؟“

”میں تمہارے دل کا حال تو نہیں جان سکتی...“ ناجیہ نے ٹٹولتی نظر سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”لیکن تمہارے ”پاک الیکٹرونکس“ میں داخل ہونے کے بعد میں نے تم میں ایک عجیب و غریب بدلاؤ محسوس کیا ہے جیسے اچانک تم نے کوئی غیر متوقع چیز دیکھ لی ہو... ایم آئی رائٹ؟“

”ایبسولیوٹلی رائٹ...“ جاسم نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”تو بتاؤ پھر... تم نے اس دکان میں ایسا کیا دیکھ لیا ہے؟“ ناجیہ نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

”کیا تم ”پاک الیکٹرونکس“ کے مالک کے نام سے واقف ہو؟“ جاسم نے معتدل انداز میں استفسار کیا۔

”نہیں، میں نے کبھی اس بندے سے کوئی ذاتی سوال نہیں کیا۔“ ناجیہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ”مجھے کبھی اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔ ویسے کارڈ پر ”پاک الیکٹرونکس“ کے نیچے پروپرائٹر کے طور پر ”جے اے، وارثی“ لکھا ہوا ہے۔“

”جے۔اے۔وارثی کا مطلب ہے، جلیل احمد وارثی!“ جاسم نے انکشاف انگیز انداز میں بتایا۔

”او مائی گاڈ...!“ ناجیہ حیرت سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولی۔ ”یُو مین، تمہارے جلیل ماموں...؟“

”یس! آئی مین اِٹ...“ جاسم نے زہرخند لہجے میں کہا۔ ”یہی ہے وہ شخص جس نے میری تباہی اور بربادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ وہ اس کا وقت تھا اور یہ میرا وقت ہے۔ قدرت نے بڑے انتظام سے مجھے اس تک پہنچا دیا ہے۔ اس کے بعد میرا کام شروع ہوتا ہے اور تم تو جانتی ہی ہو ناجیہ...“ لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر بولا۔ ”میں اپنا کام کتنا پرفیکٹ کرتا ہوں۔“

”جے بی... تمہارے ارادے مجھے اچھے نظر نہیں آرہے۔“ وہ متفکر نگاہ سے اسے گھورتے ہوئے بولی۔ ”یقیناً تم اس وقت اپنے ذہن میں مار دھاڑ سے بھرپور کوئی سین ارینج کرنے میں مصروف ہو... ہیں نا؟“

”تو تمہارے خیال میں مجھے پھولوں کا ہار لے کر اس کے پاس جانا چاہیے۔“ جاسم نے شاکی لہجے میں کہا۔ ”وہ ہار اس کے گلے میں پہنانے کے بعد کہنا چاہیے... ماموں آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ آپ کو بالکل اندازہ نہیں کہ میں نے یہ نو سال آپ کی جدائی میں کس اذیت سے گزارے ہیں اور آپ ہیں کہ دیکھ کر مجھے پہچانا بھی نہیں۔ خیر... آپ کو یہ بھولا بھالا اکلوتا بھانجا مبارک ہو۔“

”میں مذاق نہیں کر رہی جے بی۔“ ناجیہ نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”چند روز بعد ہمارا یونٹ استنبول روانہ ہونے والا ہے اس لیے ایسا کوئی کام نہیں کرنا جو ہماری راہ کی رکاوٹ بن جائے۔“

”دیکھو، میں تو سر کے حکم کے مطابق، اس آفس تک محدود ہو کر رہ گیا ہوں۔ اس سے زیادہ احتیاط پسندی میرے بس کی بات نہیں۔“ وہ معتدل انداز میں بولا۔ ”ویسے میں نے ماموں کو ڈھونڈنے کی بالکل کوشش نہیں کی۔ قدرت نے خود اسے لاکر میرے سامنے کھڑا کر دیا ہے۔ اس کا مطلب ہے، قدرت مجھ سے کوئی خاص قسم کا تقاضا کر رہی ہے۔ مجھے اس کی پکار پر لبیک کہنا چاہیے۔“

”یہ ”لبیک“ استنبول سے واپسی پر بھی تو کہا جا سکتا ہے۔“ ناجیہ نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”جے اے وارثی کہیں بھاگا تو نہیں جا رہا۔ تمہارے لیے اطمینان کا پہلو یہ ہے کہ اس نے تمہیں پہچانا نہیں۔“

”یہ تو تم سولہ آنے سچ کہہ رہی ہو۔ میں تمہاری تجویز پر ضرور غور کروں گا۔“ جاسم نے پُرخیال انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ”پاک الیکٹرونکس کی ٹائمنگز کیا ہیں؟“

”دوپہر گیارہ سے رات نو بجے تک۔“ ناجیہ نے بتایا۔

”اور ہفتہ وار چھٹی...؟“ جاسم نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

”کسی بھی دن نہیں۔“ ناجیہ نے جواب دیا۔ ”یہ دکان ہفتے کے ساتوں دن کھلتی ہے۔“

جاسم نے بے ساختہ کہا۔ ”گُڈ!“

”کیا پلیِن کر رہے ہو؟“ وہ اسے گھورتے ہوئے بولی۔ ”میری بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئی؟“

”تمہاری ہر نصیحت اور تجویز کو میں سنجیدگی لیتا ہوں ناجیہ۔“ وہ اس کے چہرے پر نگاہ جما کر بولا۔

”پھر یہ اظہارِ شکر گزاری کیا معنی رکھتی ہے؟“

”اوہ یہ...“ وہ بے پروائی سے کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ”وہ تو میں محض ”ہوم ورک“ کر رہا ہوں۔“

ناجیہ مزید تھوڑی دیر اس کے پاس بیٹھی پھر صدیقی کی

رخصت ہوگئی۔
آنے سے پہلے وہ آفس سے
اس رات پہلا پہر کے جانے کے بعد جب جاسم
سونے کے لیے سونے پر لیٹا تو ایک فون کال نے اسے بے
چین کر دیا۔ مذکورہ کال اس بلڈنگ کے یونین انچارج کی تھی
جہاں جاسم، اکبر محمود کے ساتھ رہائش پذیر تھا۔ یونین
انچارج کا جاسم کو فون کرنا کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ اس
وقت رات کے ڈھائی بجے تھے۔
''جی اشتیاق بھائی...'' جاسم نے اس کی کال پک
کرتے ہوئے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ ''خیریت...
اس وقت آپ نے فون کیا ہے؟''
''اگر خیریت ہوتی تو میں اتنی رات گئے آپ کو بھی
ڈسٹرب نہ کرتا۔'' انچارج نے بتایا۔ ''اصل میں، آپ والے
فلیٹ میں آگ لگ گئی ہے۔ آپ کا فلیٹ میرے فلیٹ کے
بالکل سامنے ہے اس لیے سب سے پہلے مجھے اس سانحے کی خبر
ہوئی۔ میں نے فائر بریگیڈ کو فون کر دیا ہے۔ اس کے بعد میں
نے آپ کے پارٹنر کو کال کی تو پتا چلا کہ وہ اپنے گاؤں نواب
شاہ گیا ہوا ہے۔ آپ جہاں بھی ہیں فوراً گھر آ جائیں۔''
اس بلڈنگ میں گراؤنڈ پلس تھری فلورز تھے۔ گراؤنڈ
پر اے سی اور فریج وغیرہ کی ریپئرنگ کا کام کرنے والوں کی
دکانیں تھیں اور اوپر کے تینوں فلورز میں لوگوں کی رہائش
تھی۔ ہر فلور پر آمنے سامنے دو فلیٹ بنے ہوئے تھے۔ جاسم
اور اشتیاق سیکنڈ فلور پر رہتے تھے۔
جاسم نے پوری توجہ سے اشتیاق کی بات سنی اور اس
کے خاموش ہونے سے پہلے وہ ایک حتمی فیصلے پر پہنچ چکا تھا۔
اسی فیصلے کی روشنی میں اس نے کہا۔
''اشتیاق بھائی! میں ایک آؤٹ ڈور شوٹنگ کے لیے پچھلے
تین دن سے نکلا ہوا ہوں اس لیے فوری طور پر آپ کے پاس
نہیں پہنچ سکتا۔ آپ ہمارے والے فلیٹ کا تالا توڑ دیں۔''
''آپ سے ابھی اگر رابطہ نہ ہوتا تو مجبوراً مجھے یہی کرنا
پڑتا۔'' اشتیاق نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔
''کچھ پتا چلا، اس آتشزدگی کا سبب کیا ہے؟'' جاسم
نے پوچھا۔
''یقین سے تو سردست کچھ نہیں کہا جا سکتا۔'' اشتیاق
نے بتایا۔ ''زیادہ امکان شارٹ سرکٹ کا نظر آ رہا ہے۔
فلیٹ کے اندر آپ لوگوں کا کوئی قیمتی سامان تو نہیں رکھا
ہوا؟''
''میرے تو چند جوڑے کپڑے اور جوتے وغیرہ ہی
ہیں۔'' جاسم نے کہا۔ ''البتہ مظہر کی اکثر تعداد کی بہت ساری
[illegible] ہے۔
کتابیں تھیں جن میں سے ہر کتاب قیمتی [illegible]
''ہم ان کی کتابوں کو اور آپ لوگوں کے دیگر سامان کو
بچانے کی حتی الامکان کوشش کریں گے۔'' اس نے کہا۔
''فائر بریگیڈ والے آ گئے ہیں۔ میں کل دن میں کسی وقت
آپ کو تفصیلی رپورٹ دوں گا۔''
جاسم نے اشتیاق کا شکریہ ادا کرنے کے بعد سیلولر رابطہ
موقوف کر دیا اور سوچنے لگا۔
''اگر طارق روڈ والے فلیٹ میں ہونے والی آتشزدگی
کا یہ واقعہ شارٹ سرکٹ کے باعث رونما ہونے والا کوئی
اتفاقی حادثہ نہیں ہے تو پھر اس سنگین کارروائی کے پیچھے یقیناً
راجا بنڈ کمپنی کا ہاتھ ہے۔ اس نے مجھے سوچے سمجھے منصوبے
کے تحت حالتِ نیند میں جلا کر مارنے کی کوشش کی ہے۔
مطلب... اس کی جانب سے دشمنی ختم کرنے کا کوئی
پروگرام نہیں ہے۔''
''جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔'' اس نے بے پروا انداز
میں خودکلامی کی اور اپنی سوچ کے دھارے کو جلیل ماموں کی
جانب موڑ دیا۔
اس خود غرض، لالچی اور بے حس شخص نے اپنی کمپنین
کے ذریعے جاسم پر بہت زیادہ قرض چڑھا دیا تھا جس کی
ایک ایک پائی ادا کیے بغیر جاسم کو سکون نہیں مل سکتا تھا۔ وہ نیند
کی وادی میں قدم رکھنے سے پہلے خیالات کے گھوڑے پر سوار ہو
کر جلیل سے کیا حساب چکتے کی منصوبہ بندی کرنے لگا۔

☆☆☆

اگلے روز اشتیاق نے دوپہر میں، جاسم کو ان کے
فلیٹ کی تباہ حالی کا قصہ سنا دیا۔ فائر بریگیڈ کو آگ پر قابو
پانے میں دو گھنٹے لگ گئے تھے۔ بہرحال، وہ لوگ اکبر محمود
کی چند کتابیں ہی بچا پائے تھے۔ باقی سب سامان اور کپڑا لتا
جل کر خاک ہو گیا تھا۔ اس خطرناک بے قابو آگ نے کسی
حد تک اشتیاق کے گھر کو بھی متاثر کیا تھا۔ تاہم وہاں کوئی
قابلِ ذکر نقصان نہیں ہوا تھا۔
''آج صبح اکبر نے مجھے فون کیا تھا۔'' اشتیاق نے
بتایا۔ ''وہ آپ کو بھی کال کرنے کی کوشش کرتا رہا مگر آپ نے
فون اٹینڈ نہیں کیا۔ بہرحال، وہ آج شام تک کراچی پہنچ
جائے گا۔ آپ کا کیا پروگرام ہے؟''
''میں گہری نیند میں تھا اس لیے اکبر کی کال پک نہیں
کر سکا۔'' جاسم نے کہا۔ ''جہاں تک میری واپسی کا تعلق ہے
تو اس میں ہفتہ دس دن اور لگیں گے کیونکہ میں شوٹنگ کا کام
ختم کیے بغیر یہاں سے ہل بھی نہیں سکتا۔ ویسے بھی اشتیاق

بھائی... [illegible] سے تھوڑی دیر سے بے توقف کیا پھر اضافہ
کرتے ہوئے کہا۔
''میں تو کافی دنوں سے شفٹنگ کے بارے میں سوچ
رہا تھا۔ اس واقعے کے بعد میں شاید اس فلیٹ میں رہ نہیں
سکوں گا۔ اکبر سے میں خود بات کر لوں گا اور ان صاحب
سے بھی جنھوں نے مجھے وہ فلیٹ دلوایا تھا۔ لین دین کا جو بھی
حساب ہوگا، وہی صاحب دیکھ لیں گے۔''
جاسم کے لیے اس رہائش کا بندوبست ناجیہ نے اپنے
ایک جاننے والے بروکر کے ذریعے کیا تھا اور اس سلسلے میں
کچھ رقم ڈپازٹ کے طور پر بھی ادا کی تھی۔ اس فلیٹ میں ایسی
کوئی بھی قیمتی شے نہیں تھی جس کے لیے جاسم ادھر کا رخ کرتا۔
جو بھی تھا، وہ سب جل کر راکھ ہو چکا تھا۔ اس فلیٹ کو ہمیشہ کے
لیے خیرباد کہنے کا خیال جاسم کے ذہن میں اس لیے بھی آیا تھا
کہ وہ ٹھکانا اس کے لیے ہرگز محفوظ نہیں رہا تھا۔ راجو، ڈیڈا اور
جانے کون کون اس فلیٹ پر نگاہ گاڑے بیٹھا تھا۔
''یہ آپ نے ٹھیک کیا کہ مجھے اپنے ذہن کے بارے
میں بتا دیا۔'' اشتیاق نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔
''آپ فکر نہ کریں، باقی کے معاملات میں خود دیکھ لوں گا۔
بس، آپ ان صاحب کو ضرور بھیج دیجیے گا جن کے تھرو آپ
نے یہ فلیٹ لیا تھا۔ ہو سکتا ہے، دونوں پارٹیوں کو یہ نقصان
شیئر کرنا پڑے۔''
''اگر منصفانہ نظر سے دیکھا جائے تو نقصان مالک
مکان کا نہیں بلکہ میرا اور اکبر کا ہوا ہے۔'' جاسم نے قدرے
تلخ لہجے میں کہا۔ ''مالک مکان تو پینٹ کروائے گا تو فلیٹ نیا
نکور ہو جائے گا جبکہ ہمارے سامان کی بھرائی کسی بھی طور ممکن
نہیں... خیر، آپ ٹینشن نہ لیں۔ وہ صاحب اس ایشو کو
ایڈریس کر لیں گے۔''
اشتیاق نے جاسم کا شکریہ ادا کرنے کے بعد ''اللہ
حافظ'' کہہ دیا۔ ایک گھنٹے کے بعد ناجیہ اس سے ملنے آئی تو
اس نے ناجیہ کو سارا حال کہہ سنایا اور آخر میں فیصلہ کن انداز
میں کہا۔
''تم اپنے جاننے والے اس بروکر سے رابطہ کرو اور
آج یا پھر کل تک اس معاملے کو نمٹا ڈالو۔ آج کی تاریخ میں
اکبر محمود نواب شاہ سے لوٹ آئے گا۔ وہ ایک طالب علم
ہے۔ پتا نہیں، اس کے والدین نے اس کے مستقبل کے
حوالے سے کیا کیا سپنے دیکھ رکھے ہوں گے۔ اگرچہ وہ معاشی
طور پر ایک آسودہ حال زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتا ہے
لیکن ہر اسٹوڈنٹ کی اپنی بے شمار مجبوریاں ہوتی ہیں اور اس
آتشزدگی میں سب سے زیادہ نقصان بھی اسی کا ہوا ہے۔
اکبر اس فلیٹ میں مزید قیام کرے گا یا نہیں، یہ فیصلہ تو وہی
کرے گا۔ بس تم ذرا اس بات کا خیال رکھنا کہ اس پر کوئی
مالی دباؤ نہ آئے۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو؟''
''ہاں، میں سمجھ گئی۔'' ناجیہ نے اثبات میں گردن
ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں اس ایشو کو ہینڈل کر لوں گی۔ آج
ہفتہ ہے۔ میں کل ادھر کا چکر لگاتی ہوں۔ ویسے، یہ بتاؤ کہ تم
نے واقعی وہ فلیٹ چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے؟''
''اس کے سوا اور کوئی راستہ بھی تو نہیں ہے۔'' وہ گہری
سنجیدگی سے بولا۔ ''استنبول روانگی تک تو مجھے اسی آفس میں
نظربند رہنا ہے۔ اس کے بعد دو ماہ تک استنبول والی شوٹنگ
میں گزر جائیں گے۔ یعنی اس فلیٹ سے میرا کوئی تعلق واسطہ
نہیں رہ پائے گا اور وہاں سامان کے نام پر میرا جو کچھ موجود
تھا، اب وہ راکھ میں بدل چکا ہے لہٰذا اس بارے میں سوچنا
وقت ضائع کرنے کے مترادف ہو
گا۔ جب ہم لوگ استنبول والا کام مکمل کر کے واپس آ گئیں گے
تو پھر نئی رہائش گاہ کے بارے میں بھی غور و فکر کر لیا جائے گا۔''
ناجیہ مزید کچھ وقت اس کے ساتھ گزارنے کے بعد
واپس چلی گئی۔ سہ پہر کے وقت سرمد صدیقی آفس آئے تو ان
کے ساتھ ڈائریکٹر بابر بخاری بھی تھے۔ جاسم سے ''ہیلو ہائے''
کرنے کے بعد وہ دونوں صدیقی کے کمرے میں چلے گئے۔
سرمد صدیقی نے اپنا آفس نثار شہید پارک کے
نزدیک ایک اپارٹمنٹ بلڈنگ میں بنا رکھا تھا۔ ایک پورا
لگژری اپارٹمنٹ ان کی کسٹڈی میں تھا۔ کیٹگری کے لحاظ
سے یہ ایک ''ٹو بی ڈی ڈی'' یعنی دو بیڈروم، ایک ڈرائنگ،
ایک ڈائننگ اپارٹمنٹ تھا۔ ایک بیڈروم میں صدیقی صاحب
نے اپنا آفس بنا رکھا تھا۔ دوسرا بیڈروم، ریکارڈ روم کے طور
پر استعمال ہوتا تھا جہاں پر مختلف اسکرپٹ، سی ڈی، ڈی وی
ڈی، ڈی وی ڈی اور دوسری بہت سی اسی نوعیت کی چیزیں محفوظ
تھیں جن میں کیمراز اور ان کی اسیسریز بھی شامل تھیں۔
ڈائننگ روم اور ڈرائنگ روم کو ان کے میرٹ پر استعمال کیا
جا رہا تھا۔ جاسم نے ان دنوں اسی ڈائننگ روم میں ڈیرا ڈال
رکھا تھا۔ ڈرائنگ روم کی ایک سلائیڈنگ ونڈو نثار شہید پارک
کی جانب کھلتی تھی۔ یہ ونڈو نہایت ہی صحت افزا اور فرحت
بخش تھی۔ علی الصباح کا سماں ہو یا سہانی شام کا منظر، نثار شہید
پارک کی رونق اور خوب صورتی نظر کو رنگ و نور اور دل و دماغ
کو تازگی سے بھر دیتی تھی۔
سرمد صدیقی اور بابر بخاری میں استنبول والے سیریل

کے حوالے سے گفتگو کا سلسلہ جاری تھا۔ اب یہ معاملہ آخری مراحل میں داخل ہو چکا تھا۔ بخاری نے صدیقی کو بتایا۔

"آج نو تاریخ ہے۔ میں نے آئندہ ہفتے یعنی سولہ تاریخ کی سیٹیں کنفرم کروائی ہیں۔ استنبول والی شوٹنگ کے لیے ہمارے یونٹ میں کل بائیس افراد ہیں۔ سیریل کی ہیروئن اور ہیرو پہلے سے وہاں گئے ہوئے ہیں۔ آپ تو جانتے ہی ہیں، وہ دونوں حقیقی زندگی میں بھی ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں۔ باقی کے ہم بیس افراد اگلے ہفتے استنبول کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔ آپ کے لاڈلے کا کیا حال ہے؟"

بخاری کے آخری سوالیہ جملے پر صدیقی زیرِ لب مسکرا کر رہ گیا۔ اس نے معنی خیز انداز میں جواب دیا۔ "اگر جنگل کی آزاد فضا میں سانس لینے والے شیر کو کسی پنجرے میں قید کر دیا جائے تو جو اس کی کیفیت ہوگی، وہی سب جے بی پر بھی گزر رہی ہے۔ بہرحال، وہ بڑی ثابت قدمی سے میرے فیصلے پر جما ہوا ہے۔ ارے ہاں....." صدیقی نے چونکتے ہوئے انداز میں کہا۔ "مجھے اس سے اظہارِ افسوس کرنا ہے۔ ٹھہریں میں اسے اندر بلاتا ہوں۔"

"مجھے بھی اسے اس کے ایک فین کا پیغام دینا ہے۔" بخاری نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

صدیقی نے بخاری کی بات پر توجہ نہیں دی اور جاسم کو اپنے کمرے میں بُلا لیا۔ جب یہ دونوں حضرات آفس میں داخل ہوئے تھے تو جاسم کی ان سے ہلکی پھلکی علیک سلیک ہو گئی تھی۔ جب جاسم اپنے پروڈیوسر کے سامنے آ کر بیٹھا تو اس نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔

"مجھے تمہارے فلیٹ والی آتشزدگی کا پتا چلا ہے۔ شکر کرو کہ تم اس وقت اپنے فلیٹ میں موجود نہیں تھے اور تمہارا فلیٹ میٹ بھی اپنے گاؤں گیا ہوا ہے ورنہ تم لوگوں کو ناقابلِ تلافی نقصان اٹھانا پڑتا۔ چیزیں تو انسان دوبارہ بھی خرید لیتا ہے لیکن اگر جان باقی نہ رہے تو پھر سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں سر!" وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا پھر صدیقی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔ "آپ کو میرے فلیٹ کے بارے میں کس نے بتایا۔ یہ واقعہ تو گزشتہ رات ہی پیش آیا ہے؟"

"میں آفس آنے کے لیے جب گھر سے نکل رہا تھا تو ناجیہ کی کال آئی تھی۔" صدیقی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ "وہ تمہارے پاس سے ہو کر گئی ہے نا؟"

جاسم ایک گہری سانس لے کر رہ گیا پھر بولا۔ "جی سر..... میں نے اس سے ذکر کیا تھا اور اسے وہ فلیٹ چھوڑنے کے بارے میں بھی میں نے بتا دیا ہے۔ جب ہم استنبول سے واپس آئیں گے تو مجھے اپنے لیے کسی نئی رہائش گاہ کا بندوبست کرنا پڑے گا۔"

"سب ہو جائے گا۔" صدیقی نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ "تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔"

بابر بخاری کو جب آتشزدگی والے واقعے کے بارے میں بتایا گیا تو اس نے بھی جاسم سے ہمدردی کا اظہار کیا پھر پوچھا۔ "تمہاری تیاری کیسی جا رہی ہے..... آرام ہی چل رہا ہے یا کچھ وقت اسکرپٹ کو بھی دے رہے ہو؟"

"کچھ نہیں بلکہ سارا وقت اسکرپٹ ہی کو دے رہا ہوں۔" جاسم نے بیزاری سے کہا۔ "یہاں کرنے کو اور کچھ ہے ہی نہیں۔"

"اگر تم سارا وقت اسکرپٹ کو دے رہے ہو تو پھر ناجیہ کو یہاں آ کر سوائے بوریت کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا ہوگا۔" بخاری نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر چھیڑنے والے انداز میں کہا۔ "وہ چپ چاپ بیٹھی تمہیں گھورتی رہتی ہوگی اور پھر پاؤں پٹخ کر یہاں سے رخصت ہو جاتی ہوگی؟"

وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔ "ایسی بھی بات نہیں ہے سر۔"

"میں تو مذاق کر رہا تھا۔" بخاری نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔ "خوش ہو جاؤ کہ ایک ہفتے کے بعد تمہارا یہ "ہاؤس اریسٹ" ختم ہو جائے گا۔"

"میں سمجھا نہیں سر......" جاسم نے بے ساختہ کہا پھر سوالیہ نظر سے باری باری ڈائریکٹر اور پروڈیوسر کو تکنے لگا۔

بابر بخاری نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں جاسم کو استنبول روانگی کے پروگرام سے آگاہ کر دیا۔ جب اس کی بات ختم ہوئی تو صدیقی نے کہا۔

"بخاری صاحب! آپ کو جے بی کو اس کے کسی فین کا پیغام دینا تھا۔"

"فین" کے ذکر پر جاسم نے الجھن زدہ نظر سے پہلے صدیقی اور پھر بخاری کی طرف دیکھا۔ بخاری نے کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔

"تمہاری نئی فلم جس چینل سے "آن ایئر" ہوئی ہے وہاں تم سے ملنے تمہارا ایک ایسا فین پہنچا تھا جس کا دعویٰ ہے کہ وہ تمہیں کافی عرصے سے جانتا ہے۔"

جاسم کے کان کھڑے ہو گئے۔ بخاری نے بات ادھوری چھوڑی تو وہ پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ "مجھ سے شناسائی کا

دعوے دار، وہ شخص آخر ہے کون؟"

"اس بندے نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔" بخاری نے کہا۔ "ظاہر ہے، مذکورہ چینل پر تمہارے پائے جانے کا کوئی امکان نہیں تھا لہٰذا جب وہ دو، تین مرتبہ تمہاری تلاش میں وہاں گیا تو کسی نے اس کا خیال کرتے ہوئے اسے میرے بارے میں بتا دیا اور کہا کہ اگر تم سے ملاقات کرنا ہے تو وہ مجھ سے ملے کیونکہ تم میرے رابطے میں رہتے ہو۔ وہ اللہ کا بندہ کل میرے پاس پہنچ گیا تھا۔"

"اوہ..... وہ دیکھنے میں کیسا لگتا ہے؟" جاسم نے استفسار کیا۔ "اس نے اپنا نام کیا بتایا ہے آپ کو؟"

"نام تو نہیں بتایا البتہ، وہ ایک دراز قامت اور اسمارٹ شخص ہے۔ رنگت گندمی اور بدن کسرتی۔ اس کے چہرے اور آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ بول چال میں بھی نپا تُلا تھا۔" بخاری نے جاسم کو اس کے فین کی تفصیل سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا۔ "وہ اپنا سیل نمبر دے گیا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ تم اسے اور وہ تمہیں اچھی طرح جانتا ہے..... وہ بلیک پجیرو میں مجھ سے ملنے آیا تھا۔"

"بلیک پجیرو" کے نام پر جاسم کا ماتھا ٹھنکا اور وقت ایک جست لگا کر دو ڈھائی سال پیچھے چلا گیا۔ اس نے تصدیق طلب نظر سے بابر بخاری کو دیکھا اور پوچھا۔ "بلیک منی پجیرو..... نمبر یہ یہ یہ.....!"

"اس کی جیپ کے نمبر پر تو میں نے دھیان نہیں دیا۔" بخاری نے معتدل انداز میں کہا۔ "ہاں، وہ بلیک منی پجیرو ہی تھی۔" پھر اس نے اپنے پرس سے ایک تہ شدہ کاغذ نکال کر جاسم کو دیتے ہوئے کہا۔ "اس پرچے پر تمہارے اس فین کا کانٹیکٹ نمبر لکھا ہوا ہے۔ اگر تم مناسب سمجھو تو کسی وقت اسے کال کر لینا۔ مجھے تو وہ خاصا معقول انسان لگا ہے۔"

"جے بی! تمہارے چہرے کے تاثرات سے تو یہی ظاہر ہے کہ تم اس شخص کو پہچان چکے ہو؟" صدیقی نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"یس سر.....!" جاسم نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس کا نام کامل ہے۔ وہ میرا ایک دیرینہ شناسا اور خیر خواہ ہے۔ جیل سے رہا ہونے کے بعد میں نے اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی مگر مجھے کامیابی نہیں ہوئی۔ پھر مجھے ناجیہ مل گئی اور میں شوبز کی دنیا میں مصروف ہو گیا۔ کامل ایک مخلص اور شریف انسان ہے۔ میں اس سے ضرور کانٹیکٹ کروں گا۔"

جاسم نے کامل کے حوالے سے "شریف انسان" کے الفاظ دانستہ استعمال کیے تھے تاکہ ان دونوں کو کسی قسم کا کوئی شک نہ ہو۔ اگر انہیں بھنک بھی مل جاتی کہ کامل مرحوم دادا کا انتہائی قریبی بندہ تھا تو وہ جاسم کو کبھی بھی اس سے میل ملاقات بڑھانے کی اجازت نہ دیتے اور..... جاسم ہر صورت میں کامل سے ملنے کا متمنی تھا۔

"کانٹیکٹ اور "ہیلو ہائے" کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔" بابر بخاری نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "لیکن زیادہ میل جول ابھی ٹھیک نہیں ہوگا۔ تم کافی دنوں سے اس ہٹ تک محدود ہو اور ٹھیک ایک ہفتے کے بعد تم ہمارے ساتھ استنبول جانے والے ہو جہاں سے دو ماہ کے بعد تمہاری واپسی ہوگی۔ تمہارے سلسلے میں جو یہ احتیاط برتی جا رہی ہے اس کے سنسنی خیز پس منظر سے تم اچھی طرح واقف ہو۔ بہتر یہی ہوگا کہ استنبول والا کام ختم ہونے سے پہلے تم خود کو کسی نئے بکھیڑے میں مت ڈالو۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

جاسم کو بہ خوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ بخاری ڈھکے چھپے الفاظ میں اسے کامل سے ملنے سے روک رہا ہے لیکن جاسم کسی بھی قیمت پر رکنے والا نہیں تھا۔ کامل کا نام سامنے آتے ہی اس کے ذہن کے پردے پر دادا کا چہرہ ابھر آیا تھا۔ دادا، جاسم کا گرو تھا۔ اسے بیوی اور بیٹی سمیت شعیب چاچا نے موت کے گھاٹ اتروایا تھا، وہ سب کچھ جاننا جاسم کے لیے ناگزیر تھا اور اس راز سے پردہ اٹھانے کے لیے کامل سے زیادہ موزوں شخص اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔

یہ تمام تر خیالات سیکنڈ کے دسویں حصے میں اس کے ذہن سے گزرے اور اس نے بخاری کے اطمینان کی خاطر پُراعتماد انداز میں کہا۔ "سر! میں حالات کی نزاکت سے بہ خوبی واقف ہوں۔ آپ بےفکر ہو جائیں۔ استنبول کی شوٹ مکمل ہونے سے پہلے تو کسی سے ملاقات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا البتہ، مجھے کامل سے کال پر یا ٹیکسٹ میسج سے رابطہ لازمی کرنا پڑے گا ورنہ وہ بار بار آپ کے پاس آئے گا اور ضد کرے گا کہ آپ اسے مجھ سے ملوا دیں۔"

"یہ تو تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔" بخاری نے ستائشی نظر سے جاسم کی طرف دیکھا۔ "تمہارا یہ شناسا مجھے ارادے کا پکا اور ثابت قدم لگا ہے۔ تم کوئی بھی مناسب سا بہانہ کر کے ملاقات والا معاملہ فی الحال ٹال دو تو اچھا ہے۔"

"ہو جائے گا سر....." جاسم نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔ "کامل والا معاملہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ میں آپ کو کسی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔"

"ہمیں تم سے یہی امید ہے۔" صدیقی نے ٹھوس

انداز میں کہا۔ ”کیونکہ ہم تمھیں ایک ذمے دار شخص سمجھتے ہیں۔“

اسی رات جب وہ آفس میں اکیلا رہ گیا تو اس نے کامل کے نمبر پر ایک مختصر سا ٹیکسٹ میسج کر دیا۔ عبارت کچھ اس طرح تھی۔

”تمہارا نمبر مجھے ڈائریکٹر صاحب نے دیا ہے۔ اگر تم کامل ہو تو ریپلائی کرو۔“

یقیناً وہ اس وقت جاگ رہا تھا اسی لیے فوراً اس کا ریپلائی آ گیا۔ ”ہاں جاسم، تم نے ٹھیک پہچانا، میں کامل ہی ہوں۔“

”میں کیسے مان لوں کہ تم کامل ہی ہو۔“ ان کے ٹیکسٹ چیٹنگ کا سلسلہ چل نکلا۔ ”یہ میرے لیے کوئی ٹریپ بھی تو ہو سکتا ہے۔ بلیک منی ہیرو اس شہر میں کوئی ایک تو نہیں ہے؟“

”جاسم! تمہارا یہ چٹاؤ انداز مجھے پسند آیا۔“ کامل نے لکھا۔ ”ایک اشارہ دے رہا ہوں۔ امید ہے اس سے تمہاری تسلی ہو جائے گی۔ تم نے آج سے لگ بھگ دو سال پہلے اپنے کیریئر کی پہلی اننگز کھیلی تھی اور اس وقت میں نے تمھیں جیل سے اپنی بلیک منی ہیرو میں بٹھا کر کھیل کے میدان تک پہنچایا تھا یعنی اس فارم ہاؤس میں جہاں تم نے اپنے والدین کے قاتل راجو نامی ایک غلیظ انسان کو کیفرِ کردار تک پہنچایا تھا۔ اتنا کافی ہے یا اور کچھ؟“

”یہ بہت ہے۔“ جاسم نے لکھا۔ ”میں جس کامل کو جانتا ہوں۔ وہ تم ہی ہو۔“

”میں نے تمھیں بہت تلاش کیا۔ جیل سے رہائی کے بعد تم پتا نہیں کہاں غائب ہو گئے تھے۔ پچھلے دنوں تمھیں ٹی وی کے ایک ڈرامے میں دیکھا تو شاید وہ کوئی لانگ پلے تھا۔ تب دوبارہ تم سے ملنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ کیا میں تمھیں ابھی کال کروں۔ مجھے تم سے بہت ساری ضروری باتیں کرنا ہیں؟“

”میں خود تم سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں لیکن فون پر باتیں کرنا میرے خیال میں مناسب نہیں ہوگا۔ کیا تم میرے پاس آ سکتے ہو؟“

”اس وقت......“

”ہاں، اسی وقت!“ جاسم نے لکھا۔ ”کیا یہ ممکن نہیں؟“

”بالکل ممکن ہے۔“ کامل نے خوش اخلاقی میں ریپلائی کیا۔ ”اپنی لوکیشن بھیجو میں آ رہا ہوں۔“

”او کے، میں بھیج رہا ہوں۔“ جاسم نے جواب دیا۔

آدھے گھنٹے ... بعد وہ دونوں، سرمد صدیقی کے آفس میں آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ آئندہ ایک گھنٹے میں انہوں نے ایک دوسرے کو اب تک کے حالات سے تفصیلاً آگاہ کر دیا۔ جاسم کی اسٹوری سن کر کامل کو خوشی ہوئی جبکہ کامل کی بیان کردہ کہانی نے جاسم کو افسردہ کر دیا۔ دادا اور اس کی فیملی کے خاتمے کے بعد ان کا گروہ بکھر کر رہ گیا تھا۔ کامل کے ساتھ صرف چھ افراد تھے اور وہ انہیں لیڈ کر رہا تھا اور یہ سب کچھ شعیب چاچا کی دشمنی کے نتیجے میں ہوا تھا۔

”میں شعیب چاچا کو مکمل طور پر تباہ و برباد کرنے کی قسم کھا چکا ہوں جاسم۔“ کامل نے زہرخند لہجے میں کہا۔ ”اس کے ڈرگ ڈیلنگ، وہتھیار سپلائنگ، ہیومن آرگن ٹرانس پلانٹیشن اور ہیومن ٹریفکنگ کے دھندے رہے ایک طرف، میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ اس نے دادا اور اس کی فیملی کا چراغ گل کر کے ہم سب کی زندگی میں اندھیرا بھر دیا ہے۔ ایسے ناپاک انسان کو جینے کا حق ہے اور نہ ہی دوسرے انسانوں کی زندگیوں سے کھیلنے کا کوئی اختیار ..... کیا تم ایسے غلیظ شخص کو نیست و نابود کرنے میں میرا ساتھ دو گے؟“

”بالکل ساتھ دوں گا۔“ جاسم نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ”میں نے بھی شعیب چاچا کے بارے میں کافی ریسرچ کی ہے لیکن یہ ہیومن ٹریفکنگ والی بات میرے لیے نئی ہے۔“

”یہ کمینہ شخص خوب صورت کمسن انجمر لڑکیوں کو اغوا کر کے اپنے ایک خفیہ ٹھکانے پر قید کر لیتا ہے پھر انہیں ایک کنٹینر میں بھر کر سمندر کے راستے مڈل ایسٹ اور یورپی ممالک کی جانب روانہ کر دیتا ہے۔“ کامل وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ بدذات چونکہ ایکسپورٹ کا بزنس بھی کرتا ہے لہٰذا دیگر کنٹینرز کی شپمنٹ کے ساتھ ہی حسین و جمیل نوعمر لڑکیوں سے بھرا ہوا کنٹینر بھی بحری جہاز پر لاد دیا جاتا ہے۔ جب تک یہ لڑکیاں اس کے ٹھکانے پر قید رہتی ہیں، انہیں نشہ آور ادویات کے انجکشن دیے جاتے ہیں تاکہ وہ کسی فراری کوشش کے بارے میں نہ سوچ سکیں۔ مڈل ایسٹ کے عیاش شیوخ اور یورپ کے ارب پتی بزنس مین ان لڑکیوں کے بڑے اونچے دام دیتے ہیں اور شعیب چاچا کو صرف پیسے سے مطلب ہے، چاہے وہ کہیں سے بھی آئے!“

بات کے اختتام پر کامل کے چہرے پر کچھ ایسے ناگوار تاثرات ابھر آئے جیسے بے دھیانی میں اس نے کوئی کڑوی اور بدمزہ شے چبا لی ہو۔ جاسم نے پوری توجہ سے اس کی وضاحت سنی اور سخت لہجے میں کہا۔

”یہ شعیب چاچا تو بہت ہی مکروہ شخص ہے۔ اسے جتنے بھی سنگین انجام سے دوچار کیا جائے، وہ کم ہوگا۔“

”ہم کم نہیں، زیادہ کریں گے۔“ کامل نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”حد سے زیادہ جاسم۔“

”ڈن!“ جاسم نے حتمی لہجے میں کہا۔ ”لیکن ہمیں جو بھی کرنا ہے، وہ دو ماہ کے بعد کریں گے۔ میں تمھیں بتا چکا ہوں کہ ایک ہفتے کے بعد میں اپنے یونٹ کے ساتھ، دو ماہ کے لیے استنبول جا رہا ہوں۔ وہاں سے واپسی پر میں مکمل طور پر تمہارے ساتھ لگ جاؤں گا مگر فی الحال مجھے استنبول والا مشن مکمل کروانا ہے۔ یہ کمٹمنٹ کا سوال ہے کامل ..... تم میری مجبوری کو سمجھ سکتے ہو۔“

”کمٹمنٹ کا پاس کرنے والوں کی میں دل سے قدر کرتا ہوں۔“ کامل نے کہا۔ ”میں تمہارے پروگرام کو بالکل ڈسٹرب نہیں کروں گا۔ بس، یہ ذہن میں رکھ لو کہ تھوڑا کام ہم استنبول میں نمٹائیں گے اور باقی کا یہاں کراچی میں۔“

”میں کچھ سمجھا نہیں..... !“ جاسم نے الجھن زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”استنبول میں تھوڑا کام نمٹانے سے تمہاری کیا مراد ہے؟“

”شعیب چاچا کے سیٹ اَپ میں میرا بھی ایک آدمی کام کرتا ہے۔“ کامل نے رازدارانہ انداز میں بتایا۔ ”مجھے پکی خبر ملی ہے کہ اس ماہ کے آخری ہفتے میں شعیب کسی بلغارین کارٹل سے ملنے ترکی جا رہا ہے اور ان کی ملاقات استنبول کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں ہوگی۔ میں نے تو استنبول جانے کی تیاری پہلے سے کر رکھی ہے۔ تم نے اپنے پروگرام کے بارے میں بتایا تو میں نے سوچا، وہاں بھی ہم دونوں مل کر کام کر سکتے ہیں۔ اس حوالے سے تمھیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“

جاسم نے پورے دھیان سے کامل کی بات سنی اور اس کے خاموش ہونے پر پوچھا۔ ”شعیب چاچا کون سے ہوٹل میں اس بلغارین کارٹل سے ملاقات کرنے والا ہے؟“

”کارٹل“ دراصل کارپوریٹ ورلڈ کی ایک مخصوص اصطلاح ہے۔ ایسے گروپ آف کمپنیز جو اپنے اثر و رسوخ سے پوری دنیا کی معیشت اور مختلف اشیا کے نرخوں کو کنٹرول کرتے ہیں۔ گولڈ کے ریٹس ہوں یا اسٹاک ایکسچینج انڈیکس ..... سب ان کے اشارۂ ابرو پر سانس لیتے ہیں۔

”ہوٹل سوئسوٹل (دی باسفورس استنبول) میں ......“ کامل نے بتایا۔ ”ملاقات کی تاریخ کے بارے میں مجھے چند روز بعد معلوم ہو جائے گا۔ میں نے اپنے خاص آدمی ادریس کو اس مہم پر لگا رکھا ہے۔“

”سوئسوٹل“ وہ ہوٹل نہیں تھا جو ان کی ڈراما سیریل کی شوٹ میں ایک پرائم لوکیشن کے طور پر استعمال ہونے والا تھا۔ کامل کی باتوں نے جاسم کے تن بدن میں ایک کرنٹ سا دوڑا دیا تھا۔ اس نے پوچھا۔

”یار! شعیب چاچا کچھ عجیب سا نام نہیں ہے۔ اتنے بڑے کاروباری نے اپنے نام کے ساتھ ”چاچا“ کا دُم چھلا کیوں لگا رکھا ہے۔ کیا تم نے اس بارے میں بھی کوئی تحقیق کی ہے؟“

جواب دینے کے بجائے کامل نے پوچھ لیا۔ ”کیا تم اسے ”انکل“ والا چاچا سمجھ رہے ہو؟“

”تو اور یہ کون سا چاچا ہے؟“ جاسم نے حیرت بھری نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

”اکثر لوگ اسے انکل والا چاچا ہی سمجھتے ہیں لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔“ کامل نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ”دراصل، کافی عرصہ پہلے ساؤتھ (ساؤتھ افریقا) میں شعیب کو ہرموسا نامی ایک لڑکی سے محبت ہو گئی تھی۔ ہرموسا کا تعلق کیوبا سے تھا اور وہ ساؤتھ میں ایک بال روم ڈانسر کے طور پر کام کرتی تھی۔ شعیب کے ایک دشمن نے کیوبن لڑکی ہرموسا کو بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ ہرموسا معروف کیوبن ڈانس ”چا۔ چا۔ چا“ کی ماہر تھی۔ یہ ”چا۔ چا۔ چا“ جلد ہی ”چاچاچا“ میں بدلا اور پھر یہ ”چاچا“ رہ گیا۔ ہرموسا کے قتل پر شعیب ذہنی طور پر خاصا منتشر ہو گیا تھا۔ شراب کے نشے میں ڈوب کر وہ اکثر ”چاچاچا“ گنگنانے لگتا تھا۔ یار لوگوں نے اس ٹائٹل کو شعیب کے نام کے ساتھ ہی ٹانک دیا۔“

”یقین نہیں آتا کہ شعیب جیسے شقی القلب اور ضمیر فروش لوگ بھی کسی کی محبت میں مبتلا ہو سکتے ہیں؟“ جاسم نے بیزاری سے کہا۔

”میں نے بتایا ہے نا، اس کیوبن بال روم ڈانسر اور شعیب کی محبت کی یہ کہانی بہت پہلے کی ہے جب شعیب محض ایک چھپی ہوا کرتا تھا اور چھوٹے موٹے جرائم میں ملوث رہ کر اپنا کام چلا لیا کرتا تھا۔ اب اس واقعے کو سال ہا سال گزر چکے ہیں۔ اس دوران میں یہ مردود کیا سے کیا بن گیا ہے۔“

”کامل ..... !“ جاسم نے اچانک موضوع بدلتے ہوئے استفسار کیا۔ ”کیا تمہارے پاس کوئی ایسا محفوظ ٹھکانا ہے جہاں پر چیخنے چلانے والے انسان کی آواز دوسرے

لوگوں کی سماعت تک رسائی حاصل نہ کر سکتی ہو؟"

"کیا راجو کی طرح کسی اور ٹیم کے ساتھ بھی کوئی دھواں دھار کھیل کھیلنے کا ارادہ ہے؟" کامل نے سنجیدہ مگر معنی خیز لہجے میں دریافت کیا۔

"ہاں، کچھ ایسا ہی سمجھ لو۔" جاسم نے تائیدی انداز میں کہا۔

"مقابلہ کامل جائے گا جگر۔" کامل نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "دادا تمہیں "جگر" بلاتے تھے... آج سے تم میرے بھی جگر ہو۔ بتاؤ، کیا مسئلہ ہے؟ کیا تم راجو اور اس کے اہلیوں موالیوں کی اوچھی حرکتوں کی وجہ سے پریشان ہو...؟"

"ویسی کوئی بات نہیں اور میں پریشان تو ہرگز نہیں ہوں۔"

"تو پھر کیا معاملہ ہے؟" کامل نے اپنائیت بھرے لہجے میں پوچھا۔ "اگر کوئی حرج محسوس نہیں کر رہے تو مجھے بتاؤ۔"

دادا کی نسبت سے جاسم کا کامل کے ساتھ جو تعلق قائم ہو چکا تھا اس کے پیش نظر جلیل کے حوالے سے، کامل سے بات کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ لہٰذا وہ شروع ہو گیا۔

☆☆☆

گیارہ تاریخ، پیر کی صبح نمبر مارکیٹ کی ایک اونچی چھت والی کشادہ دکان کے اندر جاسم اپنے شکار جلیل ماموں کے ساتھ موجود تھا۔ کامل بھی اسی دکان میں تھا اور اس "کار خیر" میں وہ جاسم کا کما حقہ ہاتھ بٹا رہا تھا۔ جلیل کو یہاں تک پہنچانے میں کامل نے آج علی الصباح ہنگامی بنیادوں پر ایک سنسنی خیز آپریشن کیا تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کے تعاون سے لگ بھگ ساڑھے پانچ بجے منہ اندھیرے جلیل کو اس کی رہائش گاہ سے اٹھا لیا تھا۔ اس کے بعد جلیل کو نمبر مارکیٹ کی اس دکان تک پہنچانے میں انہیں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ اس وقت کامل کا ایک ساتھی ریحان، جلیل کے گھر کے اندر موجود تھا اور دوسرا ساتھی اکرم، جلیل کی دکان "پاک الیکٹرونکس" کے نزدیک کامل کے احکامات کا انتظار کر رہا تھا۔ جلیل کو گھر سے اٹھاتے وقت ان لوگوں نے دکان کی چابیاں اپنے قبضے میں کر لی تھیں جو اس وقت اکرم کی کسٹڈی میں تھیں۔

کل کا پورا دن کامل نے جلیل کے حوالے سے اپنا ہوم ورک مکمل کر لیا تھا اور ایک جامع منصوبہ ترتیب دینے کے بعد ہی آج صبح اس نے عملی قدم اٹھایا تھا۔ نمبر مارکیٹ کراچی کے پرانے علاقے میں واقع تھی اور اس مارکیٹ کی دکانیں دس بجے کے بعد ہی کھلنا شروع ہوتی تھیں اور ابھی محض سوا چھ ہی بجے تھے۔ گویا، کسی بھی طوفانی کارروائی کے لیے جاسم کے پاس کافی سے زیادہ وقت تھا۔ مذکورہ دکان کے اندر پہنچتے ہی انہوں نے دکان کا شٹر گرا دیا تھا۔ اب وہ دکان بھی نمبر مارکیٹ کی دوسری دکانوں کی طرح بند تھی۔

جلیل کو یہاں تک لانے کے لیے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھی گئی تھی۔ دکان کے اندر پہنچتے ہی اس کو آرا مشین کے آہنی پلیٹ فارم پر چت لٹا کر اس کے ہاتھ پاؤں کو مشین کی باڈی کے ساتھ کس کر باندھ دیا گیا تھا۔ اس کے دونوں بازوؤں اور ٹانگوں کو اس طرح پھیلا کر باندھا گیا تھا کہ اس کا بدن انگلش الفابیٹ "ایکس" کی شکل اختیار کر گیا تھا اور آرا مشین کا خطرناک بلیڈ، اس کی چری ہوئی ٹانگوں کے بیچ، پرائیویٹ پارٹس کے انتہائی نزدیک تھا۔

کامل، جلیل کے سرہانے کی سمت ایک ایسے مقام پر کھڑا تھا جہاں جلیل کی نگاہ رسائی حاصل نہیں کر سکتی تھی۔ جاسم نے حفظ ماتقدم کے طور پر اپنے چہرے پر مصنوعی گھنی مونچھیں بھی چسپاں کر لی تھیں تاکہ جلیل کے ذہن میں بھولے سے بھی یہ خیال نہ آئے کہ چند روز پہلے اس نے نانچہ کے ساتھ جاسم کو اپنی دکان میں دیکھا تھا۔

"جگر! اس وقت باہر سڑک پر امن و آشتی ہے لیکن جیسے جیسے وقت آگے بڑھے گا، یہاں کی رونق اور گہما گہمی میں دھیرے دھیرے اضافہ ہونے لگے گا۔" کامل نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "امید ہے، تم ایک گھنٹے میں اپنا کام نمٹا لو گے۔"

"تمہارا اندازہ درست ہے برو۔" جاسم نے پُرعزم انداز میں جواب دیا۔ "تم تیار ہو جاؤ۔ میں کام شروع کر رہا ہوں۔"

"اوکے جگر۔ میں تیار ہوں۔" کامل نے کہا۔

آرا مشین کے ٹھوس اور ٹھنڈے ٹھار آہنی پلیٹ فارم پر جکڑے ہوئے جلیل نے خوف میں ڈوبی ہوئی آواز میں پوچھا۔ "کک... کون ہو تم لوگ... مجھے یہاں... کیوں لے کر آئے ہو... تم میرے ساتھ... کیا کرنا چاہتے ہو... ؟"

جاسم نے جلیل کی آنکھوں پر بندھی ہوئی پٹی کو کھولنے کے بعد اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سنگین لہجے میں کہا۔ "داملی صاحب! ابھی بھی کیا جلدی ہے۔ تمہارے سوالوں کے جواب تمہیں خود بہ خود مل جائیں گے بہ شرطیکہ

تم نے مجھ سے تعاون کرنے میں کسی ذلالت اور کمینگی کا مظاہرہ نہ کیا تو۔"

"تت... تم مجھ سے... کس قسم کا تعاون چاہتے ہو؟" جلیل نے گہری مگر سراسیمہ نظر سے جاسم کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اوہ... تو تم مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہو؟" جاسم نے خوں خوار انداز میں کہا۔ "اچھی بات ہے... اس طرح میرا کام آسان ہو جائے گا۔ بتاؤ، میں کون ہوں؟"

"میں تمہیں نہیں جانتا۔" جلیل نے الجھن زدہ لہجے میں جواب دیا۔ "پتا نہیں، تم کس غلط فہمی میں مجھے اٹھا لائے ہو... آخر تمہاری مجھ سے دشمنی کیا ہے؟"

"تم مجھے نہیں جانتے لیکن میری ماں سے ناواقفیت کا اظہار نہیں کر سکتے۔" جاسم نے اسے نفرت بھری نظر سے گھورا۔ "کیونکہ وہ تمہاری سگی بہن تھی... رخشندہ بیگم!"

جاسم کے آخری الفاظ نے جلیل کے دماغ میں ایٹمی دھماکا کیا۔ وہ چند لمحات تک پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا، پھر لکنت زدہ لہجے میں بولا۔ "تت... تم جاسم ہو... بھانجے..."

"خبردار! جو تم نے اپنی ناپاک زبان سے مجھے بھانجا کہا۔" جاسم نے قہر آلود نظر سے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہمارے بیچ موجود رشتہ اسی وقت ختم ہو گیا تھا جب تم نے پانچ لاکھ روپے وصول کر کے مجھے جنگل میں مرنے کے لیے بھیج دیا تھا اور میرے باپ کو مرنے کے لیے اسپتال میں چھوڑ کر تم نے اپنی جیب بھر لی تھی۔"

"جاسم... تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔" جلیل نے بے حد ڈرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "کسی دشمن نے تمہیں میرے خلاف بھڑکا دیا ہے۔"

"بکواس بند کرو بڈھے طوطے..." جاسم نے اس کے گال پر ایک زناٹے دار تھپڑ رسید کرتے ہوئے غضب ناک انداز میں کہا۔ "میں تمہاری منافقانہ کہانیاں سننے کے لیے یہاں نہیں لایا ہوں۔ حقیقت کیا ہے، یہ تم بھی جانتے ہو اور میں بھی جان چکا ہوں۔ مجھے نو سال پہلے والا وہ بے وقوف، نا سمجھ اور مجبور لڑکا نہیں سمجھنا جس کی زندگی کا کباڑا کر کے تم نے عیش و عشرت کے نہ صرف خواب دیکھ لیے تھے بلکہ بڑی حد تک ان خوابوں کی تعبیر بھی پا لی ہے لیکن میں آج تم سے ایک ایک لمحے کا حساب لوں گا۔ بتاؤ... تم نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا تھا؟"

"میں سچ کہتا ہوں بھانجے..."

"برو... !" اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی جاسم نے کامل سے کہا۔ "میں اس بدذات کی "بک بک" سننے کے موڈ میں بالکل نہیں ہوں۔ قبل اس کے کہ یہ اپنی قبیح زبان سے کوئی وضاحت یا صفائی پیش کرنے کی کوشش کرے، اسے دو حصوں میں چیر ڈالو۔ یہ شیطان دردناک موت مرنا چاہتا ہے تو بھلا میں کیا کر سکتا ہوں؟"

ادھر جاسم کی بات ختم ہوئی، ادھر کامل نے آرا مشین کا سوئچ آن کر دیا۔ آرے کا بلیڈ اپنے مخصوص خطرناک انداز میں متحرک ہو گیا۔ اگر جلیل کے جسم کو لکڑی کے شہتیر کے مانند دھیرے دھیرے آگے دھکیلا جاتا تو بلیڈ نے اسے بلاتردد چیر ڈالنا تھا لیکن ایسی کوئی بھی کارروائی ان کے پروگرام میں شامل نہیں تھی۔ یہ سارا ڈراما جلیل کی زبان کھلوانے اور اسے دردناک موت کے درشن کرانے کے لیے رچایا گیا تھا۔

آرا مشین کے آن ہوتے ہی جلیل کے اوسان خطا ہو گئے تھے۔ اسے ایک بھیانک موت چند گزوں کی مسافت پر کھڑی نظر آ رہی تھی۔ جاسم کے تیور نے اسے باور کرا دیا تھا کہ وہ جو کہہ رہا ہے، اسے کر گزرنے میں کسی بھی ہچکچاہٹ سے کام نہیں لے گا۔ جلیل، جاسم کا مجرم تھا۔ وہ جاسم کے سامنے اگرچہ خود کو بے قصور ثابت کرنے کے لیے "ہاتھ پاؤں" مار رہا تھا لیکن سفاک حقیقت نے اسے اندر سے مسمار کر ڈالا تھا۔ آرا مشین کی ہیبت ناک آواز کے حصار میں، وہ چشم تصور سے اپنے جسم کو دو حصوں میں تقسیم ہوتے دیکھ رہا تھا۔ اس کیفیت نے جلیل کے پورے بدن پر کپکپی سی طاری کر دی تھی۔ مارے خوف کے اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور مصیبت سے نجات کی جتنی دعائیں اسے یاد تھیں، انہیں افراتفری میں دہرانے لگا۔

"برو... اتنی دیر کیوں لگ رہی ہے...؟" جاسم نے تیز آواز میں دریافت کیا۔ "کیا یہ خبیث بڈھا لکڑی کے شہتیر سے زیادہ سخت جان ہے؟"

"خدا کے لیے مجھے مت کاٹو..." جلیل آنکھیں کھولے بغیر منت ریز لہجے میں بولا۔ "تم جو پوچھو گے، میں اس کا سولہ آنے سچا جواب دوں گا۔ اگر تم میری جاں بخشی کر دو تو میں تمہارے پانچ لاکھ روپے واپس کرنے کو تیار ہوں۔"

"جگر! تمہارے شکار نے اپنی شلوار گیلی اور پیلی کر دی ہے۔" کامل نے انکشاف کرتے ہوئے بتایا۔ "تم اگر اسے چھوڑنے کا فیصلہ کر چکو تو آرا مشین کی دھلائی اور صفائی کے پیسے بھی اس بل میں لگا لینا جو تم اس کمینے سے وصول کرنے والے ہو۔"

میں دوں گا۔" جلیل نے خطرناک لہجے میں کہا۔ "پانچ لاکھ کے علاوہ بھی کچھ تم مجھ سے لے لو اور مجھے یہاں سے جانے دو --- میں تمہارا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھوں گا۔"

جاسم اور کامل نے ختم کر سوچ بچار کے بعد ہی طے کیا تھا کہ جلیل کو جان سے نہیں مارا جائے گا۔ بلکہ اس کے ساتھ وہ سلوک کیا جائے گا جسے وہ تمام عمر صرف یاد رکھے گا بلکہ آئندہ کسی کو دھوکا دینے کا تصور بھی نہیں کر سکے گا۔

"میری نظر میں تمہاری حیثیت کسی حقیر کیڑے کوڑے سے زیادہ نہیں ہے ذلیل انسان ---" جاسم نے بپھرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "احسان وحسان کی باتوں کو تم ایک طرف رہنے دو اور یہ بتاؤ، پانچ لاکھ کے علاوہ اور کتنی رقم دے سکتے ہو؟"

"دو چار ہزار اوپر لے لو ---" جاں بخشی کے آثار پیدا ہوئے تو جلیل نے ہمت کرتے ہوئے کہا۔ "میں دینے کے لیے تیار ہوں۔"

"تم بڑے ہی بے شرم اور گھٹیا انسان ہو۔" جاسم نے زہرخند لہجے میں کہا۔ "تم نے پیسوں کے لالچ میں مجھے آٹھ سال کے لیے جیل بھجوا دیا۔ اس عرصے کا بیاج کون دے گا؟ اس کے علاوہ تم نے میری مرحوم ماں کے طلائی زیورات اور ہمارے گھر کا تمام قیمتی سامان بیچ ڈالا تھا۔ ذرا اس اکاؤنٹ کو بھی حساب میں جوڑو۔"

"میں مانتا ہوں، مجھ سے غلطی ہوگئی۔" جلیل کی بے چارگی دیکھنے لائق تھی۔ "آخر خطا بھی تو انسان ہی سے ہوتی ہے۔ میں تمہیں ایک لاکھ زیادہ دینے کو تیار ہوں۔ چھ لاکھ لے لو --- اور مجھے چھوڑ دو۔ آج کے بعد ہمارے راستے الگ ہو جائیں گے۔"

"تم نے حساب کیا اور میں نے مان لیا --- اندھی لگی ہوئی ہے کیا؟" جاسم نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ "کل ہے، تمہیں دو حصوں میں تقسیم کر دوں تو ٹھیک رہے گا۔"

"نن --- نہیں ---" جلیل بڑی شدت سے نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔ "تم اپنی زبان سے بولو کتنا چاہتے ہو؟"

"ایک ملین صرف!" جاسم نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"دس لاکھ روپے ---" جلیل نے ایک ایک لفظ کو ادا کرتے ہوئے کہا۔ "یہ بہت زیادہ ہیں۔"

"ابھی تو میں نے تم سے تمہارے باپ کی رقم کا حساب نہیں کیا۔" جاسم نے پھنکار سے مشابہ آواز میں کہا۔ "اگر تمہاری نظر میں یہ رقم بہت زیادہ ہے تو آرسے سے چیر کر، حرام موت ---" پھر اس نے کامل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ --- اس کمینے کو اپنی زندگی سے زیادہ دولت سے محبت ہے تو ٹھیک ہے --- دولت اس کے پاس بچے رہتے ہیں اور ہمیں جو کچھ بھی کرنا ہے وہ اس کی زندگی کے ساتھ کر ڈالتے ہیں۔"

"میں دس لاکھ دینے کو تیار ہوں۔" جلیل کی سرسراتی ہوئی آواز جاسم اور کامل کی سماعت تک پہنچی۔ "اب تم لوگ مجھے کھول دو تاکہ میں تمہارے لیے رقم کا بندوبست کر سکوں۔"

"بندوبست سے تمہاری کیا مراد ہے؟" جاسم نے ٹٹولنے والی نظر سے اسے گھورا۔ "کیا تم کسی بینک سے رقم نکلوانے کے بارے میں سوچ رہے ہو؟"

"نہیں ---" وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "یہ بات میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں کہ تم لوگ مجھے بینک تک جانے کی اجازت نہیں دو گے۔ تم دونوں میرے ساتھ گھر چلو --- چھ لاکھ کیش گھر میں رکھا ہوا ہے۔ وہ میں تمہارے حوالے کر دوں گا۔ باقی چار لاکھ روپے کے لیے مجھے اپنی دکان تک جانا پڑے گا۔ تم میری بات سمجھ رہے ہونا؟"

"نہیں --- میں تم جیسے آستین کے سانپوں کی باتوں کو سمجھنے کے لیے اپنی توانائی ضائع نہیں کرتا۔" جاسم نے دوٹوک انداز میں کہا۔ "تم اس وقت تک آزاد نہیں کیے جاؤ گے جب تک دس لاکھ روپے ہمارے قبضے میں نہیں آجاتے۔ بتاؤ، گھر کے اندر اور دکان میں تم نے کس کس جگہ پیسے چھپا کر رکھے ہوئے ہیں۔ تمہیں وہاں جانے کی زحمت نہیں کرنا پڑے گی۔ ہم اپنے ذرائع سے رقم اٹھا لیں گے۔ تمہارے پاس صرف دس منٹ ہیں۔ گیارہویں منٹ پر یہ آرا تمہیں بڑی بے دردی سے چیر کر دولخت کر دے گا --- ایٹ از آل کلیئر ٹو آل؟"

جاسم نے جلیل کے لیے فرار کا کوئی راستہ کھلا نہیں رہنے دیا تھا۔ وہ صحیح معنوں میں "پائے رفتن، نہ جائے ماندن" کی کیفیت سے دوچار ہو گیا تھا۔ ہر انسان کو اپنی زندگی بڑی عزیز ہوتی ہے۔ اگر انسان زندہ رہے تو دولت کو کسی بھی طریقے سے دوبارہ بھی کمایا جا سکتا ہے۔

یہ نکتہ جلیل کی سمجھ میں آگیا۔ اس نے جاسم کے حسب منشا اپنے گھر اور دکان کے خفیہ مقامات کے حوالے سے

معلومات فراہم کر دیں۔ اس کے بعد کامل نے ایک کال ریحان کو اور دوسری کال اکرم کو کر کے رقم کی بازیابی کے احکامات صادر کر دیے۔

دس منٹ کے بعد چند سیکنڈ کے وقفے سے ریحان اور اکرم کی کالز یکے بعد دیگرے کامل کے سیل فون پر ریسیو ہوئیں اور انہوں نے بڑے جوشیلے انداز میں بتایا کہ مشن کامیاب رہا ہے۔

"اور اس دوسرے کام کا کیا ہوا؟" کامل نے ریحان سے پوچھا۔

ریحان نے جواب دیا۔ "کام ہو گیا ہے۔"

"ویری گڈ!" کامل نے ستائشی انداز میں کہا۔ "اب تم وہاں سے نکل آؤ۔"

ایسی ہی ہدایات کامل نے اکرم کو بھی دیں پھر سیل فون کو اپنی جیب میں رکھنے کے بعد جاسم سے پوچھا۔ "جگر! اس کا کیا کرنا ہے؟"

"مجھے اس رذیل سے اب کوئی کام نہیں۔" جاسم نے بے مروتی سے کہا۔ "تم چاہو تو آرا مشین سے اس کے چیر ڈالو۔"

"یہ تو دھوکا ہوگا۔" جلیل نے روہانسی آواز میں کہا۔ "تم لوگوں نے جو کہا، وہ میں نے کیا۔ پورے دس لاکھ روپے میں تمہیں دے چکا ہوں۔ اب تم بھی اپنے وعدے کی پاسداری کرو اور مجھے یہاں سے جانے دو۔"

"دھوکا دہی اور ایفائے عہد کی باتیں تمہاری منحوس زبان کو زیب نہیں دیتیں۔" جاسم نے ناپسندیدہ نظر سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "بہرحال، میں اپنی مرحوم ماں کی رعایت سے تمہیں زندہ چھوڑ رہا ہوں۔ تم کتنے بھی حرام اور ہر سہی مگر میری ماں کے اکلوتے بھائی ہو۔ کوشش کرنا کہ آئندہ کبھی مجھ سے سامنا نہ ہو ورنہ میں سب کچھ بھول جاؤں گا۔ میری بات تمہارے بھیجے میں اتر رہی ہے نا؟"

"میں سمجھ گیا بھانجے ---"

"شٹ اپ۔" جاسم نے اسے گھرکا۔ "آئندہ تمہاری زبان نے اگر مجھ سے کوئی رشتہ جوڑنے کی غلطی کی تو میں اسے گدی سے کھینچ کر چیل کووں کو کھلا دوں گا۔"

"اوکے --- اوکے --- تم شانت ہو جاؤ۔ میں تمہاری نصیحت کو ہمیشہ یاد رکھوں گا۔" وہ جلدی سے بولا۔ "اور آج کے بعد کبھی تمہیں اپنی شکل نہیں دکھاؤں گا --- یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔"

"شکل نہیں --- مکروہ شکل بولو ---" جاسم نے ایک ایک لفظ پر دباؤ ڈالتے ہوئے تاکیدی لہجے میں کہا۔

"تمہیں کبھی نظر نہیں آؤں گا۔" وہ مسکین کی صورت بنا کر بولا۔ "میں اپنی مکروہ شکل

"اور آج والے واقعے کا ذکر بھی تم کسی سے نہیں کرو گے ---" جاسم نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سردمہری سے کہا۔ "اگر کسی بھی مرحلے میں تمہاری زبان پر یہ تذکرہ آیا تو وہ دن تمہاری زندگی کا آخری دن ثابت ہوگا۔"

جلیل اپنی گردن کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے منمنایا۔ "میں سمجھ گیا۔ تمہیں مجھ سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوگی۔"

جاسم نے کامل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس خبیث الخبث کو ہم اپنی گاڑی میں بٹھانے کا رسک نہیں لے سکتے ورنہ اس کی ڈلیوری کے بعد گاڑی کو واشنگ لائن بھجوانا پڑے گا۔ میں اس کی بندشیں کھولتا ہوں۔ تم اس کے لیے کوئی رکشا دیکھو۔"

"اوکے جگر ---" کامل نے کہا اور دکان سے نکل گیا۔

جب جاسم نے جلیل کے ہاتھ پاؤں کھول دیے تو اس نے سہمے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ "مجھے یقین ہی نہیں آرہا کہ تم وہی بھولے بھالے لڑکے ہو، نو سال پہلے جس کے والدین کو کسی لفنگے نے قتل کر دیا تھا۔ تم کرتے کیا ہو؟"

ایک فوری خیال کے تحت جاسم نے رازدارانہ انداز میں جواب دیا۔ "جیل سے رہا ہونے کے بعد میں نے انڈر ورلڈ کو جوائن کر لیا تھا۔ آج کل میں انہی کے لیے کام کر رہا ہوں۔ کیا تم نے شعیب چاچا کا نام سنا ہے؟"

"ہاں، سنا ہے۔" جلیل نے کہا۔ "وہ اس شہر کا کوئی بہت بڑا بزنس مین ہے۔"

"بزنس --- دراصل شعیب چاچا کا کور ہے۔" جاسم نے سرسراتی ہوئی آواز میں بتایا۔ "لوگ اسے ایک معزز بزنس مین سمجھتے ہیں لیکن اس کا اصل دھندا منشیات فروشی اور قتل و غارت گری ہے۔ وہ انڈر ورلڈ کا ڈان ہے۔ میں اس کا ایک قابل بھروسا شارپ شوٹر ہوں۔ اب تم خود اندازہ لگا لو کہ میں نے تمہارے ساتھ کتنی زیادہ رعایت برتی ہے لیکن یہ پہلی اور آخری مرتبہ ہے۔ آئندہ اگر مجھے تمہاری طرف سے کسی گڑبڑ کی اطلاع ملی تو میں کچھ نہیں کہوں گا بلکہ میری گن بولے گی اور تمہاری بولتی ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے گی۔"

جاسم کی دھمکی آمیز باتوں سے جلیل نے ایک جھرجھری لی پھر خوف میں ڈوبی ہوئی آواز میں بولا۔ "میں اس کا موقع نہیں آنے دوں گا۔"

اسی وقت کامل نے آکر اطلاع دی۔ "باہر رکشا کھڑا ہے۔" پھر اس نے جلیل کو براہ راست مخاطب کرتے ہوئے

کہا۔ ”میں نے رکشا والے کو بتا دیا ہے کہ تم بیمار ہو۔ وہ تمہیں تمہارے گھر کے دروازے تک پہنچائے گا اور ہاں...... اسے ایک لمحے کے لیے بھی یہ محسوس نہیں ہونے دینا کہ تمہاری کم ہمتی اور بزدلی نے تمہاری شلوار پر خاصے گہرے نشان چھوڑے ہیں۔ اگر رکشا والے کو تمہارے اس راز کی بھنک بھی پڑ گئی تو وہ تمہیں کسی کچرا کنڈی میں پھینک کر آگے بڑھ جائے گا۔“

کامل کی ہدایت کے جواب میں جلیل نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا اور سنبھل کر رکشا پر سوار ہو گیا۔ جلیل کو رخصت کرنے کے چند منٹ بعد وہ دونوں بھی دکان کو بند کر کے وہاں سے روانہ ہو گئے۔

ٹھیک دس بجے صبح کامل نے جاسم کو نثار شہید پارک پہنچا دیا۔ گاڑی کو ایک طرف روکنے کے بعد اس نے کہا۔ ”تم مجھے اپنا اکاؤنٹ نمبر بتا دو۔ میں آج ہی کی تاریخ میں دس لاکھ روپے تمہارے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کرا دوں گا۔“

”ابھی نہیں......“ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے جاسم نے کہا۔ ”پیسوں کا حساب ہم بعد میں کریں گے۔ فی الحال یہ رقم تمہاری کسٹڈی میں زیادہ محفوظ ہے۔“

”اس میں کسی حساب کتاب کی کیا ضرورت ہے۔“ کامل نے الجھن زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”ان پیسوں پر صرف اور صرف تمہارا حق ہے۔“

”جب ہم کسی کے قدم سے قدم اور کندھے سے کندھا ملا کر چلنے کا فیصلہ کر لیتے ہیں تو پھر چیزوں کی ملکیت اور حقوق بھی سانجھے ہو جاتے ہیں کامل......“ جاسم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”ہم ایک ہی استاد کے شاگرد ہیں اور اس وقت ایک ہی مشن پر کام کر رہے ہیں...... شعیب کی بربادی کا مشن۔ جب تک یہ شیطان مکمل طور پر تباہ و نابود نہیں ہو جاتا، ہم دونوں کی ہر خوشی اور ہر غم، ہر فائدہ اور ہر نقصان...... الغرض ہر ہر شے مشترک ہے۔ کیا تمہیں اس اشتراک پر کوئی اعتراض ہے برو؟“

جاسم نے بڑا ہی حساس اور پُرمعنی سوال کر ڈالا تھا۔ اس کے سامنے بھی کوئی عام شخص نہیں بلکہ کامل تھا۔ اس نے ایک لمحہ سوچے بغیر بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

”ہرگز نہیں...... اس نوعیت کے اشتراکی معاملات پر اعتراضات اٹھانا میری نگاہ میں گناہ کبیرہ ہے۔“

بروقت رخصت جاسم نے کہا۔ ”ہاں یاد آیا۔ وہ تم نے ریحان سے دوسرے کام کے بارے میں کیا پوچھا تھا۔ میں سمجھ نہیں پایا۔ تم نے اس کے ذمے کون سا دوسرا کام لگا رکھا تھا؟“

جاسم کے استفسار پر کامل کے ہونٹوں پر بڑی پُراسرار اور معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے جاسم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سپاٹ آواز میں کہا۔

”دوسرے کام کا احوال میری زبان سے سنو گے تو تمہیں مزہ نہیں آئے گا۔ کل کے اخبارات کا سٹی پیج دیکھ لینا۔ ساری کہانی تمہاری سمجھ میں آجائے گی۔“

جاسم نے اثبات میں گردن ہلائی اور الوداعی کلمات ادا کرنے کے بعد کامل کی گاڑی سے باہر آگیا۔

☆☆☆

منگل، بارہ تاریخ کی دوپہر جب ناجیہ جاسم سے ملنے آئی تو اس کے چہرے کے تاثرات کو دیکھ کر جاسم کا ذہن الجھ گیا۔ ایسی پُراسرار سنجیدگی اسے ناجیہ میں پہلے کبھی نظر نہیں آئی تھی۔ اس کی چھٹی حس نے بہ زبانِ خاموشی پکارا۔ ”ضرور کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔“

رسمی علیک سلیک کے بعد جاسم نے پوچھا۔ ”کیا طارق روڈ والے فلیٹ کا معاملہ سیدھا ہو گیا؟“

”ہاں، وہ معاملہ تو میں نے نمٹا دیا ہے۔“ وہ ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ”لیکن سمجھ میں نہیں آرہا کہ یہ نیا جھمیلا کیسے سنبھلے گا۔“

”نیا جھمیلا......“ جاسم نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”تم کس جھمیلے کی بات کر رہی ہو؟“

”میں اس کھٹ راگ کا ذکر کر رہی ہوں جو تم نے کل صبح ہی صبح پھیلایا تھا۔“ ناجیہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ”اور کل شام تک اس کھٹ راگ نے کافی سنسنی پھیلائی ہے۔“

”میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔“ جاسم نے بیزار کن انداز میں کہا۔ ”ناجیہ پلیز...... جو بھی کہنا ہے، صاف صاف کہو۔“

”مجھے بتاؤ، کل صبح تم نے وارثی کے ساتھ کیا، کیا تھا؟“

”کون وارثی؟“ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

”میں تمہارے جلیل ماموں کی بات کر رہی ہوں۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”پاک الیکٹرونکس کا مالک یہ شخص تمہاری ہٹ لسٹ پر تھا۔ تھا یا نہیں؟“

ناجیہ کے استفسار میں فولادی سختی پائی جاتی تھی۔ اگر وہ جلیل کے حوالے سے بات کر رہی تھی تو اس کا مطلب یہ تھا کہ اسے کہیں نہ کہیں سے کوئی اشارہ ملا تھا۔ وہ گزشتہ روز سہ پہر میں بھی اس سے ملنے آئی تھی لیکن جاسم نے نمبر مارکیٹ والی کارروائی کی اسے ہوا بھی نہیں لگنے دی۔ پھر اس نے اتنے وثوق کے ساتھ اس پر چڑھائی کیوں کر دی تھی؟

تمام تر خیالات سیکنڈ کے دسویں حصے میں اس کے ذہن سے گزر گئے۔ پھر اس نے معتدل انداز میں جواب دیا۔

”اس امر میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ میں نے جلیل کے نام پر دائرہ لگا رکھا ہے اور موقع ملتے ہی میں اسے عبرت ناک انجام سے ضرور گزاروں گا۔“

”کیا گزشتہ روز تمہیں یہ موقع ملا نہیں تھا......“ وہ جاسم کی آنکھوں میں بہ غور دیکھتے ہوئے مستفسر ہوئی۔ ”اور تم نے اس موقع کا ٹھیک ٹھاک فائدہ اٹھایا ہے...... ہیں نا؟“

”ناجیہ...... یہ تم کس قسم کی باتیں کر رہی ہو؟“ وہ نیم احتجاجی لہجے میں بولا۔

وہ بہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ”ہاں یا نہ؟“

”جب تک مجھے پتا نہ چلے کہ تم کہنا کیا چاہ رہی ہو، میں اس کی تصدیق یا تردید کیسے کر سکتا ہوں؟“

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب تم نے اپنے معاملات مجھ سے چھپانا شروع کر دیے ہیں۔“ وہ اپنے ہینڈ بیگ کو کھولنے کے دوران میں خفگی آمیز لہجے میں بولی۔ ”اور تم مجھ سے جھوٹ بھی بولنے لگے ہو۔“ اس نے اپنے بیگ کے اندر سے ایک تہ شدہ اخبار نکالا اور جاسم کی جانب بڑھاتے ہوئے اپنی بات مکمل کر دی۔ ”لو، خود پڑھ لو...... اپنے کارنامے کی تفصیل۔“

ناجیہ نے مذکورہ اخبار کچھ اس انداز میں تہ کر رکھا تھا کہ کھولنے پر سٹی پیج جاسم کی نظر کے سامنے عیاں ہو گیا۔ اس صفحے پر چھپنے والی ایک دو کالمی خبر کو ناجیہ نے ہائی لائٹر کی مدد سے نمایاں کر رکھا تھا۔ مذکورہ شائع شدہ خبر جلیل احمد وارثی کے بارے میں تھی۔

جاسم کے ذہن میں تیز روشنی کا ایک جھماکا ہوا اور کامل کے کہے ہوئے معنی خیز الفاظ اس کی سماعت میں تازہ ہو گئے...... ”دوسرے کام کا احوال میری زبان سے سنو گے تو تمہیں مزہ نہیں آئے گا۔ کل کے اخبارات کا سٹی پیج دیکھ لینا۔ ساری کہانی تمہاری سمجھ میں آجائے گی۔“

جاسم نے اخبار کے ہائی لائٹڈ حصے پر نگاہ گاڑ دی۔ اس ڈبل کالم نیوز کے مطابق، گزشتہ روز مغرب سے تھوڑی دیر پہلے پولیس نے ”پاک الیکٹرونکس“ کے مالک جلیل احمد وارثی

کو اس کی دکان واقع دہلی کالونی سے گرفتار کر لیا تھا۔ پولیس کافی دنوں سے اس پر نظر رکھے ہوئے تھی۔ اس کے بارے میں پتا چلا تھا کہ وہ قسطوں والے گھریلو استعمال کے سامان کی آڑ میں منشیات کی ترسیل کا کام کر رہا تھا۔ پولیس نے گرفتاری کے بعد اس کی دکان کے ایک خفیہ مقام سے ڈرگز بھی برآمد کر لی تھیں۔ بعدازاں پولیس نے اس کی رہائش گاہ واقع بہائی کالونی پر بھی چھاپا مارا اور وہاں سے بھی منشیات کی بھاری مقدار ہاتھ لگی تھی۔ اپنی گرفتاری اور ڈرگز کی برآمدگی کو جلیل وارثی نے اپنے خلاف ایک سوچی سمجھی سازش قرار دیا تھا۔ پولیس کو بیان دیتے ہوئے اس نے بتایا کہ پیر کی صبح شعیب چاچا کے دو بندوں نے اسے گھر سے اغوا کر کے ڈاک یارڈ پہنچا دیا تھا۔ اس کے بعد ان کے دوسرے ساتھی جلیل کی دکان اور گھر کے ساتھ کیا کرتے رہے، اس بارے میں وہ کچھ نہیں جانتا۔ اس نے دس لاکھ روپے دے کر اپنی جان بچائی لیکن شام سے پہلے اسے گرفتار کر لیا گیا۔ جلیل نے واضح الفاظ میں پولیس کو بتایا کہ اسے اس معاملے میں پھنسانے میں اس شہر کے ایک بااثر شخص شعیب چاچا کے آدمیوں کا ہاتھ ہے۔ پولیس نے جلیل کو حراست میں لینے کے بعد تحقیقات شروع کر دی ہیں۔ زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ رنگے ہاتھوں پکڑے جانے پر جلیل نے ایک معروف بزنس مین شعیب چاچا پر کیچڑ اچھالنے کی کوشش کی ہے۔ پولیس کا خیال ہے کہ جلیل آٹھ، دس سال کے لیے تو جیل جائے گا ہی۔ اگر شعیب چاچا نے اس پر ہتک عزت کا کیس ٹھوک دیا تو پھر اس کا گھر اور دکان بک کر وکلا کی جیبوں میں چلے جائیں گے اور اس کی جتنی عمر بچی ہے، وہ جیل ہی میں گزرے گی۔

جاسم نے اخبار کو میز پر پھینکا اور ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے ناجیہ سے پوچھا۔ ”تو تمہارا خیال ہے کہ یہ سب میں نے کیا ہے؟“

”میں نے اس حوالے سے تمہارے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم نہیں کی ہے جے بی......“ وہ گمبھیر انداز میں بولی۔ ”اگر تم انکار کر دو گے تو میں تمہاری بات کا یقین کر لوں گی اور یہ معاملہ یہیں پر رفع دفع ہو جائے گا حالانکہ جلیل کے بیان کی تصدیق کا راستہ ہے میرے پاس لیکن میرے لیے تمہارا ماموں نہیں، تم زیادہ اہم ہو۔ ہم دونوں کے درمیان جو سنجیدہ تعلق ہے، میں اس میں کوئی کنفیوژن برداشت نہیں کر سکتی اور...... یہ حقیقت تم اچھی طرح جانتے ہو۔“

ناجیہ نے اسے ایک بند گلی میں لا کر کھڑا کر دیا تھا۔ اس کے پاس فرار کا کوئی راستہ نہیں بچا تھا اور وہ فرار چاہتا بھی

نہیں تھا۔ اگر اس نے نمبر مارکیٹ والے آپریشن کا ذکر ناجیہ سے نہیں کیا تھا تو اس اخفائے راز میں اس کی کسی بدنیتی کا دخل نہیں تھا۔ اس نے بھی سوچا تھا کہ کسی مناسب موقع پر وہ ناجیہ کو سب کچھ بتادے گا لیکن ایسا کوئی موقع آنے سے پہلے ہی پرنٹ میڈیا نے اس نیوز کو بریک کر دیا تھا۔ الیکٹرونک میڈیا بھی اس دوڑ میں یقیناً پیچھے نہیں رہا تھا۔

آئندہ چند منٹ میں، بے تلے الفاظ کا استعمال کر کے جاسم نے ناجیہ کو حقیقتِ حال سے آگاہ کر دیا۔ ناجیہ نے پوری توجہ سے اس کی بات سنی اور آخر میں کہا۔

''گویا تم نے ایک تیر سے دو شکار کیے ہیں۔''

''ایسا ہی سمجھ لو۔'' وہ سادگی سے بولا۔ ''میں نے جلیل کے دل میں اپنا خوف بٹھا کر ماضی کا حساب بے باق کرنے کے علاوہ اسے ہمیشہ کے لیے خود سے دور رہنے پر بھی مجبور کر دیا ہے اور شعیب چاچا کے گروہ سے اپنا تعلق ظاہر کر کے اسے ایک ایسی مصیبت میں ڈال دیا ہے کہ وہ جیل میں رہے یا باہر، شعیب چاچا اس کا جینا عذاب کر دے گا۔''

''ویسے تو تمہارے دوست کامل نے بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی، جلیل کو زندگی بھر جیل میں سڑانے کے لیے۔'' ناجیہ نے کہا۔ ''لیکن ایک بات میری سمجھ میں آگئی ہے جے بی۔''

ناجیہ نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو اس نے الجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔ ''کون سی ایک بات؟''

''یہی کہ تمہارے ساتھ مستقل یاری کا کوئی فائدہ نہیں۔'' وہ تیز نظروں سے اسے گھورتے ہوئے بولی۔ ''تمہاری کھوپڑی میں جو ایک بار سما جاتا ہے، اسے کیے بغیر تم سکون سے نہیں بیٹھتے۔''

''ارے — ایسا کیوں کہہ رہی ہو —'' وہ تعجب خیز نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں نے کیا، کیا ہے؟''

''میں نے تمہیں کتنا سمجھایا ہے کہ تمہارے ذہن میں مارد ھاڑ کے جتنے بھی منصوبائی کیڑے کلبلا رہے ہیں انہیں استنبول سے واپسی تک کے لیے تھپک تھپک کر سلا دو —'' وہ شاکی نظروں سے اسے تکتے ہوئے بولی۔ ''لیکن تم پر میری کسی بات کا خاک اثر نہیں ہوتا۔ تم اکیلے ہی کچھ کم نہیں تھے اور اب تمہیں کامل کا ساتھ بھی میسر آگیا ہے۔'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر ہونٹ بھینچ کر اضافہ کیا۔

''اگر تمہارے یہ ''ڈشواں، ڈشواں'' یونہی جاری رہے تو مجھے نہیں امید کہ تم ہنٹ کے ساتھ استنبول بھی جا سکو گے۔''

حیرت تھا کہ ابھی تک جاسم نے ناجیہ کو ابلی ہوئی استنبولی مشترکہ کارروائیوں کے پروگرام سے آگاہ نہیں کیا تھا۔ وہ دونوں مل کر استنبول میں شعیب چاچا کے ساتھ کیا کرنے جا رہے تھے، اس سے ناجیہ قطعی بے خبر تھی۔

''تم ہی بتاؤ، میں کیا کروں —'' وہ معصوم سی صورت بنا کر ناجیہ سے مستفسر ہوا۔ ''میں بچوں کے پیچھے نہیں بھاگتا، وہ خود ہی میرے پاس چلی آتی ہیں۔ میں تو تم لوگوں سے ہر قسم کا تعاون کر رہا ہوں۔ سر نے کہا، ان کے دفتر میں ڈھیر ہو جاؤں۔ میں نے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ تم میرا ایک کام کر سکتی ہو ناجیہ؟''

جاسم نے اچانک بات ختم کر کے سوالیہ نظروں سے ناجیہ کی طرف دیکھا تو وہ پوچھے بنا نہ رہ سکی۔ ''کون سا کام؟''

''تم کسی پہنچے ہوئے بابا کے پاس جا کر میرے لیے کوئی کرشماتی تعویذ لے آؤ۔'' وہ سادگی بھری معصومیت کی اداکاری جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''تاکہ میں اس تعویذ کے اثر سے، اس آس سے باہر قدم رکھنے کا خیال بھی اپنے ذہن میں نہ لاؤں۔''

''میں ایسی دقیانوسی خرافات پر یقین نہیں رکھتی۔'' وہ منہ سا بناتے ہوئے بولی۔ ''انسان کا ارادہ، نیت اور عمل ہی اس کی زندگی کی راہوں کا تعین کرتے ہیں۔ باقی سب خود کو دھوکا دینے والی باتیں ہیں۔''

''کامریڈ کا بھی یہی خیال ہے۔'' جاسم نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

''کون کامریڈ؟'' ناجیہ نے بے ساختہ پوچھا۔

''ارے وہ انور بیگ صاحب —'' جاسم نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ جیل میں ان سے میں نے بہت کچھ سیکھا تھا۔ وہ نظریاتی طور پر ایک سوشلسٹ تھے، کارل مارکس کے پیروکار لیکن انہوں نے مجھے زیست کرنے کا ڈھنگ سکھایا تھا۔ میں نے کامریڈ سے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔''

''میں کیسے یقین کرلوں۔'' ناجیہ نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ''جیل میں تم نے دو افراد سے ذہنی اور جسمانی تربیت لی تھی۔ مراد علی عرف دادا اور انور بیگ عرف کامریڈ۔ میں ایک سال سے تمہارے ساتھ ہوں لیکن مجھے تم پر دادا ہی کا رنگ غالب نظر آتا ہے۔ کہیں سے بھی نہیں لگتا کہ تم نے کامریڈ کی تعلیمات کو یاد رکھا ہوا ہے۔''

''اگر تمہارا اشارہ کرشماتی تعویذ والی میری بات کی جانب ہے تو وہ سب میں نے تمہیں متاثر کرنے کے لیے کہا تھا۔'' جاسم نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''بتاؤ، تمہیں میری اداکاری کیسی لگی؟''

''اوہ — تو تم ایکٹنگ کر رہے تھے۔'' ناجیہ نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

جاسم نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے اثبات میں گردن ہلادی۔

''تم اوّل درجے کے بدمعاش ہو۔'' وہ چمک کر بولی۔

''تم اپنی بے خبری میں مجھے ایک ایسے اعزاز سے نواز رہی ہو جو کام ابھی تک میں نے تمہارے ساتھ کیا نہیں۔'' جاسم — اس کے چہرے پر نگاہ جما کر معنی خیز انداز میں بولا۔ ''اب تو مجھے اٹھتے بیٹھتے تمہارے عطا کردہ اس ٹائٹل کا دفاع کرنا پڑے گا۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' وہ حیرت بھرے لہجے میں مستفسر ہوئی۔

''میں تمہاری نظر میں بدمعاش درجۂ اول ہوں۔'' وہ ایک ایک لفظ پر دباؤ ڈالتے ہوئے شرارت آمیز انداز میں بولا۔ ''یہ ٹائٹل شوکیس میں سجا کر رکھنے کا تو ہے نہیں — اب مجھ پر لازم ہو چکا کہ تم سے بدمعاشی کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دوں۔''

''اب ایسی بھی اندھیر نہیں مچی ہوئی۔'' ناجیہ بڑی لگاوٹ سے بولی۔ ''میں اتنی بھی کمزور نہیں ہوں کہ تمہیں من مانی کے لیے آزاد چھوڑ دوں گی۔''

''تو کیا پابندِ من مانی کی اجازت ہے۔'' وہ اس کے نزدیک آتے ہوئے بولا۔ ''میں تو ویسے بھی کتنے ہی دنوں سے اس آفس میں نظر بند ہوں۔ ایک پابندی اور سہی۔''

وہ کمزوری احترازی کوشش کرتے ہوئے بڑبڑائی۔

''میں سوچ کر جواب دوں گی۔''

''بقول تمہارے، میں تو ایک بدمعاش ہوں —'' وہ ناجیہ کی معنوی کوشش پر پانی پھیرتے ہوئے بولا۔ ''میں سوچے سمجھے بغیر اپنے دشمنوں کو منہ توڑ اور دوستوں کو منہ جوڑ جواب دیتا ہوں۔''

جاسم کے اس جواب کے سامنے ناجیہ کی مزاحمت جواب دے گئی۔ ان لاجواب لمحات میں وہ کسی کو جواب دہ نہیں تھے۔

ایک گھنٹے کے بعد ناجیہ جب خوش گوار موڈ میں وہاں سے رخصت ہونے لگی تو اس نے وعدہ لینے والے انداز میں کہا۔

''ہماری استنبول روانگی میں صرف تین دن باقی رہ گئے ہیں۔ تمہیں یہ پیمان باندھنا ہو گا کہ ..... نو مور قاکا قائی، نو مور آؤٹ ڈور ایکٹیویٹی۔''

''او کے۔ میں اپنی سی کوشش کروں گا۔'' جاسم نے کہا۔ ''آگے جو مالک کو منظور۔''

ناجیہ کے جانے کے بعد کامل کی کال آگئی۔ ''ہیلو، ہائے'' کے بعد اس نے استفسار کیا۔ ''جاسم کیا تم نے آج کا اخبار دیکھا؟''

''ہاں دیکھا اور تمہارا ''دوسرا کام'' مجھے بہت پسند آیا ہے۔'' جاسم نے ستائشی انداز میں کہا۔ ''اسے کہتے ہیں — آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام۔ تم نے ایک طرف جلیل سے بھاری تاوان وصول کیا اور دوسری جانب اسے جیل بھجوانے کا بندوبست کر کے میرے جیل میں گزرے ہوئے آٹھ سالوں کو کیس توپوں کی سلامی بھی دی ہے۔''

''یہ سب اس شیطان کو خوف زدہ کرنے کے لیے ہے۔'' کامل نے کہا۔ ''میں سمجھتا ہوں، جلیل کے منشیات والے دھندے کے کیس میں زیادہ جان نہیں ہے۔ وہ سارا چکر میں نے اپنے ایک اے ایس آئی کے تعاون سے چلایا ہے۔ مجھے اُمید ہے، پولیس اچھی طرح نچوڑنے اور موڑنے کے بعد اسے چھوڑ دے گی لیکن ......'' لمحاتی توقف کر کے کامل نے ایک گہری سانس لی پھر معنی خیز انداز میں بولا۔ ''تم نے اپنے ماموں پر جو کام لگایا ہے، اس کا جواب نہیں —''

''میں نے ایسا کیا کر دیا برو —؟'' جاسم نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''شعیب چاچا والا فقرہ —'' کامل نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''تم نے جلیل پر کون سا منتر پڑھ کر پھونکا تھا کہ اس کی زبان سے تمہارے بجائے شعیب چاچا کا نام نکلا۔ اس بے چارے کو قطعاً اندازہ نہیں کہ اپنی بے خبری میں اس نے کس کے جبڑوں میں اپنا بازو دے دیا ہے۔''

''جلیل نے میرا نام لینے کے بجائے شعیب چاچا کے خلاف بیان اس لیے دیا ہے کیونکہ اسے اغوا کرنے اور تاوان وصول کرنے والے شعیب چاچا کے آدمی تھے۔'' جاسم نے سرسراتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

''جگر! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟'' کامل ششدر رہ گیا۔

''جلیل نے پولیس کو جو بیان دیا ہے، وہ اخبار میں شائع ہونے والی خبر کے ذریعے اب تک شعیب چاچا تک پہنچ چکا ہو گا۔

پولیس تو اپنی جیب گرم کرنے کے بعد جلیل کو چھوڑ دے گی لیکن شعیب چاچا قبر تک اس کا پیچھا کرے گا۔ اگر اس نے جلیل کو تشدد کا نشانہ بنا کر اس کی زبان سے یہ راز اگلوا لیا کہ اس کے ساتھ پیر کی صبح جو کارروائی ہوئی تھی وہ سب اس کے بھانجے جاسم کا کیا دھرا ہے تو تمہارے لیے نت نئی مشکلات کھڑی ہوجائیں گی جاسم۔"

"برو! میں تمہاری تشویش کو اچھی طرح سمجھ رہا ہوں لیکن ایسا کچھ نہیں ہوگا۔" جاسم نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "تم نے تھوڑی دیر پہلے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ...... میں نے جلیل پر ایک خاص منتر پھونک کر اس کے دماغ کو اپنی مٹھی میں لے لیا ہے۔"

"اوہ...... اچھا۔" کامل نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "ذرا میں بھی تو سنوں کہ وہ کایا پلٹ منتر کون سا ہے؟"

"یہ جنتر اور منتر کی آمیزش سے تیار کیا جانے والا ایک آزمودہ کار منتر ہے برو......" جاسم نے موقع محل کے تقاضوں کے پیش نظر، حقائق کے دامن میں دروغ بر مصلحت کی ٹاکی لگاتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "اس روز نمبر مارکیٹ والے آپریشن کے دوران میں جب تم جلیل کے لیے رکشا کا بندوبست کرنے گئے تھے تو مجھے جلیل سے بات کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ ہم انڈر ورلڈ کنگ شعیب چاچا کے بندے ہیں۔ جیل میں میری اس کے بھانجے جاسم سے ملاقات ہوئی تھی اور جاسم نے مجھے اپنے حالات سے آگاہ کیا تھا۔ میں نے ان حالات کا فائدہ اٹھانے کے لیے جاسم بن کر اپنے ساتھیوں کی مدد سے اسے اغوا کیا ہے اور دس لاکھ روپے وصول کرنے کے بعد اسے زندہ اس لیے چھوڑ رہا ہوں کہ میری اس سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہے۔ میں نے اس پر یہ بھی واضح کردیا کہ جاسم بے چارے کو تو اس واقعے کی خبر بھی نہیں ہے۔ وہ جیل سے رہا ہونے کے بعد در در کی ٹھوکریں کھاتا رہا اور آج کل شوبز کی دنیا میں اپنی قسمت آزمانے کی کوششوں میں لگا ہوا ہے۔ جلیل نے میری ہر بات پر من و عن یقین کرلیا تھا کیونکہ......" وہ اپنی سانس ہموار کرنے کے لیے تھما پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

"کیونکہ ایک تو جلیل نے مجھے نو سال کے بعد دیکھا ہے۔ اس دوران میں میری جسامت، قدوقامت اور خال و خط میں نمایاں تبدیلیاں پیدا ہوچکی ہیں۔ دوسرے میں نے اپنے چہرے پر گھنی مونچھیں چپکانے کے علاوہ اپنے ہیئر اسٹائل کو بھی ایک نیا لک دے رکھا تھا لہٰذا پہچان کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا برو۔"

"جگر......!" کامل نے حیرت اور الجھن کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ کہا۔ "تم تو چھپے رستم نکلے۔"

"برو! رستم اور سہراب کا زمانہ تو لد گیا۔" جاسم نے عام سے لہجے میں کہا۔ "آج کل کے مدِمقابلین کو جسمانی نہیں، ذہنی طاقت سے مات دینا پڑتی ہے۔ بس، ان لمحات میں، میرے ذہن میں جو آیا، میں نے چشم زدن میں اس پر عمل کر ڈالا۔ یہ میری گڈ لک ہے کہ میں نے جو چال چلی تھی، اس کے نتائج حسبِ توقع برآمد ہوئے ہیں۔"

یہ درست ہے کہ جاسم نے کامل کو آدھا سچ/آدھا جھوٹ بتایا تھا۔ اس کا یہ اقدام حفظِ ماتقدم کا عکاس تھا۔ اگرچہ وہ شعیب چاچا کی بربادی والے پروجیکٹ میں کامل کے شانے سے شانہ ملا کر چل رہا تھا لیکن ان کے تعلقات ابھی اعتماد کے اس نہج پر نہیں پہنچے تھے کہ وہ اپنا دل و دماغ کھول کر کامل کے سامنے رکھ دیتا۔

"تم نے یعنی تمہاری ذہانت اور معاملہ فہمی نے مجھے متاثر کیا ہے جگر!" کامل نے توصیفی انداز میں کہا پھر پوچھا۔ "کل دن میں دو تین گھنٹے نکال سکتے ہو؟"

کامل کے اس اچانک سوال پر جاسم نے سپاٹ آواز میں استفسار کیا۔ "خیریت تو ہے نا؟"

"تھوڑے ہاتھ پاؤں کھولنے کا ارادہ ہے۔" کامل نے بتایا۔ "میں کل شعیب چاچا کو ایک جھٹکا دینا چاہتا ہوں۔ اس نیک کام میں اگر تم بھی میرے ساتھ ہوگے تو لطف دوبالا ہوجائے گا۔"

"اوہ۔" جاسم نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ "کیا پلین ہے؟"

"پلین کے بارے میں، میں تمہیں کل ہی بریف کروں۔" کامل نے دوٹوک انداز میں جواب دیا۔ "ابھی صرف اتنا بتادو کہ تم آرہے ہو یا نہیں......؟"

جاسم نے فیصلہ کن لہجے میں دریافت کیا۔ "کتنے بجے اور کہاں آنا ہے؟"

"ٹھیک نو بجے، کینٹ اسٹیشن، مین بلڈنگ......"

"اوکے۔ میں پہنچ جاؤں گا۔" جاسم نے ٹھوس انداز میں کہا۔

شعیب چاچا کو جھٹکا دینے والی بات نے جاسم کے تن بدن میں ایک مسرت انگیز سنسنی دوڑا دی تھی۔

☆☆☆

لاہور جنکشن سے براستہ فیصل آباد، کراچی کینٹ اسٹیشن آنے والی بیالیس ڈاؤن ایکسپریس ٹرین لگ بھگ

آدھا گھنٹا لیٹ تھی۔ یہ ٹرین عموماً اٹھارہ سے انیس گھنٹے میں لاہور سے کراچی پہنچ جایا کرتی تھی۔ کامل کے مشن کا تعلق اسی ٹرین سے تھا چنانچہ اس نے جاسم کو ٹھیک نو بجے کینٹ اسٹیشن آنے کو کہا تھا کیونکہ بیالیس ڈاؤن اس ٹرین کی آمد کا وقت کم و بیش ساڑھے نو بجے کا تھا لہٰذا انہیں بات چیت کے لیے اچھا خاصا موقع مل گیا تھا کہ ٹرین لیٹ تھی۔

کامل نے جاسم کو بتایا۔ "اس ٹرین پر فیصل آباد کے ریلوے اسٹیشن سے ایک باپ بیٹی سوار ہوئے تھے۔ وہ ایک کرسچن فیملی سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہیں یہاں صدر کے علاقے میں جانا ہے۔ باپ کا نام مائیکل اور بیٹی کا ٹریسی ہے۔ ٹریسی ایک اسکول ٹیچر ہے اور وہ اپنی بیمار بڑی بہن سارہ سے ملنے آرہی ہے۔ سارہ ایک اسپتال میں نرس کے طور پر کام کرتی ہے۔ اس کے دونوں گردے ناکارہ ہوچکے ہیں کیونکہ وہ کافی عرصے سے ہائی لیول گلوکوز کی پیشنٹ ہے۔ اگر فوری طور پر سارہ کے اندر ایک ہیلدی کڈنی ٹرانسپلانٹ نہ کیا گیا تو اس کی موت واقع ہوجائے گی۔ ٹریسی اپنی بڑی بہن کی زندگی بچانے کے لیے اپنا ایک کڈنی ڈونیٹ کرنے کراچی آرہی ہے اور بدقسمتی سے ٹریسی کے اس پروگرام کی خبر شعیب چاچا کے لوگوں کو ہوگئی ہے۔"

"اوہ۔" جاسم نے فکرمندی سے کامل کی طرف دیکھا۔ "اس کا مطلب ہے، شعیب چاچا کے آدمی ٹریسی اور مائیکل کو سارہ کے پاس نہیں پہنچنے دیں گے لیکن میں سمجھ نہیں پارہا کہ شعیب چاچا کو ٹریسی کے پروگرام کا کیسے پتا چلا؟"

"شعیب چاچا کا نیٹ ورک پورے ملک میں کام کررہا ہے۔" کامل نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "بعض چیدہ پرائیویٹ لیبارٹریز میں اس کے نمک خوار موجود ہیں۔ جب کوئی تشویشناک معاملہ درپیش ہو تو ہم مریض کے ٹیسٹ وغیرہ کے لیے عموماً پرائیویٹ ہاسپٹلز اور لیبارٹریز کا رخ کرتے ہیں کیونکہ ہمارے ذہن میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ لیبارٹری جتنی زیادہ مہنگی اور اس کی عمارت جتنی زیادہ عالیشان ہوگی، ٹیسٹ کی رپورٹ بھی اتنی ہی زیادہ معیاری اور لائق اعتبار ہوگی۔ بہرحال......" وہ سانس ہموار کرنے کے لیے تھما پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"شعیب کے وفادار، ایسے افراد کی رپورٹس کی ایک کاپی اسے بھی بھیج دیتے ہیں جن کے انٹرنل آرگنز صحت مند ہوتے ہیں۔ جب ٹریسی کے سپرفٹ گردوں کے بارے میں انہیں پتا چلا تو انہوں نے ٹریسی کو فالو کرنا شروع کردیا۔ جلد ہی یہ معلوم کرلیا گیا کہ ٹریسی، فیصل آباد کے چوک گھنٹا گھر میں رہتی ہے اور اپنی بڑی بہن سارہ سے ملنے کراچی جانے والی ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی پتا چل گیا کہ ٹریسی کس مقصد سے کراچی جارہی ہے۔ ٹریسی کے بلڈ گروپ اور دیگر میچنگز کا حامل ایک کڈنی شعیب چاچا کی اشد ضرورت ہے۔ اس کے پارٹنر جنید واسطی کے عالیشان اسپتال میں اشفاق علی نامی ایک ایسا مریض ایڈمٹ ہے جسے ٹریسی کے کڈنی کی ٹرانسپلانٹ سے نئی زندگی مل سکتی ہے۔ اشفاق علی ایک کروڑ پتی عیاش گڈز ٹرانسپورٹر ہے جس کی بدفعلیوں اور بے اعتدالیوں نے اس کے دونوں گردوں کا سوا ستیاناس مار دیا ہے۔ وہ اس وقت جنید واسطی کے اسپتال میں ڈیالسس پر ہے۔ اس سے میچنگ گردے کی تلاش تھی اور یہ گردہ ٹریسی کے پیٹ کے اندر رہتے ہوئے خود چل کر کراچی پہنچ رہا ہے چنانچہ آئندہ پیر، اٹھارہ تاریخ کو جنید واسطی کے اسپتال میں اشفاق علی کے جسم میں ٹریسی کا کڈنی ٹرانسپلانٹ کیا جانے والا ہے۔ ٹریسی کی بہن سارہ صدر میں، جعفری چشمے والی گلی میں رہتی ہے لیکن شعیب کے بندے ٹریسی کو کینٹ اسٹیشن سے صدر نہیں پہنچنے دیں گے، اسے راستے ہی میں کسی جگہ اٹھا لیا جائے گا۔"

"او مائی گاڈ......" جاسم نے نفرت آمیز انداز میں کہا۔ "کتنے سفاک اور درندہ صفت ہیں یہ لوگ......"

سرمد صدیقی نے جب جاسم اور ناجیہ کو شعیب چاچا کے ہیومن آرگنز کی ٹرانسپلانٹیشن کے گھناؤنے کاروبار (بلڈی بزنس) کے بارے میں بتایا تھا تو اس سلسلے میں صدیقی نے شعیب کے دو پارٹنرز کا بھی ذکر کیا تھا جن میں سے ایک کسی مہنگے پرائیویٹ اسپتال کا مالک اور دوسرا کراچی کا ایک چوٹی کا وکیل تھا تاہم صدیقی نے ان کے نام نہیں لیے تھے۔ ابھی کامل کی زبانی جاسم کو معلوم ہوا تھا کہ شعیب کے پارٹنر ڈاکٹر کا نام جنید واسطی تھا۔ یہ تمام تر خیالات پلک جھپکتے میں جاسم کے ذہن سے گزر رے۔ اگلے ہی لمحے کامل کی سرسراتی ہوئی آواز اس کی سماعت تک پہنچی۔

"تمہاری سوچ سے بھی زیادہ سفاک اور شقی القلب...... میں خود کو دودھ کا دھلا نہیں سمجھتا۔ میں نے ایک طویل عرصہ دادا کے سائے میں کام کیا ہے اور اب ڈھائی سال سے اکیلا ہی اس کام کو سنبھال رہا ہوں لیکن اپنے دھندے میں انسانیت سوز معاملات کی کوئی گنجائش نہیں۔ دادا جس نوعیت کی بدمعاشی کرتے تھے، اس میں کمزور اور عزت دار کا بھلا اور طاقتور بے غیرتوں کی واٹ لگائی جاتی تھی۔ میں بھی دادا کی روش پر چل رہا ہوں اور مجھے اس میں کوئی شرمندگی محسوس نہیں ہوتی۔ ہم نے کبھی کسی مجبور کی جان،

مال اور عزت پر ہاتھ نہیں ڈالا۔ ہمارا نشانہ شیب چاچا جیسے تنگ انسانیت لوگ ہی بنتے رہے ہیں۔ اس قسم کی بڑی مچھلیاں اپنی دولت اور تعلقات کا استعمال کر کے ہر قانون اور اس کی پکڑ دھکڑ سے با آسانی بچ جاتی ہیں اور ہم ایسی خون خوار مچھلیوں کے شکار کو کارِ ثواب سمجھتے ہیں۔"

کامل کی نگاہ اس گفتگو کے دوران میں کسی عقاب کے مانند یہاں سے وہاں تک معروفِ عمل تھی۔ وہ بے حد چوکنا اور مستعد دکھائی دیتا تھا۔ جاسم نے پوچھا۔

"شیب کا ایک دوسرا پارٹنر بھی تو ہے۔ سنا ہے، وہ کوئی بہت ہی کائیاں ایڈووکیٹ ہے۔"

"اس وکیل کا نام احمد یار علی ہے۔" کامل نے بتایا۔ "احمد یار کی ایک خاصیت یہ ہے کہ وہ اپنی حکمتِ عملیوں سے شیب چاچا کے راستے میں کسی قانونی روڑے کو اٹکنے نہیں دیتا۔ اس شاطر انسان کو کتابوں میں لکھے ہوئے قوانین کی ایک ایک کمزوری کا علم ہے لہٰذا وہ شیب چاچا کے بچاؤ کا کوئی نہ کوئی راستہ نکال ہی لیتا ہے۔ ویسے بھی اس وقت پوری دنیا میں کارپوریٹرز کا راج ہے۔ ان کی طاقت کے سامنے قانون کسی موم کی گڑیا سے زیادہ حیثیت کا حامل نہیں ہے جسے یہ لوگ جب چاہیں، اپنی مرضی کے قالب میں ڈھال لیتے ہیں۔"

"کارپوریٹ کلچر چاہے کتنا بھی اسٹرانگ کیوں نہ ہو لیکن ان کے اوپر بھی تو کوئی طاقت موجود ہے نا——" جاسم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "وہ قادرِ مطلق جب اپنی دراز رسی کو کھینچتا ہے تو اس رسی کے ساتھ بندھے ہوئے تمام سرکش اور خود سر انسان منہ کے بل، اپنی فرعونیت کے آسمان سے زمین پر آ کر گرتے ہیں، پھر در بہ دری اور خاکستری ہی ان کا مقدر ٹھہرتی ہے۔"

"بے شک!" کامل نے قلبی لہجے میں کہا۔ "اس قادرِ مطلق نے ہم جیسوں کو ان فرعونوں اور نمرودوں کی سرکوبی کے کام پر لگا رکھا ہے۔"

"تمہارے ہوم ورک کو دیکھ کر مجھے بہ خوبی اندازہ ہو گیا ہے کہ تم نے سارہ کا صدر والا گھر بھی دیکھ رکھا ہو گا۔" جاسم نے کامل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور تمہیں یہ بھی اچھی طرح معلوم ہے کہ مائیکل اور اس کی بیٹی ٹریسی فوری طور پر ڈاؤن کی کس بوگی سے برآمد ہوں گے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا——؟"

"نہیں—— تمہارا اندازہ درست ہے۔" کامل نے گرد و پیش پر گہری نگاہ ڈالتے ہوئے جواب دیا۔ "میرے بندے نے ابتدائی معلومات فراہم کی تھیں۔ باقی کی ریسرچ میں نے خود کی ہے۔ بیالیس ڈاؤن ایکسپریس ٹرین پلیٹ فارم پر آ کر لگے گی جہاں اس وقت ہم کھڑے ہیں۔ ٹریسی والی بوگی ہمارے سامنے ہی پڑے گی۔ پلیٹ فارم پر موجود قلی حضرات کا تجربہ بڑا زبردست اور سولڈ ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں، میں نے ایک قلی سے مدد لی تاکہ زیادہ نہ بھٹکنا پڑے۔"

ادھر کامل کی بات ختم ہوئی، ادھر اسپیکر سے ٹرین کی آمد کا اعلان ہونے لگا۔ "لاہور سے آنے والی بیالیس ڈاؤن ایکسپریس ٹرین پلیٹ فارم نمبر پانچ پر لگے گی۔"

جاسم نے بے ساختہ نظر اٹھا کر دیکھا۔ اسے ایک فریم میں پلیٹ فارم نمبر پانچ کا بورڈ دکھائی دیا۔ کامل کی ایکوریسی نے اسے متاثر کیا۔ اس نے گمبھیر انداز میں سوال کیا۔

"کامل! تمہارا پلان کیا ہے……؟"

"پلان اے……" کامل نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "کسی قسم کی مار دھاڑ کے بغیر ٹریسی کو شیب کے بندوں کے ہاتھ نہ لگنے دیا جائے۔ تمہیں وہ جینز اور چیک دار اوپن شرٹ میں جو آدمی نظر آ رہا ہے، اس کا نام فیضان ہے۔ وہ میرا بندہ ہے اور ایک رکشا ڈرائیور کے روپ میں یہاں موجود ہے۔ ٹریسی اور مائیکل جیسے ہی ٹرین سے باہر آئیں گے، میں فیضان کو اشارہ کر دوں گا۔ وہ سائے کی طرح ان کے ساتھ لگ جائے گا اور انہیں اپنے رکشا میں صدر تک پہنچانے کے لیے آمادہ کر لے گا۔ مطلب وہ دونوں باپ بیٹی ہمارے بندے کے رکشا میں ہوں گے لہٰذا ان کا تحفظ دینا ہمارے لیے آسان ثابت ہو گا۔ ہم سے مراد میں، تم اور وسیم و ناصر۔ یہ دونوں گرین ہائی روف میں ریلوے اسٹیشن کے باہر ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ اپنی ہائی روف فیضان والے رکشا کے ساتھ لگا کر رکھیں گے کہ جانے کس وقت کسی ہنگامی کارروائی کی ضرورت پیش آ جائے کیونکہ شیب چاچا کے لوگ ٹریسی والے رکشا کو گھیر کر ٹریسی کو لے جانے کی اپنی سی پوری کوشش کریں گے۔ میں ہونڈا سیون فائیو لایا ہوں۔ ہم دونوں اسی موٹر سائیکل پر رکشا و ہائی روف کے ساتھ چلیں گے۔ پھر جو ہو گا، دیکھا جائے گا۔"

جاسم نے اثبات میں گردن ہلائی اور ہر قسم کی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے تیار ہو گیا۔

حیرت و تجسس کی تہ میں چھپی اس داستان کے باقی واقعات اگلے ماہ پڑھیں

اناڑی

خلیل جبار

پرانے دوستوں کو دیکھ کے ضبط کے بندھن ٹوٹ جاتے ہیں... صحبتِ دوستاں میں گزرے لمحات گویا نہنڈ کے مانند ہوتے ہیں... جو وقت گزرنے کے بعد جسم کو حرارت بخشتے ہیں... مگر کچھ دوست وقت کی گردش کے ساتھ بدلتے چلے جاتے ہیں... دو دوستوں کے درمیان رونما ہونے والی ڈرامائی صورتِ حال...

ایک فرض شناس پولیس افسر کی تحقیق و تفتیش کا نتیجہ

قتل کی واردات ریلوے کوارٹرز کے پچھلی جانب ہوئی تھی۔ مجھے جیسے ہی قتل کے بارے میں خبر ملی میں وہاں پہنچ گیا۔ میرے ساتھ میرا اسسٹنٹ یاسر بھی تھا۔ لاش گھاس کے لمبے پتوں پر پڑی تھی۔ کوارٹرز کے پیچھے آبادی نہ ہونے پر لوگوں کی یہاں دن کے وقت بھی آمد و رفت نہیں تھی۔ ریل کی پٹریاں تھیں جس پر ٹرین اپنے مخصوص اوقات میں گزرتی تھی۔ میری ڈیوٹی کے دوران اس علاقے میں یہ قتل کی پہلی واردات تھی۔

لاش کی مختلف زاویوں سے تصاویر لی جا رہی تھیں۔ اس دوران میں اور میرا اسسٹنٹ یاسر بھی اس واردات کو سمجھنے کے لیے بغور جائزہ لے رہے تھے۔

"سریدگی کا کیس لگتا ہے۔" یاسر نے معائنہ کرنے پر کہا۔

"تم یہ بات کس بنیاد پر کہہ رہے ہو؟" میں نے اس کے چہرے کو بغور دیکھا۔

"لاش سے کچھ فاصلے پر اس کی موٹر سائیکل کھڑی ہے۔ ڈکیت نے اس سے موبائل اتارا ہو گا اس کے انکار پر قتل کر دیا۔"

"میرا خیال ہے ایسا نہیں ہے، یہ موبائل چھیننے کی واردات نہیں ہے۔ یہ خالصتاً قتل کی واردات ہے۔" میں نے

کہا۔
"وہ کیسے سر؟"
"موبائل نہ دینے پر ڈکیت گولی مار کر فرار ہو جاتا اور جاتے جاتے موبائل بھی لے جاتا۔ اسے کیا ضرورت پڑی تھی وہ پستول کے بجائے کسی دوسری چیز کا استعمال کر کے اس کے سر پر حملہ کرتا اور پھر لاش کو گھسیٹتا ہوا اسے گھاس پر ڈالتا۔"
"واقعی میرا ذہن اس طرف نہیں گیا۔" یاسر نے کہا۔
"اپنے دماغ کو حاضر رکھا کرو۔ دیکھو قتل موٹر سائیکل پر نہیں کچھ دور ہوا ہے پھر قتل کر کے لاش کو گھسیٹ کر گھاس پر ڈال دیا گیا۔"
"قتل میں استعمال ہونے والا کوئی ہتھیار بھی یہاں موجود نہیں ہے۔"
"قاتل اناڑی ضرور ہے مگر اتنا بے وقوف نہیں ہے کہ وہ ہتھیار پھینک جاتا جس سے قتل کیا ہو۔ پولیس فنگر پرنٹ کی مدد سے اسے گرفتار کر سکتی ہے۔"
"سر یہ بات طے ہے کہ قتل ڈکیتی کے دوران مزاحمت پر نہیں ہوا، کسی دشمنی پر ہوا ہے۔"
"بالکل یہی بات ہے۔" میں نے اپنی گردن ہلائی۔
"سر یہ کیس بہت دلچسپ لگ رہا ہے۔"
"حقائق سامنے آجائیں پھر تبصرہ کر لینا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
لاش کا پوسٹ مارٹم ہو جانے پر مقتول کے لواحقین کو لاش دے دی گئی تھی۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے کوئی خاص بات معلوم نہیں ہو سکی تھی۔ سوائے اس کے کہ مقتول سجاد کے سر میں لوہے جیسی کسی سخت چیز سے حملہ کر کے زخمی کیا گیا تھا۔ چوٹ گہری تھی اس لیے موقع پر ہی جاں بحق ہو گیا۔
مقتول کے والد جاوید اور بیوہ زبیدہ کو کسی پر بھی شک نہیں تھا اور نہ ہی انہوں نے کوئی ایسی بات نوٹ کی تھی جس سے پتا چلتا کہ وہ ان دنوں پریشان ہے یا کسی شخص سے خوف زدہ ہے۔ واقعے کی رات روزانہ کی طرح اپنے دوستوں سے ملاقات کرنے گیا تھا۔ رات بھر گھر سے باہر رہا۔ کال کرنے پر بھی کال وصول نہیں کر رہا تھا۔ صبح پولیس کے ذریعے اطلاع ملی، سجاد کو قتل کر دیا گیا ہے۔
قتل کے سلسلے میں تفتیش کا آغاز میں نے ریلوے کوارٹرز سے کیا۔ ریلوے ملازم شبیر کا کوارٹر اس مقام پر تھا جہاں سجاد کا قتل ہوا تھا۔ میں شبیر کے سامنے بیٹھا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر خوف زدہ ہو گیا تھا۔ پولیس کو دیکھ کر اکثر لوگ خوف زدہ ہو ہی جاتے ہیں۔

"تمہارے علم میں یہ بات ہو گی کہ پرسوں رات ایک قتل ہوا ہے اور قتل بھی تمہارے کوارٹر کے پیچھے ہوا ہے۔" میں نے بات کا آغاز کیا۔
"ہاں مجھے آج ہی معلوم ہوا ہے۔" شبیر نے بتایا۔
"جس وقت قتل ہوا تم کہاں تھے؟"
"میں ڈیوٹی پر تھا۔ جس ٹرین میں میری ڈیوٹی تھی، قتل کی رات سے قبل شام سات بجے راولپنڈی روانہ ہوئی۔ دوسرے دن شام کو لوٹنے پر پتا چلا کہ رات ایک شخص کا قتل ہو گیا ہے۔"
"قتل کے متعلق پولیس کو کسی قسم کی کوئی معلومات مل سکتی ہے؟"
"جمعرات کی رات کو قتل کے وقت میں یہاں موجود نہیں تھا اور نہ ہی میری فیملی کیونکہ میری فیملی ایک شادی کے سلسلے میں کراچی گئی ہوئی ہے۔"
"قتل کی رات تمہارا کوارٹر بند تھا؟"
"نہیں۔"
"پھر کون تھا کوارٹر میں اس وقت؟"
"میرا دوست الطاف موجود تھا۔ اسے حیدرآباد میں کام تھا اس لیے میرے کوارٹر میں ٹھہر گیا تھا۔"
"وہ کہاں رہتا ہے؟"
"الطاف کراچی میں رہتا ہے۔ اکثر کام کے سلسلے میں حیدرآباد آتا رہتا ہے۔"
"وہ کیا کام کرتا ہے؟"
"سیلز مین ہے۔ کبھی پندرہ اور کبھی مہینے میں حیدرآباد آتا ہے اور دکان داروں سے وصولی مال کا آرڈر لے کر چلا جاتا ہے۔ کبھی دیر ہو جانے پر میرے یہاں قیام کرتا ہے۔"
"کیا الطاف سے ملاقات ہو سکتی ہے؟" میں نے پوچھا۔
"یہ اتفاق ہی ہے، وہ دو روز اور حیدرآباد میں قیام کرے گا۔ وہ مارکیٹ گیا ہوا ہے اور آنے ہی والا ہے۔ اگرچہ منٹ انتظار کر لیں تو ملاقات ہو سکتی ہے۔"
"ٹھیک ہے، میں انتظار کر لیتا ہوں۔" میں نے کہا۔
"میں ویسے بھی وہاں کچھ دیر ٹھہرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ دراصل میرا مقصد کوارٹر کا معائنہ کرنا تھا تاکہ کوئی ایسی معلومات مل جائیں جو قتل کا سراغ لگانے میں مدد فراہم کر دے۔ الطاف کے آنے تک میں کوارٹر کا تفصیلی معائنہ کر چکا تھا۔ وہاں سے کوئی ایسی چیز نہیں مل سکی جس سے قاتل تک پہنچنے میں کوئی مدد ملتی۔
ایک چھوٹے قد کا آدمی کوارٹر میں داخل ہوا۔ اس کے

ہاتھ میں ایک تھیلا تھا۔ جس میں روزمرہ استعمال ہونے والی ضروریات کا سامان تھا۔ اس نے بے فکری سے وہ تھیلا ایک جانب رکھ دیا اور آگے بڑھ کر مجھ سے مصافحہ کیا۔
"یہ الطاف ہے۔" شبیر نے بتایا۔
"جس رات قتل ہوا تم کہاں تھے؟" میں نے پوچھا۔
"میں کوارٹر میں ہی موجود تھا۔" اس نے بتایا۔
"پھر تو تم سے قتل کی واردات کے بارے میں خاصی معلومات مل سکتی ہیں۔" میں نے الطاف کے چہرے کو بغور دیکھا۔
الطاف میری بات سن کر ایک لمحے کو گھبرایا اور پھر اس نے شبیر کی طرف دیکھا۔
"قتل کے وقت تم نے کیا دیکھا؟"
"م...... میں سمجھا نہیں۔"
"میں تمہیں سمجھاتا ہوں، جس وقت تک کوارٹر میں تھے۔ کسی کے چیخنے چلانے کی آواز سنی ہو گی یا کسی کے زور، زور سے بات کرنے کی آواز سنائی دی ہو گی؟" میں نے کہا۔
"میری عادت ہے میں روزانہ بارہ بجے تک ٹی وی پروگرام ضرور دیکھتا ہوں۔ قتل والی رات میں بازار میں خاصی دیر تک رہا تھا جس سے بہت تھکاوٹ ہو گئی تھی اس لیے میں رات دس بجے ہی سو گیا تھا۔"
"تمہیں صبح ہونے پر پتا چلا ہو گا کہ کوارٹر کے پچھلی طرف قتل ہو گیا ہے؟"
"جی ہاں، بالکل یہی بات ہے۔" الطاف نے کہا۔
"شبیر قتل کے متعلق اس علاقے سے کچھ مدد مل سکتی ہے۔"
"یہ ممکن نہیں ہے۔"
"وہ کیوں؟" میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔
"جس جگہ قتل ہوا ہے وہ کوارٹرز کا پچھلا حصہ ہے۔ وہاں گھاس اور خودرو پودوں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ کوارٹرز کا گندا پانی اس جگہ کو خراب رکھتا ہے۔ رات تو کیا دن میں بھی کوئی وہاں جانا پسند نہیں کرتا۔ پچھلی طرف خاصا گھوم کر جانا پڑتا ہے۔ کوارٹرز کے درمیان سے کوئی ایسا راستہ نہیں ہے جو آدمی فوراً اسے وہاں لے جائے۔" شبیر نے بتایا۔
یہ بات وہ واقعی درست کہہ رہا تھا۔ کوارٹرز کے درمیان پچھلی طرف جانے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ میں وہاں سے چلا آیا۔ مجھے اب مقتول سجاد کے دوست سلمان سے ملاقات کرنی تھی۔ اس سے ضرور کچھ نہ کچھ ایسی بات معلوم ہو جاتی جس سے قاتل تک پہنچنا آسان ہو جاتا۔

اسانژی
سلمان ایک ہینڈسم قسم کا نوجوان تھا۔ اس کی شادی کو چند سال ہی ہوئے تھے۔ وہ ایک پرائیویٹ ادارے میں ملازم تھا۔ وہ سجاد کا قریبی دوست تھا اور ساتھ ہی انہوں نے تعلیم حاصل کی تھی پھر وہ پرائیویٹ ادارے میں ملازمت کرنے لگا تھا۔ اس کے برعکس سجاد نے اخبار کے شعبہ اشتہارات کی نوکری کو اپنایا تھا۔ دونوں کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق ہونے کے باوجود ان کی دوستی اچھی چل رہی تھی۔ میں نے سلمان سے اس کے گھر یا دفتر میں ملاقات کرنے کے بجائے ایک ریسٹورنٹ میں ملاقات کرنے کو...... ترجیح دی۔ میں اس وقت سادہ لباس میں تھا۔ ریسٹورنٹ میں وہ میرے سامنے بیٹھا تھا۔
"سجاد تمہارا گہرا دوست تھا؟" میں نے سوالات کا آغاز کیا۔
"اس میں کوئی شک نہیں، وہ میرا اچھا دوست تھا۔"
"تمہاری دوستی اس سے کب ہوئی؟"
"پرائمری اسکول میں میرے ساتھ تھا اور تعلیم مکمل ہونے تک ہمارا ساتھ رہا۔"
"کیا تم یہ بتا سکتے ہو، اس کی کسی سے ذاتی دشمنی تھی؟"
"ذاتی دشمنی بڑا مشکل سوال کر دیا ہے۔"
"مشکل کیسے؟" میں چونکا۔
"سجاد ایسا شخص نہیں تھا جس سے کوئی دشمنی رکھتا، وہ یاروں کا یار تھا۔"
"دوستوں کے کام آنے والا یہی بات ہے نا؟"
"ہاں بالکل یہی بات ہے۔"
"جب وہ اتنا اچھا انسان تھا پھر اس کا قتل کیسے ہو گیا؟"
"سجاد کا کام ایسا تھا وقتی طور پر اس کی لوگوں سے دشمنی ہو جاتی تھی پھر دوستی بھی ہو جاتی تھی۔"
"تمہاری بات میں بہت گہرائی ہے، ذرا کھل کر وضاحت کرو گے۔"
"میں سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔" سلمان نے کہا۔
"ٹھیک ہے بتاؤ۔"
"سجاد ایک اخبار میں شعبۂ اشتہارات میں کام کرتا تھا۔"
"ہاں، یہ بات میرے علم میں ہے آگے بولو۔"
"کوئی بھی بلڈر یا پارٹی جب آسانی سے اشتہار نہ دے پھر اشتہارات کے لیے کام کرنے والے ان کے متعلق کچھ خبریں حاصل کر کے شائع کرا دیتے ہیں جن سے ان کی ساکھ متاثر ہو سکتی ہے۔ بعض خبریں آنے سے پہلے ہی بلڈر یا پارٹی ان سے جوڑ توڑ کر لیتی ہے۔ کچھ اخبار میں خبر شائع ہونے پر"

"اخبار میں جب خبر چھپ گئی کہ وہ پارٹی کیوں اشتہار دے گئی؟" میں نے پوچھا۔

"ویسے تو اس طرح کی خبریں اخبار کی زینت بنتی ہیں، جب کوئی ڈیل فائنل ہو جائے، اس وقت یہ باتیں دل پر نقش ہو جاتی ہیں۔ معاہدت طے ہو جانے پر لاتعلقی ہو جاتی ہے۔"

"کیا ان دنوں سجاد کی کسی بندے سے کشیدگی چل رہی تھی؟"

"میرے علم میں نہیں ہے۔"

"کوئی ایسی بات جو مقتول کے منہ سے نکل گئی ہو جس کی مدد سے قاتل تک پہنچا جا سکے۔"

"سجاد کچھ پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھنے کی کوشش کی مگر وہ ٹال گیا۔"

"آپ نے مقتول سے کیا پوچھا تھا، کچھ یاد ہے؟"

"وہ کہنے لگا کہ اشتہارات کا معاملہ ہے۔ پیسے وقت پر نہیں ملے ہیں اور ادارے والے بات نہیں سمجھتے کہ وقت پر پیسے چاہئیں۔"

"تم ادارے کو مطمئن کر دو کہ پیسے آتے ہی ادا کر دو گے۔"

"ادارے والے اتنی آسانی سے بات نہیں مانتے۔ جب تک ادارے کو پیسے نہیں دو گے، میں جان چھڑا کر نہیں بھاگ سکتا۔"

"یہ بڑا مشکل کام ہے۔"

"لوگوں کی جیبوں سے پیسے نکلوانا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ یہ کاروبار بڑی محنت کا ہے۔" سجاد نے بتایا تھا۔

☆☆☆

میں ان چند لوگوں سے بھی ملا جن کے سجاد اشتہارات چھاپا کرتا تھا لیکن کوئی ایسی بات نکل نہ سکی جس سے پتا چلتا کہ سجاد کے ان چند میں سے کسی ایک سے تعلقات کشیدہ تھے۔

سلمان کی بات میں کوئی شک نہیں تھا، وہ مقتول دوستوں کا دوست تھا۔ اس کی نوکری اس نوعیت کی تھی کہ لوگوں سے اچھے تعلقات استوار رکھ کر ہی اشتہارات لے سکتا تھا۔ حال ہی میں سلمان ایک جھوٹے مقدمے میں جیل سے بری ہو کر آیا تھا۔ سلمان کے کہنے کے مطابق اس کی باتوں سے کہیں سے بھی نہیں لگتا تھا کہ وہ کسی جرم میں ملوث ہو سکتا ہے اس لیے وہ جھوٹے مقدمے سے بری ہو گیا تھا۔ سجاد نے اس مقدمے میں اس کا بھرپور ساتھ دیا۔ وکیل کی فیس اور دیگر اخراجات بھی وہی ادا کرتا رہا تھا کوئی بھی دوست اس موقع پر اس کے کام نہیں آیا تھا۔ دفتر میں بھی سلمان کی بہت عزت تھی۔ اس کا سب سے اچھا اخلاق تھا، وہ اپنی باتوں سے سب کو اپنا گرویدہ بنا لیتا تھا۔

میں سجاد کے اس دفتر میں بھی گیا جہاں وہ ملازمت کرتا تھا۔ اخبار کے منیجر نے خوش دلی سے میرا استقبال کیا۔

"میں اس وقت کیا خدمت کروں؟" منیجر قاسم نے پوچھا۔

"میں سجاد کے قتل کے سلسلے میں کچھ معلومات لینے آیا ہوں۔"

"سجاد ایک اچھا انسان تھا، اس کی کسی سے بھی دشمنی نہیں تھی پھر کیوں اسے قتل کر دیا گیا؟" منیجر قاسم یہ کہتے ہوئے افسردہ ہو گیا۔

"اس کی دشمنی تھی جبھی قتل ہوا۔" میں نے کہا۔

"دل یہ بات ماننے کو تیار نہیں ہے کہ کوئی اس کا دشمن بھی ہو سکتا ہے۔" منیجر نے کہا۔

"دل چاہے مانے یا نہ مانے۔ سجاد کا قتل ذاتی دشمنی کا نتیجہ ہے۔ میری تفتیش ثابت کر دے گی۔"

"اللہ کرے قاتل پکڑا جائے۔" منیجر قاسم نے کہا۔

"پولیس کی پوری کوشش ہوتی ہے جلد سے جلد قاتل کو پکڑ کر سزا دلائے۔ ہمیں لوگوں کے تعاون کی ضرورت ہے۔"

"میں یہ بات وثوق سے کہہ سکتا ہوں اخبار میں اس کی کسی سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔"

"کیا میں اخبار میں اس کے دوستوں سے بات چیت کر سکتا ہوں۔" میں نے پوچھا۔

"ہاں کیوں نہیں، میں سب سے تمہاری ملاقات کرا دیتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے منیجر نے باری باری کئی لوگوں سے ملاقاتیں کرا دیں۔

اخبار کے دفتر میں لوگوں سے ملاقات بے نتیجہ رہی۔ قاتل تک پہنچنے کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ اس کے اخبار میں سب سے اچھے تعلقات تھے پھر جس نے اسے قتل کیا، اس کی کیا دشمنی تھی اور وہ کون تھا۔ میں نے اپنے اسسٹنٹ یاسر کو موبائل سے متعلق معلومات لینے بھیجا تھا تاکہ معلوم ہو سکے کہ قتل ہونے کے ایک ماہ کے دوران اس کی کس کس سے باتیں ہوئی تھیں۔

سجاد کے موبائل سے ایک کارڈ بھی نکلا تھا۔ میں نے چیک کر لیا تھا اس میموری کارڈ میں اس کے دوستوں کی تصاویر تھیں، ان تصاویر کے پرنٹ بننے کو دے دیے۔ جب تصاویر کے پرنٹ میرے ہاتھ میں آئے، میرا رخ اسٹیشن کی طرف ہو گیا۔ ریلوے اسٹیشن پر بنے ایک ہوٹل والے کے پاس پارکنگ

کا ٹھیکا تھا۔ میں جب پارکنگ کے حصے میں گیا، یوسف مجھے دیکھ کر خوش ہو گیا۔

"سر جی آج ادھر کیسے؟ کیا کسی کو ڈھونڈنے نکلے ہیں؟"

"آج میں صرف تمہارے پاس خصوصی طور پر آیا ہوں۔"

"پھر تو میری یہ خوش نصیبی ہے۔" وہ زوردار قہقہہ مار کر ہنس دیا۔

"تمہارا کام کیسا چل رہا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کام ماشاء اللہ اچھا چل رہا ہے۔ پہلے یہ بتائیں ٹھنڈا چلے گا یا گرم؟" اس نے پوچھا۔

"میں کچھ پینے نہیں آیا۔"

"جب میرے پاس آئے ہو، کچھ نہ کچھ پینا چاہیے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے زبردستی بوتل منگوالی۔

بات چیت کے دوران میں نے سجاد کے دوستوں کی تصاویر نکالیں اور ایک ایک کر کے اسے دکھانے لگا۔ تصاویر دکھاتے ہوئے پوچھتا بھی جاتا تھا کہ اسے جانتے ہو اور وہ نفی میں سر ہلا دیتا۔ ایک تصویر پر یوسف بولا۔ "ہاں اسے میں جانتا ہوں۔"

"کیسے جانتے ہو؟"

"میں اس کا نام نہیں جانتا مگر شکل سے جانتا ہوں، یہ ہمارے پرانے علاقے میں رہتا ہے۔"

"تم نے اپنا علاقہ تبدیل کر لیا ہے؟"

"وہ گھر تنگ ہو گیا تھا۔ فیملی میں خوب اضافہ ہو گیا تھا۔ اس لیے بڑا ہونے کے ناتے میں ہی دوسرے علاقے میں اپنی فیملی کو لے گیا ہوں۔"

"یہ شخص کیسا ہے؟"

"شریف آدمی ہے۔ کسی لڑائی جھگڑے میں نہیں رہتا۔"

"کیا جمعرات کی رات اس نے اپنی گاڑی پارک کی تھی؟"

"ہاں جمعرات کو یاد آیا رات بارہ بجے یہ گاڑی پارک کرنے آیا تھا اور واپسی ایک یا ڈیڑھ گھنٹے بعد ہوئی، یہ شخص کچھ گھبرایا ہوا لگ رہا تھا۔"

"تم نے اس سے پوچھا نہیں۔"

"میں نے پوچھا تھا۔"

"پھر کیا بتایا؟"

"کہنے لگا، میں جلدی میں ہوں اور چلا گیا۔"

"اس شخص کو پہچان لیا ہے نا؟"

"میں اسے کیسے نہیں پہچانتا میرے پرانے علاقے کا بندہ ہے، ویسے بات کیا ہے؟"

"ابھی کچھ نہیں ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے یوسف کو دیکھا۔

"پولیس والے ہو، ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔ جبھی میرے پاس آئے ہو۔" وہ مسکرایا۔

"میں نے کہا ہے نا ابھی کچھ نہیں، جب تفتیش مکمل ہو گی پھر بتاؤں گا۔" میں نے کہا۔

ہم پولیس والوں کے کام کا آغاز شک سے شروع ہوتا ہے۔ مجھے پارکنگ پر جانے کا خیال اس لیے آیا تھا کہ جس جگہ قتل کی واردات ہوئی تھی وہاں دوسری کسی موٹر سائیکل کے ٹائر کے نشانات نہیں تھے۔ اس کا مطلب ہے قاتل پہلے سے وہاں موجود تھا۔ وہ جانتا تھا کہ مقتول وہاں سے ضرور گزرے گا یا وہ خود کسی بہانے سے مقتول کو اس مقام پر لایا تھا۔ میں اسی لیے پارکنگ پر گیا تھا تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ قاتل نے وہاں اپنی گاڑی پارک کی تھی یا نہیں۔ کوئی بھی قاتل یہ رسک نہیں لے سکتا۔ وہ قتل کر کے آسانی سے پیدل، پیدل چلا جائے، یہ بھی ممکن ہے۔ میں جس کو قاتل سمجھ رہا ہوں وہ قاتل نہ ہو محض میرا شک ہو۔

☆☆☆

سلمان تھانے میں میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ میرے بلانے پر ہی آیا تھا۔

"تم نے سجاد کو کیوں قتل کیا؟"

"م۔۔۔م۔۔۔ میں کیوں قتل کروں گا؟"

"سجاد تمہارا بہت اچھا دوست تھا۔ اس نے تمہیں ایک جھوٹے مقدمے سے جیل سے چھڑایا تھا پھر بھی۔۔۔"

"وہ جھوٹا مقدمہ بھی اس نے ہی مجھ پر بنوایا تھا۔"

"یہ تم کیسے کہہ رہے ہو؟"

"جیل سے آنے پر مجھ پر یہ انکشاف ہوا تھا۔ اس میں بھی اس کے مقاصد تھے اس لیے سجاد نے ایسا کیا تھا۔"

"کیا مقاصد تھے ذرا کھل کر بتاؤ؟"

"یہ میں نہیں بتا سکتا۔"

"دیکھو قتل کے مقدمے سے تم کسی طرح بھی نہیں بچ سکتے اس لیے صاف صاف بتا دو ممکن ہے تمہاری بچت ہو جائے، سزا میں نرمی ہو جائے۔" میں نے ٹھہر ٹھہر کر جملے ادا کیے۔

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ میں اسے زیادہ سوچنے کی مہلت نہیں دے سکتا تھا۔

"تم نے جمعرات کی رات گاڑی ریلوے اسٹیشن کے پارکنگ میں پارک کی اور پھر سجاد کو دھوکے سے وہاں لے گئے

اور پھر ترقی کرتے بڑی تیزی کے ساتھ پارکنگ پر گئے تم بہت پوچھنے کو رہے تھے، پارکنگ پر موجود شخص نے تم سے بات چیت کرنے کی کوشش بھی کی لیکن تم نے اس کی بات سنی ان سنی کردی تھی۔"

میری بات سن کر ایک لمحے کو وہ بری طرح چونکا۔

"جو بات تم کہہ رہے ہو، ثابت کر سکتے ہو؟" سلمان نے کہا۔

"ہم ثبوت کی بنیاد پر مجرمان کو گرفتار کرتے ہیں۔ قاتل کو ثبوت کی بنیاد پر ہی سزا ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔

اس پر میری بات نے گہرا اثر چھوڑا تھا اس لیے وہ سوچ میں پڑ گیا۔

"زیادہ سوچو نہیں صاف صاف بتاؤ، ہم لوگوں کا وقت بہت قیمتی ہوتا ہے۔"

"جب تم مجھے قاتل سمجھ رہے ہو پھر گرفتار کیوں نہیں کر رہے؟"

"میں چاہتا ہوں کہ تم سچ بتا دو۔"

"میرے سچ اگلنے سے کیا ہوگا؟"

"سزا میں نرمی ہو جائے گی۔" میں نے اپنی بات پر زور دیا۔

حقیقت یہ تھی میرے پاس کوئی ٹھوس ثبوت نہیں تھا کہ اسے قاتل ثابت کر سکوں۔ میں شک کی بنیاد پر سلمان کو سجاد کا قاتل سمجھ رہا تھا۔ آج سلمان سے میں یہ اگلوانے میں کامیاب ہو جاتا کہ وہ ہی قاتل ہے اور قتل کس طرح کیا ہے تو میں اپنی کوشش میں کامیاب ہو جاتا۔

میری تھوڑی سی کوشش سے سلمان قتل سے متعلق معلومات دینے کو تیار ہو گیا۔

"سجاد اور میں نے بی اے تک ساتھ تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ بی اے کر کے اخبار کی نوکری سے منسلک ہو گیا تھا۔ اخبار میں رہ کر اس نے مختلف بلڈرز سے اچھے تعلقات بنا لیے تھے۔ موٹر سائیکل بنانے والی کمپنیوں کے مالکان سے بھی اس کے اچھے روابط تھے۔ دولت آنے پر وہ غیر اخلاقی سرگرمیوں میں مبتلا ہو گیا۔ جس راہ پر وہ گامزن تھا وہ اچھی راہ نہیں تھی۔ دوست ہونے کے ناتے میں اسے سمجھاتا تھا۔

"سجاد شراب پینا اور دیگر غیر اخلاقی سرگرمیاں اچھی نہیں ہوتی ہیں۔"

"تم نہیں جانتے یہی کامیابی کا زینہ ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"بڑے لوگوں کی صحبت میں رہنے کے لیے ان جیسا بننا پڑتا ہے۔ شراب پینا کوئی برا فعل تصور نہیں کیا جاتا۔ بڑے لوگوں سے دوستی رکھنا کبھی بھی بہت فائدہ مند رہتا ہے۔ انسان بہت سی باتیں منوالیتا ہے۔ بزنس اچھا چل جاتا ہے۔"

"اسی لیے تم اشتہارات لینے جب بھی جاتے ہو کوئی نہ کوئی لڑکی تمہارے ساتھ ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔

"بات سمجھتے ہو اور پھر مجھ سے سوال بھی کرتے ہو۔" زوردار قہقہہ لگایا۔

میں اپنی پوری کوشش کر کے بھی سجاد کو سمجھانے میں ناکام رہا۔

میری شادی اور ولیمے والے دن بھی سجاد میرے ساتھ تھا۔ اس کی جب میری بیوی کشف پر نظر پڑی وہ چونکا۔ دلہن کے لباس میں وہ بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ سجاد مسکراتے ہوئے میرے نزدیک آیا اور کان میں کہنے لگا۔

"سلمان تم بڑے لکی ہو، بہت خوب صورت دلہن پائی ہے تم نے۔"

میں نے اس کی بات کو مذاق جان کر نظرانداز کر دیا۔ شادی ہونے سے قبل میں سجاد کو گھر بلا بلا کر تھک جاتا تھا تب کہیں جا کر وہ میرے گھر آتا تھا۔ شادی ہونے کے چند مہینے بعد ہی میں نے الگ کرائے پر گھر لے لیا تھا۔ وہ اب میرے گھر آنے کے بہانے ڈھونڈتا تھا۔ میں اس کی تبدیلی پر خود بھی حیران تھا اور سوچتا تھا شادی سے قبل میں اس کو بلانے پر اس کے نہ آنے پر خود ہی اخبار، یا اس کے مطلوبہ ٹھکانوں پر جا کر ملاقات کرتا تھا۔

سجاد میرا اچھا دوست تھا۔ میں اس پر کسی قسم کا شک کر ہی نہیں سکتا تھا۔ ہم دونوں میں کبھی کسی مسئلے پر بدمزگی نہیں ہوئی تھی۔

میری شادی کو مشکل سے پانچ ماہ ہوئے تھے۔ پولیس نے ایک مقدمے میں مجھے پکڑ لیا۔ وہ قتل کا مقدمہ تھا۔ ایف آئی آر میں قتل کے مقدمے میں ملوث لوگوں کے نام شامل تھے۔ مجھے ایف آئی آر میں نامعلوم افراد میں شامل کر کے تفتیش کے لیے بلایا گیا تھا اور مجھے جیل بھجوا دیا گیا۔ میں حیران تھا جب میرا نام مقدمے میں شامل نہیں ہے پھر کیوں گرفتار کیا گیا ہے۔ جیل میں قیدیوں کی زبانی مجھے پتا چلا کہ جب کسی مقدمے کی ایف آئی آر درج کی جاتی ہے اس میں نامعلوم افراد بھی لکھ دیے جاتے ہیں تا کہ کبھی اس مقدمے میں ملوث ملزمان پکڑے جائیں یا کسی کو کسی کی بنیاد پر جیل بھیجنا ہو اس شخص کو نامعلوم افراد بنا کر کورٹ میں پیش کر دیا جاتا ہے۔ مقدمہ چلنے پر بے گناہ افراد رہا ہو جاتے ہیں اور جو واقعی مقدمے میں ملوث ہوتے ہیں اور بعد میں پکڑے جاتے ہیں، ان کو سزا ہو جاتی ہے۔

تھانے اور جیل میں سجاد مجھ سے باقاعدگی سے ملاقات کرتا رہا اور مجھے یقین دلاتا رہا کہ وہ اس مقدمے سے جلد رہائی دلا دے گا۔ اس نے یہ بھی یقین دہانی کرائی کہ میں گھر کے خرچے اور کرائے کی فکر نہ کروں، وہ سب انتظام کر دے گا۔ وہ کبھی کبھار کشف کو بھی مجھ سے ملانے جیل لے آتا تھا۔ کشف نے بتایا کہ سجاد بھرپور طریقے سے ان کا خیال رکھ رہا ہے، میں پریشان نہ ہوں۔ اس کے بتانے پر میں گھر سے مطمئن ہو گیا۔

قتل کے مقدمے سے باہر آنے میں مجھے دو سال کا عرصہ لگ گیا۔ جیل میں دو سال کا عرصہ کیسے گزارا، یہ میں ہی جانتا تھا۔ میرا بس چلتا میں ایک دن بھی جیل میں نہیں رہتا۔ میں جب بھی سجاد سے کہتا کہ کم از کم میری ضمانت ہی کرا دو۔ اس پر وہ کہتا۔

"میرے دوست یہ قتل کا مقدمہ ہے، چھوٹا موٹا مقدمہ ہونے پر میں تمہیں چند دن میں ضمانت پر باہر لے آتا۔"

"پھر تم وکیل سے بات کر کے دیکھو۔"

"میں نے بات کی ہے۔"

"وکیل کیا کہتا ہے؟"

"یہ قتل کا مقدمہ ہے فوری طور پر ضمانت داخل کرنے سے ضمانت مسترد ہو سکتی ہے۔"

سجاد کی بات سن کر میں خاموش ہو جاتا۔

جیل سے رہائی ملنے پر میں بہت خوش تھا۔ میں سجاد کا بھی شکرگزار تھا کہ اس موقع پر اس نے بھرپور مدد کی۔ میں نے سوچ لیا تھا ہر ماہ کچھ بچت کر کے سجاد کو مقدمے پر خرچ ہونے والی رقم لوٹا دوں گا۔

میں اس دن گھر پر ہی تھا۔ طبیعت بہتر نہ تھی اس لیے دفتر نہیں جا سکا تھا۔ کشف گھر سے خریداری کرنے باہر گئی تھی۔ کشف کے موبائل بجنے پر میں چونکا۔ وہ جلدی میں اپنا موبائل گھر پر ہی چھوڑ گئی تھی۔ میں نے موبائل کی کال اٹینڈ نہیں کی تھی۔ دوبارہ کال آنے پر میں نے کال اٹینڈ کر لی۔ میں ابھی ہیلو کہنے ہی والا تھا، دوسری طرف سے مردانہ آواز آئی۔

"کشف جان اب ہم سے کیسی بے رخی، تمہارا شوہر جیل سے کیا چھوٹ کر آیا ہے، ہم سے بات کرنا بھی تمہیں گوارا نہیں ہے۔"

میرا سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ یہ کون شخص ہے جو کشف سے اس لہجے میں بات کر رہا ہے۔ جہاں تک کشف کو جان کہنے کا تعلق ہے۔ یہ حق میں رکھتا ہوں اور میں یہ کسی صورت برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی دوسرا مرد اسے جان کہے۔ میں نے اس سے کچھ پوچھنے کے بجائے اس بات کو سننے کا فیصلہ کر لیا۔ میں اس معاملے کی تہ تک جانا چاہتا تھا۔ میری غیر موجودگی میں کشف کیا کچھ کرتی رہی ہے۔ میری خاموشی پر وہ پھر بولا۔

"تمہارے شوہر کے گرفتار ہونے پر تم، اپنے رشتے داروں سے کتنے ہاتھ پھیلاتی رہیں، کسی نے تمہاری مدد نہیں کی۔ تمہارے شوہر کے بھائی بھی کام نہ آئے، میں تمہاری فیملی کا سہارا بنا۔ اس کے عوض میں نے تم سے جو فائدہ اٹھایا وہ میرا حق تھا، بولو خاموش کیوں ہو؟"

میں نے اس کی آواز پہچان لی تھی یہ سجاد تھا اور کشف سے بات کرنے کو دوسری طرف سے بات کر رہا تھا۔

"کشف میں تمہاری زندگی کو دشوار نہیں کرنا چاہتا۔ میری خواہش ہے تمہارا گھر بسا رہے، تمہیں کوئی غم نہ آئے۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو گی۔ مجھے ایک بلڈر کی اشتہاری کمپین لینی ہے اشتہاری کمپین جس منیجر کے پاس ہے اس نے مجھ سے فرمائش کر دی ہے کہ ایک بار کشف کو میرے پاس بھیج دو، تمام اخبارات کو اشتہارات دینے کی کمپین میرے پاس آ جائے گی۔ اس طرح میرے پاس سال بھر کی کمائی آ جائے گی۔ میں تمہیں آخری بار یہ زحمت دے رہا ہوں۔ ورنہ سوچ لو تمہارا شوہر دوبارہ جیل جا سکتا ہے۔ ہم جیسے لوگوں کا تمہارے شوہر کو کسی بھی مقدمے میں پھنسا دینا معمولی بات ہوتی ہے۔"

اس سے آگے سننے کی مجھ میں سکت نہیں رہی تھی۔ میں نے موبائل کو بند کر دیا۔ میں سارے معاملے کی تہ تک پہنچ چکا تھا۔ میری غیر موجودگی میں اس گھر میں کیا کچھ ہوتا رہا تھا۔ سجاد کی آخری دھمکی نے یہ بات ثابت کر دی تھی کہ اس نے ہی مجھے جھوٹے مقدمے میں پھنسا کر جیل بھجوایا تھا تا کہ وہ میری بیوی کشف کو ڈھال بنا کر اشتہارات حاصل کر سکے۔ اس سے قبل سجاد کی تیسری بار کال آتی، میں نے موبائل آف کر دیا۔

مجھے سجاد کی دوستی پر جس قدر فخر و غرور تھا، وہ سب خاک میں مل گیا تھا۔ مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میں نے اس سے دوستی کیوں کی تھی۔

کشف گھر کا سودا سلف لے کر جب لوٹی، وہ خاصی تھکی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے سوچوں میں گم صم دیکھا تو وہ چونکی۔

"کیا بات ہے اتنے خاموش اور چپ کیوں ہو؟"

میں نے اسے جواب دیے بغیر موبائل اس کی جانب بڑھا دیا۔

"ارے یہ موبائل آف کیسے ہو گیا صبح ہی میں نے چارج کیا تھا؟"

"میں نے بند کیا ہے؟"
"کیوں؟"
"موبائل پر آنے والی کال کا نمبر دیکھ کر تم خود سمجھ جاؤ گی۔"
اس بات پر کشف بُری طرح سے چونکی۔ اس کا چونکنا فطری تھا۔
"سجاد کے چند جملوں نے پوری کہانی بیان کر دی ہے کہ میرے پیچھے کیا ہوتا رہا ہے۔" میں نے کہا۔
میرے لہجے میں کرب تھا جو وہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکی تھی۔ کشف کا چہرہ فق ہو گیا۔
"کشف مجھے اس موقع پر کیا کرنا چاہیے؟" میں نے پوچھا۔
"میں نے اپنی مرضی سے کچھ نہیں کیا۔"
"پھر وہ سب کیسے ہوا؟"
"میں بے قصور ہوں۔"
"اس لیے تم ابھی تک پیروں پر کھڑی ہو ورنہ میں کب کا غیرت میں آ کر تمہیں قتل کر چکا ہوتا۔ مجھ سے سچائی بیان کرو، سب کیسے ہوا؟"
میرے دل میں یہ آ رہی تھی کہ فرار ہو جاؤں اور سجاد کو قتل کر دوں لیکن پولیس مجھے دوبارہ سے پکڑ کر جیل بھیج دیتی اور کشف پھر ان ہی حالات سے دوچار ہو جاتی جیسے میرے جیل جانے پر ہوئی تھی۔ میں ایسی کوئی غلطی نہیں دہرانا چاہتا تھا کہ کشف کی زندگی پھر سے مشکلات کا شکار ہو جائے۔
"جب تمہیں جیل ہوئی میں بے بس ہو کر رہ گئی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا ہوگا۔ ایسے میں سجاد ایک مہربان دوست بن گیا۔ وہ مجھے تم سے جیل میں ملاقات کرانے، کبھی وکیل کے پاس لے جاتا تھا، کبھی کورٹ میں لے جانے کے بہانے لے جاتا مگر کورٹ کے بجائے ادھر ادھر گھما کر گھر چھوڑ جاتا تھا۔ جب میں کورٹ نہ جانے کی وجہ پوچھتی، وہ کہتا۔
"آج جج صاحب کو کوئی کام تھا اس لیے مقدمے کی اگلی تاریخ دے دی ہے۔" میں اس کی چال بازی نہیں سمجھ پائی تھی کیونکہ میں اسے اپنا مخلص اور ہمدرد سمجھتی تھی۔ اکثر یہ بھی ہونے لگا تھا وہ کوئی کاغذ مجھے دیتا اور کہتا کہ اس آفس میں دے آؤ۔ جب میں کہتی تم کیوں نہیں جا رہے، وہ کہتا۔
"میرے جانے پر زیادہ دیر آفس میں بیٹھنا پڑ جائے گا۔"
اس لیے میں آفس میں مطلوبہ شخص کو وہ کاغذ دے آتی [illegible] اشتہار لینے کسی آفس میں بھیج دیتا۔ میرا اول نمبر مردوں کے پاس جانے کو نہیں کرتا تھا لیکن سجاد تمہارے جیل سے جلد باہر آنے کی کوشش کر رہا تھا اس لیے بات ماننے کو تیار ہو جاتی۔
ایک دن سجاد نے مجھے بتایا کہ اس کی بہن صائمہ کی سالگرہ میں جانا ہے میں بیوٹی پارلر سے تیار ہو جاؤں۔
"بیوٹی پارلر سے کیوں، میں گھر میں تیار ہو جاتی ہوں۔" میں نے کہا۔
"میں چاہتا ہوں کہ میری بہن یہ نہ سمجھے کہ سلمان کے جیل جانے پر تم پریشانی میں آ گئی ہو۔"
"اچھا ٹھیک ہے، میں بیوٹی پارلر سے تیار ہو جاؤں گی۔" میں نے کہا۔
سجاد کے آنے پر میں محلے میں بیوٹی پارلر سے تیار ہو چکی تھی۔ وہ مجھے اپنے گھر لے جانے کے بجائے ایک زیر تعمیر پلازا میں لے گیا۔ میں حیران تھی کہ رات کے گیارہ بجے اس کا یہاں کیا کام ہے۔ پوچھنے پر اس نے بتایا کہ اسے اشتہار لینا ہے۔
"اشتہار کل لے لیجے۔" میں نے کہا۔
"کل پلازا کا مالک اسلام آباد ہوگا۔"
"اس سے کہہ دیتے کہ اپنے کسی ملازم کو دے دو، میں کل لے لوں گا۔"
"جو اشتہار دیتا ہے وہ کہتا ہے میں بہت بڑا احسان کر رہا ہوں اس لیے جب بلاؤں میں فوراً اس کے پاس پہنچ جاؤں۔"
آفس میں اس وقت دو آدمی موجود تھے۔ ایک بلڈر اور دوسرا منیجر تھا۔ ہم دونوں کے آفس میں بیٹھنے پر بلڈر جس کا نام فرید تھا اس نے کوئی کاغذ سجاد کو فوٹو کاپی کرانے کو دیا۔ مجھے ان دونوں کی نیت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔ فرید اور اس کا منیجر ساجد دونوں ہی عجیب نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے ان کے اشارے میں کچھ سمجھ نہ پائی۔
کاغذ کی فوٹو کاپی کرانے سجاد کے ساتھ ساجد بھی چلا گیا۔ میں اکیلی رہ گئی تھی۔ فرید مسکراتے ہوئے صوفے پر میرے برابر بیٹھ گیا۔ میں اس سے دور کھسک کر بیٹھ گئی وہ پھر میرے قریب کھسک آیا۔
"گھبرا کیوں رہی ہو، میں بھی ایک انسان ہوں۔" فرید بولا۔
"انسان کو اکیلے میں شیطان بنتے دیر نہیں لگتی۔" میں نے کہا۔
اس نے مجھے دبوچنے کی کوشش کی۔
"مجھ سے دور رہو۔" میں نے کہا۔ "میں ایسی ویسی

عورت نہیں ہوں۔"
"یہاں اس طرح بن سنور کر آنے کا مطلب؟"
"میں سجاد کی بہن صائمہ کی سالگرہ میں شرکت کرنے کو تیار ہوئی ہوں۔"
"سجاد نے تم سے جھوٹ بولا ہے۔"
"جھوٹ بولا ہے؟" میں بُری طرح چونکی۔
"میری اس سے ڈیل ہوئی ہے، میں اسے اس بنیاد پر اشتہار دوں گا جب وہ تمہیں میرے پاس لے کر آئے گا اور وہ تمہیں تیار کر کے لے آیا ہے۔"
"مجھ سے سجاد نے اس قسم کی کوئی بات نہیں کی۔"
"نہیں کی، میں ابھی بات کرا دیتا ہوں۔"
یہ کہتے ہوئے فرید نے کال ملائی اور اسپیکر آن کر دیا۔
"سجاد یہ تم سے بات کرنا چاہتی ہے۔"
میں نے فوراً موبائل ہاتھ میں لیا۔
"سجاد یہ مجھے غلط قسم کی عورت سمجھ رہا ہے۔"
"کیا حرج ہے تھوڑی دیر کو بن جاؤ۔"
"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"
"سلمان کو جیل سے رہا کرانا ہے اس کے لیے وکیل کو بھاری فیس دینا ہے میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ فرید صاحب بہت اچھے آدمی ہیں ان کو خوش کر دو، ہمیں اشتہار کی مد میں اتنے پیسے مل جائیں گے کہ ہم وکیل کو فیس اور دیگر خرچا آسانی سے کر لیں گے۔"
"میں یہ کام نہیں کر سکتی۔" میں نے کہا۔
اس نے میری بات سن کر کال کاٹ دی۔ میں نے بھاگنے کی بہت کوشش کی لیکن فرید کا منیجر بھاگنے کے سارے راستے بند کر گیا۔ میں بے بس پنچھی کی طرح جال میں پھنس چکی تھی۔ جب میں فرید کے آفس سے نکلی لٹ چکی تھی۔ سجاد نے مجھے سمجھانے کی پوری کوشش کی کہ کچھ نہیں ہوا سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں اندر سے ٹوٹ چکی تھی۔
سجاد اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا تھا۔ وہ یہی چاہتا تھا کہ میں اس کے لیے استعمال ہوتی رہوں اور اسے اشتہارات ملتے رہیں۔ میں جب انکار کرتی، وہ کہتا۔
"میرے پاس کوئی خزانہ نہیں ہے جو تمہارے شوہر کی رہائی کے لیے نوٹ لٹاتا رہوں، تمہارے گھر کے اخراجات اٹھاتا رہوں۔ تم تعاون کرتی رہو تاکہ مجھے اشتہار ملتے رہیں اور میرا اور تمہارا کام چلتا رہے۔" میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے اشاروں پر چلنے پر مجبور ہو چکی تھی۔ بس ایک آس تھی شوہر کے جیل سے باہر آ جانے پر تمام معاملات سنبھل جائیں گے۔ سجاد جو چاہتا تھا، میں وہی کرتی رہی۔"
کشف کی باتوں سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں دیر نہ لگی۔ اس نے میری بیوی کی آڑ لے کر اشتہارات حاصل کیے تھے۔ اس کی کامیابی کا یہی راز تھا۔ میری زندگی کا مقصد اب سجاد سے انتقام لینا تھا۔
رات ہونے پر میں بیڈ پر لیٹا خاموشی سے چھت کو مسلسل گھور رہا تھا۔ کشف نے مجھے سوچوں میں گم دیکھا تو وہ میرے پاس آئی۔
"مجھ سے ناراض ہو؟"
"نہیں۔"
"پھر کیا سوچ رہے ہو؟"
"میں اس بلیک میلر سجاد سے انتقام لینا چاہتا ہوں۔ اسے کس نے حق دیا تھا تمہاری مجبوری سے فائدہ اٹھانے کا؟"
"مجھے یہ سجاد کی چال لگ رہی ہے اس نے تمہیں جھوٹے مقدمے میں پھنسایا اور پھر نکلوا کر احسان کر دیا۔"
"ہاں حالات و واقعات یہی بتا رہے ہیں۔ یہی اس کا منصوبہ تھا۔" میں نے کہا۔
"تم سجاد سے کیسے انتقام لو گے؟"
"میں نے ابھی کوئی منصوبہ ترتیب نہیں دیا ہے۔ جلد بازی میں کوئی بے وقوفی کا مظاہرہ کرنا نہیں چاہتا ورنہ دوبارہ جیل جانے کا خطرہ پیدا ہو جائے گا۔"
"جو بھی کرنا ہے، ہوشیاری سے کرنا۔" کشف نے کہا۔
مجھے گہری سوچوں میں گم دیکھ کر کشف بھی سوچوں میں گم ہو گئی تھی۔ وہ کیا سوچ رہی ہے، میں یہ نہیں جانتا تھا لیکن اتنا ضرور جانتا تھا کہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔
میرے ذہن میں ایک اچھوتا خیال آ ہی گیا۔ اس منصوبے پر عمل کر کے میں اپنا انتقام بھی لے لیتا اور پکڑا بھی نہ جاتا۔ میں نے اپنے منصوبے کی باریکیوں پر غور کرنا شروع کر دیا۔ جب میں ہر طرح سے مطمئن ہو گیا تو اس منصوبے پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔
رات میں سجاد اپنے ایک دوست ذوالفقار کے پاس شراب پینے جاتا تھا۔ اس کی واپسی ساڑھے بارہ اور ایک بجے کے درمیان ہوتی تھی۔ جس راستے سے وہ آتا تھا، میں اس سے خوب واقف تھا۔ رات کے بارہ بجے میں نے موٹر سائیکل نکالی۔ گھر سے باہر آیا۔ میں نے ریلوے کراسنگ میں گاڑی پارک کی اور وہاں سے ٹہلتے ہوئے ایک تاریک حصے میں کھڑا ہو گیا۔ اب میں سجاد کا انتظار کرنے لگا۔ چند لمحے گزرنے پر [illegible] گاڑی آتی دکھائی دی۔ میں سجاد کی موٹر سائیکل سے

اتنا آشنا تھا کہ دور سے دیکھ کر پہچان لیا کرتا تھا۔ میں نے اسے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ میرے اشارے پر اس نے گاڑی میرے پاس لا کر روک دی۔ وہ نشے میں تھا لیکن مجھے دیکھتے ہی پہچان گیا اور حیرت سے بولا۔

”ارے تم اور اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟“

”میں ایک کام سے یہاں آیا ہوں۔“ میں نے بتایا۔

”تمہاری گاڑی کہاں ہے؟“

”وہ نزدیک ہی ہے۔“

”اچھا اب کیا پروگرام ہے؟“ سجاد نے پوچھا۔

”تمہیں کسی سے ملانا ہے۔“

”کوئی خاص بات لگ رہی ہے۔“

”ہاں میرا ایک دوست سہیل کسی بلڈر کے پاس کام کرتا ہے۔“

”وہ مجھ سے کیوں ملنا چاہتا ہے؟“

”وہ اپنے کسی نئے پروجیکٹ کے سلسلے میں اخبارات کو اشتہاری کمپین دینا چاہتے ہیں۔ تمہارے ذریعے اسے بھی کچھ کمیشن مل جائے گا۔“

”میں کمیشن میں اس کا بھی حصہ رکھ دوں گا نو پرابلم۔“ سجاد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”آؤ سہیل سے ملاقات کر لیتے ہیں۔“

”اس وقت تمہارے دوست سے ملاقات کرنا مناسب رہے گا؟“

”اس وقت تم فارغ ہوتے ہو اس لیے یہ وقت مقرر کیا ہے۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ دن بھر میری مصروفیات زیادہ ہوتی ہیں۔“ سجاد نے کہا۔

اس نے مجھے اپنی موٹر سائیکل پر بٹھایا اور میرے بتائے ہوئے راستے پر چل پڑا۔ رات کا وقت تھا۔ وہاں تاریکی کا راج تھا۔ میں نے اسے موٹر سائیکل سے اترنے کا اشارہ کیا۔ وہ حیرت زدہ تھا کہ میں اسے کہاں لے آیا ہوں۔

”یہ تم مجھے کہاں لے آئے ہو؟“

”ہمیں سامنے والے کوارٹر میں جانا ہے۔“ میں نے کہا۔

”ہم کوارٹر میں داخل کیسے ہوں گے۔ یہاں سے ملحقہ کوارٹرز میں جانے کا کوئی راستہ بھی نظر نہیں آ رہا ہے۔“ وہ کوارٹر میں جانے کا راستہ دیکھنے لگا۔

وہاں کوارٹرز میں جانے کا راستہ ہوتا تو نظر آتا۔ اس دوران میں نے تھیلے سے ہتھوڑا نکال لیا۔ یہ تھیلا میں کچھ دیر قبل

چھپا کر گیا تھا۔ اس سے قبل کہ وہ مجھے پلٹ کر دیکھتا، میں نے زور سے ہتھوڑا اس کے سر پر دے مارا۔

”یہ... یہ کیا کر رہے ہو؟“ سجاد زور سے چیخا۔

میں رکا نہیں دو اور وار کیے جس سے وہ ڈھیر ہو کر زمین پر گر پڑا۔ میں نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ دور تک کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ جب مجھے یہ اطمینان ہو گیا کہ سجاد دم توڑ چکا ہے۔ میں نے اسے موٹر سائیکل سے مزید دور کر کے اس کی لاش گھسیٹا اور گھاس پر ڈال دیا۔ ہتھوڑے کو تھیلے میں رکھ کر گندے نالے میں اچھال دیا۔ میں نے ایسا منظر بنا دیا تھا کہ لوگ سمجھیں کہ ڈکیتی کی واردات میں سجاد مارا گیا ہے اور مزاحمت ہونے پر چیخ و پکار سے خوف زدہ ہو کر ڈکیت موٹر سائیکل چھوڑ کر بھاگ گئے۔“

”ڈکیت اپنے پاس پستول رکھتے ہیں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”پستول کے حصول میں مشکلات بہت تھیں اور میں پکڑ میں بھی آ سکتا تھا۔“

”پہلی بار واردات کی ہے اس لیے گھبرا رہے ہو گے۔“

”ہاں کچھ ایسی ہی بات تھی۔“ سلمان نے کہا۔

”اس منصوبہ بندی کا خیال تمہیں کیسے آیا؟“

”آج کل فلموں اور ڈراموں میں یہی کچھ دکھایا جا رہا ہے۔ اس طرح کا خیال آ جانا معمولی بات ہے۔ اس طرح کی وارداتوں میں لوگ بچ بھی جاتے ہیں۔“

”کبھی کبھار، ورنہ پولیس سراغ نکال ہی لیتی ہے۔“

”خالد صاحب! درست کہہ رہے ہو، پولیس سراغ نکالنے پر آئے تو ان کے لیے یہ معمولی بات ہوتی ہے۔“

انویسٹی گیشن آفیسر کی حیثیت سے میرے تھانے کی حدود میں ہونے والے قتل کی واردات کی مکمل تفتیش کر کے رپورٹ دینا میرے فرائض میں شامل تھا۔ میں نے اپنی ذمے داری پوری طرح سے نبھائی اور قاتل کو بھی گرفتار کر لیا تھا۔ سجاد نے سلمان کو جھوٹے مقدمے میں پھنسایا۔ اس کی غیر موجودگی میں اس نے جو کچھ بھی کیا، وہ غلط اقدام تھا۔ سلمان اس سلسلے میں پولیس سے تعاون مانگ لیتا تو اسے انصاف بھی مل جاتا اور سجاد کو اس کے کیے کی سزا بھی مل جاتی۔ قانون کو ہاتھ میں لینے سے وہ ایک قاتل بن گیا۔ قتل کرتے ہوئے وہ یہ بھول گیا کہ جلد یا بدیر وہ پولیس کی گرفت میں ضرور آ جائے گا۔

تفتیش مکمل ہو چکی تھی اور میں سلمان کو لاک اپ کے حوالے کر کے رپورٹ تیار کرنے میں مصروف ہو گیا تھا۔

☆☆☆

الجھن

اے آر راجپوت

انسانی نفسیات کی الجھی گتھیوں کو سلجھانا آسان نہیں... کسی نہ کسی ایک بات سے کوئی نہ کوئی کہانی جڑی ہوتی ہے... جسے انسان سمجھنے سے قاصر رہتا ہے... ایسے ہی ماحول سے وابستہ کہانی کے پیچ و خم... جس کے کردار ہر لحاظ سے اپنی ایک خاص حیثیت رکھتے ہیں... ان میں کسی کمی یا نقص کا قطعی سوچا نہیں جا سکتا تھا...

معمولی اور غیر اہم چیزوں کی گمشدگی کا سنسنی خیز ماجرا......

تیمور احمد کو خفیہ پولیس کو جوائن کیے ہوئے ابھی تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ یہ عجیب کیس اس کے حصے میں آ گیا۔ یہ کیس سپرد کرنے والا اس کا سینئر پولیس افسر سکندر شاہ تھا۔ وہ ایک فربہی مائل اور گرانڈیل شخص تھا۔ سر سے گنجا اور عمر ریٹائرمنٹ کے قریب۔ اس کے بارے میں یوں بھی مشہور تھا کہ وہ بہت سے کیسز زیادہ تر محکمے میں نئے بھرتی ہونے والے جونیئرز کے سپرد کرنے کا عادی تھا۔

”دیکھو برخوردار......!“ اس نے اپنے سامنے بیٹھے

جونیئر افسر تیمور احمد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ایک پولیس والے کی زندگی میں پہلا کیس ہی اہمیت کا حامل ہوتا ہے جو اس کی ترقی کی راہیں کھولتا ہے۔ لہٰذا اسے بوجھ سمجھنے کی کوشش مت کرنا۔"

"کیس کی نوعیت جان سکتا ہوں سر؟" تیمور اس کے سانس لینے کا ہی منتظر تھا لہٰذا جیسے ہی وہ رکا، اس نے پوچھ لیا۔

"یہ تمہارے لیے ایک آزمائشی کیس ہے۔ اگرچہ کیس عجیب ضرور ہے مگر قریب نہیں ہے۔" سینئر افسر نے ایک جمائی لینے کے بعد کہا اور تیمور آنکھیں پٹپٹا کر رہ گیا۔

"معاملہ ہے، ایک نقلی ہیرے کی چوری کا اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ چوری کرنے والے کو بھی اس کا علم تھا کہ وہ ہیرا نقلی ہے۔"

"جی سر...؟" تیمور الجھن آمیز حیرت سے بولا۔

"ہاں، برخوردار! میں جانتا ہوں یہ پہلا ہی کیس تمہارے لیے، عجیب، الجھا ہوا اور مشکل ثابت ہو سکتا ہے لیکن یہی تمہارا امتحان ہے۔"

"تفصیل بتائیے سر؟" بالآخر تیمور نے جیسے تھکے تھکے انداز میں کہا۔

"تفصیل جاننا اور اس کے متعلق تیر بہدف سوالات پوچھنا میں تمہاری مہارت پر چھوڑتا ہوں۔" سینئر افسر نے خوامخواہ ہی پراسرار آمیز سنسنی پیدا کی اور مسکراہٹ دبا کے بولا۔ "نائلہ خان... نامی ایک حسین جمیل خاتون جو ایک ہائی فائی سوسائٹی سے تعلق رکھتی ہے، وہ خود تم سے رابطہ کرنے والی ہے۔ میں نے اسے تمہارا سیل نمبر دے دیا ہے۔" اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک تیمور کے سیل فون کی بیل گنگنائی۔

"آ گیا فون، جاؤ شاباش اپنے کمرے میں۔" بیل کی آواز پر افسر نے کہا اور خود بھاری بھرکم چیئر کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔

تیمور جیب سے سیل فون نکالتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

☆☆☆

"میرا نام نائلہ خان ہے۔ مجھے انسپکٹر سکندر شاہ نے آپ کا نمبر دیا تھا۔ آپ تیمور صاحب ہی بات کر رہے ہیں نا؟"

دوسری جانب سے مترنم آواز میں وہ خاتون اس تیزی سے بولتی چلی گئی کہ تیمور سوچتا ہی رہ گیا کہ پہلے اسے کون سے سوال کا جواب دے۔ جبکہ وہ معروف پولیس جاسوس کے بارے میں... پوچھنے ہی والا تھا کہ اسے کوئی غلط فہمی تو نہیں ہوئی مگر نہ کہہ سکا۔

"جی محترمہ! وہ میں ہی ہوں جس کے بارے میں آپ اس قدر نیک خیالات رکھتی ہیں۔" بالآخر اس نے کہا۔ وہ حیران تھا کہ اسے خفیہ پولیس کا محکمہ جوائن کیے جمعہ جمعہ آٹھ دن ہی ہوئے تھے اور وہ اس قدر مشہور اور مایہ ناز جاسوس کیسے ہو گیا؟

"نیک خیالات کے بارے میں تو مجھے کچھ معلوم نہیں ہے۔" نائلہ برجستہ بولی۔ "البتہ ایک اہم کیس کے سلسلے میں آپ سے ملاقات کرنی تھی۔"

"تو پھر تشریف لے آئیے۔" تیمور نے کہا۔

"اگر آپ... برا نہ منائیں تو شام پانچ بجے میں ڈرائیور بھیج دیتی ہوں، آپ زحمت کر کے تشریف لے آئے تو زیادہ بہتر تھا، کیونکہ کچھ سیکیورٹی رسک کا معاملہ تھا....." نائلہ خان نے گویا التجا کی۔

"ٹھیک ہے۔" تیمور نے بے اختیار کہا۔ "لیکن ڈرائیور بھیجنے کی ضرورت نہیں، آپ پتا نوٹ کروائیں، میں خود ہی پہنچ جاؤں گا۔"

نائلہ نے پتا نوٹ کروا دیا۔

اچانک اس کے کمرے کا دروازہ کھلا، تیمور اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ سامنے اس کا سینئر افسر کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس کی مسکراہٹ جانے کیوں تیمور کو ذومعنی سی لگی۔

"بڈی! ایک بات بتا دوں، نائلہ خان ایک حسین اور دولت مند بیوہ بھی ہے۔ بائے۔"

کہتا ہوا وہ پلٹ گیا۔ تیمور ایک گہری سانس خارج کر کے رہ گیا۔

☆☆☆

تیمور کو بیس منٹ لگے تھے خیابانِ گل زار پہنچنے میں۔ اس کے پاس نئے ماڈل کی سرکاری سوزوکی ون لو قائم تھی۔

خیابانِ گل زار ایک پوش علاقہ تھا۔ گیٹ پر موجود باوردی مسلح گارڈ نے انٹرکام پر اندر رابطہ کرنے کے بعد تیمور کو اندر جانے کی اجازت دی تھی۔ تیمور سادہ لباس میں تھا۔

نائلہ خان ایک پچیس چھبیس سالہ نہایت ہی حسین و جمیل خاتون تھی۔ سبک خرام اور متناسب الاعضا کی مالک، دراز قامتی میں ایک وقار جھلکتا تھا۔ بال ڈائی کیے ہوئے تھے اور انہیں سلیقے سے جوڑا گوندھ کر بنایا گیا تھا۔ چہرے کے نقوش پرکشش اور آنکھیں غزال چشم۔ جلد ملائم اور رنگت قدرے سانولی تھی۔

اپنے سامنے ایک بائیس، تیئیس سالہ نوجوان کو دیکھ کر نائلہ کو پہلے حیرت اور پھر مایوسی ہوئی۔ اگرچہ اسے تیمور کی

شخصیت میں وجاہت محسوس ہوئی تھی۔ وہ کسرتی جسم اور دراز قامت تھا۔ رنگت گندمی تھی اور روشن آنکھوں سے ذہانت ٹپک رہی تھی، لیکن باوصف اس کے نائلہ کے تصور میں کوئی پینتیس، چالیس سالہ پختہ العمر پولیس افسر تھا، جو چہرے مہرے سے ہی رعب دار اور کڑک مزاج نظر آتا ہو۔ مگر یہ نوجوان تو اسے رومان پرور لگا تھا۔

بہرکیف..... اب بھگتنا تو تھا۔ اس نے دلنشین مسکراہٹ، خواہ زبردستی کی ہی سہی، سے تیمور کا استقبال کیا۔

دونوں ایک شاہانہ طرز کی نشست گاہ میں نفیس اور دبیز صوفوں پر جا بیٹھے۔ دو ایک رسمی باتوں کے بعد تیمور اپنے سینئر افسر کا حوالہ دیتے ہوئے اسے فوراً مقصد کی بات پر لے آیا۔

"دراصل بات یہ ہے....." نائلہ نے جواب میں کہا۔ "وہ واقعی اصلی ہیرا نہیں تھا، مصنوعی تھا اور شیشے یا پلاسٹک یا ایسی ہی کسی چیز کا بنا ہوا تھا جس سے آج کل مصنوعی ہیرے بنائے جاتے ہیں۔"

"تو پھر اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ جس ہیرے کو چرایا گیا ہے وہ اصلی ہیرا نہیں تھا۔" تیمور نے تصدیق طلب انداز میں کہا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "بلکہ..... اصلی آویزے میں لگے ہوئے ہیرے کی محض نقل تھا!"

"وہ کسی کی نقل نہیں تھا۔" نائلہ نے جواب دیا۔ "وہ بذاتِ خود اصلی تھا۔"

تیمور بھونچکا رہ گیا۔ اسے یا تو اپنے سینئر افسر کی عقل پر شبہ ہونے لگا تھا یا یہ دلنشین خاتون اسے پاگل لگی۔

"ذرا مجھے اس ساری بات پر غور کرنے دیجیے۔ آپ نے کہا کہ کل رات کوئی شخص چپکے..... سے آپ کے بیڈ روم میں داخل ہوا اور اس نے آویزے چرا لیے، جبکہ آپ اس وقت سو رہی تھیں۔"

"بالکل۔" نائلہ خان نے اپنے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے جواب میں کہا۔ "میں وہاں نیم تاریکی میں بیٹھی اس بات کی منتظر تھی کہ کون اسے چراتا ہے اور کس طرح، لیکن ہوا یوں کہ میں زیادہ دیر تک جاگ نہ سکی اور میری آنکھ لگ گئی۔ اسی اثنا میں آویزہ چوری ہو گیا....."

اس کی بات کے بجائے تیمور اس بات پر غور کرنے لگا کہ کیا کبھی کسی جنم میں اس کی اپنے سینئر افسر سے کوئی دشمنی رہ چکی تھی؟ جس کا وہ اس سے بدلہ ایسا عجیب و غریب کیس سونپ کر لینے کی کوشش کر رہا تھا یا پھر اس کا مقصود تنگ تھا۔ بہرکیف اس نے کہا۔

"تو گویا بات یہ تھی کہ آپ نے چور کو خود دعوت دی تھی؟ آپ نے جان بوجھ کر آویزے کو اپنے بیڈ روم میں ایک ایسی جگہ رکھا جہاں سے وہ با آسانی نظر آ سکے اور پھر آپ نے سو جانے کا بہانہ کیا لیکن بدقسمتی یہ ہوئی کہ آپ کے اس بہانے نے حقیقت کی صورت اختیار کر لی اور آپ واقعی سو گئیں اور اس اثنا میں چور اپنا کام کر گیا؟"

نائلہ نے تیمور کو ایسی نگاہوں سے دیکھا جیسے اس کے سامنے دنیا کا عقل مند ترین انسان بیٹھا ہو۔ بولی۔ "بالکل بجا بات ہے، لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ میں سو کیوں کر گئی، کسی کو بھی اس طرح نیند نہیں آ سکتی، ایسے مواقع پر جب انتظار کا اضطراب... اور ہیجان انسان کو بیدار رکھتا ہے اور نیند کا کوسوں پتا نہیں ہوتا۔ میں نے ایسے بہت سے لوگوں کے بارے میں سنا ہے جو ایسی ہی کسی کیفیت سے دوچار ہو کر ساری ساری رات جاگتے رہے اور ان کی پلک تک نہیں جھپکی، لیکن مجھے افسوس ہے کہ میرے ساتھ ایسا نہیں ہوا، میں شاید اس رات سو گئی تھی، جب میں نے تکیے پر اپنا سر رکھا تھا، مجھے بستر پر لیٹتے ہی نیند آ گئی۔" اتنا کہہ کر نائلہ رکی تو تیمور کا جی چاہا کہ اسے اردو کے ایک محاورے کی یاد دلا دے کہ "نیند تو سولی پر بھی آ جاتی ہے۔" لیکن اس سے پہلے ہی وہ مزید بتانے لگی۔

"اصل بات یہ ہے کہ میں آج تقریباً دوپہر تک سوتی رہی اور جب میں بیدار ہوئی تو اس وقت بھی مجھ پر نیند کا سخت غلبہ تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میری یہ کیفیت کیوں کر ہوئی؟"

تیمور نے اس بار غور کرنے کے انداز میں اپنے سر کو کھجاتے ہوئے کہا۔

"میرا شبہ یہ ہے کہ کسی نے آپ کو کوئی خواب آور دوا کھلا دی ہو، کیا آپ نے کل سونے سے پہلے کہیں کچھ پیا تھا؟ کچھ یاد ہے آپ کو؟"

"ہاں ایک بڑی پُرتکلف سوشل پارٹی تھی، جس میں اور بھی بہت سے لوگ شامل تھے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی پارٹیوں میں ہر کوئی پیتا ہے اور کسی شخص کے لیے بھی بہت آسان سی بات تھی کہ میرے گلاس میں کچھ ملا دیا ہو۔" نائلہ نے جواب دیا۔

"اور آج صبح۔" تیمور بولا۔ "جب آپ کو یہ پتا چلا کہ آپ کا آویزہ غائب ہے تو آپ نے فوراً ہی شور مچانا شروع کر دیا؟"

"بالکل نہیں۔" نائلہ نے بتایا۔ "ہم لوگ اس قسم کی حرکتیں نہیں کرتے، پھر مہمان بھی میری کوٹھی میں مدعو ہوں اور

خاص طور سے ایک قیمتی زیور کے لیے ہم بالکل بھی ایسا نہیں کر سکتے۔ میں نے تو بلکہ اس چوری کے بارے میں کسی کو بھی نہیں بتایا ہے۔ جن لوگوں کو اس بات کا علم ہے کہ آویزہ چوری ہوگیا ہے، ان کی تعداد صرف چار ہے۔ میں خود، انسپکٹر سکندر صاحب، آپ اور چور ---"

"کیا آپ کے مہمانوں میں کوئی ایسا شخص شامل تھا جو کسی مالی مشکلات سے دوچار ہو؟" تیمور نے پوچھا۔

"جہاں تک میرا خیال ہے میرے مہمانوں میں کوئی ایسا شخص نہیں تھا، ظاہر ہے ہم سب کھاتے پیتے لوگ ہیں اور ہم میں کوئی بھی شدید مالی مشکلات سے دوچار نہیں ---" نائلہ نے تفاخر سے جواب دیا۔

"لیکن ضروری نہیں کہ کسی شخص کے بارے میں دوسروں کو ہمیشہ بالکل صحیح معلوم ہو، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص جو بظاہر آسودہ حال اور مالدار نظر آتا ہو مگر اندرونی طور پر کسی شدید معاشی بحران سے دوچار ہو جبکہ دوسرے لوگ اس سے بالکل ناواقف ہوں، میں یہ اندازہ لگانے کی کوشش میں ہوں کہ شاید آپ کے مہمانوں میں کوئی ایسا آدمی موجود ہو جسے کسی نہ کسی سبب سے پیسے کی سخت ضرورت ہو اور اس نے اس غرض سے آپ کا یہ آویزہ چُرالیا ہو کہ وہ اسے فروخت کرکے بہت بڑی رقم حاصل کرے گا جو کسی طرح لاکھوں سے تو کم نہ ہوگی۔ اس لیے اس نے آپ کے مشروب میں کچھ ملا دیا ہوتا کہ آپ گہری نیند سو جائیں اور یوں وہ اپنا کام کرگزرے۔ "یہاں تک کہہ کر تیمور رکا اور پھر بولا۔

"دوسرا یہ کہ مجھے ذرا وضاحت سے آپ اپنی اس منطقی حرکت کا مطلب سمجھا دیں کہ آپ کو کیوں یقین تھا کہ یہ آویزہ چوری ہوگا؟"

"اسے میرا پاگل پن سمجھ لیں یا روایتی خدشہ، ویسے میں نفسیات کی طالبہ بھی رہ چکی ہوں۔" نائلہ نے بات ٹالنے کے انداز میں کہا اور اس کے پہلے سوال کے جواب میں نفی میں سرہلا دیا اور بولی۔

"ایسی بات بالکل نہیں، ہر شخص کو یا کم از کم چند خاص آدمیوں کو جن سے اس وقت ہمارا تعلق ہے، یعنی توصیف، نعیم، جابر اور مسز جابر، یہ بات معلوم تھی کہ یہ ہیرا اصلی نہیں ہے، کیونکہ میں نے یہ بات انہیں بتائی تھی۔ چور کو اگر یہ بات معلوم ہوتی کہ یہ آویزہ خاص قدر و قیمت کا حامل نہیں تو وہ اسے کبھی نہ چُراتا۔"

نائلہ کی بات نے تیمور کو اور بھی اُلجھا دیا۔ وہ کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں وضاحت طلب نظروں سے اس کی جانب دیکھنے لگا۔ وہ اس کی نظروں اور چہرے کی اُلجھن کو دیکھ گئی اور اس نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے دوبارہ کہنا شروع کیا۔

"میں نے ان لوگوں سے یہ بات کہی تھی کہ یہ ہیرا اصلی ہے۔ اس میں کوئی جھوٹ نہیں تھا، البتہ ایک جھوٹ میں نے بولا تھا اور وہ یہ کہ میں نے ان لوگوں سے یہ بات کہی تھی کہ میں اس آویزے کو خوش نصیبی کی علامت سمجھتی ہوں، اسی لیے اسے بہت عزیز رکھتی ہوں۔"

اب اس کی بات تیمور کی سمجھ میں آچکی تھی اور اس کے لیے اندازہ لگانا قطعی آسان تھا کہ اس چوری کے محرکات کیا ہوسکتے ہیں، چنانچہ اس نے مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"آپ کے ہر مہمان کو یا کم از کم ان چار خاص افراد کو یہ بات معلوم تھی کہ یہ آویزہ فی الحقیقت کسی مالی قدر و قیمت کا حامل نہیں ہے۔ اس کے باوجود بھی ان میں سے کسی ایک نے رات کے وقت اسے چُرانے کی کوشش چاہی اور چُرا بھی لیا۔ مزید یہ کہ آپ کو اس بات کی توقع بھی تھی کہ یہ کوشش کی جائے گی؟"

تیمور کے سوالوں کے جواب میں نائلہ کے نرم و گداز ہونٹوں پر ایک دل نشین مسکان بکھر گئی، جسے دیکھ کر تیمور کو بھی چٹکلے کے لیے یوں لگا جیسے وہ بھی بکھرنے لگا ہو مگر اس نے فوراً خود کو سنبھال لیا۔

"مجھے اس بات کا سو فیصد تو یقین نہیں تھا لیکن میرا خیال تھا کہ اس بات کے قوی امکانات موجود ہیں کہ اس آویزے کو چُرانے کی کوشش کی جائے گی۔"

تیمور بظاہر غور سے نائلہ کی بات سن رہا تھا۔ اسے چور کی حرکت تو سمجھ آگئی تھی مگر ابھی تک نائلہ کی یہ عجیب حرکت سمجھ نہیں آرہی تھی کہ آخر اسے یہ کیا بھوت چڑھایا تھا کہ وہ دیکھنا چاہتی ہو اس آویزے کو بے قیمتی ہوجانے کے باوصف کوئی چرا بھی سکتا ہے؟ کیا یہ خالی دماغ، تنہائی اور امارت کا کوئی خناسی مشغلہ تھا؟

"میرا خیال غلط ثابت نہیں ہوا۔" نائلہ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "چوری کی کامیاب کوشش کی گئی اور اگرچہ میں نے اس بات کا پورا پورا بندوبست کرلیا تھا کہ میں اس چوری کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ سکوں لیکن مجھے اس میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی اور میں سوگئی۔ میں اب تک یہ سمجھ نہیں پائی کہ مجھے اس طرح اچانک اور اتنی شدت کے ساتھ نیند کیوں آگئی؟"

پھر کچھ ٹھہر کے دوبارہ بولی۔ "بات یہ ہے کہ جن چار

افراد کا میں نے ذکر کیا ہے، ان میں سے ایک شوقیہ چوری کرنے کے مرض میں گرفتار ہے۔ یا کم از کم میرا خیال ہے کہ اس فرد کو شوقیہ چوری کرنے والوں کے زمرے میں شامل کیا جاسکتا ہے، اس کا آغاز بہت پہلے ہوا تھا۔ ہم لوگ ایک ہی محلے میں پلے بڑھے ایک ہی اسکولوں میں ہم نے تعلیم پائی اور ہمارے سوشل سرکل بھی مشترک تھے۔ ہم سب لوگ گلستان مہران میں رہتے ہیں، آپ نے اس جگہ کے بارے میں تو ضرور سنا ہوگا۔"

تیمور جیسے کے لیے بھی جو خود اس علاقے کے لیے نسبتاً اجنبی تھا، گلستان مہران کا نام سنا تھا اور وہ اس علاقے سے واقف بھی تھا جہاں موروثی اور جدی پشتی امیر کبیر افراد رہتے چلے آرہے تھے۔ وہ سب عام خوش حالی کے درجے سے بہت بلند تھے۔

"ہاں، میں اس علاقے کے بارے میں جانتا ہوں۔" تیمور کا جواب اثبات میں تھا۔ نائلہ نے پھر اپنی بات شروع کردی۔

"جیسا کہ میں نے کہا۔ اس کا آغاز کئی برس پہلے ہوا تھا۔ پارٹیوں وغیرہ میں بالکل اچانک کوئی چیز غائب ہوجاتی، کوئی چھوٹی موٹی سی چیز، جس کی مالیت زیادہ نہ ہوتی جو بہت معمولی قدر و قیمت کی حامل ہوتی لیکن جس کی ذاتی اہمیت بہت زیادہ ہوتی، مثلاً کوئی کنگھا، کوئی لپ اسٹک، کوئی چھوٹی موٹی سی گھڑی وغیرہ۔"

"یہ ساری کی ساری چیزیں جو چُرائی جاتی رہیں آپ ہی کی ملکیت تھیں؟" تیمور نے سوال کیا۔

"جی نہیں۔" نائلہ نے نفی میں سر ہلایا۔ "ایسی کوئی بات نہیں تھی، چور نے کبھی تخصیص سے کام نہیں لیا۔ وہ کوئی بھی چیز چُرا سکتا ہے۔"

"اور--- کبھی کسی نے پولیس میں رپورٹ درج نہیں کرائی؟" تیمور نے پوچھا۔

"یقیناً نہیں، چور نے کبھی کوئی ایسی چیز ہی نہیں چُرائی جس کی ذاتی کوئی قیمت ہو اور پھر یہ کہ جن لوگوں کی چیز چوری ہوتی تھی ان میں سے زیادہ تر یہ سمجھتے تھے کہ وہ خود ہی اسے کہیں رکھ کر بھول گئے ہیں یا انہوں نے اسے گم کردیا ہے۔ یہ کہ ہوسکتا ہے کہ بعد میں انہیں یہ چیز خود ہی کہیں مل جائے، لیکن ایسا آج تک نہیں ہوا، جو چیز ایک مرتبہ غائب ہوگئی اس کا بعد میں کہیں سراغ نہیں ملا۔" اتنا کہہ کر نائلہ کسی سوچ میں گم ہوگئی اور تھوڑی دیر تک خاموش رہی۔ پھر پُرسوچ انداز میں دوبارہ کہنے لگی۔

"چور بہت ہوشیار اور چالاک تھا۔ میرا خیال ہے کہ میرے حلقے میں میرے علاوہ شخص دو یا تین سے زیادہ ایسے افراد موجود نہیں ہیں، جنہیں یہ شبہ ہو کہ ہمارے اندر ایک ایسا شخص بھی موجود ہے جو شوقیہ چوری کرنے کے مرض میں گرفتار ہے۔"

"لیکن میرا خیال ہے کہ رات کے وقت آپ کے ڈریسر سے ایک آویزہ چُرانا کسی ہوشیاری یا چالاکی کی علامت نہیں ہے۔ کیونکہ اس صورت میں آپ لازماً فوری طور پر اسی نتیجہ پر پہنچیں گی کہ آویزہ گم نہیں ہوا ہے بلکہ اسے چوری کیا گیا ہے۔" تیمور نے کہا۔

"یہ ٹھیک ہے۔" نائلہ اس کی بات سے پہلی بار اتفاق کرتے ہوئے بولی۔ "لیکن بات یہ ہے کہ چور یہ سمجھتا ہے کہ میں آویزے کے چوری ہوجانے کو کسی نوکر کی حرکت سمجھوں گی۔ کیونکہ اس امیر کبیر پوش علاقے میں رہنے والی خاتون کے بارے میں یہ سوچا بھی نہیں جاسکتا کہ وہ اپنے گھر آئے ہوئے مہمانوں میں کسی کو چور گردانیں گی۔ چور اس بات سے اچھی طرح واقف ہے اور اسے یقین تھا کہ مہمانوں میں سے کسی پر بھی شبہ کیے جانے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، اس لیے اس نے پورے اطمینان کے ساتھ یہ کام انجام دے دیا۔"

"آپ کو اس سے پہلے کب اس بات کا شبہ ہوا کہ اس پوش علاقے کے رہنے والوں میں کوئی ایسا شخص موجود ہے جو عادتاً چوری کرنے کے مرض میں گرفتار ہے؟" تیمور نے پوچھا۔

تیمور کے سوال پر نائلہ بولی۔ "یہ آج سے دو سال پہلے کی بات ہے۔ مسز جابر کی پارٹی میں میرا ایک نیلے رنگ کا خوب صورت کنگھا غائب ہوگیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے نہ تو اسے گم کیا ہے اور نہ میں اسے کہیں رکھ کر بھولی ہوں۔ پھر اچانک میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ گزشتہ دنوں کے دوران میری اور دوسرے لوگوں کی بھی بہت سی چیزیں اسی طرح غائب ہوتی رہیں اور غائب ہونے والی چیز دوبارہ دستیاب نہ ہوگی۔ میں ان تمام چیزوں کو یاد کرنے اور دماغ پر زور دے کر ان کی فہرست مرتب کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ تب کہیں میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ یہ اشیا خودبخود غائب نہیں ہوگئیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انہیں چُرایا گیا ہے۔"

"تب آپ نے چور کا کھوج لگانا ضروری سمجھا؟" تیمور نے پوچھا۔

"جی ہاں۔" نائلہ نے جواب میں کہا۔ "پہلے تو میری نظر میں مشتبہ افراد کی تعداد زیادہ تھی لیکن اس کے بعد میں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ ان لوگوں کو یاد رکھنے لگی جو کسی ایسی پارٹی میں شریک تھے جہاں سے کوئی چیز گم ہوئی تھی۔ میری تفتیش کا یہ طریقہ بڑا کامیاب ثابت ہوا اور بالآخر مشتبہ افراد کی تعداد گھٹتے گھٹتے چار رہ گئی۔"

"کیا آپ نے کسی سے اس بات کا ذکر کیا کہ آپ چور کی تلاش میں ہیں؟" تیمور نے پوچھا۔

"ہرگز نہیں۔" اس نے حتمی انداز میں جواب دیتے ہوئے کہا۔ "اگر میں کسی سے بھی اس کا ذکر کرتی تو یہ امر یقینی تھا کہ یہ اطلاع چور تک پہنچ جاتی اور وہ محتاط ہو جاتا، میرا خفیہ پولیس کو مطلع کرنے کا مقصد بھی یہی تھا کہ یہ سب کارروائی اس عجیب غریب چور کے خلاف بالکل خفیہ ہو، کہیں وہ کسی زاویے سے خطرہ کی پرنہ اتر آئے۔"

تیمور کو یوں لگا جیسے نائلہ غیر ارادی طور پر کسی جانے انجانے خوف کا شکار ہو گئی ہو۔

"مجھے ذرا ان چار افراد کے بارے میں مختصراً بتا دیں۔"

"توصیف فوج میں ہے اور وہ رخصت پر تھا۔" نائلہ نے بتانا شروع کیا۔ "اس کی رخصت ختم ہونے والی ہے، جابر کی گارمنٹ فیکٹری ہے، وہ اس میں مصروف رہتا ہے۔ اس کی بیوی ڈاکٹر اور میڈیکل اسپیشلسٹ ہے، جبکہ نعیم اکیلا تنہا امیرزادہ ہے، زیادہ تر وقت سیر و تفریح میں گزارتا ہے۔"

یہ بتانے کے بعد اس نے قریب تپائی پر رکھے ایک چھوٹے سے ڈبے کو اُٹھایا، اسے میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ "ہم چور کو تلاش کا کام ایک ساتھ کریں گے، یہ بے حد ضرورت ہوگا۔"

"یہ کیا ہے؟" تیمور نے جیسے اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے پوچھا۔

"اس میں کف لنکس ہیں۔ دو روز بعد پھر ایک گھر میں پارٹی ہے، میں چاہتی ہوں تم یہ پہن کر آنا۔ میں نے ان کف لنکس کا انتخاب خاص طور پر اسی پراسرار اور عجیب چور کی پسند کو مدنظر رکھتے ہوئے کیا ہے، کیا خبر وہ تم سے ہی ٹکرا جائے۔"

تیمور نے ڈبا کھول کر دیکھا۔ دو نیلے رنگ کے کف لنکس جگمگا رہے تھے۔ سستے تھے مگر دیکھنے والوں کو اپنی جانب متوجہ کرنے کی پوری خوبی رکھتے تھے، یہ ان کی خوب صورتی تھی۔ مگر اس سے تیمور کو، اس نے کچھ نہیں کہا اور خاموشی سے انہیں رکھ لیا۔

☆☆☆

"یہاں آج کتنے مہمان مدعو ہیں؟" تیمور نے نائلہ سے پوچھا۔ اس وقت وہ دونوں ٹھیک دو روز بعد ایک بڑی سی کوٹھی پر شام ڈھلے پہنچے تھے۔ بقول نائلہ کے، یہ کوٹھی ان کے والدین کی تھی، وہ آج کل فارن ٹور پر نکلے ہوئے تھے۔ چھوٹے بیٹے کے ساتھ..... آج کل اس کا قبضہ تھا۔ کوٹھی خالی تھی اسی لیے نائلہ نے یہاں مہمانوں کی گیٹ ٹو گیدر پارٹی رکھ لی تھی۔ اس نے تیمور کو بتایا تھا کہ چونکہ یہ پارٹی رات گئے تک جاری رہتی ہے، اسی لیے کچھ دوست احباب جو دور سے آتے ہیں ان کے سونے کا بندوبست بھی کیا ہوتا ہے۔

تیمور نے نیلے کف لنکس پہن رکھے تھے۔

"بیس۔" نائلہ نے تیمور کے سوال کے جواب میں کہا اور دونوں نیچے اُتر آئے۔ بڑے سے کار پورچ میں اور لوگوں کی بھی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ وہ آگے بولی۔

"تاہم ہمیں اتنے سارے لوگوں سے کوئی مطلب نہیں، ہمارا واسطہ صرف چار افراد سے ہے اور ہمیں صرف انہی کی نقل و حرکت پر نظر رکھنی ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ چور کو اس بات کا قطعی احساس نہ ہونے پائے کہ کوئی غیر معمولی بات ہونے والی ہے۔ اسے بالکل اس بات کا علم نہ ہونے پائے:— کہ کوئی اس کے پیچھے لگا ہوا ہے یا اس کی نقل و حرکت کی نگرانی کی جا رہی ہے۔"

اندر ہال میں داخل ہوتے ہی وہ مجھے سائڈ والے لیرن پر لے گئی۔ ساتھ ہی چلتے چلتے بولی۔ "خوش قسمتی سے، مشتبہ افراد میں سے دو آ گئے ہیں اور یہ ہیں جابر اور مسز جابر—"

میرا تعارف اُس نے اپنے ایک دوست کی حیثیت سے کروایا۔ جابر جو ایک بیش قیمت سفاری سوٹ میں تھا، لگنے سے قدرے گورا چٹا آدمی تھا۔ اس کی بیوی جو ڈاکٹر تھی، ارم نام تھا اس کا۔ وہ ساڑی میں تھی اور خاصی خوب صورت نظر آ رہی تھی۔

"جابر اور ارم میرے یونیورسٹی فیلوز ہیں۔" نائلہ نے اس جوڑے کی طرف دیکھتے ہوئے تیمور سے کہا اور تیمور نے انہیں دیکھ کر اخلاقاً اپنے سر کو مسکراتے ہوئے اثباتی جنبش دی تھی۔ جواب میں ان دونوں میاں بیوی نے بھی خلوص بھری مسکراہٹ نچھاور کی۔

"جابر صاحب کا اپنا کاروبار ہے اور ان کی بیگم ارم ایک میڈیکل اسپیشلسٹ ہیں۔"

اگرچہ نائلہ خاں پہلے ہی ان کے بارے میں تیمور کو بتا چکی تھی تاہم سامنے بتانا بھی لازمی تھا، کیونکہ یہ ظاہر کرنا ہی نہ تھا کہ تیمور اور نائلہ کا مقصد کیا تھا۔

سب کے درمیان ہلکی پھلکی گفتگو ہوتی رہی۔ تیمور نے داڑھی مونچھ لگائی تھی۔ اپنا نام بھی اس نے خالد بتایا تھا، اس میں بھی نائلہ کا ہی مشورہ تھا۔

اسی طرح ذرا دیر بعد باقی دو... دوست یعنی توصیف اور نعیم بھی آ گئے۔ اس طرح لگے ہاتھوں نائلہ نے دو اور افراد سے بھی تیمور کا تعارف کروایا، ان میں ایک ڈاکٹر نیورو فزیشن منصور تھا اور دوسرا مشہور آرکی ٹیکچر شعیب تھا۔ سب سے آخر میں قریبی چند دوستوں میں ایک شوخ و چنچل سی لڑکی ناہید سے بھی تعارف اور ملاقات کروا دی۔ ناہید ٹینس پلیئر تھی۔ خاصی اسمارٹ اور خوب صورت تھی۔ ان آخری تینوں اشخاص کے سامنے بھی تیمور نے حفظ ماتقدم کے طور پر انہیں اپنے کف لنکس کے بارے میں موقع نکال کر رٹی رٹائی داستان سنائی۔

پھر جب نائلہ ذرا دیر کو الگ ہوئی تو اس نے انہی قریبی مہمانوں کے ساتھ گھل مل کر کچھ باتیں کیں۔ نائلہ کسی سے مل کر جلد ہی واپس لوٹ آئی۔

یہ لوگ گھل مل گئے، تب ہی منصوبے کے مطابق جب نائلہ نے دیکھا کہ "کورم" پورا ہو چکا ہے، اس نے جان بوجھ کر تیمور کے کف لنکس کی جانب توجہ کی اور ساتھ ہی دوسروں کو بھی اس طرف توجہ دلانے کی غرض سے تیمور سے بولی۔

"ہائے اللہ! خالد، آپ کے یہ کف لنکس کتنے پیارے ہیں پہلے ان پر میری نگاہ پڑی ہی نہیں، یہ کتنے غیر معمولی اور اعلیٰ درجے کے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ کافی قدیم ہیں اور شاید آپ کے خاندان کی نشانی کے طور پر آپ کو ورثے میں ملے ہیں۔ یہ یقیناً بہت قیمتی ہوں گے۔"

نائلہ چونکہ اس سلسلے میں پہلے ہی تیمور کو "ڈکٹیشن" دے چکی تھی۔ لہٰذا اس نے پہلے تو ان فضول سے کف لنکس کی جانب بناوٹی غرور سے دیکھا، پھر بولا۔

"یہ بہت زیادہ قیمتی نہیں ہیں، یہ معمولی نیلے رنگ کے شیشے کے بنے ہوئے ہیں۔ ان کی قیمت اگرچہ زیادہ نہیں ہے لیکن بعض دیگر وجوہات کی بنا پر یہ مجھے بے حد عزیز ہیں۔ یہ کف لنکس مجھے ایک بہت ہی ضعیف خاتون نے دیے تھے اور ساتھ ہی یہ کہا تھا کہ اگر میں یہ پہنے رہوں گا تو ہر بلا اور مصیبت سے محفوظ رہوں گا۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر میں مہینے میں صرف دو بار ان کف لنکس کو پہن لیا کروں تو کافی ہو گا۔ میں اس بوڑھی خاتون........ کی ہدایت پر برابر عمل کرتا چلا آیا ہوں اور واقعی اس کی بات سچ نکلی، مجھے اس کے بعد سے کبھی کسی پریشانی یا مصیبت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔"

تیمور نے بھی اپنے اور نائلہ خاں کے طے شدہ منصوبے کے مطابق خوب نمک مرچ لگا کر رٹی رٹائی داستان سنا دی۔

تیمور کی کوشش تھی کہ وہ اس چور کو پکڑنے میں جلد از جلد کامیاب ہو جائے۔ لہٰذا اس نے سوچا کہ اپنے بچھائے ہوئے جال کے پھندوں کو تھوڑا اور کس دے۔ یہ سوچ کر اس نے آہستہ سے ایک جمائی لی اور کہا۔

"میں ابھی کافی لمبے سفر سے آیا ہوں اور مجھے کافی تھکن محسوس ہو رہی ہے۔ شاید آج رات مجھے اِدھر ہی قیام کرنا پڑے۔ تمہارا کیا خیال ہے نائلہ ڈیئر؟"

"بالکل، تمہارا گھر بھی دور ہے اور رات بھی کافی ہو گئی ہے۔" وہ بھی بھرپور اداکاری کرتے ہوئے تائیداً بولی۔ "تم نے مجھے بتایا تو تھا کہ کام کی زیادتی کے سبب رات بھی تم نہیں سو سکے، ایسی شدید تھکن اور نیند کے عالم میں تمہیں اتنی دور تک ڈرائیونگ بھی نہیں کرنی چاہیے۔ تم جا کر آرام سے سو جاؤ۔ یہ ہنگامے تو رات گئے چلتے رہیں گے۔"

یوں نائلہ ان سب سے معذرت کرتے ہوئے تیمور کو لے گئی۔

کمرے میں آ کر نائلہ نے تیمور سے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"اچھا تو ذرا اب بتاؤ..... تمہارے خیال میں ان چاروں میں کون شوقیہ چوری کے مرض کا شکار ہے؟"

تیمور کے ہونٹوں پر اسرار بھری مسکراہٹ عود کر آئی، اسی لہجے میں بولا۔ "ابھی تو میں کسی ایسے شخص کا نام نہیں لے سکتا جو بعد میں فی الحقیقت معصوم ثابت ہو۔ ہم آج رات جال بچھائیں گے اور پھر میں دیکھوں گا کہ میرا اندازہ صحیح ہے یا نہیں۔"

یہاں تیمور نے ایک لمحہ توقف کرنے کے بعد نائلہ سے دریافت کیا۔ "یہ کامران خاں کون تھا؟ جس کا انتقال ہو چکا ہے؟"

تیمور کی بھانپتی ہوئی نظروں نے دیکھا کہ اس کے یہ سوال پوچھتے ہی پل کے پل نائلہ کا چہرہ سپید پڑ گیا۔ وہ بہ مشکل بولی۔ "ہم... میرا بھائی تھا۔"

"اور اس کا انتقال ہو گیا تھا۔" تیمور نے پوچھا۔

"ہاں۔" اس نے کہا۔

"کسی حادثے میں؟" تیمور نے پوچھا۔

"نہیں۔" اس نے مختصراً جواب دیا اور تیمور پر یہ فوراً

واضح ہو گیا کہ وہ اس موضوع پر زیادہ بات نہیں کرنا چاہتی، کچھ سوچ کر وہ بھی چپ ہو رہا۔

وہ کمرے سے چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی تیمور آگے بڑھا اور دیکھا کہ نائلہ ہال کی طرف جا رہی تھی۔ ابھی وہاں مزید دو تین گھنٹے ہلا گلا مچنا تھا۔ وہ نظروں سے اوجھل ہوئی تو تیمور تیزی سے چلتا ہوا اس کمرے کے دروازے پر آن کھڑا ہوا، جو نائلہ کے آرام کرنے کے لیے تھا۔ اس نے جیب سے ماسٹر کی نکالی، دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ لائٹ آن کی، سرسری نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا۔ بہ ظاہر وہاں کوئی غیر معمولی پن نہ پایا مگر اس کا تجزیاتی اندازہ کہتا تھا کہ ادھر ہی کہیں "غیر معمولی" پن موجود ہے۔ وہ آگے بڑھا اور ایک میز کی دراز کھول کر دیکھی۔ کوئی قابلِ ذکر شے برآمد نہ ہوئی۔ پھر وہ آرام دہ... بیڈ کی جانب بڑھا۔ وہاں نائٹ اسٹینڈ تھا، اس کی دراز کھولی تو اندر پستول تھا۔ تیمور نے دستانے چڑھا کر پستول کا جائزہ لیا۔ وہ بھرا ہوا تھا اور اڑتالیس میگنم کا بھاری پستول تھا۔ اس نے اسی طرح اسے دوبارہ رکھا اور پلٹ گیا۔ کوئی بھی سمجھ سکتا تھا کہ یہ بھرا ہوا پستول نائلہ یقیناً اپنی حفاظت کے لیے رکھتی ہوگی لیکن تیمور کے لیے اس میں سمجھنے کے لیے بہت کچھ تھا۔

تیمور اپنے کمرے میں آ گیا۔ نائلہ نے اس سے خصوصی طور پر یہ درخواست کر دی تھی کہ وہ اسے رنگے ہاتھوں نہ پکڑے صرف اسے دیکھ لے باقی معاملات وہ خود سنبھال لے گی۔ تیمور بہ ظاہر اس کی ہاں میں ہاں ملا رہا تھا تاکہ اس کا ساتھ برقرار رہے، تاہم اس نے اپنے طور پر ایک لائحہ عمل بنا رکھا تھا۔

وہ لائٹ آف کر کے آرام دہ بیڈ پر دراز ہو گیا۔ اس نے کف لنکس ڈریسر پر رکھ دیے تھے، تاہم اپنے سیل فون کو سائلنٹ پر کر کے اپنے قریب کر لیا تھا، تاکہ جیسے ہی اسے دروازے پر "مخصوص" قسم کی کھڑبڑ کا احساس ہو وہ اپنے سیل کے مووی میکر کیمرے میں یہ سارا منظر ریکارڈ کر لے۔ اس مہارت سے کہ آنے والے چور کو پتا بھی نہ چل سکے اور اس کی مووی بنتی رہے۔

وہ اب بیڈ پر لیٹا بہ ظاہر آنکھیں موندے ان باتوں پر غور کر رہا تھا جو اسے دیگر مہمانوں کے ذریعے معلوم ہوئی تھیں اور کچھ اس نے اپنے طور پر بھی پوچھ گچھ کی تھی۔ یہ سب نائلہ کی غیر موجودگی میں اس نے کیا تھا۔ جب اس نے ذرا دیر کے لیے تیمور کو تنہا چھوڑ دیا تھا۔ اسے خاص طور پر اس آنے والی شوخ و چنچل لڑکی ناہید جو بزنس پلینر تھی، کی باتیں یاد آ رہی تھیں، جو اس نے نائلہ خاں کے بھائی کامران خان کے بارے میں اسے بتائی تھیں۔

بقول ناہید کے اس روز نائلہ کے گھر میں چھوٹے دوستوں اور فیلوز کی پارٹی تھی۔ کامران بھی اس میں بھرپور انداز کے ساتھ شریک تھا۔ بالکل ایسا ہی ماحول تھا پارٹی کا اور رات ہو گئی۔ کسی کو بھی اجازت تھی کہ وہ اگر آرام کر کے اگلے دن جانا چاہے تو گھر جا سکتا ہے۔

کچھ لوگ ان کے لیے تحفے بھی لائے تھے۔ ناہید بھی ڈیکوریشن پیس کے طور پر چینی کا بنا ہوا ایک درخت لائی تھی، وہ آبنوسی رنگت کا خوب صورت شو پیس تھا۔

کامران کو وہ بے حد پسند آیا تھا اور اسے اس نے اپنے ہی کمرے میں رکھا تھا۔ پھر نجانے کیا ہوا کہ کامران کو نیند ستانے لگی اور وہ دیگر لوگوں سے معذرت کر کے سونے چلا گیا۔ کسی نے کمرے میں داخل ہو کے اس کے بٹوے کو چوری کرنا چاہا تھا کہ اس کی آنکھ کھل گئی اور چور نے وہی ناہید کا پکڑا ہوا چینی شو پیس (درخت) اٹھا کر کامران کے سر پر مار دیا۔ جس سے وہ موقع پر ہلاک ہو گیا۔ پولیس آئی اور اسے چوری کی واردات کا رنگ دے کر چلتی بنی۔ تفتیش ہوتی رہی مگر کچھ نہ ہو سکا۔ خیال اغلب تھا کہ یہ چوری کی نہیں بلکہ کامران کو قتل کرنے کی واردات تھی۔

یہ وہ ساری باتیں تھیں جو تیمور کو ناہید سے بات چیت کے دوران معلوم ہوئی تھیں۔ اس نے ان باتوں کا زیادہ ذکر نائلہ سے نہیں کیا تھا۔

آخری نتیجہ تیمور نے یہ نکالا تھا کہ نائلہ خاں نے اسے آویزے یا قیمتی ہیرا چرانے کی کوئی من گھڑت کہانی سنائی ہے، درمیان میں معاملہ کچھ اور ہی تھا جو نہایت پُراسرار تھا۔ تیمور کو اسی کا کھوج لگانا تھا۔

کف لنکس ڈریسر پر رکھے ہوئے تھے۔ تیمور چادر اوڑھ کر سوتا بنا رہا۔ نیند اسے تنگ تو کر رہی تھی کیونکہ رات اب اپنے درمیانی پہر سے آخری پہر کی جانب گامزن تھی کہ دفعتاً... دروازے پر آہٹ ہوئی۔ اس کی نیند ایک دم بھاگ گئی۔ جوش سے رگوں میں لہو کی گردش تیز ہو گئی۔ اس نے فوراً اپنا سیل فون سیٹ کر کے اس طرح رکھ دیا کہ کم از کم ڈریسر پر اس کا فوکس بنا رہے اور چور کو وہ نظر بھی نہ آئے۔

تیمور نے چادر کی ہلکی سی اوٹ اس طرح کر رکھی تھی کہ متوقع چور کو دیکھ سکے لیکن وہ اسے سوتا سمجھے۔ یوں اس نے ڈرامے میں رنگ بھرنے کے لیے ہلکے ہلکے مصنوعی خراٹے بھی لینا شروع کر دیے۔

کوئی آہستگی سے دروازہ کھول کے اندر داخل ہو چکا تھا...

کمرے میں زیرو پاور کا بلب روشن تھا۔ آنے والا شخص ذرا دیر تک دروازے میں کھڑا سن گن لیتا رہا اور پھر مطمئن ہوا کہ سونے والا بے خبر سوتے میں خراٹے لے رہا ہے۔ چند لمحوں کے بعد چور تیزی کے ساتھ ڈریسر کی جانب بڑھا، اس نے جھپٹ کر کف لنکس اٹھائے اور تیزی کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا۔ یہ سب چند ہی سیکنڈ کے اندر اندر ہو گیا۔ تاہم اس مختصر ترین عرصے کے دوران میں ہی تیمور نے اس شخص یا چور کو واضح طور پر پہچان لیا تھا۔

جب وہ شخص تیمور کے کف لنکس لے کر چلا گیا تو چند منٹ تک تو خاموشی سے لیٹا رہا، اس کے بعد چادر پھینک کر اپنا سیل اٹھایا، اس کی مووی دیکھی۔ اس میں بھی کافی حد تک ایک خاص زاویے سے چور کی شکل اور قد و قامت واضح تھا۔ لیکن وہ اس سے کچھ خاص مطمئن نہ ہو سکا۔ اس نے جوتے پہنے اور اپنے کمرے کی کھڑکی... کے باہر چھوٹی سی بالکونی میں آ کر کوٹھی کا جائزہ لینے لگا۔

کوٹھی کی دوسری منزل پر صرف دو کھڑکیوں میں روشنی ہو رہی تھی۔ ان میں سے ایک کمرے کی کھڑکی سے تیمور نے چور کو دیکھ لیا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور وہ کف لنکس کا جائزہ لے رہا تھا۔

دوسرے کمرے میں کھڑکی سے نائلہ بیٹھی ایک کتاب پڑھتی نظر آ رہی تھی اور بار بار بے چینی کے ساتھ گھڑی دیکھ رہی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ چور کے بارے میں اطلاع حاصل کرنے کے لیے بے چین تھی۔

تیمور نے اس کے کمرے کی کھڑکی پر آہستہ سے دستک دی۔ وہ اچھل پڑی۔ لیکن جب تیمور کو دیکھا تو اس نے کھڑکی کی چٹخنی کھول دی۔ اس نے تیمور کو گھور کر دیکھا اور قدرے حیرت اور غصے کے ساتھ پوچھا۔

"تم... تم یہاں کس طرح آ گئے، میرے کمرے کی بالکونی تمہارے کمرے کی بالکونی سے ملی ہوئی تو نہیں ہے؟"

"آپ کو اس سلسلے میں پریشان ہونے کی مطلق ضرورت نہیں محترمہ!" تیمور نے نہایت سکون سے جواب دیا۔ "آپ کو معلوم ہے کہ میں ایک خفیہ پولیس کا آدمی ہوں کوئی عام پولیس والا نہیں۔ ہم جیسے لوگ ہمیشہ سے ہی دروازوں سے نہیں آتے جاتے۔" نائلہ کا موڈ ایک دم خوش گوار ہو گیا۔ شاید اس نے تیمور کے لہجے سے فتح مندی کا اندازہ لگا لیا تھا۔

لہٰذا اس نے خوش اُمیدی اور خوش دلی سے پوچھا۔ "کیا تم کو کامیابی ہوئی؟ کیا معلوم ہو گیا کہ چور کون ہے؟"

"پہلے میڈم مجھے ایک سوال کا جواب دیں۔" تیمور بولا۔ "یہ بتایئے کہ آپ اپنے بستر کے قریب رکھے ہوئے نائٹ اسٹینڈ میں پستول کیوں رکھتی ہیں؟"

فطری طور پر نائلہ کی نگاہیں فوراً نائٹ اسٹینڈ کی جانب منتقل ہو گئیں۔

"تم کو کیسے معلوم ہوا...؟" اور پھر اس نے اپنے شانے جھٹکتے ہوئے جواب دیا۔ "ظاہر ہے کہ ذاتی حفاظت کے لیے... اور کس لیے؟"

"یہ پستول آپ نے خود خریدا تھا؟" تیمور نے پوچھا۔

"جی ہاں۔" نائلہ نے کہا۔

تیمور نے مسکرا کر کہا۔ "نہیں میڈم! میں یہ بات ماننے کے لیے تیار نہیں کہ آپ نے یہ پستول خود خریدا ہے اور اپنے ذاتی استعمال کے لیے خریدا تھا۔ کیونکہ عورتیں عموماً اڑتالیس میگنم کے پستول نہیں خریدتیں، عورتیں زیادہ تر روایتی طرز کے نو ملی میٹر پسٹل یا کسی ساخت کے پستول خریدتی ہیں مگر اڑتالیس میگنم کا پستول کبھی نہیں خریدتیں۔"

"اچھا چلیے، ٹھیک ہے یونہی سہی۔" اس نے تیمور کے دلائل سے گھبرا کر کہا۔ "میں نے یہ پستول خود نہیں خریدا تھا۔ یہ کامران نے خریدا تھا اور اسی کی ملکیت تھا لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"میڈم!" تیمور نے کہا۔ "میں صرف اس نکتے کی جانب آ رہا تھا کہ اگر کوئی شخص کسی ایک چیز کے بارے میں جھوٹ بولے تو وہ دوسری چیزوں کے بارے میں بھی جھوٹ بول سکتا ہے۔ چنانچہ میں اب اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ گزشتہ رات جب آپ نے اپنا آویزہ ڈریسر پر رکھ کر چور کے لیے جال پھیلایا تھا تو آپ کا مقصد صرف اتنا ہی نہیں تھا کہ آپ اپنے جذبۂ تجسس کو تسکین دے سکیں۔ بات صرف آپ کی اس معصومانہ خواہش تک محدود نہیں تھی کہ آپ چور کو پہچان لیں، آپ کا ارادہ یہ تھا کہ جب آپ چور کو دیکھیں تو اسے فوراً گولی مار دیں، آپ اس کے ٹکڑے اُڑا دینا چاہتی تھیں۔"

"یہ سب فضول باتیں ہیں۔ میں بھلا ایسا کیوں کرنے لگی؟" نائلہ خاں نے کہا۔ "اب آپ مجھے یہ بتایئے کہ چور کون ہے؟"

مگر... تیمور نے اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔

وصول کیے تھے۔ رامو نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ دو ہزار کی رقم ایک ماہ کے اندر اسے دے دے۔ تب وہ معاملے کے متعلق بات چیت کرے گا۔ دراصل بلو کی بھتیجی کانچی نہ صرف جوان تھی بلکہ کافی حد تک خوب صورت بھی تھی۔ رامو کی نظریں اس پر تھیں لیکن اس کے باوجود بھی وہ رقم سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں تھا۔ تین ہزار کی رقم میں سودا مکمل کرنے کے بعد وہ کانچی سے بیاہ بھی کر سکتا تھا۔ لیکن کانچی نہایت منہ پھٹ اور ہاتھ چھٹ قسم کی لڑکی تھی۔ وہ چھت والی کے مسافر خانے میں کام کرتی تھی۔ وہاں کی تمام لڑکیاں جسم فروشی کے دھندے میں ملوث تھیں۔ لیکن کانچی نے ابھی تک اپنے آپ کو نیلام نہیں کیا تھا۔ اس لیے مسافر خانے کی تمام لڑکیوں کی نسبت اس کی کمائی کم تھی۔ بلو کو اپنی بھتیجی کی یہ بات نہایت کھلتی تھی۔ اس نے باتوں باتوں میں اسے سمجھانے کی کوشش بھی کی تھی کہ جب تک جوانی ہے تب تک روانی بھی ہے اور بڑھاپا قریب آتے ہی روانی تھم جاتی ہے۔ اس وقت کے آنے سے پہلے اسے اپنے مستقبل کے لیے کچھ سوچ لینا چاہیے۔ کانچی بات کو ٹال جایا کرتی تھی۔ اسے مستقبل کی خواہش نہیں تھی۔ اس کے خیال میں جو کچھ بھی تھا وہ آج تھا اور کل کے متعلق سوچنا فضول تھا۔ اسے اپنی زندگی سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ وہ جیسے تیسے کر کے وقت گزار رہی تھی۔ باچو نے جب ڈھابے میں قدم رکھا۔ تب بلو کی باچھیں کھل کر چہرے کے قریب ہونے لگیں۔ اس نے پہلی نظر میں ہی اندازہ لگا لیا کہ اسامی تگڑی ہے۔ وہ باچو کے استقبال کے لیے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور خوش آمدانہ لہجے میں دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔

"میں اپنے ڈھابے میں تیرا سواگت کرتا ہوں۔ تجھے یہاں کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ میرے پاس اصلی گھی سے تیار کردہ بھوجن کے علاوہ دیسی دارو بھی ہے تو صرف خواہش کا اظہار کر، تجھے حسب منشا سب مل جائے گا۔"

"میں دھرم پورہ میں مسافر ہوں۔" باچو بولا۔ "رات ہونے کے قریب ہے۔ اگر ہو سکے تو رہائش کے لیے کمرے کا انتظام کر دے۔ رقم کی فکر نہ کر۔ وہ میرے پاس بہت ہے۔"

بلو سوچ میں پڑ گیا۔ اس کے پاس ڈھابے کی چھت پر مختصر کمرا تھا۔ اگر وہ کرائے پر چڑھ جاتا تو سو روپے بہ آسانی اس سے مل سکتا تھا لیکن پریشانی کی بات یہ تھی کہ کمرا رہائش کے قابل نہیں تھا۔ وہ اسے اسٹور کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ تاہم وہ اتنی آسانی کے ساتھ تگڑی اسامی کو ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس لیے چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد اس نے باچو سے پوچھا۔

"تجھے کمرا کتنے دنوں کے لیے درکار ہے، مگر اس حساب سے تجھے بھاڑے کے متعلق بتاؤں گا۔"

"پرسوں مجھے قتل جانا ہے۔ یوں سمجھ لے کہ کل کا دن میرے پاس ہے لیکن اگر حالات ناساز ہوئے تو کچھ دن اور بھی یہاں رک سکتا ہوں۔"

"تو ٹھیک ہے میرے پاس ڈھابے کے اوپر کمرا ہے۔ تو وہاں رہ لے۔ قصبے میں قتل کی وارداتیں ہو رہی ہیں۔ تیرا وہاں جانا خطرے سے خالی نہیں ہوگا۔"

باچو نے چونکتے ہوئے بلو کی طرف دیکھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بتایا۔ "میں سچ کہہ رہا ہوں۔ مہینے میں تین لاشیں قصبے کے بازار سے ملنا ایک عام بات ہو کر رہ گئی ہے۔ آج جو تجھے بازار میں ویرانی دکھائی دے رہی ہے۔ وہ انہی وارداتوں کی وجہ سے ہے۔"

"پولیس کیا کر رہی ہے، قصبے والوں نے وارداتوں کے خلاف پرچہ درج نہیں کروایا؟"

"پولیس نے کیا کرنا ہے۔ وہ بھوتوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ دو ماہ قبل تھانے دار ہلاک ہو گیا۔ تب سے دھرم پورہ والوں کا اعتماد پولیس سے اٹھ گیا۔"

باچو اس کی باتوں سے بیزار ہونے لگا تھا۔ اس لیے دوبارہ مدعا پر آتے ہوئے بولا۔ "مجھے کمرا دکھا اگر پسند آگیا تو میں لے لوں گا۔ ورنہ دھرم پورہ کے بھوت سے نمٹنے کے لیے میرے پاس سامان موجود ہے۔" اس نے شلوار کے نیچے بیلٹ میں اڑسا ہوا رام پوری چاقو نکالا اور اس کی دھار پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ "میں نے اس سے سیکڑوں آدمیوں کی گردنیں کاٹی ہیں۔ آج بھوت کی کاٹ کر دیکھوں گا۔"

بلو کے چہرے پر خوف کے تاثرات پیدا ہوئے اور وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا۔ "اسے واپس رکھ لے۔ مجھے خوف محسوس ہوتا ہے۔ میں تو بھوجن تیار کرنے کے لیے بھی اس کا استعمال کم کرتا ہوں۔"

"بھوجن سے یاد آیا، میں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔" باچو بولا۔ "اگر تیرے پاس کچھ ہے تو وہ لے آ... کمرا بعد میں دیکھیں گے۔"

بلو قریب ہی رکھی ہوئی دیگچیوں کے پیچھے چلا گیا۔ اسے چاقو دیکھنے کے بعد باچو سے خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ چاقو واقعی رام پوری تھا۔ لیکن ایک بات اور بھی تھی جس نے

اسے چونکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ باچو کی بنیان میں سو روپے کی گڈی اس نے دیکھی تھی۔ رقم اندازاً تین ہزار کے قریب تو ضرور تھی۔ لیکن اسے صرف پندرہ سو کی ضرورت تھی۔ تاہم اگر پندرہ سو مزید مل جاتے تو مضائقہ نہیں تھا۔ رقم حاصل کرنے کے لیے اسے مارنا ضروری تھا۔ اس نے آج تک انسان تو دور کی بات کسی مکھی کو بھی نہیں مارا تھا۔ لیکن اب وہ تین ہزار کی رقم حاصل کرنے کے متعلق سنجیدگی کے ساتھ سوچ رہا تھا۔ اسے ہتھیار کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ باچو کے رام پوری چاقو سے وہ ایک ہی وار میں اس کا کریا کرم کر سکتا تھا۔ اسے لاش کو ٹھکانے لگانے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اسے بھوت کے کھاتے میں ڈال سکتا تھا۔ اس پر کوئی شک نہیں کرتا۔ وہ جیسے جیسے سوچتا جا رہا تھا، اس کے ارادے میں پختگی آتی جا رہی تھی۔ وہ اسے قتل سے لائی ہوئی شراب پلا کر مدہوش کرنے کے بعد ختم کر سکتا تھا۔ دماغ میں بننے والی منصوبہ بندی کے دوران وہ کام بھی کرتا جا رہا تھا۔ دال گرم ہو گئی تھی۔ اس نے دیگچی اتار کر ساگ کی ہانڈی چولھے پر رکھ دی۔ اب روٹیاں توے پر ڈالنا باقی تھا۔ نجانے کانچی کہاں مر گئی تھی۔ عموماً اس وقت تک مسافر خانے سے واپس آجایا کرتی تھی۔ وہ دونوں ڈھابا بند کر کے اکٹھے گھر جاتے تھے۔

باچو اٹھ کر اس کے قریب آگیا اور دال کا معائنہ کرتے ہوئے بولا۔ "اگر اس کے ساتھ مکئی کی روٹی اور پیاز کی چٹنی مل جائے تو مزہ ہی آجائے۔"

بلو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اس سے آنکھیں چرا رہا تھا کیونکہ بات اب کاروبار سے ہٹ کر مفاد پرستی تک چلی گئی تھی۔ تاہم اس سے فرق نہیں پڑتا تھا۔ بھگوان نے اسے موقع دینے کے لیے باچو کو اس کے ڈھابے میں بھیجا تھا۔ ورنہ وہ سیدھا رنگ محل بھی جا سکتا تھا اور رقم کا غیر متوقع طور پر دکھائی دینا اس بات کی دلیل تھی کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے گا۔

باچو کی آواز سنائی دی۔ "تو نے بتایا تھا کہ تیرے پاس دیسی دارو ہے لیکن مجھے تو ولایتی شراب پینے کی عادت ہے۔ کیا تو اس کا انتظام کر سکتا ہے۔ میں تجھے ادائیگی کر دوں گا۔"

بلو خوشی سے بھرپور لہجے میں بولا۔ "چند دن پہلے ایک گاہک قتل سے شراب لایا تھا۔ میں نے اچھے داموں خرید لی۔ تجھ سے منافع نہیں لوں گا۔ کیونکہ مہمان بھگوان کا روپ ہوتا ہے اور میں بھگوان کو ناراض نہیں کرنا چاہتا ہوں۔"

ڈھابے کے دروازے پر آہٹ ہوئی اور سرخ ساڑی میں ملبوس کانچی اندر آگئی۔ باچو نے مڑ کر دروازے کی طرف دیکھا اور مبہوت ہو کر رہ گیا۔ کچھ ایسا ہی حال کانچی کا بھی ہوا۔ وہ جہاں تھی وہیں ساکت ہو کر رہ گئی۔ اس کی نگاہیں باچو کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے پتھرا کر رہ گئی ہوں۔ باچو کو اس کے حسن نے بہت متاثر کیا۔ رنگ سانولا، چہرہ پرکشش، قد مناسب اور جسم کے نشیب و فراز تباہ کن تھے۔

ان دونوں کے احساسات سے بے پروا بلو، کانچی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ "میں تیرا ہی منتظر تھا۔ جلدی سے روٹیاں توے پر ڈال۔ میں اوپر والا کمرا صاف کرتا ہوں۔ باچو وہیں رہے گا۔ اسے کسی قسم کی تکلیف نہیں ہونی چاہیے۔"

کانچی کی خواب میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی۔ "یہ تو رنجن ہے۔ میرے خوابوں کا شہزادہ ... مجھے معلوم تھا کہ ضرور واپس آئے گا لیکن اتنی جلدی آئے گا مجھے یقین نہیں تھا۔"

"اب آگیا ہے تو اسے تو ہی سنبھال، میں اوپر کام کر کے آتا ہوں۔" بلو سیڑھیوں کی طرف جاتے ہوئے بولا۔

کانچی نے آگے بڑھ کر باچو کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں تھاما اور گلوگیر لہجے میں بولی۔ "تجھے میری یاد نہیں آتی تھی۔ میں تو تیرے جانے کے بعد پاگل ہو گئی تھی۔ اگر تجھے یقین نہیں آتا تو چندن بائی سے پوچھ لے۔ وہ تجھے بتائے گی کہ میں نے تیرے بعد کتنی دفعہ آتما ہتیا کرنے کی کوشش کی۔"

باچو کو کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ لیکن اس کی خوب صورتی نے اسے بدحواس کر دیا تھا۔ وہ لاثانی حسن کی مالک تھی۔ اس لیے اسے اپنے سینے کے ساتھ بھینچتے ہوئے مخمور لہجے میں بولا۔ "مجھے کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ میں سب جانتا ہوں تو میرے روم روم میں بسی ہوئی ہے اور ہمارا ساتھ جنموں پر مشتمل ہے لیکن میں تیرا رنجن نہیں ہوں۔ میرا نام باچو ہے اور میں احمد آباد سے یہاں آیا ہوں۔" وہ جذباتی ہو کر نہ جانے کیا کچھ بولے جا رہا تھا۔ کانچی نے اپنے آپ کو اس کی گرفت سے چھڑایا اور چولھے کی طرف جاتے ہوئے بولی۔

"تو رنجن ہے یا نہیں۔ مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں۔ آج میں تجھے اپنے ہاتھوں سے بھوجن کراؤں گی۔ تو وہاں چارپائی پر بیٹھ جا۔ میں ابھی لاتی ہوں۔"

باچو چارپائی پر بیٹھ گیا۔ کانچی نے توے پر روٹیاں

آمدنی نہیں رہی۔ تب چندن بائی نے دہلی سے دیال سنگھ کو یہاں بلایا۔ وہ اُجرت لے کر آدمیوں کو قتل کرتا تھا۔ چندن بائی نے اس کے ساتھ مل کر دھرم پور میں قتل و غارت شروع کر دی۔ دہلی کی خوب صورت اور مہنگی طوائفوں کو رنگ محل میں لایا گیا۔ دلالوں کو گاہک دھرم پورہ بھیجنے کے لیے اچھا خاصا معاوضہ دیا گیا۔ حسن پرست افراد رنگ محل آنے لگے۔ ان کے پاس حرام کا پیسا بہت ہوتا تھا۔ دیال سنگھ انہیں قتل کر دیتا اور چندن بائی ان کے مال پر قبضہ کر لیتی۔ لیکن قتل کے چند واقعات کے بعد پولیس حرکت میں آ گئی۔ تب حوالدار بھیم سنگھ چندن بائی سے ملنے کے لیے رنگ محل آیا اور اسے دھمکی دی کہ اگر اسے معاملے میں حصہ نہ دیا گیا تو وہ سب کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دے گا۔ مجبوراً اسے بھی ساتھ ملانا پڑا۔ دیال سنگھ جو بھی قتل کرتا اسے ڈھکے چھپے انداز میں بھوت کی کارستانی قرار دے کر معاملے کو دبا دیا جاتا تاکہ بات دہلی تک نہ جا سکے۔''

باچو بولا۔ ''تیں تو نے مجھے یہ سب کچھ بتا کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔ پولیس سے تعلق ہونے کی بدولت میں تم سب کو گرفتار کروا سکتا ہوں۔''

کاچی کی آنکھوں میں دوبارہ آنسو جھلملانے لگے۔ اس دفعہ اس نے انہیں پونچھنے کی کوشش نہیں کی اور گلوگیر لہجے میں بولی۔ ''میں نے تجھے اپنے محبوب کے متعلق نہیں بتایا۔ اس کا نام رنجن تھا۔ ہم جلد شادی کرنے والے تھے لیکن ایک دن اس کی سربریدہ لاش دھرم پورہ کے بازار سے ملی اور ایسا صرف دھرم پورہ کا بھوت یعنی دیال سنگھ کر سکتا تھا۔ اس کی موت کو بھوت کی کارروائی سے منسوب کیا جانے لگا لیکن مجھے معلوم تھا کہ رنجن کی ہتیا دیال سنگھ نے کی ہے۔ اس لیے لاش کے ملتے ہی میں تیکھی چالاکی ہوئی چندن بائی کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اس نے مجھے دلاسا دینے کے بجائے دھمکی دی کہ اگر میں نے قصبے والوں کو کچھ بھی بتانے کی کوشش کی تو میرا بھی وہی حال ہوگا جو رنجن کا ہوا تھا۔ میں خاموشی سے ساتھ آ گئی لیکن میں نے دل میں تہیہ کر لیا کہ رنجن کا بدلہ ضرور لوں گی اور ایک دن میں احمد آباد چلی گئی۔ میں نے وہاں کے تھانیدار کو معاملے کے متعلق بتایا۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ جلد اپنے آدمی کو حالات کے متعلق معلوم کرنے کے لیے قصبے کی طرف بھیجے گا اور پھر تو دھرم پورہ آ گیا۔ جب میں نے تجھے کل رقص گھر کے دریچے میں دیکھا تو پتا چلا۔ تیری شکل و صورت، قد و قامت اور لب و لہجہ سب کچھ رنجن جیسا تھا لیکن جلد ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ تیرا اس سے کوئی تعلق نہیں اور تجھے احمد آباد کے تھانے سے یہاں بھیجا گیا ہے۔''

باچو نے پوچھا۔ ''لیکن دیال سنگھ نے رنجن کی ہتیا کیوں کی؟ تو مجھے تفصیل سے سب کچھ بتا، میں تیری مدد کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔''

''تفصیل اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ اس نے دیال سنگھ کو کسی کو قتل کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ پولیس کو سب کچھ بتانا چاہتا تھا۔ اس لیے دیال سنگھ نے اس کی ہتیا کر دی۔'' کاچی زار و قطار رونے لگی۔

باچو نے منہ پھیر لیا۔ وہ خوب صورت لڑکیوں کو روتا ہوا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ رات کے تین بجے وہ ڈھابے سے نکل کر قصبے کی طرف چلی گئی۔ اس ملاقات کے متعلق دھرم پورہ والوں کو معلوم نہیں ہو سکا لیکن بلو کو سب معلوم تھا۔ وہ کاچی کا پیچھا کرتے ہوئے ڈھابے تک آیا تھا۔ اس کے ساتھ رامو بھی تھا۔ اسے ساتھ لانا بلو کی مجبوری تھی۔ وہ بھوت کے ہوتے ہوئے اکیلا رات کے وقت ڈھابے کی طرف نہیں آ سکتا تھا۔ اس خوف کی پاداش میں اسے باچو سے حاصل ہونے والی رقم کا آدھا حصہ رامو کو دینے کا وعدہ کرنا پڑا۔ اس کے علاوہ رامو نے ہی دوسرے دن قصبے والوں کو بتایا تھا کہ دھرم پورہ کے بھوت نے قصبے سے گزرنے والے مسافر کو رات کے وقت موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ رہ گئی بات کاچی کی۔ تو وہ اسے یہ کہہ کر بہ آسانی مطمئن کر سکتا تھا کہ باچو رات کے کسی پہر شراب پی کر ڈھابے سے باہر نکل گیا تھا۔ اس لیے بھوت کا شکار ہو گیا۔ اس رات بلو اور رامو گھر واپس نہیں جا سکے۔

☆☆☆

اگلی صبح قصبے کے لوگوں کو ان دونوں کی لاشیں ملیں۔ انہیں بازار کے آخر میں رنگ محل کی عمارت کے پاس پھینکا گیا تھا۔ کاچی بہت بدحواس تھی۔ اس نے عجلت کے عالم میں باچو کو رنگ محل بھجوا دیا۔ اگر قصبے والوں کو معلوم ہو جاتا کہ گزشتہ رات باچو، بلو کے ڈھابے میں مقیم تھا تو اس پر بھی شک کیا جا سکتا تھا۔ قصبے والوں نے دونوں لاشوں کا کریا کرم کر دیا۔ اس دن کاچی، باچو سے ملاقات کے لیے رنگ محل نہیں آئی لیکن رات کو اس کے کمرے میں آ گئی۔ باچو نے تمام دن شراب نوشی کی تھی اس لیے نشے میں دھت بستر پر چت لیٹا ہوا تھا اور اس کی بنیان میں سے روپوں کی گڈی باہر جھانک رہی تھی۔ کاچی کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات ابھرے اور اس نے آگے بڑھ کر روپوں کی

گڈی کو اندر کر کے جیب کے بٹن بند کر دیے۔ باچو نے اسے بازو سے تھاما اور کھینچ کر اپنے اوپر گرا لیا۔ کاچی پھرتی کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر فیصلہ کن لہجے میں بولی۔ ''تو اپنے ساتھ مجھے بھی مروائے گا۔ اگر چندن بائی کو معلوم ہو گیا کہ تیرے پاس تگڑی رقم ہے تو وہ چاقو کے زور پر رقم چھپا لے گی۔''

باچو نے ٹانگ سے بندھے چاقو کو کھولا اور ہاتھ میں تھامتے ہوئے بولا۔ ''مجھے رقم کی حفاظت کرنا آتی ہے جس نے اسے ہاتھ لگایا تو میں اس کا ہاتھ کاٹ دوں گا۔'' اس کے لہجے میں نہ جانے ایسی کیا بات تھی کہ کاچی کو اپنے جسم کے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے۔

''قاتل کا کچھ پتا چلا؟'' باچو نے دوبارہ سرد لہجے میں پوچھا۔

''نہیں، حیرت کی بات ہے۔ چندن بائی بھی اس قتل سے لاعلم ہے۔ صبح قصبے والوں نے ڈھابے کو بند کر دیا۔ اگر تو وہاں ہوتا تو تیری اصلیت بھی منظر عام پر آ جاتی۔ اس کے بعد چندن بائی تیرے وجود کو ایک منٹ بھی دھرم پورہ میں برداشت نہ کرتی۔ میری تجھ سے بنتی ہے کہ رقم کو چھپا کر رکھ۔''

باچو نے چاقو کی دھار پر ہاتھ پھیرا۔ ''اس کی دھار پیاسی ہے۔ اسے خون کی ضرورت ہے۔ تیری آشا بھی پوری ہو جائے گی اور اس کی پیاس بھی..... قصبے والوں کو بھوت سے نجات ملنے والی جائے گی۔''

کاچی نے چاقو اس کے ہاتھ سے لے لیا اور اس کی ٹانگ پر باندھتے ہوئے بولی۔ ''آج کی رات میری اور تیری ملاقات کی آخری رات ہے۔ میں خون خرابا نہیں چاہتی ہوں۔ نہ جانے کل تو کہاں ہوگا اور میں کہاں ہوں گی۔ ہم اس رات کو یادگار بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔''

باچو نے بے اختیار اسے اپنی بانہوں میں بھینچ لیا۔ دفعتاً دروازے پر دستک ہوئی۔ کاچی نے حیرت بھری نگاہوں سے دروازے کی طرف دیکھا۔ ''اس وقت کون ہو سکتا ہے؟'' وہ بڑبڑائی۔ ''چندن بائی بھیم سنگھ سے ملاقات کے لیے تھانے چلی گئی ہے اور دیال سنگھ نشے میں دھت اپنے کمرے میں پڑا ہے۔ دستک دوبارہ ہوئی۔ اس نے اپنے آپ کو باچو کی گرفت سے آزاد کیا اور دروازے کی طرف آ گئی۔ دروازے پر چندن بائی کی ملازمہ کھڑی تھی۔ کاچی نے تیکھی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ بولی۔ ''چندن بائی تجھے اپنے کمرے میں بلا رہی ہے، جلدی چل۔''

کاچی اس دخل در معقولات پر برہم ہوئی لیکن انکار کر کے چندن بائی کے غصے کو بھڑکانا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے باچو کو جلد واپس آنے کا کہہ کر ملازمہ کے ساتھ اندرون مسافر خانے کی طرف آ گئی۔ مسافر خانے کا سب سے آخری کمرا چندن بائی کا تھا۔ جسے کسی محل کی طرح سجایا گیا تھا۔ فرش پر قالین اور قالین کے آخر میں مسہری تھی۔ جس کے گرد گاؤ تکیے رکھے ہوئے تھے۔ کھڑکیوں پر شاہانہ پردے لگے تھے اور مسہری کے پاس صندل کی لکڑی سے بنی ہوئی میز پر طرح طرح کی شرابوں کی بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔ چندن بائی جام ہاتھ میں لیے گاؤ تکیے کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اس کی عمر پچاس سے کچھ اوپر تھی۔ جسم فربہی مائل۔ کپڑے زرق برق اور مہنگے۔ بال جوڑے کی صورت میں بندھے ہوئے تھے اور چہرے کے خدوخال کرخت تھے۔ کاچی کو اندر داخل ہوتا دیکھ کر وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''مجھے دیال سنگھ نے بتایا ہے کہ تو صبح تگڑی اسامی کو رنگ محل میں لائی ہے۔ مجھے تجھ سے یہی امید تھی۔ دیال سنگھ نے مجھے یہ بھی بتایا ہے کہ اس کی بنیان میں کم و بیش تین ہزار کی رقم ہے۔ میں نے رات کے آخری پہر اس کا کریا کرم کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔''

کاچی غصیلی نگاہوں سے چندن بائی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''اسے ہاتھ بھی لگانے کی کوشش نہ کرنا۔ وہ میرا رنجن ہے اور اب کی دفعہ برداشت نہیں کروں گی۔ جس نے بھی اس کی طرف میلی نگاہوں سے دیکھا، میں اس کی نگاہیں پھوڑ دوں گی۔''

چندن بائی مسکراتے ہوئے بولی۔ ''رنجن کب کا مر گیا اور مر جانے والے دوبارہ زندہ نہیں ہوتے۔ تیرے دل میں بہت سی بدگمانیاں ہیں۔ انہیں اب ختم ہو جانا چاہیے۔ میں بھیم سنگھ سے ملنے تھانے گئی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ احمد آباد کی جیل سے ایک قیدی فرار ہو گیا ہے۔ وہ پندرہ آدمیوں کا قاتل ہے۔ جیل کے کھوجی نے بتایا ہے کہ اس کے قدموں کے نشان دھرم پورہ کی طرف پائے گئے ہیں اور میرے خیال میں بلو کی ہتیا اسی نے کی ہے۔''

کاچی نے بہ آسانی جان لیا کہ وہ اس کی بدگمانیوں کو دور کرنے کے لیے جھوٹ بول رہی ہے۔ درحقیقت اس کی نگاہیں باچو کی رقم پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ اسے ہتھیانا چاہتی تھی اور اس کے لیے اسے کاچی کی مدد کی ضرورت تھی۔ جب بھی ایسا کوئی گاہک رنگ محل میں آتا تھا۔ تب کاچی اسے شراب

کے نشے میں اس حد تک دھت کر دیتی تھی کہ وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہونے کے بعد سب کچھ اس کے حوالے کر دیتا تھا۔ بعدازاں دیال سنگھ اپنے چاقو کے جوہر دکھانے کے بعد لاش کو دھرم پورہ کے بازار میں پھینک دیتا تھا۔ اسے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر چندن بائی دوبارہ بولی۔

"جیل سے بھاگا ہوا قاتل کسی کا محبوب نہیں ہوتا۔ وہ صرف انسانوں کا دشمن ہوتا ہے اور اس سے محبت کرنا حماقت سے کم نہیں۔ تو رات کو اسے مدہوش کر دینا تاکہ دیال سنگھ اپنا کام بہ آسانی کر سکے۔"

"وہ جیل سے بھاگا ہوا قاتل نہیں ہے۔" کانچی فوراً بولی۔ "بلکہ پولیس کا آدمی ہے۔ احمد آباد کے حوالدار نے بلو کو کچھ دن پہلے بتایا تھا کہ قصبے والوں کی درخواست سننے کے بعد جلد ہی پولیس کا آدمی دھرم پورہ بھجوایا جانے والا ہے۔ میں نے بلو سے اس کے متعلق پوچھا تو اس نے اقرار کیا تھا۔" کانچی نے منہ پھاڑ کر جھوٹ بولا اور یہ حربہ کسی حد تک کارآمد بھی ثابت ہوا۔

چندن بائی کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات پیدا ہوئے اور کانچی کو یہ جان کر خوشی محسوس ہوئی کہ اس کی جیل سے بھاگے ہوئے قیدی والی بات جھوٹ پڑ چکی تھی۔ کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد چندن بائی دوبارہ گویا ہوئی۔

"دیال سنگھ کے چاقو کو اس بات سے کوئی سروکار نہیں کہ اس کی دھار سے کٹنے والی گردن عام شہری کی ہے یا کسی پولیس کے سپاہی کی ہے۔ رنگ محل میں ایک دفعہ جو بھی آ گیا اس کا واپس جانا ممکن نہیں۔" چندن بائی کے لہجے کی سردمہری کو محسوس کر کے کانچی نے مزید بات چیت کا ارادہ ملتوی کر دیا اور کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ اس کے چلے جانے کے بعد دیال سنگھ کمرے میں آ گیا۔ چندن بائی نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"جب اپنے گھر کی مرغی بغاوت پر اتر آئے تو اسے کاٹ دینا ہی بہتر ہوتا ہے۔ آج کی رات تیرے لیے آزمائش کی رات ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ تو کانچی کو پسند کرتا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ اسی شش و پنج میں مبتلا تھی کہ تیری خدمات کے بدلے اسے تیرے حوالے کر دوں یا نہیں۔ لیکن مجھ کو یہ سب منظور نہیں۔ رات کو دو بجے کے بعد کانچی کا سر تن سے جدا کر دے۔ قیدی کے … تین ہزار کی رقم ہے۔ اس میں سے پندرہ تیرے اور پندرہ میرے … کام احتیاط سے کرنا، ہو سکتا ہے کہ وہ واقعی پولیس کا آدمی ہو۔"

دیال سنگھ نے جیب میں سے خنجر نکالا اور اس کی دھار پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ "میرے خنجر کے سامنے … خاص آدمی کی کوئی اہمیت نہیں۔ صرف آپ کے حکم کی دیر ہے۔ کام حسب توقع ہو جائے گا۔ لیکن کانچی والا معاملہ … ہے۔ میں انکار نہیں کرتا تاہم یہ کام میرے لیے کسی آزمائش سے کم نہیں۔" وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

چندن بائی دوبارہ شراب نوشی میں مشغول ہو گئی۔ باچو کے کمرے کے پاس سے گزرتے ہوئے دیال سنگھ نے اندر جھانکا۔ کانچی اور باچو ہم آغوش تھے۔ دیال سنگھ کانچی سے بہت محبت کرتا تھا۔ تاہم کانچی نے کبھی اسے گھاس نہیں ڈالی تھی اور اگر باچو والا معاملہ درمیان میں نہ آتا تب بھی چندن بائی کانچی کو کسی صورت بھی اس کے حوالے نہ کرتی۔ رنگ محل کی اہم ترین لڑکی تھی۔ لیکن اب معاملہ دیال سنگھ کے حق میں تھا۔ وہ کانچی کو قتل کیے بغیر دھرم پورہ سے دور … سکتا تھا۔ اس کے پاس اتنی رقم جمع ہو چکی تھی کہ وہ دونوں مناسب زندگی گزار سکتے۔

☆☆☆

اس رات کانچی بہت دیر سے گھر گئی۔ وہ بہت … تھی۔ باچو اور اس کی یہ آخری ملاقات تھی۔ وہ صبح نکل جانے کی تیاری کر چکا تھا۔ شاید واپس کبھی بھی نہ آتا۔ کانچی کو یقین تھا کہ وہ جیل سے بھاگا ہوا قیدی نہیں تھا۔ وہ پولیس کا آدمی بھی نہیں تھا۔ صرف اور صرف اس کے رنجن کا ہم شکل تھا۔ اس نے دوسرا جنم بھی نہیں لیا تھا۔ تاہم پھر بھی اس کی بہت سی عادتیں رنجن سے مطابقت رکھتی تھیں۔ جیسے رنجن کھیتوں کی طرف جاتے ہوئے ہمیشہ اس کے ماتھے کو چومتا تھا۔ باچو نے بھی اسے رخصت کرتے ہوئے ماتھا چوما تھا۔ رنجن کو کانچی کی آنکھیں بہت پسند تھیں۔ وہ ہمیشہ ان کی تعریف میں زمین و آسمان ایک کر دیا کرتا تھا۔ آج رات باچو نے بھی اس کی آنکھوں کی تعریف کی تھی۔ سب سے زیادہ جس بات نے اسے چونکنے پر مجبور کیا تھا وہ بات یہ تھی کہ رنجن اسے پیار سے کشمیری سیب کہہ کر بلاتا تھا اور ان دو مختصر ملاقاتوں کے دوران تنہائی کے عالم میں باچو نے متعدد بار اسے اس نام سے پکارا تھا۔ وہ شش و پنج میں مبتلا تھی۔ اس کی پرچھائیں میں اسے رنجن کی صورت دکھائی دیتی تھی لیکن گزشتہ ملاقات میں باچو نے اس کی تشنگی کو دور کر دیا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس کی بوڑھی ماں محل کے قریب ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتی ہے۔ وہ اس سے ملنے کے لیے وہاں جا رہا تھا۔ شاید واپس بھی نہ آتا۔ تاہم کانچی اس سے ملنے کے لیے محل ضرور جا سکتی تھی۔ وہ اسے منانے کی کوشش بھی کر سکتی تھی کہ وہ

… سے شادی کر لے۔ ہو سکتا تھا کہ وہ مان جائے۔ لیکن اس نے محل میں واقع اپنے مکان کا پتا نہیں بتایا تھا۔ اس کے باوجود بھی اسے وہاں تلاش کرنا مشکل نہیں تھا۔ کانچی نے دل میں تہیہ کر لیا کہ وہ اسے منانے کے لیے صبح رنگ محل ضرور جائے گی۔ اگر مان گیا تو ٹھیک ہے ورنہ سب کچھ چھوڑ کر اس کے ساتھ محل چلی جائے گی۔ بلو کی موت کے بعد دھرم پورہ میں اس کا رہا ہی کون تھا۔ وہ جب بھی جانے کے لیے آزاد تھی۔ اس نے آنکھیں موند لیں۔ اور رنجن کے سپنوں میں کھو کر اس کے ساتھ ہواؤں میں کسی آزاد پرندے کی طرح اڑنے لگی۔ رات یونہی گزر گئی۔ صبح منہ اندھیرے وہ بستر چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ابھی مرغ نے بانگ نہیں دی تھی۔ اس نے بے دلی کے ساتھ ناشتا کیا۔ پھر زیب تن کرنے کے بعد کپڑے سمیت رنجن کی پیٹی میں رکھنے لگی۔ سامان بہت زیادہ تھا لیکن وہ سب کچھ اپنے ساتھ نہیں لے جانا چاہتی تھی۔ اس نے دو جوڑے کپڑے، کنگھی شیشہ اور رنگ برنگی چوڑیوں کا وہ ڈبا نہایت احتیاط کے ساتھ پیٹی میں رکھا جو اسے رنجن نے دیوالی پر دیا تھا۔ پیٹی کو بند کرنے کے بعد وہ ابھی گھر سے باہر نکلنے کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ باہر شور مچ اٹھا۔ وہ ہڑبڑا کر گھر سے باہر آئی۔ گاؤں والے جوق در جوق رنگ محل کی طرف جا رہے تھے۔ اس نے ایک آدمی سے وہاں جانے کی وجہ دریافت کی تو اس نے بتایا۔

"پولیس کے سپاہی رنگ محل کو گھیرے میں لے رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جلد حوالدار بھیم سنگھ وہاں آنے والا ہے۔ وہ دھرم پورہ کے بھوت کا قصہ تمام کر کے قصبے والوں کو اس سے نجات دلائے گا۔" کانچی رنگ محل کی طرف دوڑ پڑی۔ اس کے دماغ میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگی تھیں۔ رات کو رنگ محل سے رخصت ہوتے ہوئے اس نے باچو کو چندن بائی کے ارادوں سے باخبر کر دیا تھا اور اس سے التجا بھی کی تھی کہ وہ اس کے گھر میں رات گزار لے۔ لیکن وہ انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولا کہ اسے اپنے رام پوری چاقو پر اعتماد ہے۔ وہ دیال سنگھ جیسے دس آدمیوں کا گلا بہ آسانی کاٹ سکتا ہے۔ نہ جانے کیوں کانچی نے اس کی باتوں پر اعتبار کر لیا تھا۔ اب اسے افسوس ہو رہا تھا۔ اسے باچو کو رنگ محل میں تنہا نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔ دیال سنگھ اپنا وار کر گیا تھا اور بھیم سنگھ کو بلوا کر چندن بائی باچو کی لاش کو دھرم پورہ کے بھوت سے منسوب کرنا چاہتی تھی۔ وہ جب رنگ محل پہنچی تب بھیم سنگھ کا سفید گھوڑا مسافر خانے کے سامنے پہنچ کر رک … تب … اور عمارت کے سامنے چھ لاشیں سفید کپڑے میں ملبوس پڑی تھیں۔ وہ ٹھٹک کر جہاں تھی وہیں کھڑی ہو گئی۔ گاؤں والے رنگ محل کے سامنے جمع ہو کر تماشا دیکھنے میں مصروف تھے۔

بھیم سنگھ ان سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ "مجھے جیل کے کھوجی نے بتایا ہے کہ دو دن قبل جیل سے فرار ہونے والے قاتل کے قدموں کے نشان رنگ محل کے اردگرد پائے گئے ہیں۔ اس نے رات یہاں گزاری ہے اور صبح چندن بائی، دیال سنگھ اور اس کے چار ساتھیوں کو قتل کر کے محل کی طرف بھاگ گیا ہے۔ اس سانحے کے متعلق ہمیں رنگ محل میں کام کرنے والی عورتوں نے بتایا۔ میرے آدمیوں نے جب مسافر خانے میں قدم رکھا تب چھ سربریدہ لاشوں کو درمیانی کمرے میں پڑے ہوئے پایا۔ اگر تم میں سے کسی کو قاتل کے متعلق کچھ معلوم ہے تو مجھے بتا دے تاکہ اسے جلد از جلد گرفتار کیا جا سکے۔ اس کا نام باچو خان ہے۔"

کانچی کو اپنی امید ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ واقعی اس کا رنجن نہیں تھا۔ لیکن پولیس کا آدمی بھی نہیں تھا۔ بلکہ جیل سے بھاگا ہوا قاتل تھا۔ جس کی کوئی منزل نہیں ہوتی۔ یقیناً وہ محل سے آگے چلا گیا ہوگا۔ بھیم سنگھ نے لاشوں کے اوپر سے کپڑا ہٹا کر ان کا معائنہ کیا۔ تب سرسری سی نگاہ کانچی کی بھی لاشوں پر پڑی۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں پھیر لیں۔ سب لاشوں کے سر تن سے جدا تھے۔ رام پوری چاقو کے سامنے ان کی حیثیت ہی کیا تھی۔ مولی اور گاجر کی طرح انہیں کاٹا گیا تھا۔ اسے بھیم سنگھ کی آواز سنائی دی۔

"مجھے کافی دنوں سے شک تھا کہ چندن بائی اور دیال سنگھ بھوت کا ڈراما رچا کر دھرم پورہ سے گزرنے والے مسافروں کی چتا کر کے ان کا مال لوٹنے میں ملوث تھے لیکن میرے پاس ان کے خلاف کوئی ثبوت نہیں تھا۔ اچھا ہوا آج دونوں اپنے انجام کو پہنچ گئے۔ میرے خیال میں اب دوبارہ خوف و ہراس کی لہر قصبے کو اپنی لپیٹ میں نہیں لے گی۔"

کانچی لٹے پٹے قدموں کے ساتھ واپس گھر آ گئی اور پیٹی کھول کر کپڑے باہر نکالنے لگی۔ چوڑیوں کا ڈبا باہر نکالتے ہوئے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ رنجن نے دوبارہ جنم نہیں لیا تھا اور اب اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ دوبارہ جنم لے گا بھی نہیں۔ اس نے بے اختیار اپنی آنکھیں بند کر لیں جیسے باچو کے ساتھ گزرنے والے لمحوں کو ان میں قید کر لینا چاہتی ہو۔ اس کی زندگی کا سرمایہ یہی چند لمحے تھے...

❖❖❖

قسط: 15

شعلہ زن

روبینہ رشید

وہ شعلہ زن تھی یا جوالا مکھی... اس کے وجود میں ایک آتش فشاں دہک رہا تھا... اپنوں کی خودغرضی، دھوکے اور دل و جاں پر گزر جانے والی ناگہانی اس کے وجود کو تہ و بالا کر دینے والے لاوے کے مانند رقصاں تھی... رسوائی کی موت کو اس کا انجام ٹھہرایا گیا مگر مقدر اسے اپنے ساتھ لے اُڑا... اس کے راستے میں رکاوٹوں اور دشواریوں کے ہمالیہ حائل تھے مگر وہ حاتم طائی کی طرح زندگی کی حسن آرا کے مشکل سوالات کے جواب تلاشتی رہی... ہر قیامت نے اس کے حوصلے کو مہمیز کیا... ہر افتاد اسے مضبوط بناتی گئی... پناہ اور بقا کی تلاش اسے مسلسل دوڑا رہی تھی... موت روپ بدل بدل کر اس کے تعاقب میں تھی... وہ اپنی طاقت سے خود ناآشنا تھی... راہ میں آنے والے ہر پتھر کو وہ اپنے راستے سے ہٹا رہی تھی... اس کے باوجود اس بار آنے والا طوفان شدید تھا... اس میں ناکامی قیامت کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی تھی... ایک ایسی قیامت جو کروڑوں افراد کے قدموں سے زمین کھینچ لیتی ہے...

ایک سادہ معصوم مگر نڈر دوشیزہ کی سنسنی خیز داستان

گذشتہ افسانہ کا خلاصہ

میں سارہ عمر چھوٹے سے گاؤں کی ایک نہایت عام سی لڑکی تھی جسے تین بہنوں میں سب چھوٹی ہونے کی وجہ سے ماں باپ کا پیار [illegible] ہونے کے برابر ملا۔ گھر میں بھائی کی حکومت تھی۔ میرے پیروں سے گھر کی زمین اس وقت سرک گئی جب اسی بھائی نے غصے میں [illegible] کر دیا اور نوبت [illegible] کا بہانہ بنا کر سزا سے بچنے کے لیے مجھے بدنامی اور الزام کی کالک لگا کر موت کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا۔ میرے ماں باپ نے بیٹے کو بچانے کی خاطر اس فیصلے کو قبول کر لیا۔ اس شام میں نے گھر، گاؤں اور سب کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا۔ ٹرین پر سوار ہوئی۔ ٹرین میں ایک شیطان ملا۔ میں نے اس کا مقابلہ کیا اور کچھ پیسے لے کر وہاں سے بھاگنے میں کامیاب ہوئی مگر اس نے میرا پیچھا [illegible] میں ایک بستی میں پہنچی جہاں گندے نالے میں ایک چھوٹی بچی ڈوب رہی تھی۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اس بچی کو بچانے کے لیے نالے میں کود گئی۔ اس کی جان بچانے کے انعام کے طور پر مجھے اس کے گھر میں جگہ ملی۔ اس بستی میں منشیات کا دھندا زوروں پر تھا۔ مجھے پتا تو چلا مگر میری تقدیر کی گردش میرے ساتھ تھی۔ پہلے مجھ پر اس بچی کے باپ کے قتل کا الزام لگا [illegible] خوف [illegible] پھیلانے والی کالے جادو [illegible] سے میری جھڑپ ہوئی۔ وہ اس بچی کے خون سے ایک [illegible] طاقت حاصل کرنا چاہتی تھی۔ [illegible] بچانے کی کوشش میں وہ جادوگرنی جل کر مر گئی۔ جس کے بدلے بستی کے بڑے بدمعاش نے مجھے [illegible] قتل کرنے کا حکم سنایا۔ [illegible] دوسرے [illegible] نے [illegible] کر کے مجھے بچایا۔ اس نے مجھے اپنے اڈے پر قید کیا جہاں ہر طرف منشیات ہی منشیات تھیں۔ میں نے اس کے تمام [illegible] کے ساتھ ختم کرنے اور اس کے منشیات کے ذخیرے کو آگ لگا کر وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہوئی [illegible] تھی کہ ایک [illegible] کے ہتھے چڑھ گئی۔ جس نے [illegible] مجھے آپانی کے ہاتھوں فروخت کر دیا۔ وہ آپانی مجھے [illegible] مجھے بہت اچھی لگی تھیں مگر درحقیقت آپانی [illegible] تھیں۔ مجھے ان کے بنگلے پر ہر قسم کی تربیت فراہم کر کے امیروں کا دل خوش کرنے کے لیے تیار کیا گیا۔ آپانی نے ایک رات مجھے ایک [illegible] شخص کے گھر بھجوا دیا۔ جہاں بڑی مشکلات اور جان لیوا کوشش کے بعد میں [illegible] فرار ہونے میں کامیاب ہوئی۔ میں جان بچانے کے لیے [illegible] دوڑ رہی تھی کہ بڑی سڑک پر دوڑتی گاڑی جہاں سامنے سے آنے والی کار کی ٹکر [illegible] وہ گاڑی ڈاکٹر علی چلا رہے تھے۔ جو مجھے پہلے [illegible] اور پھر بابا کے پاس لے گئے۔ بابا کے گھر آ کر میری زندگی بدل گئی۔ [illegible] والے [illegible] حملے میں میری کوشش اور بہادری نے [illegible] جان بچانے میں مدد کی۔ [illegible] جس کے بعد انہوں نے مجھے اپنی بیٹی بنا لیا۔ ان کی زندگی کی کہانی مجھ سے [illegible]

نہیں تھی۔ لندن میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران انھیں وہاں ایک کروڑ پتی یہودی ابراہام کی بیٹی سے محبت ہوگئی تھی۔ اس محبت نے شادی کا روپ دھارا۔ ابراہام مسلمانوں سے سخت نفرت کرتا تھا۔ اس کے نہ ماننے اور مسلسل دھمکیوں کی وجہ سے وہ دونوں پاکستان آ گئے۔ یہاں ان کی زندگی بہت شاندار اور خوشیوں سے بھرپور تھی۔ اللہ نے انھیں ایک بیٹی سونیا عطا کی مگر اسی دوران ابراہام کے لوگ یہاں آ گئے۔ جہاں ان کی جان بچانے کی کوشش میں مریم نے اپنی جان دے دی اور وہ لوگ سونیا کو اپنے ساتھ لے گئے۔ بابا بمشکل اپنی جان بچا کر کرتے ہوئے اپنی بیٹی کی تلاش میں لندن پہنچے۔ کسی طرح وہ ابراہام کے محل میں گھسنے اور سونیا تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ وہ اسے لے کر باہر آ گئے تھے مگر آخری لمحوں پر ابراہام اور اس کے لوگوں نے انھیں شدید زخمی کر کے سونیا کو ان سے چھین لیا۔ وہ ان کو مارنے والے تھے کہ ان کے دوست نے کسی طرح انھیں بچایا اور پاکستان بھیج دیا۔ ابراہام کے محل سے انھیں وہ خفیہ فائلیں ملی تھیں جس سے انھیں معلوم ہوا تھا کہ ابراہام کے پاس موجود تمام دولت مریم کی ماں کی ملکیت تھی اور اس نے اس دولت کو مریم یا اس کی اولاد کے نام کر رکھا تھا۔ سونیا کے اٹھارہ سال کی ہونے تک وہ اس کا ولی تھا مگر اسے یہ ثابت کرتے رہنا تھا کہ مریم یا سونیا میں سے کوئی ایک اس کے پاس موجود ہے۔ ابراہام اسے انگلینڈ میں کسی نامعلوم مقام پر لے گیا مگر بابا سے اس کا جھگڑا جاری تھا۔ بابا نے مجھے تعلیم و تربیت سے نکھارا۔ وہاں ان کے علاوہ علی اور کریم موجود تھے۔ کریم ایک فلسطینی خاندان سے تعلق رکھتا تھا جس کے پورے خاندان کو یہودیوں نے مار ڈالا تھا اور بابا اسے یہاں ساتھ لائے تھے۔ وہ فوج میں میجر رہا تھا۔ مارشل آرٹ کا ماہر تھا اور اب فوجی ٹریننگ کی ایجنسی چلا رہا تھا۔ ڈاکٹر علی بابا کے دوست کا بیٹا تھا۔ ماں باپ کے حادثے میں انتقال کے بعد اس کی ذمے داری بابا نے لے لی تھی۔ اب ان دونوں کے ساتھ میں بھی اس گھر کا فرد بن چکی تھی۔ ابراہام کے بابا کو ایک فون نے ہم سب کو پریشان کر دیا تھا۔ اس نے بابا کو بتایا کہ اب وہ جلد ہی پاکستان کو تباہ و برباد کرنے والا ہے اور یہ سب کرنے کے لیے اس نے ان کی بیٹی سونیا کو (جسے وہ مریم کہہ رہا تھا) تیار کیا ہے یہ سب وہی کرے گی۔ کریم اس معاملے کو فوراً اعلیٰ افسروں تک لے گیا تھا۔ اسی دوران سڑک پر ایک بھکاری کے مشکوک انداز پر میں نے اس کا پیچھا کیا اور وہاں سے ملنے والا ایک سکہ مجھے فوراً کریم کے دفتر لے گیا۔ وہ اور وہ بھکاری تاشی موسمار کے لیے کام کر رہے تھے۔ ہم نے ان کے کئی منصوبے ناکام کیے۔ اسی دوران تاشی نے ڈمی کیس کے ذریعے مجھے جان سے مارنے کی کوشش کی مگر آخری لمحے پر کریم اور علی نے مجھے بچا لیا۔ پھر کریم کو قتل کرنے کی کوشش کی گئی۔ اب ہماری ان سے کھلی جنگ تھی۔ فراڈ یہ پکڑا گیا مگر غضنفر نے دلاور کے ذریعے اس کو قتل کرا دیا۔ ہم تینوں کو اس معاملے سے ہٹانے کے لیے غضنفر نے بابا کو ایک اسٹاف کے ذریعے اغوا کروایا مگر ہم تینوں وہاں پہنچ گئے۔ اور بابا کو چھڑا لیا گیا۔ اس دوران ہم نے ایک سراغ پر عمل کر کے تاشی کو پکڑ لیا ہمارے خفیہ ایجنسی کے دفتر پہنچوا دیا۔ تب ہی مجھے معلوم ہوا کہ کریم بظاہر فوجی ٹریننگ ایجنسی چلا رہا ہے مگر وہ اندر کو فوج کے خصوصی خفیہ مشن پر کام کرتا ہے۔ تاشی کے غائب ہونے پر ابراہام اور غضنفر نے میرے اغوا کا فیصلہ کیا۔ ہمارے گھر کے باہر کیا گیا اغوا کی اس کوشش میں وہ ناکام رہے اور سب کے سب کریم کے ہاتھوں گرفتار ہوئے۔ ایک منصوبے کے تحت تاشی کو فرار ہونے میں مدد ملی کہ وہ ایک حملے سے بچ نکلے اور اس کے گھر پہنچی جہاں غضنفر نے اسے ختم کرنے کے لیے دلاور کو بھیجا۔ تاشی وہاں ماری گئی۔ مسلسل ناکامی کی وجہ سے ابراہام نے سونیا کو پاکستان بھیجا۔ شیطانی ہتھیاروں کی جانکاری کے لیے وہاں کے ایک اعلیٰ ترین افسر سے دوستی کرتی ہے اور خبر پڑی جاتی ہے۔ تلاشی کے دوران اس کا فون پھٹ جاتا ہے اور وہ ہلاک ہو جاتی ہے۔ ابراہام کی ٹیم بھی جوزف کی سرکردگی میں شہر میں موجود ہے وہ اس کی مدد سے بوسٹ پر کیمیکل کے ذریعے سیکڑوں لوگوں کی موت کا باعث بنتے ہیں۔ اس پر ابراہام سے جھگڑے کے بعد سونیا گھر سے نکل پڑی اور گاڑی سے اس کا حادثہ ہو گیا۔ میں اسے بے ہوشی کی حالت میں اسپتال لے گئی۔ چوٹ لگنے کی وجہ سے وہ وقتی طور پر یادداشت کھو چکی تھی۔ دوسری طرف ابراہام نے خفیہ ایجنسیوں کی وجہ سے اس کی تلاش رکوا دی اور پکی ٹیم نے تمام کام کرنے والوں کو گرفتار کر دیا۔ دوسری جانب ابراہام کے لیے کام کرنے والا ایڈمرل بابا بن کر بڑے افراد کو بے وقوف بنا رہا تھا۔ انھوں نے دہشت گردوں کی مدد سے بڑی فوجی چھاؤنی میں گھس کر اسلحہ خانہ اور ان پر قبضہ کر لیا اور اسٹاف کو یرغمال بنا کر ایٹمی ہتھیار حوالے کرنے کا مطالبہ کر دیا۔ وہاں مجھے دلاور اور غضنفر نے اغوا کر لیا مگر اپنی خاص صلاحیت کی وجہ سے مجھے بہت جلد ہوش آ گیا اور میں غضنفر کو اٹھا لانے میں کامیاب ہوئی۔ فوجی چھاؤنی کے معاملے میں کریم کو بھی طلب کر لیا گیا تھا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

ڈیوڈ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔
"یہ — یہ نہیں ہو سکتا؟ یہ تو بالکل ہی بودے ثابت ہوئے — اور یہ لوگ؟ ان کی اتنی جرأت ---؟" وہ دہاڑا اور میز پر رکھے کافی کے کپ کو دیوار پر دے مارا۔ شور کی آواز سن کر شبیر دوڑتا ہوا کمرے میں داخل ہوا مگر پھر ڈیوڈ کا چہرہ دیکھ کر چپ چاپ کمرے سے باہر نکل گیا۔
"سب کچھ انڈر کنٹرول ہے۔ ہم نے ان تینوں پر قابو پا لیا ہے۔" اس آواز نے اس کے تن بدن میں گویا آگ سی بھر دی تھی۔ "ان میں سے ایک ہلاک ہو گیا مگر باقی دونوں زندہ ہیں۔ ایک زخمی ہے اور جبکہ دوسرا صرف بے

ہوش ہے۔"
"سب بگاڑ دیا ان بے وقوفوں نے --- اور خود بھی موت کے ہاتھوں میں جانے کے لیے تیار ہیں۔" وہ بڑبڑایا۔ "مگر یہ ان لوگوں کا خواب ہے صرف کھلی آنکھوں سے دیکھا جانے والا خواب --- انھیں ان میں سے کوئی بھی زندہ نہیں ملے گا جسے وہ دنیا کے سامنے اپنی گواہی میں پیش کر سکیں۔"
شکر ہے کہ اس نے جوزف کی واضح ہدایات کے باوجود جیمز کے علاوہ باقی دو افراد سے "ہیڈ بگ" واپس نہیں لیے تھے بلکہ اسے پہنے رکھنے کی خاص ہدایت کی تھی اور اب حالات اس نہج پر تھے کہ اسے ان تینوں سے چھٹکارا حاصل کرنا ہی تھا۔ ان کے لیے سب سے زیادہ اہم ان کا مشن تھا۔ انسانی جانوں کی اس کھیل میں کوئی اہمیت نہیں تھی اور جیمز جس کی موجودگی میں وہ بہ آسانی ایسا کر سکتا تھا۔
مگر یہ اس کا پلان نہیں تھا۔
ابراہام اور جوزف کی ہدایات کے مطابق انھیں چھاؤنی میں زیادہ سے زیادہ جانی اور مالی نقصان کرنا اور پھر اس کی آڑ میں ان لوگوں کو وہاں سے نکل جانا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسی گڑبڑ میں کسی کا دھیان ان کی طرف جانا مشکل تھا۔ یوں وہ زندہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو سکتے تھے۔
مگر اب خاصی گڑبڑ ہو چکی تھی۔ اسلحہ خانہ ان کے ہاتھ سے نکل چکا تھا جو ان کا سب سے بڑا نقصان تھا اور اب یہ سب بھی ملیامیٹ ہو رہا تھا مگر یہاں کی حد تک بازی فی الحال اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے خود کو تسلی دی۔
وہ اب بھی ان سب کو تباہ و برباد کر سکتا تھا اور وہ یہ کرنے والا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اسے ان تینوں احمقوں کا حساب بھی چکتا کرنا تھا۔ اس کے بعد ہی وہ یہاں سے نکل سکتا تھا۔ اس نے ٹرانسمیٹر کے ساتھ موجود ڈبے کی جانب ہاتھ بڑھایا جس میں کئی بٹن لگے ہوئے تھے۔ اس نے ان میں سے پہلے بٹن کو آف کر دیا۔ ایک لمحے بعد ہی ٹرانسمیٹر پر ہلکے دھماکے کی آواز کے ساتھ ایک زوردار چیخ سنائی دی جو بعد میں کئی مختلف چیخوں میں بدل گئی۔

☆☆☆

کریم، کیپٹن شاہد اور کئی دوسرے فوجیوں کے ہمراہ دوڑتا ہوا ہال میں داخل ہوا، اندر کا منظر دیکھ کر وہ ہکا بکا رہ گئے تھے۔
جس شخص کو وہ دروازے کے قریب بے ہوش چھوڑ کر آیا تھا، وہ عجیب کی پتلی حالت میں زمین پر تڑپ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں سے اب چیخوں کی جگہ ہلکی ہلکی بے ربط آوازیں آ رہی تھیں۔ اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا اور آنکھیں کسی ماہی کے مانند ابل کر باہر نکل رہی تھیں۔ ہال میں موجود کئی لوگ اس اچانک دھماکے اور پھر یہ سب کچھ دیکھ کر بے اختیار چلا رہے تھے۔
"او خدایا ---" کریم نے کہا پھر وہ یک دم پلٹا اور نہایت تیزی سے دوڑتا ہوا باہر نکل گیا۔
"کہاں --- کہاں جا رہے ہیں سر؟" شاہد نے بے اختیار پوچھا اور پیچھے کھڑے فوجی کو کریم کے پیچھے جانے کا اشارہ کیا۔
کریم تیزی سے چھوٹے ہال میں داخل ہوا جہاں جوزف کو اسپتال لے جایا جا رہا تھا۔ دو فوجی اسے اسٹریچر پر ڈال رہے تھے۔
"اس کے کان میں دیکھو --- اس کے کان میں کچھ ہے۔" وہ دور سے چلایا۔ "اسے نکال کر دور پھینک دو۔"
اس کے ان الفاظ کے ساتھ ہی اسے بازو سے پکڑے ہوئے فوجی نے اسے زمین پر لٹا دیا اور تیزی سے اس کے دونوں کانوں کو ٹٹولا۔ دائیں کان میں اس کی انگلیاں کسی ٹھوس چیز سے ٹکرائیں۔ اس نے انگلی کی مدد سے اسے باہر کھینچنا چاہا مگر وہ بائیں والے ایئر پیس سے نسبتاً کچھ زیادہ سختی اور مضبوطی سے اپنی جگہ پر موجود تھا۔ اس نے کھینچ کر اسے باہر نکالا اور اسے قدرے خالی جگہ پر پھینک دیا۔ چند ہی لمحوں میں اس ایئر پیک نے پھٹنا شروع کر دیا۔ پھر یکلخت وہ ایک ہلکے سے دھماکے سے پھٹ گیا۔ جس کے بعد اس میں سے تیزاب نما کوئی چیز نکلی جس نے چاروں طرف زمین تک میں سوراخ سا کر دیا۔ وہ سب پلک جھپکائے بغیر اس کو دیکھ رہے تھے۔ جوزف اب بھی بے ہوش تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ چلنے والی موت صرف چند لمحوں کے فاصلے سے اس سے دور ہو گئی تھی۔ کریم دونوں گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کے جھکا ہوا گہری سانسیں لے رہا تھا۔
"اسے سخت سیکیورٹی میں رکھنا ہے اور لیوی کو بھی ---" اس نے اپنے ساتھ کھڑے لیفٹیننٹ شاکر سے کہا۔
"یس سر --- سیف ہاؤس میں منتقل کیا جا رہا ہے۔"
اس نے ایڑیاں بجائیں اور پھر وہ لوگ جوزف کو لے کر تیزی سے وہاں سے روانہ ہو گئے۔ اب ان کے پاس دو ثبوت ہو گئے تھے۔

☆☆☆

جوزف کو اب اس کام میں لطف آنے لگا تھا۔ بلیڈ کا وار لگتے ہی سامنے والا جیسے حیرت زدہ، سراسیمہ اور پھر درد و تکلیف کا شکار ہوتا تھا۔ اس سے اس کی حیوانی جبلت کو بہت تسکین حاصل ہوتی تھی۔ دل چاہتا تھا کہ ہر آنے جانے والے پر اپنے بلیڈ کا جادو چلائے مگر مسئلہ یہ تھا کہ وہ ان کی تکلیف سے لطف اندوز ہونے کے لیے وہاں رک نہیں پاتا تھا۔

اس نے اس کام کے لیے خصوصی بلیڈ بنوائے تھے جن کو ہاتھ میں باندھا جاتا۔ اس کا باہری بلیڈ چار انچ سے زیادہ لمبا تھا اور اتنا تیز تھا کہ گوشت کو مکھن کے مانند کاٹتا ہوا گزر جاتا تھا۔

وہ اس وقت کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا تھا جس کے ساتھ ایک بڑی اسکرین منسلک تھی اور سی سی ٹی وی کیمرا فوٹیج کی طرح الگ الگ ڈبے بنے ہوئے تھے جس میں شہر کے مختلف علاقے نظر آرہے تھے۔

پولیس ڈپارٹمنٹ ہر روز خنجر بدمعاشوں سے نمٹنے کے لیے شہر کے مختلف علاقوں میں ناکوں، چیکنگ اور پٹرولنگ کا جو خفیہ پلان بناتا تھا وہ "ڈالرز" کی مہربانی سے ہر روز اس کی اس اسکرین پر موجود ہوتا تھا اور وہ اسی کو دیکھتے ہوئے اپنے اور اپنی ٹیم کے لیے محفوظ پروگرام بناتا تھا۔ جگہوں کا انتخاب کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہر روز کی بڑھتی پٹرولنگ کے باوجود اب تک اس کی ٹیم کا کوئی ایک فرد بھی پکڑا نہیں گیا تھا۔

"جوزف تمہیں ٹیم کے معاملے میں محتاط رہنا ہوگا....." جیمز نے اسے پہلے دن یہ ہدایت دی تھی۔ "یہاں کے لوگ خاصے بے پروا ہیں۔"

"اگر ان میں کوئی بے پروائی کرے گا تو نقصان اسی کا ہوگا۔" اس نے مسکرا کر کہا تھا۔ "پکڑے جانے کی صورت میں یہ زیادہ سے زیادہ رقوم کی وصولی کا ذریعہ اور ایک فون نمبر بتا سکتے ہیں جس سے کوئی بھی مجھ تک نہیں پہنچ سکتا اور جس تک پہنچا جا سکتا ہے، وہ بھی میرے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتا کیونکہ اس سے میں ہمیشہ پبلک فون سے بات کرتا ہوں۔"

"گڈ پلاننگ۔" جیمز بولا۔

"ویسے یہ ہمیں مزید کتنے عرصے تک جاری رکھنا ہے....؟"

"بس یہ ختم اور" جیمز نے جواب دیا۔ "اس کے بعد اسے ختم کر دیا جائے گا۔"

"ٹھیک ہے، کیا اس کے بعد اگلے مرحلے [illegible] شروع ہوگا؟"

"بالکل۔" جیمز بولا۔ "مگر اس بارے میں ہم [illegible] میں بات کرتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے جیمز جیسا تم پسند کرو....." جوزف نے [illegible] دلی سے کہا اور کال بند کر کے اسکرین کی جانب متوجہ ہو [illegible]

☆☆☆

بم ڈسپوزل اسکواڈ کے ارکان تیزی سے [illegible] ہالوں میں پہنچ گئے تھے۔ کریم اس وقت بڑے ہال [illegible] تھا۔ جمیر کی باقیات کو وہاں سے اٹھایا جا چکا تھا اور فرش [illegible] مکمل صفائی بھی کر دی گئی تھی۔

ہال میں موجود افراد کے چہروں پر اب امید [illegible] چمک تھی۔ انہیں اپنے مرنے والے ساتھیوں کا غم بھی تھا [illegible] جو کچھ گزر گیا تھا اس نے ان کے اعصاب کو بھی توڑ دیا تھا [illegible] وہ اپنی کرسی پر اسی طرح بیٹھے اسکواڈ کے لوگوں کی جانب امید بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

کچھ ہی دیر بعد ان کا سربراہ کیپٹن شایان، کریم کے پاس آیا۔

"کیا ہوا کیپٹن؟ کچھ کامیابی حاصل ہوئی؟ یہ کس طرح کے بم ہیں؟" کریم نے اسے دیکھ کر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔

"سر..... یہ..... یہ بم نہیں ہیں۔" وہ بالآخر بولا۔

"کیا مطلب؟ تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ ان کی کرسیوں کے نیچے بم نہیں ہیں۔ یعنی انہیں صرف بلف کیا گیا ہے؟" اس نے بے یقینی سے پوچھا۔

"میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں سر..... جو چیز ان کی کرسیوں کے نیچے موجود ہے، وہ بم سے بھی زیادہ خطرناک اور جدید ہے۔" اس نے سنجیدگی سے بتایا۔

"کیا چیز ہے وہ؟"

"وہ الیکٹرولائسر قسم کا ایک آلہ ہے جس میں بہت زیادہ کرنٹ قید ہوتا ہے ایک بار ایکٹیو کیے جانے کے بعد انہیں ڈی ایکٹیویٹ کر پانا بہت مشکل اور خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔"

"اس سے ہوتا کیا ہے؟" کریم نے پوچھا۔

"نہیں اس سے یہ لگتا ہے کہ جیسے کوئی بہت زیادہ شدید کرنٹ لگنے سے مرا ہو رنگت سیاہ پڑ سکتی ہے۔"

کریم کو یاد آیا کہ اسے بتایا گیا تھا کہ سب سے پہلے جن دو افراد کو ہلاک کیا گیا تھا، ان میں سے ایک لاش بُری

طرح جلی ہوئی تھی۔

"تو اب اس کو بیکار کرنے کے لیے کیا کیا جانا چاہیے؟" کریم کی پیشانی پر چھوٹی سی رگ ابھر آئی تھی۔

"ہم پھر بھی کوشش کر رہے ہیں اگر الیکٹرانکس کے ماہر کو بلا لیا جائے تو اچھا ہوگا۔"

"میں ابھی بلا رہا ہوں۔" چند لمحوں میں کریم نے حشمت اللہ کو موجودہ صورت حال کے بارے میں رپورٹ کر کے ان سے ممکنہ وسائل کی بات کر لی۔ چھاؤنی میں موجود الیکٹرانک انجینئرز آفس آنے کے لیے فوراً الرٹ کر دیے گئے تھے۔

"تمہارا کیا خیال ہے کیپٹن کیا وہ اس معاملے کو حل کر سکیں گے؟" کریم نے پوچھا۔

"شاید..... جہاں تک میرے تجربے کی بات ہے، یہ الیکٹرولائسر ایکٹیو ہیں۔ ان کا تعلق یہاں کی ڈسٹری بیوشن سے نہیں ہے کہ اسے بند کر کے انہیں ختم کیا جا سکے۔ یہ خود اپنے اندر اپنا کرنٹ پیدا کرتے ہیں اور یہ ایک ہاتھی کو بھی ختم کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔" وہ مایوسی سے بولا۔ "ہو سکتا ہے کہ انجینئرز اس حوالے سے کوئی راستہ نکال پائیں۔"

"اور..... اگر نہ نکال پائیں تو.....؟ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اس صورت میں ہم کیا کر سکیں گے..... تمہارے خیال میں بچت کا کیا راستہ ہو سکتا ہے؟"

"کوئی یقینی راستہ نہیں بتا سکتا۔ وہ وہی طریقہ ہے کہ کرسی پر فوراً اتنا ہی وزن رکھ دیا جائے مگر یہ بھی دیرپا راستہ نہیں ہے۔" وہ بولا۔

"ہاں ایک بات ہو سکتی ہے ہمارے پاس جو ریموٹ ہیں وہ ان سے غالباً کوئی راستہ نکال پائیں۔"

انجینئرز کچھ ہی دیر میں وہاں پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے سب سے پہلے الیکٹرولائسر کا اچھی طرح معائنہ کیا اور پھر اس کے ریموٹ کی چھان بین شروع کی۔

"ایک راستہ ممکن ہے۔" کچھ دیر بعد ٹیم ہیڈ نے کریم کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"شکر ہے کہ کوئی راستہ ہے۔" اس نے تھوڑی سی بلند آواز میں کہا پھر اپنے نارمل لہجے میں پوچھا۔ "جلدی بتاؤ۔" وہ اردگرد ان کرسیوں پر بیٹھے افراد کی بے چینی اور خوف کو محسوس کر رہا تھا۔

"سر اس آلے میں بنیادی کام ان تین تاروں کا ہے ان میں سے یہ سرمئی تار کو کاٹ کر ہم اندر موجود کرنٹ سپلائی کے نظام کو توڑ سکتے ہیں۔" اس نے لیپ ٹاپ پر موجود امیج کو کریم کے سامنے کرتے ہوئے بتایا۔

"اس سے کوئی خطرہ تو نہیں ہوگا، میرا مطلب ہے کہ یہ بات یقینی ہے کہ یہی تار کرنٹ سپلائی کر رہی ہے؟"

"جی ہاں..... اس سسٹم کے مطابق یہی ہونا چاہیے مگر پھر بھی اس قسم کے آپریشن میں کم از کم پندرہ فیصد خطرہ تو ہوتا ہی ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"مگر یہاں خطرے کا مطلب ایک جان کا زیاں ہے۔" کریم نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "ہم ان خالی کرسیوں کا استعمال کر سکتے ہیں؟"

"جی..... میں دیکھتا ہوں....." وہ ان کرسیوں کی جانب بڑھتے ہوئے بولا۔ ان کرسیوں پر بیٹھنے والے اپنی جان سے گزر چکے تھے۔

"نہیں سر..... یہ آلہ شاید بیٹھنے کے بعد ہی کام شروع کرتا ہے۔ ہمیں کسی ایکٹیو الیکٹرولائسر کی تار کاٹنی پڑے گی۔"

"اگر وہ تار ٹھیک ہوتی ہے، تمہارا اندازہ بھی درست ہو اور کوئی غلطی بھی نہیں ہو تو پھر کیا کرنٹ بالکل ختم ہو جائے گا؟" کریم نے پوچھا۔

"تقریباً اگر کچھ باقی بھی رہا تو وہ بہت ہی کم طاقت کا مالک ہوگا جس سے کوئی نقصان نہیں ہوگا۔"

"ٹھیک ہے، ہمیں کچھ تو کرنا ہی ہوگا مگر ایک سوال ہے؟" کریم نے کہا پھر اس نے بہ آواز بلند پوچھا۔ "کیا آپ لوگ بتا سکتے ہیں کہ آپ کے ان ساتھیوں کو جو ان کرسیوں پر بیٹھے تھے، شہید کر دیا گیا تو پھر یہاں کچھ ہوا تھا کچھ دھماکا یا کرنٹ.....؟"

"نہیں ایسا تو نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے آرام سے انہیں اٹھا کر نیچے بچھا دیا تھا۔" احمد علی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"یہ تو سوچنے والی بات ہے، اصولاً تو ان کے اٹھتے ہی یہ سب ہونا چاہیے تھا اور پھر جو کوئی انہیں اٹھاتا اسے بھی کرنٹ لگنا چاہیے تھا؟"

"جی..... جی....." احمد علی نے کریم کی بات دہرائی "اس کا مطلب ہے کہ کرنٹ نہیں ہے۔ یہ سب، سب کچھ بکواس ہے۔ ہم خواہ مخواہ ڈر رہے ہیں۔ یہاں کرنٹ یا بم نہیں ہے۔" وہ یہ کہہ کر جذباتی ہو گئے۔

"نہیں، نہیں۔ آپ سب اپنی جگہ بیٹھے رہیں، ابھی کچھ کہا نہیں جا سکتا۔" کریم نے تیزی سے کہا۔

جذبات کے عالم میں وہ کھڑے ہی ہو گئے۔ ان کے کھڑے ہوتے ہی ان کے پیروں کو عجیب سا جھٹکا لگا اور پھر وہ کرسی پر ڈھے گئے۔ ان کا پورا جسم لرز رہا تھا۔
"اوہ... یہ کیا ہوا...؟" کریم لپک کر ان کے قریب پہنچا۔
اس سے پہلے ایک فوجی نے انہیں گھسیٹنا چاہا مگر وہ کرسی سے چپک چکے تھے۔ اس کا ایک ہاتھ اس کوشش میں کرنٹ کی لپیٹ میں آگیا جسے بمشکل بچایا گیا۔
"جلدی کرو، ان کی مدد کرو... لکڑیاں لاؤ وہاں سے۔" کریم چلّایا۔ اس نے آگے بڑھ کر انہیں بچانے کی کوشش کی مگر کیپٹن ارسلان اور دیگر نے اسے پکڑ لیا تھا۔ ان کے ارد گرد موجود لوگ باقاعدہ چیخ رہے تھے، چلّا چلّا کر رو رہے تھے۔ ان سب کی آنکھوں کے سامنے وہ بے جان سے ہو گئے، ان کا جسم اور چہرہ سب جھلس چکا تھا۔ کریم ساکت سا کھڑا انہیں دیکھ رہا تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کی آنکھوں کے سامنے اس طرح ایک انسان موت کے گھاٹ اتر گیا ہے۔

☆☆☆

غضنفر اس وقت لائی ڈیٹیکٹر (lie detector) کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اس مشین کے بارے میں خاصا کچھ جانتا تھا۔ اسے ایک بار کسی نے بتایا تھا کہ آپ مشین کے سامنے جو بات بتانا چاہتے ہیں خود بھی وہی سوچیں اور اسی کو حق سچ سمجھیں تو مشین آپ کا جھوٹ نہیں پکڑ سکے گی اور وہ یہی کرنے جا رہا تھا۔ اس کے سامنے میز کی دوسری جانب میجر عدنان، کیپٹن شفیق اور ڈاکٹر ثریا موجود تھے۔
"تم کیا کام کرتے ہو؟" ڈاکٹر ثریا کے ہلکے سے اشارے پر کیپٹن شفیق نے پوچھا۔
"کام... پتا نہیں... کچھ کرتا تو ہوں مگر یاد نہیں آ رہا۔" غضنفر نے الجھے ہوئے انداز میں کہا۔
"تم ہاشی کو جانتے ہو؟" میجر عدنان نے اچانک پوچھا۔
"کک کون ہاشی...؟" غضنفر نے جواب میں سوال کیا۔
"تم نے سامعہ کو اغوا کیا تھا؟"
"میں نہیں جانتا..." غضنفر نے کہا۔
"کتنے لوگوں کو مار چکے ہو اب تک...؟" کیپٹن شفیق نے پوچھا۔
"میں نے کس کو مارا، میں کیوں ماروں گا؟"
"جب تمہیں کچھ یاد نہیں تو کیسے کہہ سکتے ہو کہ یہ..." کیپٹن شفیق بولا۔
"مجھے لگتا نہیں کہ میں نے ایسا کیا ہو۔"
"مگر ہمیں تو لگتا ہے، تم تو بھول گئے ہو مگر تم ایک بم دھماکے کے سلسلے میں لائے گئے ہو جس نے ایک مارکیٹ میں 90 لوگوں کی جان لی اور درجنوں زخمی ہوئے اور سب کچھ بھول گئے۔" میجر عدنان نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "ویسے یہ سب آن ریکارڈ ہے۔ سارے ثبوت، گواہ سب موجود ہیں۔ تمہاری یادداشت کھونے سے معاملے میں کوئی خاص فرق پڑنے کا نہیں۔"
"میں نے یہ سب نہیں کیا... یہ سب جھوٹ ہے۔" غضنفر ایک لمحے کے لیے بالکل گھبرا گیا تھا۔ یہ خفیہ والے اس کے خلاف ایسی چال چلیں گے یہ تو وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ ایسے تو وہ اسے لٹکانے کا پورا انتظام کر چکے ہیں۔ نجانے کس کا گناہ وہ اس کے سر منڈھ رہے تھے۔ حقیقت میں وہ اچھے خاصے خون کر چکا تھا مگر بم دھماکے میں ہونے والے خون تو اس نے کیے ہی نہیں تھے۔ اگر وہ کرتا بھی تو ایسا کام کمرے میں بیٹھ کر حکم دینا ہی ہو سکتا تھا۔ سوچیں اس کے ذہن کو گھیرے ہوئے تھیں۔
"اس دھندے میں کب سے ہو تم غضنفر؟" کیپٹن شفیق کی آواز نے اسے چونکا دیا۔
"کس... کس دھندے میں؟" وہ بولا۔
"اسی بم دھماکوں کے کام میں؟ بم بنا لیتے ہو؟"
"نہیں، نہیں... میں نے کبھی بم نہیں بنایا، نہ بنانا آتا ہے۔"
"تو پھر کیا کام کرتے تھے تم...؟" کیپٹن شفیق نے کہا۔ "اگر تم کہتے ہو تم نے یہ سب نہیں کیا تو پھر جو تم نے کیا ہے اس پر بات کر لو... اگر تم نے یہ نہ کیا تو ظاہر ہے کہ ہمیں سچ نکلوانا تو ہم کریں گے نا۔"
غضنفر اس بات پر بالکل چپ رہا۔
"غضنفر!" ڈاکٹر ثریا کے اچانک پکارنے پر وہ چونکا، اس کی جانب دیکھا اور پھر سر نیچے کر لیا۔
"تو تمہارا نام غضنفر ہے نا..." وہ مسکرائی۔
"مجھے نہیں پتا... میرے سر میں شدید درد ہو رہا ہے... بہت شدید... مجھے چکر آ رہے ہیں۔ میرا سر گھوم رہا ہے۔ مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا۔" وہ بولا اور جھومتا ہوا زمین پر آ رہا۔
"اسے کمرے میں پہنچا دو۔" کیپٹن شفیق نے پیچھے کھڑے سپاہی سے کہا اور پھر ڈاکٹر ثریا کی جانب دیکھا۔

"آپ کیا کہتی ہیں؟" میجر نے ڈاکٹر سے پوچھا۔
"اسے سب یاد ہے میجر... شروع میں تو مجھے بھی یقین ہو گیا تھا کہ وہ سچ بول رہا مگر بم دھماکے کے بعد سے اس کے دماغ کی ریڈنگ بالکل ہی تبدیل ہو گئی۔ وہ جانتا ہے کہ وہ اس نے نہیں کیا اور اسے سب یاد ہے۔ میں کافی حد تک یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ اداکاری کر رہا ہے۔" وہ بولی۔
"ہوں تو پھر ہم بھی اس سے اداکاری ہی کرائیں گے۔" میجر عدنان مسکرایا۔ "وہ خود سب کچھ قبول کرے گا۔"
"جی... جی..." ڈاکٹر ثریا غضنفر کے ریکارڈز کی کاپی نکالتے ہوئے بولی۔ "یہ دیکھیں اس ایک سوال کے بعد اس کے پولی گراف میں اس کا بلڈ پریشر، ہارٹ ریٹ، سانسوں کی رفتار سب میں فرق آیا ہے۔ حتیٰ کہ الیکٹرو ڈرمل ایکٹیویٹی بھی بڑھ گئی ہے۔"
"شکریہ ڈاکٹر صاحبہ..." میجر عدنان نے جواباً کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔
اس کا شک سچ ثابت ہوا تھا، غضنفر مکر کر رہا تھا اور اسے اب یہ جھوٹ مہنگا پڑنے والا تھا۔

☆☆☆

سونیا کمرے میں اکیلی تھی۔
رات گہری ہو چلی تھی۔ وہ خاموشی سے بستر پر دراز ارد گرد کا جائزہ لے رہی تھی۔ کمرے کو خوب صورتی سے سجایا گیا تھا۔ فرنیچر بھی اچھا تھا اور ضرورت کی ہر چیز یہاں میسر تھی۔ "یہ لوگ اچھے ہیں۔" اس نے سوچا۔ "وہ لڑکی، وہ ڈاکٹر اور وہ بوڑھا آدمی... اب تک یہاں وہ ان تینوں سے ہی ملی تھی اور تینوں نے اس سے محبت اور خلوص کا رویہ رکھا تھا۔"
مگر وہ بہت زیادہ الجھی ہوئی تھی۔ اس کے ذہن کی اسکرین پر سوالات بری طرح رقصاں تھے۔
آخر وہ تھی کون؟
اس کا نام کیا تھا؟
کہاں سے آئی ہے وہ؟
وہ کیا کرتی تھی؟ اس حادثے سے قبل اس کا کوئی خاندان تھا بھی کہ نہیں؟ اگر تھا تو وہ اب تک اس تک کیوں نہیں پہنچے۔ پھر یہ سوچ بھی اس کے لیے سوالیہ نشان ہی تھی کہ یہ لوگ اجنبی ہونے کے باوجود اس کا اتنا خیال کیوں رکھ رہے ہیں۔ اس کے ذہن میں یہ بات بھی موجود تھی کہ اس بوڑھے شخص نے اسے دیکھ کر "مریم" کا نام لیا تھا۔ یہ مریم کون تھی؟ وہ یہ سب کچھ جاننا چاہتی تھی مگر اس کے ذہن میں ہر سوال کے جواب میں صرف سکوت اور اندھیرا تھا۔
اس نے دونوں ہاتھوں میں اپنا سر تھام لیا۔
"کیوں یاد نہیں آ رہا مجھے کچھ بھی... کیوں...؟" وہ قدرے زور سے بڑبڑائی۔ "کون ہوں میں... آخر ہوں کون میں...؟" وہ بے اختیار یہ سوال دہرائے جا رہی تھی۔
"کیا ہوا بی بی...؟" صائمہ شاید دودھ دینے آئی تھی، اس کی حالت دیکھ کر وہ دروازے پر ہی ٹھٹک گئی۔
"کچھ نہیں۔" وہ غصے سے چلّائی۔ "تم جانتی ہو میں کون ہوں؟ نہیں جانتی نا...؟"
"نہیں، آپ..."
"تو پھر دفع ہو جاؤ یہاں سے..." وہ اس کی بات کاٹ کر چیخی۔
"کیا... کیا ہوا ہے...؟" شور کی آواز مجھے بھی کمرے سے باہر لے آئی۔
"یہ سونیا بی بی کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔" صائمہ نے گڑبڑا کر مجھے بتایا، وہ اس کے کمرے سے ہی باہر نکلی تھی۔
"کیا ہو گیا سونیا کو...؟ ابھی تو میں سب ٹھیک چھوڑ کر گئی تھی۔" میں اس کے کمرے کی جانب بڑھی۔ "علی گھر پر ہے؟" میں نے رک کر صائمہ سے پوچھا۔
"جی باجی..."
"علی صاحب کو بھیج دو... بتا بھی دینا۔"
"ٹھیک ہے۔" وہ میری بات سن کر تیر کی طرح علی کے کمرے کی طرف گئی۔
"سونیا... کیا ہوا ہے؟" میں نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ وہ بہت پریشان لگ رہی تھی۔
"سونیا... کیا یہ میرا نام ہے؟" اس نے پوچھا۔
"ہاں، تب ہی تو ہم سونیا کہہ رہے ہیں تمہیں۔" میں نے اس کا بازو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔
"یہ نام تو مجھے آپ لوگوں نے دیا ہے... میں ہوں کون؟ کہاں سے آئی ہوں؟ مجھے کیوں کچھ یاد نہیں آ رہا؟"
"آ جائے گا... کچھ وقت دو اپنے آپ کو..." میں نے سمجھاتے ہوئے کہا۔
"کیا ہو گیا بھائی... تم عورتوں نے ہلا کر رکھا ہے کہ مجھ جیسے اسمارٹ، ذہین اور قابل ڈاکٹر علی احمد کو سونے نہیں دو گے۔" علی نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے

پوچھا۔
"علی، سونیا کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔" میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔
"کیا ہوا سونیا...؟" علی نے آگے بڑھتے ہوئے پوچھا۔ "اور اب آپ مجھے بیٹھنے کی جگہ عطا کریں گی — ڈاکٹر کو مریض کے بالکل سامنے بیٹھنا چاہیے۔" میرے پیچھے بٹے پردہ سونیا کے سامنے بیٹھ گیا۔
"کیوں اُلجھ رہی ہو؟ کیوں خود کو پریشان کر رہی ہو؟" اس بار اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔
"مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا؟ میں کوشش کر رہی ہوں تب بھی نہیں۔" وہ بے بسی سے بولی۔ اس کی خوب صورت آنکھوں میں آنسو تھے۔
"تو...؟ اگر یاد نہیں آ رہا تو اتنا پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟"
"یہ بات —"
"نہیں ہے کیونکہ ہمیں میڈیکلی معلوم ہے کہ اس کی وجہ چوٹ ہے اور یہ عارضی ہے تمہاری یادداشت کبھی بھی واپس آسکتی ہے تو خود کو صحت مند رکھو اور انتظار کرو —"
"مگر مجھے معلوم ہی نہیں کہ کون ہیں؟ یہ سب آسان نہیں ہے۔" وہ تھکی ہوئی آواز میں بولی۔
"بالکل نہیں ہے اگر تم اسی طرح سوچتی رہیں تو — یوں بھی تمہیں ایک نام مل گیا ہے سونیا، بابا نے تمہیں اپنی بیٹی بنا لیا۔ تمہارے پاس ایک گھر بھی ہے جہاں سارا موجود ہے تمہاری بے بی سٹنگ کے لیے — اور پھر میں بھی ہوں — یاد ہے میں نے کیا کہا تھا —؟"
"کیا؟"
"اسمارٹ، ذہین اور قابل ڈاکٹر علی —"
"اوہ —" وہ مسکرائی۔
"صرف اوہ — یعنی تمہیں اس بیان پر یقین نہیں ہے۔" علی نے غم زدہ لہجے میں پوچھا۔
"یقین ہے۔" وہ بولی۔ "مگر میرا ذہن میرے قابو میں نہیں ہے۔ اتنی سخت اُلجھن ہوتی ہے کہ میں اسے الفاظ میں بیان نہیں کر سکتی۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔
"میں سمجھتا ہوں اور اس کے لیے میں کچھ لایا ہوں۔"
"کیا؟" سونیا اور میں نے ایک ساتھ پوچھا۔
"دو منٹ رکیے لیڈیز اور تم تیسری لیڈیز —" اس نے دروازے پہ دودھ کا گلاس تھامے کھڑی صائرہ کو بلایا۔
"جی علی صاحب —" اس نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔
"یہاں تشریف لا کر دودھ کا یہ گلاس ان میڈم کی خدمت میں پیش کریں گی آپ؟" اس نے پوچھا۔
"جی... جی..." وہ گلاس لے کر سونیا کی جانب بڑھی جسے علی نے اس کے ہاتھ سے لے لیا۔
"بہت شکریہ آپ کا — مجھے دے دیجیے۔" اس نے ہاتھ میں موجود گولیاں سونیا کی جانب بڑھائیں۔ "یہ لو... یہ دوا لے لو اور یہ دودھ پی لو پھر دیکھتے ہیں کہ کیا کرنا ہے۔"
"سونیا کو دوا دینے کے بعد وہ چند باتیں کر کے کمرے سے باہر نکل گیا۔
"کیا دیا ہے اسے — نیند کی گولیاں۔" میں نے کمرے سے باہر نکل کر پوچھا۔
"ہاں — سکون آور ہے، اس کی اسے ضرورت ہے۔"
"ٹھیک ہے — میں صائرہ کو اس کے کمرے میں سونے کو کہہ دیتی ہوں۔" میں نے کہا۔
"ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔" علی نے سر ہلایا۔ "تم بھی سو جاؤ اب —"
"پتا نہیں کریم کیا کر رہا ہوگا، وہاں کیا ہو رہا ہوگا۔" میں نے آہستگی سے کہا۔
"کریم انشاء اللہ کامیاب واپس آئے گا۔" علی نے پُر یقین انداز میں کہا۔ "مشن کے دوران رابطہ ناممکن ہے۔ ضروری ہوا تو وہ خود کرے گا۔"
"اور جو یہ خبریں پھیل رہی ہیں؟" میں نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ "یہ تو عجیب سی تاثر دے رہی ہیں۔"
"ہم تو یہ کہہ سکتے ہیں تاکہ یہ سب ہو ہی اسی مقصد سے رہا ہے۔ بلی کھل کر تھیلے سے باہر آ گئی ہے لیکن ان کے ناپاک عزائم بھی پورے نہیں ہونے والے..." علی بھی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "ملکی میڈیا تو اس بارے میں بالکل خاموش ہے، انٹرنیشنل بھی روکا جا رہا ہے مگر آج کے دور میں خبر کا رکنا ناممکن ہے۔"
"مجھے لگ رہا ہے کہ آج یہ معاملہ حل ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔
"ہاں ہونا بھی چاہیے۔ کوئی ہم پر دھوکے سے حملہ کر سکتا ہے مگر ہمیں اس سے نمٹنا آتا ہے۔" علی کے لہجے میں غصہ اور یقین سب کچھ تھا۔
"کریم خیریت سے آ جائے گا نا؟" میری تشویش بالآخر لبوں پہ آ گئی۔

"بالکل آ جائے گا۔ یقین رکھو اس بات کا وہ لیفٹیننٹ کرنل کریم، کمانڈوز ٹرینر اور سب کریم ہے... کے ساتھ انڈر کور یعنی خفیہ ترین وہ خیر سے بھی آئے گا اور فاتح بن کر بھی۔ بھائی ہے وہ میرا۔" علی فخر سے کہہ رہا تھا۔ اس کا یقین میرے دل کا اطمینان بن کر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ لے آیا تھا۔

☆☆☆

حشمت اللہ تک تمام خبریں پہنچ رہی تھیں۔ حالات کے قابو میں آنے کے بعد بھی وہ ابھی تک اپنے یرغمال لوگوں کو آزادی نہیں دلا پا رہے تھے۔ اس چیز نے انہیں مضطرب اور پریشان کر رکھا تھا۔ وہ اندرونی مسائل میں اس طرح اُلجھے ہوئے تھے کہ ابھی تک انہیں عالمی میڈیا میں چلنے والی خبروں اور اپنے آڈیو کے چلنے تک کی خبر نہیں تھی۔
فون بجا تو انہوں نے اسکرین پر نظر ڈالی۔ کال ہائی کمان کی طرف سے تھی۔
"یہ سب کیا ہو رہا ہے حشمت؟" دوسری جانب سے سخت آواز اُبھری۔
"کیا سر...؟ آپ کس بارے میں پوچھ رہے ہیں؟" حشمت اللہ نے سوال کیا۔ "چھاؤنی اور اس کے تمام تر حالات تو آپ کے علم میں ہیں۔ میں باقاعدہ رپورٹنگ کرتا رہا ہوں۔ ہمارے لوگوں نے اس سازش کا سر کچل دیا ہے۔ تمام دہشت گرد یا تو مارے جا چکے ہیں یا گرفتار ہیں..."
"میں اس معاملے کی بات نہیں کر رہا حشمت! ہم نے وقت لینے کے لیے جو اسٹریٹجی بنائی تھی، وہ باہر کیسے آ گئی؟ وہ بھی تمہاری آواز میں؟" انہوں نے سرد لہجے میں پوچھا۔
"میری آواز میں —؟"
"ہاں تمہاری آواز میں، جس میں تم دہشت گردوں کو فون پر یقین دلا رہے ہو کہ ہم انہیں ایٹمی ہتھیاروں تک رسائی دینے کے لیے تیار ہو گئے ہیں۔" وہ غرائے۔
"مگر میں نے تو..." وہ کہتے کہتے چپ ہو گئے۔ یہ حرکت یقیناً ان کے کمرے میں الماری میں بند اسی دہشت گرد کی تھی۔ وہ صرف جاسوسی نہیں کر رہا تھا بلکہ ان کی خبریں کہیں اور بھی پہنچا رہا تھا۔ انہوں نے افسوس سے سر ہلایا اور مختصر لفظوں میں اس کی تفصیل بتائی۔
"اوہ... حشمت ایک دہشت گرد تمہارے کمرے کی الماری میں گھسا رہا اور تم لوگوں کو خبر نہیں ہوئی؟" انہوں نے سب کچھ سننے کے بعد دریافت کیا۔
"سر وہ الماری استعمال میں نہیں تھی اور یہاں اتنا کچھ ہو رہا تھا کہ اس جانب توجہ نہیں جا سکی۔ مگر یہ بڑا نقصان ہو گیا ہے۔ میں شرمندہ ہوں سر میں اس کا ذمے دار ہوں۔"
"ہماری جانب سے اس آڈیو کی تردید جاری کی جا رہی ہے۔ تم نے ایسا کوئی معاملہ نہیں کیا ہے باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔ صورتِ حال کیا ہے؟" اس بار لہجہ تھوڑا نرم تھا۔
"سر حالات پر تقریباً قابو پا لیا گیا ہے۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔
"تقریباً کیا ہوتا ہے حشمت؟ کیا اس سے میں یہ سمجھوں کہ کسی ایک جگہ اُن میں سے کچھ لوگ موجود ہیں؟"
"نہیں سر، حملہ آور تو مارے اور پکڑے جا چکے ہیں لیکن ہمارے آفس ونگ میں جہاں انہوں نے ورکرز کو یرغمال بنایا تھا، کچھ گڑبڑ موجود ہے۔ ان کی نشستوں کے نیچے بم تھے جو بعد میں الیکٹرو وائرڈ ثابت ہوئے ہیں اب ان کی بیں بجھ کر انہیں بیکار کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔"
"ٹھیک ہے، کیا تم نے متعلقہ ماہرین کو طلب کر لیا ہے؟"
"یس سر، ہمارے انجینئرز کی ٹیم، بم ڈسپوزل اسکواڈ اور دیگر ماہرین وہاں موجود ہیں اور اس کا حل نکالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"
"اس مسئلے کو آج رات حل ہو جانا چاہیے تاکہ ہم کل اس معاملے پر بین الاقوامی سطح پر بات کر سکیں۔"
"میں سمجھتا ہوں سر... یہ صرف چھاؤنی پر حملہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک بڑی سازش ہے جس میں ہمیں فٹ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔" حشمت اللہ نے سنجیدگی سے کہا۔
"اور جس مہارت سے یہ سب کیا گیا ہے، وہ کوئی نئی جماعت نہیں کر سکتی۔ اس کے پیچھے ماہر خفیہ ایجنسیوں کا ہاتھ ہے۔"
"بالکل یہی بات ہے۔ کچھ کرمہ قبل ہمیں اس سازش کا کچھ تانا بانا ملا تھا تب ہی ہم تیزی سے اس معمے کو حل کرنے میں کامیاب ہو رہے ہیں۔ خیر اس پر پھر بات ہو گی... فی الحال کے لیے یہ ہے کہ یوں تو میڈیا اس طرف نہیں آئے گا۔ ہم نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ یہ ملکی مفاد اور سلامتی کا مسئلہ ہے اور اس میں کسی قسم کی غلطی قابلِ قبول یا قابلِ برداشت نہیں ہوگی۔ اگر کسی وجہ سے ایسا ہو تو تم کو

اسے سنبھالنا ہوگا۔"

"آپ فکر نہ کریں سر! میں خود بھی اس کا خیال رکھوں گا اور حفاظت کے لیے بھی اچھی طرح ہدایت جاری کر دیتا ہوں۔ کل صبح جب سے ہمیں اس سب کا سامنا ہے یہاں سے کسی کو بھی باہر یا گھر جانے کی اجازت نہیں دی گئی ہے نہ ہی کسی اسٹاف کو بلایا گیا ہے تاکہ خبریں گردش میں نہ آ سکیں۔"

"ٹھیک ہے امید ہے آج رات جینیو مسئلے کا بھی ڈراپ سین ہو جائے گا۔ البتہ اس سے جو گرد اڑی ہے، اسے صاف کرنے میں کافی وقت لگے گا۔" انہوں نے یہ کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

☆☆☆

وہ ایک جدید انداز میں بنا ہوا کانفرنس ہال تھا جس کے درمیان اوول شیپ (بیضوی انداز) کی بڑی سی کانفرنس ٹیبل موجود تھی۔ اس کے اردگرد بارہ نہایت قیمتی اور آرام دہ کرسیاں موجود تھیں جو اس وقت تمام کی تمام بھری ہوئی تھیں۔

عام کانفرنس روم کی مانند یہاں اسکرین وغیرہ موجود نہیں تھی بلکہ اس کی جگہ میز کے عین درمیان میں ایک چھوٹا سا آلہ لگا ہوا تھا جس کی مدد سے وہیں تھا میں بغیر کسی اسکرین کے پریزینٹیشن دیکھی جا سکتی تھی۔ اس وقت وہاں ایک نقشہ نظر آ رہا تھا، جس پر سرخ حروف سے ایشیا لکھا ہوا تھا۔

"ہمارے سامنے اس وقت جو مسئلہ ہے، وہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ اس سے امن کے لیے بلکہ ساری دنیا کے امن و امان کو شدید خطرات کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ یہ تیسری عالمی جنگ کی ابتدا بھی ہو سکتی ہے جس میں لاکھوں بے گناہ جانیں جا سکتی ہیں۔" ایک گنجے سر والا شخص نہایت جوش و خروش سے تقریر کر رہا تھا۔

"شمعون آپ درست کہہ رہے ہیں لیکن کسی فیصلے پر پہنچنے سے قبل ہمیں ہر رخ کا تجزیہ کرنا اور پھر ان کی وضاحت بھی لینی چاہیے۔" اس کے سامنے والی کرسی پر براجمان سنجیدہ سی شکل والی خاتون نے کہا۔

"مادام جی --- آپ درست کہہ رہی ہیں عام حالات میں ایسا ہی ہونا چاہیے مگر یہ حالت جنگ ہے، اس میں دلائل اور وضاحتیں نہیں صرف جنگ ہوتی ہے۔" شمعون نے اصرار کیا۔

"میرے خیال میں اسے حالت جنگ کہنا تھوڑا زیادہ ہے۔" درمیانی قد و قامت والے ادھیڑ عمر انگریز نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"آپ یہ کہہ سکتے ہیں کیونکہ آپ فی الحال ان کے براہ راست نشانے پر نہیں ہیں۔ ان کا پہلا شکار اسرائیل ہی ہوگا، یہ ہمیں یقین ہے اور اسی لیے ہم اس بات پر اتنا زور دے رہے ہیں۔ مسلمان چاہے ایران کے ہوں یا کہیں اور کے ان کی سب سے زیادہ دشمنی ہم سے ہی ہے جبکہ ہم تو صرف اپنے ملک کی حفاظت کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔" وہ معصومیت سے بولا۔

"بہرحال میں اس بات کے حق میں ہوں کہ ہمیں وضاحت کا موقع دینا چاہیے۔" دوسری خاتون نے کہا۔

"دیکھیے --- ہم نے یہ خفیہ اجلاس یہاں پریزیڈنٹ ہاؤس میں رات کے دو بجے اسی لیے طلب کیا ہے کہ ہمیں اس مسئلے کی سنگینی کا اندازہ ہے۔ اگر ایسا ہو گیا جیسا کہ ہمیں شک ہے تو واقعی دنیا بڑے خطرے میں پڑ جائے گی۔ امریکا اور اس کے اتحادی یقیناً ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ کل اس حوالے سے باقاعدہ گفتگو بھی کی جائے گی اور ان سے اس سارے معاملے کی وضاحت بھی مانگی جائے گی۔ اگرچہ ہمارے پاس ساری معلومات ہیں مگر پھر بھی ہمیں ایک بار اس عمل سے گزرنا ہوگا --- کل اقوام متحدہ کے اجلاس میں بھی اس معاملے کو اوپن میٹنگ میں پیش کیا جائے گا۔" سربراہی کرسی پر براجمان امریکی وزیر دفاع نے کہا۔

"سر، فوری حملہ یا جنگ ضروری بھی نہیں ہے ہمیں صرف ان کے ایٹمی پروگرام کو ختم کر دینا چاہیے تاکہ ان کے دہشت گردوں کے ہاتھ لگنے کا خطرہ ہی نہیں رہے۔" ایک اور رکن نے دھیمی آواز میں کہا۔

"بالکل یہی --- یہی بات ہم بھی کہہ رہے ہیں۔" شمعون نے اس کی تائید میں کہا۔

"سچ یہ ہے کہ ہم سب ہی یہ چاہتے ہیں کہ کسی بھی اسلامی ملک کے پاس ایٹمی طاقت نہیں ہونی چاہیے ورنہ کیپٹل کے پاس ہونی چاہیے۔" امریکی وزیر نے کہا۔ "مگر اس کے لیے مناسب اور بہتر طریق کار کا انتخاب کرنا ہوگا۔ اس وقت دنیا بہت سے مسائل کا شکار ہے اور ایسے میں اس معاملے کو سنجیدگی اور دانشمندی سے کام لے کر حل کرنا ہوگا۔ یہ طے ہے کہ ہم سب ایک پیج پر ہیں اور ہم میں سے کسی کو بھی پہنچنے والا کسی بھی قسم کا نقصان ہم سب کا نقصان تصور ہوگا۔ اس نئی جماعت پر بھی بات کی جائے گی اور باقی تمام چیزوں کو بھی دیکھا جائے گا۔"

"ٹھیک ہے۔" فرانسیسی خاتون نے سر ہلایا۔ "ہم

سب اس پر متفق تھے۔"

"یہ دشواری دراصل ایک موقع ہے اور ہمیں اس موقع کو ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہیے۔"

"ویل سیڈ مائی ڈیئر گریٹ ---" امریکی وزیر مسکرائے۔ "آپ جانتی ہیں کہ ہم مواقع ضائع نہیں کرتے بلکہ اگر ضرورت ہو اور موقع نہ ملے تو مواقع بنا لیتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ کھڑا ہو گیا، یہ اجلاس ختم ہونے کا اعلان تھا۔

☆☆☆

ابراہام اپنے شاندار بیڈروم میں اکیلا بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اپنی سونے اور ہیروں سے مرصع گھڑی میں موجود جدید ترین ٹرانسمیٹر پر ڈیوڈ اور جیمز سے گفتگو کر رہا تھا۔ جوں جوں وہ ڈیوڈ کی رپورٹ سن رہا تھا، اس کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔

"کیا تم لوگ یہ بات سمجھ سکتے ہو کہ اس جگہ آ کر تمہارے بندوں کے ہاتھوں سے سب کچھ اس طرح نکل جانا سارے آپریشن کو متاثر کر سکتا ہے۔ وہ چوبیس گھنٹے بھی اپنا قبضہ برقرار نہیں رکھ سکے۔" وہ غرایا۔

"ہم مجبور رہے تھے سر اور اسی وجہ سے پریشانی ہے، دراصل ان کی کمانڈو ٹیم نے سارا منظر بدل دیا --- یوں بھی ان کے بارے میں یہ بات ہمیشہ کی جاتی ہے کہ ان کا کچھ پتا نہیں ہے، کب ہارتے ہارتے جیت جائیں اندازہ ہی نہیں ہوتا۔" جیمز روانی میں کہتا چلا گیا۔

"میں نے تم سے ان کی تعریفیں سننے کے لیے فون نہیں کیا ہے۔" ابراہام دہاڑا۔ "وہاں جو بندہ گرفتار ہوا ہے، اس کا کوئی بندوبست کیا ہے یا وہ بھی نہیں ہو سکا؟"

"جی سر، لیوی کے لیے دو لوگوں کی ڈیوٹی لگائی ہے وہ اندر ہی کام کرتے ہیں۔"

"کب تک کریں گے وہ یہ کام؟ اسے فوری طور پر ہونا چاہیے ورنہ جیمز یہ غلطی تمہارے حساب میں جائے گی --- ڈیوڈ سچ کہہ رہا ہے تمہیں اس کے کانوں سے ایئر پلگ نکالنے کا حکم دینا ہی نہیں چاہیے تھا۔" وہ سرد لہجے میں بولا۔

"سر --- سر وہ تو میں نے اس لیے ---" اس نے کچھ کہنا چاہا۔

"تاویلیں نہیں سننا چاہتا میں --- لیوی مجھے مردہ چاہیے فوراً باقی سب کی طرح اور کارروائیوں کو تیز کرو --- دنیا کو نظر آنا چاہیے کہ یہاں سب کچھ غیر محفوظ ہے اور اس کے لیے ان کے سب سے بڑے شہر میں کارروائی کرو ---

اظہار تاسف

ایک بوڑھی غیر شادی شدہ عورت نے اخبار پڑھتے ہوئے اپنی ہم عمر غیر شادی شدہ سہیلی کو بتایا۔ "کل لیزا کا تیسرا شوہر بھی انتقال کر گیا اور وصیت کے مطابق اس کی لاش کو نذر آتش کر دیا گیا۔"

بوڑھی سہیلی نے ایک طویل آہ بھر کر کہا۔ "کیسی عجیب دنیا ہے ہم میں سے کچھ ایسی ہیں کہ جنہیں ایک شوہر بھی نصیب نہیں ہوتا اور کچھ ایسی بھی ہیں جو شوہر پر شوہر نذر آتش کرتی جا رہی ہیں۔"

خواہش

ایک آدمی کی اپنے ایک پرانے دوست سے ملاقات ہوئی۔ اس کا دوست اب معمولی آدمی نہیں رہا تھا بلکہ وہ ایک دیوتا کا روپ دھار چکا تھا۔ آدمی نے اس سے اپنی مفلسی کا رونا رویا۔ دیوتا نے تحمل سے اس کی بپتا سنی۔ پھر سڑک کے کنارے پڑی ہوئی ایک اینٹ کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔ اینٹ فی الفور سونا بن گئی۔ دیوتا نے وہ سونا اپنے دوست کو دے دیا مگر دوست مطمئن نہیں ہوا۔ دیوتا نے اسے مطمئن کرنے کے لیے سونے کا ایک بڑا سا مکان بنا کر دے دیا لیکن اس کی اب بھی تسلی نہیں ہوئی۔ دیوتا نے سوال کیا۔

"دوست تم اور کیا چاہتے ہو؟"

"تمہاری انگلی۔" آدمی نے جواب دیا۔

(قیصر اعوان کا تعاون، سرگودھا)

ایک تو وہ معاشی حب ہے اس سے ان کا نقصان زیادہ ہوگا اور دوسرا --- مجھے اس شہر سے نفرت ہے --- فوراً --- مجھے فوراً اچھی رپورٹ چاہیے۔" اس نے اتنا کہہ کر رابطہ کاٹ دیا۔

"گدھے، کام چور، بے عقل ---" وہ بڑبڑایا۔ "صرف چوبیس گھنٹے میں ہار گئے۔" یہ صورت حال اس کے پلان کو کمزور کر رہی تھی۔ دنیا کے سامنے اس تاثر کو ختم کر رہی تھی جو وہ دینا چاہ رہا تھا۔ سوچتے سوچتے اس کا ذہن مریم کی جانب چلا گیا۔

"وہ کہاں جا سکتی تھی؟"

اس کی سوچ کے مطابق اس کے ساتھ دو ہی باتیں

حوقع تھیں یا تو وہ خود ہی کہیں چلی گئی تھی یا پھر وہ خفیہ والوں کے ہتھے چڑھ گئی تھی۔ دوسری صورت میں جو نقصان ہوسکتا تھا، ابراہام اپنے فوری فیصلے سے رک گیا تھا۔ اس نے اس پوری ٹیم کو گراؤنڈ کر دیا تھا۔ وہ دفتر اور سارے پلان روک دیے تھے یوں خفیہ ٹیم اس کے پلان کے باوجود کچھ بھی نہیں کرسکتی تھی۔ ویسے بھی وہ کوئی آسان شکار نہیں تھی۔ ابراہام اس کی صلاحیتوں سے بخوبی واقف تھا۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ وہ اپنے طور پر کسی مشن میں مصروف ہو اور پھر یکدم آکر اپنی کامیابی کا کریڈٹ لینا چاہتی ہو۔

اُسے دوسری بات زیادہ قرینِ قیاس لگ رہی تھی کیونکہ اگر وہ خفیہ کے ہاتھوں میں جاتی تو کچھ نہ کچھ تھوڑی بہت ہلچل ضرور محسوس ہوتی۔

اس وقت کسی مداخلت سے اس کا پلان بگڑ سکتا تھا اس لیے بہتر یہی تھا کہ خاموشی سے اس کی جانب سے رابطے کا انتظار کیا جائے۔ اس سے قبل بھی وہ ایک آپریشن میں یہ سب کرچکی تھی۔ اس نے اس وقت یہ سب دوسروں اور خود ابراہام کی مداخلت کو روکنے کے لیے کیا تھا۔ اس بار بھی اُسے یہ مسئلہ تھا ہی تو عین ممکن ہے کہ وہ اسی لیے تمام تر رابطوں کو منقطع کرکے غائب ہوئی تھی۔ اس نے سوچا۔

مریم کو اس نے پالا تھا، اس کی تربیت کی تھی مگر اسے اس سے محبت نہیں تھی۔ نہ جانے کیوں اسے دیکھ کر اسے ہمیشہ اس کے باپ اور اس کی وجہ سے پہنچنے والے نقصانات یاد آجاتے تھے۔ اسے مریم یاد آجاتی تھی جس کی موت کی وجہ وہی تھا۔ وہ اسے تڑپا تڑپا کر مارنا چاہتا تھا۔ اس سے سخت نفرت کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے بچپن سے ہی مریم کے ذہن میں اس کے باپ کے خلاف نفرت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وہ بھی مسلمانوں سے اسی کی طرح نفرت کرتی تھی۔

وہ اسے مسلمانوں کے خلاف استعمال کرکے اس کے باپ کی تکلیف میں اضافہ کرنا چاہتا تھا۔ اگر وہ کسی پلان پر کام کرنے کے لیے گم ہوئی تھی تو وہ اسے مکمل کرنے کا پورا موقع دینا چاہتا تھا۔ یہ وہ جانتا تھا کہ وہ اسی کی طرح ضدی تھی اور ہر قیمت پر اپنی ضد پوری کرنا جانتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ جلد ہی وہ اسے اپنی نئی اور بڑی کامیابی کی خبر دے گی۔ وہ ایسا کرکے اسے شرمندہ کرنا یا نیچا دکھانا چاہتی ہوگی مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ وہ اس کے کھیل کو ہی مکمل کر رہی تھی۔

☆☆☆

انجینئرز ٹیم اور بم ڈسپوزل اسکواڈ کافی دیر کی کاوش کے بعد سرخ تار والی تھیوری پر ہی متفق ہوگئے تھے۔

"خطرہ تو بہرحال ہے ہی مگر اسے مول لینا ہی پڑے گا، اس کے بغیر سب کی جان نہیں بچ پائے گی۔" انجینئر محمد بشیر نے سادگی سے کہا۔ "اب آپ یہ بتایئے کہ ہمیں کہاں سے شروع کرنا ہے۔"

"آپ میری کرسی سے شروع کیجیے۔" ان کی داہنی جانب سے آواز آئی۔ اس کرسی پر ایک نوجوان لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔

"آپ اس کا مطلب سمجھتی ہیں؟ .....؟" کیپٹن شاہد نے پوچھا۔

"جی بالکل ..... لیکن جو کچھ ہو رہا ہے، وہ اس سے الگ تو نہیں ہے نا ..... اگر کچھ نہ ہوسکا تب بھی موت ہمارے ساتھ تو ہے ہی ..... تو پھر اللہ پر بھروسا رکھ کر کوشش تو کرلی جائے۔" وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"بالکل یہی اسپرٹ درکار ہے۔ جیت کو نظر میں رکھیں گی تو ہار نہیں ہوگی ان شاء اللہ۔" کریم نے انجینئرز کو اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"آپ کا نام کیا ہے؟"

"سعدیہ ..... میں یہاں تین سال سے کام کررہی ہوں سر ..... آپ کو ایک بات بتاؤں میں ہمیشہ سوچتی تھی کہ ہم فوج میں ہیں مگر ہمیں کبھی دشمنوں سے لڑنے اور شہید ہونے کا موقع نہیں ملے گا۔ یہ دیکھیے آج جنگ لڑنے کا موقع مل گیا۔"

"آپ کو کچھ نہیں ہوگا، اس جنگ میں غازی ہیں آپ ....." اس نے مسکرا کر کہا۔

محمد بشیر نے فوراً ہی اپنے کام کا آغاز کردیا تھا۔ کئی لوگ وہیں موجود تھے اور اس لڑکی اور دیگر کا حوصلہ بڑھانے کی کوشش کررہے تھے۔

"کرنل صاحب ..... تار کٹ ہونے جارہی ہے۔" محمد بشیر نے چند لمحے بعد کہا۔

"بسم اللہ کریں، اللہ نے چاہا تو سب بخیر ہوگا۔"

کریم نے اس دوران ممکنہ احتیاطی تدابیر کرلی تھیں۔ لکڑی پر ربڑ چڑھا کر انہیں سعدیہ کے ہاتھوں میں پکڑا دیا گیا تھا۔ اس کے ہاتھوں پر ربڑ کے لمبے دستانے پہنائے گئے تھے۔ پیروں میں ربڑ کے جوتے تھے اور جسم پر بھی مختلف چیزیں باندھی گئی تھیں۔ اس سب کا مقصد خدانخواستہ شروع ہونے والے کرنٹ سے کم سے کم نقصان پہنچنے کی کوشش تھی۔

اس کے ساتھ ان کے پاس لکڑی کے ڈنڈے، ربڑ کے دیگر بچاؤ کا سامان بھی موجود تھا۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ....." محمد بشیر نے قدرے بلند آواز میں کہا۔ اس کے ساتھ ہال میں موجود تمام افراد نے بسم اللہ پڑھی۔ کچھ بہ آواز بلند آیات پڑھ رہے تھے۔

محمد بشیر کے سرخ تار کو الگ کردینے کے بعد انہوں نے چند لمحے انتظار کیا۔ سب کی نگاہیں سعدیہ پر جمی تھیں جو آنکھیں بند کرکے منہ ہی منہ میں آیات کا ورد کررہی تھی۔

"سعدیہ جی اللہ نے ہماری سن لی ہے۔" محمد بشیر نے کہا۔ "کیا آپ کچھ غلط محسوس کررہی ہیں؟"

"نہیں ..... بالکل نارمل ....." اس نے گہری سانس لے کر کہا۔

"سر ....." محمد بشیر نے کریم کی جانب دیکھا جو گہری نظروں سے سعدیہ کے تاثرات کا مشاہدہ کررہا تھا۔

"ٹھیک ہے تم کھڑی ہوجاؤ اب ....." کریم نے بالآخر کہا۔

اس کے ان الفاظ کے ساتھ ہی سعدیہ کرسی سے کھڑی ہوگئی ہال میں بالکل خاموشی طاری تھی۔ وہ ایک لمحے اپنی کرسی کے پاس کھڑی رہی اور پھر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی تھوڑا آگے آگئی تھی۔

"یا اللہ شکر ہے۔" کریم نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ "پلیز، آپ لوگ جلد سے جلد تمام افراد کو اس مصیبت سے آزاد کردیں اور سعدیہ تم باہر جاسکتی ہو۔ جس جس کا مسئلہ حل ہوتا جائے، وہ باہر نکلتا جائے یہاں بالکل کوئی نہیں رکے گا کیونکہ ہم نہیں جانتے کہ یہاں کوئی اور خطرہ ہے یا نہیں اور اس کا حل کیا ہے۔"

انجینئرز اور بم اسکواڈ کی ٹیم نے اپنا کام سنبھال لیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بڑے ہال اور پھر تینوں ہالز کے افراد وہاں سے نکل کر نیچے والے ہالز میں پہنچ گئے تھے جہاں ان کے لیے کھانے پینے کا انتظام موجود تھا۔

بم ڈسپوزل اسکواڈ نے ایک بار پھر تمام ہالز کا جائزہ لیا اور اس جگہ کو اب خطرے سے خالی قرار دیا تھا۔

کرسیوں کے نیچے لگے ہوئے تمام الیکٹرولائسنز نکال کر تحویل میں لے لیے گئے تھے۔

کریم بم اسکواڈ ٹیم کے ساتھ سب سے آخر میں ہال سے نکلا تھا۔

چھاؤنی اب مکمل طور پر دہشت گردوں اور اُن کی دہشت گردی کے آلات سے آزاد ہوچکی تھی۔

☆☆☆

ڈیوڈ ایک بار پھر تہ خانے میں موجود اپنے خاص کمرے میں تھا۔ ابراہام سے گفتگو کے بعد اسے کچھ دیر کے لیے اوپر جانا پڑا تھا۔ اب اس کے آخری مشن کی تکمیل کا وقت تھا۔ چھاؤنی میں بڑا دھماکا ابراہام کی سب سے بڑی خواہش تھی۔ ایک ایسے وقت میں جب ان کی حکومت اور مقتدر افراد سب کچھ انڈر کنٹرول ہے، کہنے کی کوشش کررہے ہوں گے۔ چھاؤنی سے اٹھتا دھواں ان کی باتوں کی حقیقت کو اُڑا کرلے جائے گا۔" وہ مسکرایا۔

یرغمالی افراد کی کرسیوں کے نیچے جیکو نے جو الیکٹرولائسنز سسٹم لگائے تھے۔ انہیں ریموٹ کے ذریعے کنٹرول کیا جاتا تھا جبکہ ڈیوڈ یہاں بیٹھ کر اپنے ٹرانسمیٹر سے منسلک ایک ڈیوائس کی مدد سے ان سب کو یہاں بیٹھ کر بھی اسی اذیت میں جلا کرسکتا تھا۔

وہ یہ پہلے ہی کرگزرتا مگر جوزف اور پھر ابراہام کو رپورٹ دینے اور ان کی رائے لینے میں اسے کچھ وقت لگ گیا۔ وہ سب جانتے تھے کہ یہ الیکٹرولائسنز ایک بار ایکٹیو ہوجاتے تو انہیں روکا نہیں جاسکتا تھا حتیٰ کہ ریموٹ کے ذریعے بھی انہیں بند کرنا ناممکن تھا۔ صرف ڈیوڈ یہاں موجود ڈیوائس سے اس کرنٹ کو روک سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جیکو سیمول اور جوزف نے وہاں جتنے لوگوں کا خون بہایا انہیں کرسی سے اٹھا کر نیچے پھینکنے سے قبل انہیں اس کی خبر ڈیوڈ کو دینا اور الیکٹرولائسنز کو بند کروانے کے لیے اطلاع دینا ضروری تھا۔

"خیر اب وہ تینوں تو ختم شد ہوچکے تھے۔" ڈیوڈ نے سوچا "کرسیوں پر آرام کرتے لوگوں کو بھی ان جیسے دارِ موت کے درشن کروا ہی دیتا ہوں۔"

ڈیوائس آن ہونے میں دو لمحے لگے تھے۔ کسی طے شدہ نمبر کو بند کرنے یا اُڑانے کے لیے اسے دبانا ضروری تھا مگر اب چونکہ اسے سب کو ہی اُڑانا تھا تو اس کے لیے "آل" کا آپشن منتخب کیا۔ ایک بٹن دبتے ہی تمام الیکٹرولائسنز اس کی رینج میں تھے اور دوسرا بٹن دبتے ہی موت کا کھیل شروع ہونے والا تھا۔ اسے افسوس تھا کہ وہ اس منظر کو دیکھ نہیں سکتا تھا البتہ ڈیوائس سے اسے کام ختم ہونے کی خبر بالکل مل سکتی تھی۔

اس نے بالآخر الیکٹرولائسنز کے بٹن کو دبا دیا۔

ڈیوائس میں لگی نیلی روشنی دو لمحوں تک نیلی ہی رہی تو اس نے چونک کر ڈیوائس کو دیکھا۔ پھر اس نے ایک ایک کر

کے تمام بٹن دبانا شروع کیے مگر ڈیوائس کے مطابق اب بھی کچھ نہیں ہوا تھا۔ اب کے غصے اور پریشانی میں اس نے تیزی سے سارے بٹن دوبارہ دبائے۔ پھر انہیں بار بار دباتا رہا مگر کہیں کچھ نہیں ہو رہا تھا۔ ڈیوائس کے مطابق سارے الیکٹرولائزر بیکار ہو چکے تھے۔

"یہ نہیں ہو سکتا؟ یہ ہوا کیا ہے؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ الیکٹرولائزر اس طرح جام ہو ہی نہیں سکتے……؟" وہ واقعتاً اپنے بال نوچ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ یہ ہو کیا گیا ہے؟ اور اس سے زیادہ اسے اس بات کی فکر تھی کہ وہ ابراہام کو کیا بتائے گا؟

وہ دیوانوں کی طرح بار بار ڈیوائس کو چلا چلا کر دیکھتا رہا پھر اسے واپس میز پر پٹخ کر کرسی پر گر گیا۔

معاملہ ان کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔

☆☆☆

حشمت اللہ نے چالیس گھنٹوں بعد سکون کی سانس لی تھی۔

وہ ڈراؤنا خواب ختم ہو چکا تھا۔ اس دوران بچھڑ جانے والے ان کے ہیرو تھے۔ انہیں شہادت نصیب ہوئی تھی۔ وہ فوج کے اصولوں کے مطابق تمغوں اور ان کے خاندان تا عمر سرپرستی کے حق دار تھے۔ اس وقت ان کے کمرے میں اعلیٰ افسران جمع تھے اور بچھڑ جانے والوں کی یاد میں دعاؤں کا سلسلہ جاری تھا۔ دعا مکمل ہوتے ہی فون کی گھنٹی بجی جیسے وہ اسی کا انتظار کر رہی ہو۔

"یس۔" حشمت اللہ نے ریسیور کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ "جی… جی سر۔" دوسری جانب سے آنے والی آواز ہائی کمان کے سربراہ کی تھی۔ ان کی آواز سنتے ہی حشمت الرٹ ہو گئے تھے۔

"چھاؤنی کی اب کیا صورت حال ہے؟"

"سر، اللہ کا شکر ہے سب کچھ سو فیصد کنٹرول میں ہے۔" انہوں نے جواب دیا۔

"اثر میں کی کیا صورت ہے، مجھے بتایا گیا ہے کہ وہاں بہت تباہی ہوئی ہے۔" انہوں نے پوچھا۔

"جی سر… یہ درست ہے ہمارے ہنگر میں پانچ جیٹ کا پارٹ تھے، وہ سب متاثر ہوئے ہیں مگر وہاں کی مکمل صفائی کرا دی گئی ہے۔ جہازوں کو بھی وہاں سے ہٹا لیا گیا ہے۔ کچھ کا بہانا بھی ہوا ہے۔"

"گڈ… یہی میں کہنا چاہ رہا تھا اس کام کو نہایت تیزی سے کر لو گے تک چار پانچ جیٹ کا پارٹ وہاں پہنچ جائیں گے۔ اثر میں کو بالکل نارمل ہونا چاہیے باقی پوری چھاؤنی میں سب کچھ معمول کے مطابق ہو اور یہ کام آج ہی مکمل ہونا چاہیے شام چھ بجے تک۔"

"ہو جائے گا سر… کیا آپ تشریف لا رہے ہیں سر؟" حشمت نے پوچھا۔

"ہاں، شام سات بجے یہاں ملکی اور غیر ملکی صحافیوں کو بلوایا جا رہا ہے انہیں چھاؤنی کا دورہ کرایا جائے گا اور پریس کانفرنس بھی کی جائے گی۔ تاکہ دنیا بھر میں پھیلی ہوئی افواہوں کا زور ختم کیا جا سکے۔ تمہیں بھی وہاں گفتگو کرنی ہو گی… تمہاری جو ویڈیو لیک ہوئی ہے، اس سلسلے میں بات کرنا ہو گی۔"

"سر مجھے کیا کہنا ہو گا؟ یہ کہ وہ میری ہے ہی نہیں جعلی ہے۔"

"نہیں تم یہ کہو گے کہ تم نے یہ بات فون پر دھمکی دینے والے کو احمق بنانے کے لیے کی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ وعدہ نہ تمہارے استحقاق میں آتا ہے اور نہ تم کر سکتے ہو اور سچ بھی یہی ہے، مگر انہیں تمہارے کمرے میں ہونے والی گڑبڑ کا علم نہیں ہونا چاہیے۔"

"جو حکم سر… ایسا ہی ہو گا۔ وہ کمرا مرمت کے لیے بند کر دیا گیا ہے اور میں ایک دوسرے کمرے میں شفٹ ہو گیا ہوں۔"

"بہتر ہے بس یہ یاد رکھنا کہ انہیں یوں لگے جیسے اس چھاؤنی پر کوئی حملہ ہوا ہی نہیں۔ معمولی سا کوئی واقعہ تھا جس کی داستان بنا دی گئی ہے۔"

"او کے سر…" حشمت اللہ نے مؤدبانہ انداز میں جواب دیا۔

"جو بندے گرفتار ہوئے ہیں وہ کہاں ہیں؟" انہوں نے پوچھا۔

"ان میں ایک زخمی ہے، وہ دونوں کرنل جواد اور کرنل کریم کی نگرانی میں ہیں۔ وہی اُن سے تفتیش کر رہے ہیں۔"

"او کے، میں بات کر لیتا ہوں… تم اپنا کام سنبھال لو۔" یہ کہہ کر لائن کاٹ دی گئی۔

حشمت فون رکھ کر افسران کی جانب مڑے جو غور سے ان کی گفتگو سن رہے تھے۔ چند لمحوں میں وہ سب کے سب اپنا، اپنا کام سنبھالنے باہر نکل گئے تھے۔ حشمت اللہ بھی چھاؤنی کے دورے کی خاطر ان کے ساتھ تھے۔ انہیں آج پوری دنیا کے سامنے اپنی

صلاحیتوں کا لوہا منوانا تھا۔

☆☆☆

چھاؤنی کے بڑے کانفرنس ہال میں پریس کانفرنس کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ڈیڑھ سو سے زائد افراد کی گنجائش کے ساتھ خاصی بڑی تعداد میں ٹی وی کیمروں کے لیے جگہ بنائی گئی تھی کیونکہ تمام بڑے غیر ملکی اور ملکی چینل پر اس پریس کانفرنس کو براہ راست نشر کرنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ چھاؤنی حملے اور اس حوالے سے جو کچھ عالمی میڈیا میں ہو چکا تھا اس نے اسے تمام دنیا کے منددبین کے لیے خصوصی اہمیت کا حامل بنا دیا تھا۔ جس کی وجہ سے ہال میں اس وقت تل دھرنے کو بھی جگہ موجود نہیں تھی۔ کانفرنس سے پہلے تمام افراد کو چھاؤنی کا دورہ کرایا جا چکا تھا۔ اس وقت اسٹیج پر فوجی ہائی کمان کے افراد کے ساتھ وزیر دفاع بھی موجود تھے۔ جو کہ مختصر الفاظ میں چھاؤنی حملے کی تفصیلات بیان کر چکے تھے۔ اب سوال وجواب کا سیشن شروع ہو چکا تھا جس کے لیے آدھا گھنٹہ مخصوص کیا گیا تھا۔

"آپ نے دیکھا اور آپ سمجھ سکتے ہیں کہ سب کچھ حکومت اور فوج کے مکمل کنٹرول میں ہے۔ کچھ لوگ یہاں اندر گھسنے میں کامیاب ضرور ہو گئے تھے مگر وہ ادارے یا ملک کو نقصان نہیں پہنچا سکے۔ اس صورت حال کو بالکل غلط سمجھا اور دکھایا گیا ہے جس کے خلاف ہم ہر جانے کا حق محفوظ رکھتے ہیں۔" وزیر صاحب نے ایک سوال کے جواب میں کہا۔

"کیا اس تنظیم کی جانب سے آپ سے دوبارہ رابطہ کیا گیا ہے؟ یہ کون لوگ ہیں اور آپ کے خیال میں ایٹمی ہتھیار تک رسائی کا مطالبہ الارمنگ نہیں تھا؟" ایک انگریز خاتون صحافی نے پوچھا۔

"اس بات کا جواب میں آپ کو دوں گا۔" فوجی ہائی کمان کے ایک اہم افسر نے کہا۔ "سب سے پہلے تو ہم یہ کلیئر کرنا چاہتے ہیں کہ اس نام کی کوئی تنظیم موجود نہیں ہے۔"

"مگر انہوں نے اس حملے کی ذمے داری قبول کی ہے۔" ایک اور غیر ملکی صحافی نے کہا۔

"یہ تو آج کے دور میں کوئی بھی، کہیں بھی بیٹھ کر ایک پریس ریلیز ایشو کر کے کسی بھی چیز کی ذمے داری لے سکتا ہے۔ 'جانباز' نام کی کوئی تنظیم موجود نہیں ہے۔"

"آپ یہ بات کس طرح کہہ سکتے ہیں؟" ایک مشہور صحافی نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "میرا مطلب ہے کہ آپ کے پاس اس کا کوئی ثبوت موجود ہے؟"

"میں یہ بات پوری تفتیش کے بعد اور پوری ذمے داری سے کہہ رہا ہوں کہ اس سارے معاملے کے پیچھے کسی اور کرم فرما کا ہاتھ ہے۔ کوئی دوسری مسلمان تنظیم اس میں ملوث نہیں ہے۔ اگر آپ سارے معاملے کو چھوڑ دیں اور صرف اس تنظیم کے بارے میں موجود تمام اہم اور مشہور مسلمان تنظیموں سے رابطے کریں تو آپ کو حقیقت کا علم خود ہو جائے گا۔ اس نام کی کوئی تنظیم کہیں موجود نہیں ہے۔ ناکام ہونے کے بعد ایک کہانی بنا کر اس کا اسٹیج کیا جانا ہی اس معاملے کی تمام حقیقت کو کھول دینے کے لیے کافی ہے۔" وہ بولے۔ "اور جی ہاں ہمارے پاس اس کا ثبوت بھی ہے۔ جو ابھی آپ کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ اس پورے معاملے کو اسی وجہ سے شروع کیا گیا تھا تاکہ دنیا کو ہماری کمزور تصویر پیش کی جائے مگر الحمدللہ ساری دنیا نے دیکھ لیا کہ ہم اپنے اثاثوں کی حفاظت کرنا جانتے ہیں۔ یہ بھی یاد رکھیں کہ یہاں گھسنے والے کسی ریگ ٹیگ آرمی (خستہ حال فوج) کے افراد نہیں تھے۔ ان کے پاس جدید ترین ہتھیار موجود تھے۔ وہ نہایت اعلیٰ طریقے سے تربیت یافتہ تھے اور مسلسل کسی سے رابطے میں تھے۔ وہ مسلمان تنظیم سے متعلق نہیں تھے نہ ہی ان کی زبان عربی یا اردو وغیرہ تھی حتیٰ کہ ان کا تعلق ساؤتھ ایشیا یا مڈل ایسٹ کے علاقوں سے تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ ہم ڈی این اے ٹیسٹ کے ذریعے فی الحال قومیتوں کی نشاندہی نہیں کر سکتے البتہ علاقوں کے بارے میں بتا سکتے ہیں جہاں سے فرد اور اس کے آباؤ اجداد کا تعلق رہا ہو۔ دہشت گردوں کے ڈی این اے سے متعلق ایک رپورٹ آپ سب کے ساتھ شیئر کی جائے گی جس سے آپ کو اس کا ثبوت بھی مل جائے گا۔"

"یعنی آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ وہ مسلمان انتہا پسند نہیں تھے؟" ایک اور صحافی نے گویا دوبارہ تصدیق چاہی۔

"سو فیصد… یہی بات میں کہہ رہا ہوں، اب جبکہ وہ مسلمان انتہا پسند نہیں تھے تو پھر ان کی ایٹمی ہتھیاروں تک رسائی والی بات کا مطلب کیا تھا اور وہ اس کا کیا کرتے، اس سوال کا جواب ہی اس ڈرامے سے پردہ اٹھانے کے لیے کافی ہے۔ وہ جو کوئی تھے ابھی آپ کو اس حوالے سے ایک فوٹیج بھی دکھائی جائے گی۔"

"یعنی اس کا مطلب دنیا کو دھوکا دینا تھا۔"

"جی ہاں سو فیصد… یہ احساس دلانا کہ یہاں ایٹمی ہتھیار محفوظ نہیں ہیں لہٰذا ہمارے خلاف کارروائی ہو اور ہم سے یہ اختیار چھین لیا جائے۔ انہوں نے کس حد تک اس کھیل

ہوئے اس وقت تمام کیمرے معمول کے مطابق چل رہے تھے۔ انہوں نے بغیر کسی تمہید کے گفتگو کا آغاز کیا۔ ان کے ان الفاظ کے ساتھ پیچھے موجود قدِ آدم اسکرین پر سی سی ٹی وی کیمرے کی تصاویر نظر آ رہی تھیں جس میں ایک بڑی فوجی جیپ چھاؤنی میں داخل ہو رہی تھی۔ چیک پوسٹ کے پاس آ کر جیپ رکی۔ جیپ اور چیک پوسٹ میں تھوڑا فاصلہ ہونے کی وجہ سے جیپ سے دو افراد نیچے اترے۔ وہ کمانڈوز کی پوری یونیفارم میں تھے۔ انہیں دیکھ کر اسٹاف نے سلیوٹ کیا جس کا انہوں نے جواب دیا۔ یہیں کرنل جواد نے تصویر کو روکا اور پھر زوم کیا۔ ان میں سے ایک کا چہرہ اب اسکرین پر صاف نظر آ رہا تھا۔ تمام ناظرین نہایت دلچسپی سے اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ اس تصویر کو کھینچ کر اسکرین کے کونے میں پہنچانے کے بعد کرنل جواد نے دوسری وڈیو کھولی جس میں وہی نوجوان ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے ایک میز رکھی تھی۔ چند لمحوں بعد اس نے بولنا شروع کیا۔ وہ نہایت عمدہ انگریزی بول رہا تھا جبکہ اس کا لہجہ بالکل امریکیوں جیسا تھا۔

''میرا نام لیوی ہے میں ایک تربیت یافتہ فوجی ہوں اور اسرائیلی فوج سے منسلک ہوں۔ موساد کے اس آپریشن کا مقصد اس ملک کے ایٹمی ہتھیاروں پر پابندی لگوانا تھا۔ ہم جانتے تھے کہ ہم ان تک نہیں پہنچ سکیں گے اور یہ ہمارا مقصد تھا بھی نہیں، ہمیں مسلمانوں کے روپ میں یہاں قتل و غارت گری کرنا تھی۔ اسلحہ خانہ اور پوری چھاؤنی کو بالآخر اڑانا تھا تاکہ دنیا ان کے ہتھیاروں پر پابندی لگا دے اور ان پر حملہ کر دے۔ میں اپنے ملک کا وفادار ہوں مگر میں یہ بیان بھی ہوش و حواس میں اپنی مرضی سے دے رہا ہوں کیونکہ میں نے دیکھا کہ پوری وفاداری سے کام کرنے کے باوجود مصیبت میں پھنس جانے کی صورت میں میرے دوست ناتھن کو کس اذیت ناک انداز میں موت کا سامنا کرنا پڑا..... اس منظر نے مجھے خوف زدہ کیا بہت خوف زدہ کیا مگر میری آنکھیں بھی کھول دیں..... اور میں نے وہ فیصلہ کیا جو مجھے اپنے لیے درست لگا۔''

اس کے خاموش ہو جانے کے بعد بھی ہال میں چند لمحوں تک بالکل سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس کے بعد کیمروں کی دھڑا دھڑ کلکوں کی آوازیں گونجیں اور پھر پورا ہال آوازوں سے بھر گیا۔ یہ پریس کانفرنس اس وقت دنیا بھر کے تمام اہم چینلز پر براہِ راست دکھائی جا رہی تھی۔ جس کا واضح مطلب صرف ایک تھا..... بازی پلٹ گئی تھی۔

☆☆☆

''یہ نہیں ہو سکتا... یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ موساد کی صفوں میں غدار... میں ان میں سے کسی کو نہیں چھوڑوں گا۔ اس لیوی کو کتے کی موت نصیب ہوگی۔'' ابراہام زخمی شیر کے مانند گرج رہا تھا۔ کئی اور لوگوں کے ساتھ جیکب اس کے سامنے کھڑا پتے کے مانند لرز رہا تھا۔

دنیا بھر کے میڈیا پر براہِ راست موساد کے نام کے آنے سے اسرائیلی مقتدر حلقوں میں بھی زلزلہ سا آ گیا تھا جس کا ملبا کافی حد تک موساد پر گرا تھا۔ اپنی تمام تر طاقت اور پہنچ کے باوجود کسی نہ کسی حد تک ابراہام پر بھی اثر پڑا تھا۔ اگرچہ انہوں نے حکومتی سطح پر اس بیان اور پریس کانفرنس کی مذمت کی تھی، اسے مسلمانوں کی سازش قرار دیا تھا اور خود کو اس سب سے بری الذمہ ثابت کرنے کے لیے اسے خود ان ہی کی چال قرار دیا تھا مگر اس کے باوجود جو ہونا تھا، وہ ہو چکا تھا۔ آدھے گھنٹے کی یہ پریس کانفرنس میڈیا کی ذہن سازی کر گئی تھی۔

اس کی برسوں کی محنت تاش کے پتوں سے بنائے گئے مکان کے مانند لمحوں میں ڈھے گئی تھی۔ اگرچہ امریکا اور اس کے اتحادی بنیادی طور پر اس کی کوششوں کے ساتھ تھے مگر اس کے باوجود اب وہ کھل کر کسی ایکشن کے حق میں نہیں تھے ان کے پاس اس کا کوئی بھی جواز نہیں تھا یوں وہ سب کچھ کرنے کے باوجود ہار گیا تھا۔

''جیکب...'' وہ اس کی جانب مڑا۔ ''تم نے اس لیوی کے کانوں سے ہیر بگ کیوں نکلوایا تھا۔ کہیں تم ان لوگوں کے ساتھی تو نہیں ہو؟'' وہ سرد آواز میں غرایا۔

''نہیں سر..... ایسا نہیں ہے سر.....'' وہ باقاعدہ گھگیا رہا تھا۔ ''شاید آپ کو یاد ہو..... یہ حکم آپ نے ہی دیا تھا سر۔''

''میں نے.....؟ کیا بکواس ہے؟ میں ایسا حکم کیوں دوں گا؟''

''سر آپ نے کہا تھا کہ اس سے احکامات ایک جگہ سے آگے جا سکیں گے اور راز کھلنے کا خطرہ کم سے کم ہوگا۔ یوں بھی ان قیدیوں کو اسلحہ خانے میں ایک ساتھ رہنا ہے۔''

''اس کے ان الفاظ پر وہ ایک لمحے کو خاموش ہوا، یہ گفتگو اس کے ذہن میں تازہ ہو گئی تھی مگر اس وقت وہ خود نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ اس نے یہ حکم آخر کیوں دیا تھا۔

''میں نے ایسا کوئی حکم بھی نہیں دیا تھا۔'' وہ بالآخر غرایا۔ ''یہ تمہاری غلطی ہے اور تمہاری ایک غلطی کا نتیجہ کیا

میں کامیابی بھی حاصل کر لی تھی مگر وہ نہیں جانتے تھے کہ ناکامی ان کا مقدر ہے اور یہ تو بالکل ہی نہیں جانتے تھے کہ انہیں اتنی جلد، فوری اور ذلت آمیز ناکامی نصیب ہوگی۔ دراصل انہوں نے ہمیں تھوڑا کم سمجھا اور کم جانا..... ہمیں اپنے اثاثوں اور اپنے لوگوں کی حفاظت کرنا آتی ہے اور ہم اس کے لیے اپنی جان بھی قربان کر سکتے ہیں۔''

''اس حملے کی وجہ سے آپ کو کتنا جانی نقصان ہوا؟'' یہ سوال ملکی میڈیا کی جانب سے آیا تھا۔

''ہمارے چھ افراد نے اس حملے میں جامِ شہادت نوش کیا ہے۔'' وہ سنجیدگی سے بولے۔ ''وہ بھی کسی براہِ راست لڑائی میں نہیں بلکہ یرغمال بنا کر انکاؤنٹر کے ذریعے..... ہمارے شہید ہمارے ہیرو ہیں۔ ان کی قربانی کی وجہ سے ہم آج یہاں کھڑے جھوٹ کا پردہ چاک کرنے میں کامیاب ہو پائے ہیں۔'' انہوں نے خاموشی کا ایک وقفہ لیا۔

''یہ محض ایک پلانڈ پلان (سوچا سمجھا منصوبہ) تھا جس کا مقصد ہمارے ایٹمی اثاثوں کو ختم کرنا یا پھر ان پر قبضہ کرنا تھا۔ جو کہ ہماری میرا مطلب ہے کہ ہم سب کی زندگیوں میں ممکن نہیں ہے۔'' انہوں نے سادگی سے کہا۔

''آپ کے خیال میں آپ کے ایٹمی ہتھیار دنیا کے لیے خطرہ نہیں ہو سکتے تھے جبکہ آپ کے اپنے ایک سینئر فوجی نے دہشت گردوں کو یہ یقین دہانی کرائی تھی کہ وہ اور آپ سب اس پر تیار ہیں۔ یقیناً آپ نے بھی آڈیو کلپ سنا ہی ہو گا؟'' یہ ایک سینئر جیمز کریٹ تھا جو نیویارک ٹائمز کی نمائندگی کر رہا تھا۔

''ہمارے ایٹمی ہتھیار بالکل محفوظ ہیں اتنے کہ ہم خود بھی چاہیں تب بھی ان تک کسی کو نہیں پہنچا سکتے۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولے۔ ''آپ نے جو کلپ سنی، وہ اس حد تک سچ تھی کہ یہ ساری گفتگو ہوئی تھی مگر اسے دہشت گردوں کی جانب سے بغیر سیاق و سباق کے پیش کیا گیا اور اس سے فائدہ اٹھانے والوں نے بغیر کسی تحقیق کے اسے نشر کیا، معاف کیجیے گا یہ تھوڑی تلخ بات ہے مگر ہے تو سچ کہ مسلمانوں پر الزام لگانے کا کوئی موقع مغربی دنیا ہاتھ سے نہیں جانے دیتی۔ ورنہ کیا مہذب دنیا میں یہ ممکن ہے کہ کروڑوں لوگوں کی زندگیوں کو متاثر کرنے والے ایک کلپ کو بغیر کسی تحقیق یا کم از کم رسمی سوال و جواب کے بغیر اس طرح دنیا بھر کے چینلز پر اچھالا جائے؟ آپ کا جواب یقیناً نفی میں ہوگا مگر اس بارے میں کسی صحافیانہ یا اخلاقی اصول و قاعدے کو مدِ نظر نہیں رکھا گیا جس کا مجھے افسوس ہے۔''

''مگر سر.....'' کسی اور نے بیچ میں اپنا سوال پھینکنا چاہا۔

''مہربانی کر کے مجھے ایک سوال کا مکمل جواب دینے دیں پھر میں آپ کی جانب آتا ہوں، جہاں تک حضرت اس فون کال کا معاملہ ہے وہ ہماری حکمتِ عملی کا حصہ تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ انہوں نے ہمارے کئی لوگ یرغمال بنا رکھے تھے اور وقفے وقفے سے وہ ایک دو افراد کی جان لے رہے تھے۔ ایسے میں ان کو اس ظالمانہ عمل سے روکنے اور آگے کی کارروائی کے لیے کچھ وقت حاصل کرنے کے لیے ایسا کرنا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ میں اس کی مثال دیتا ہوں ہوائی جہاز کو ہائی جیک کیا جاتا ہے اور ہائی جیکرز سے یہ کہا جاتا ہے کہ مطالبوں پر غور ہو رہا ہے تو اس کا مطلب مطالبے تسلیم کر لینا تو نہیں ہوتا۔ یہی یہاں کیا گیا تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس قسم کا کوئی وعدہ یا بات بغیر کسی حکمتِ عملی کے کرنا حشمت کے استحقاق میں بھی نہیں ہے۔ وہ تو کیا کوئی خود تن تنہا ایسا فیصلہ نہیں لے سکتا اس کے لیے بہت سے لوگوں کی مرضی، تصدیق اور ساتھ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر کوئی اس کلپ پر یقین لاتا ہے تو اس کے دو ہی مطلب ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ وہ بالکل پروفیشنل نہیں ہے ایسی چیزیں کس طرح ہوتی ہیں اس کی کوئی معلومات نہیں ہے یا پھر وہ ایسا جان بوجھ کر کر رہا ہے۔''

''آپ نے کہا ہے کہ آپ کے پاس ثبوت موجود ہے کہ دہشت گردوں کا تعلق مسلمانوں سے نہیں ہے؟'' ایک مشہور تجزیہ نگار نے پوچھا۔

''بالکل ہے... اصل میں حملہ آوروں میں سے دو زندہ گرفتار کر لیے گئے تھے۔'' انہوں نے ڈرامائی انداز میں کہا۔ ''چونکہ ان کی جان کو خطرہ ہے اس لیے انہیں سخت سکیورٹی میں رکھا گیا ہے ابھی میں آپ کو ان کا بیان ان کی ہی زبانی آپ کی خدمت میں پیش کروں گا۔'' ان کے اس اعلان کے ساتھ ہال میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔

''اور اس بات کا کیا ثبوت ہوگا سر کہ جو بیان دے رہا ہے وہ واقعی حملہ آوروں میں شامل تھا؟'' ایک سینئر صحافی نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''مجھے آپ کی ذہانت سے اسی سوال کی توقع تھی۔ تو اب میں کرنل جواد کو بلا رہا ہوں، وہ آپ کو اس بارے میں تمام تفصیلات سے آگاہ کریں گے۔'' وہ مسکرائے اور کرنل جواد کی جانب دیکھا۔

''پرسوں رات جب یہ لوگ چھاؤنی میں داخل

"سر گر سر — میں سچ کہہ رہا ہوں۔" وہ ہکلایا۔
"یعنی میں جھوٹ کہہ رہا ہوں؟" اس نے دہاڑ کر پوچھا۔

جبھر جواب میں بالکل چپ رہا تھا پھر وہ ابراہام کے پیروں پر گر گیا۔ "سر آپ درست کہہ رہے ہیں یہ میری غلطی ہے مجھ سے سمجھنے میں غلطی ہوئی، مجھے آپ سے دوبارہ پوچھنا چاہیے تھا جو میں نہیں پوچھ پایا — سر میں معافی کا خواستگار ہوں اور آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر آپ نے موقع دیا تو میں اس کی تلافی کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔" وہ لجاجت آمیز لہجے میں بولا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ پھنس گیا ہے اور ابراہام اس معاملے میں اسے جان سے بھی مار سکتا ہے اس لیے اس نے وہ حل نکالا تھا جو ابراہام کی جھوٹی انا کو تسکین دے سکے صرف اسی طرح وہ خود کو بچا سکتا تھا۔

"تو تمہاری یادداشت آگئی واپس....؟" اس نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔ "اٹھو یہاں سے — یہ جو کچھ ہمارے ساتھ ہوا ہے، یہ حرفِ آخر نہیں ہے بلکہ یہ ایک نئی ابتدا ہے۔ ہم انہیں اب ایسا تباہ و برباد کریں گے کہ ان کی نسلیں بھی یاد کریں گی۔ جبھر، ڈیوڈ سے کہو کہ لیوی کو ہر صورت میں ختم کرا دے اور تم فوری ایکشن کے لیے تیار ہو جاؤ۔ ہم اپنے پروگرام پر تیزی سے عمل کریں گے۔"

"بہت شکریہ — بہت شکریہ سر...... میں آپ کا مشکور ہوں آپ کو مجھ سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوگی۔" وہ جاں بخشی پر بہت خوش نظر آ رہا تھا۔

"ہمیں انہیں ایک تحفہ تو فوری طور پر دینا ہوگا — ایسا تحفہ جو ایسا انتشار پھیلائے گا کہ انہیں سنبھلنا مشکل ہو جائے گا۔" ابراہام اب اپنی کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔ اس کے چہرے پر غصہ اب بھی موجود تھا مگر اب وہ سازشوں کے جال بُننے میں مصروف ہو گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ سب وہاں سے رخصت ہو گئے۔ اب وہ کمرے میں اکیلا تھا۔ وہ اس شکست کو تسلیم نہیں کر سکتا تھا۔ وہ انتقام کی آگ میں جھلس رہا تھا۔ اب وہ اس آگ میں دشمنوں کو خاکستر کر دینا چاہتا تھا۔

جن دشمنوں کو تباہ و برباد کرنا اس کی زندگی کا مقصد تھا، ان میں ایک نام "احمد" کا تھا۔ احمد کا خیال آتے ہی اس کا ذہن مریم کی جانب گیا۔ وہ اب تک غائب تھی۔ یہ سب ہو جانے کے بعد تو اسے رابطے میں آ جانا چاہیے تھا مگر اب تک اس کی طرف سے کوئی خبر نہیں آئی تھی۔
مریم کہاں تھی؟

کیا کر رہی تھی؟ کہیں اس نے بھی تو انہیں دھوکا نہیں دے دیا؟ اس خیال نے اس کے تن بدن میں آگ لگا دی۔ آخر وہ ایک مسلمان کی بیٹی ہے۔ اس کے ذہن پر غلبہ نفرت نے اس کی سماعت میں سرگوشی کی۔
"وہ یہ کر بھی سکتی ہے .... اگر اس نے یہ کیا تو اسے میرے عتاب سے کوئی نہیں بچا سکے گا؟"

اس نے مٹھیاں بھینچ لیں، غصہ ایک بار پھر اس کے دل و دماغ پر حاوی ہو رہا تھا۔ وہ ان سب کو برباد کر دینا چاہتا تھا۔ سوال صرف یہ تھا کہ کیسے؟ اور اب اسے اسی کیسے کا جواب تلاش کرنا تھا۔

یہ سوال اس کے دماغ سے چپک سا گیا تھا۔
اس شکست نے اسے باؤلا سا کر دیا تھا۔ اس شکست، پیچھے رہ جانا ... اسے ان الفاظ سے نفرت تھی۔ وہ ہر قیمت پر جیتنے کا عادی تھا اور اس بار اسے جیتے جیتے بری ہار ہوئی تھی۔ بساط اس نے بچھائی تھی۔ کھیل بھی اس کا اپنا تھا اور مہرے بھی۔ وہ شہ مات دینے ہی والا تھا کہ بازی پلٹ گئی۔

"اس کا بدلہ ضرور لیا جائے گا — کھیل ابھی ختم نہیں ہوا ابراہام ....." اس نے خود کو سمجھایا۔ "مگر اس طرح نہیں — آرام سے ... ٹھنڈے دماغ کے ساتھ — سوچ سمجھ کر — سب سے پہلے تو اسے ان کولاشوں کے تحفے دینا تھے اور اس کے لیے وہ حکم صادر کر چکا تھا۔ اس سے کم پر اس کی اشک شوئی ممکن نہیں تھی۔ اس کے بعد اسے مریم کو ڈھونڈنا تھا۔ اسے یقین تو نہیں تھا کہ وہ اسے دھوکا دے سکتی ہے پھر بھی اگر ایسا کچھ ہوا تو وہ اسے قرار واقعی سزا دے گا ..... یہ طے تھا۔ پھر اسے احمد کو بھی انجام تک پہنچانا تھا۔ اس بار کوئی مریم اسے اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے کے لیے اس کے پاس موجود نہیں تھی۔

"میں ابراہام ہوں — ناقابلِ شکست ابراہام۔" وہ بڑبڑایا۔ "یہ جو کچھ ہوا ہے، وہ ان کے لیے مزید مشکلات کو سامنے لائے گا۔ اس بار ان کا ناقابلِ تلافی نقصان ہونے والا ہے۔" وہ مسکرایا۔
اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی مگر آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے اور چہرے پر سفاکی کے پتھریلے تاثرات پھیلے ہوئے تھے۔

☆☆☆

بابا کے چہرے پر خوشی دمک رہی تھی۔
وہ سب بھائی سے براہِ راست نشر ہونے والی پریس کانفرنس دیکھ رہے تھے۔

"مبارک ہو بابا۔" پریس کانفرنس کے اختتام پر میں نے بابا سے کہا۔ "ابراہام کے ارادوں کو شکست فاش ہوئی اور یہ سب ہائی کمانڈ ہوا۔ ساری دنیا نے دیکھ لیا کہ موت کے اس کھیل کے پیچھے کون چھپا ہے۔"

"واقعی مبارک باد تو بنتی ہے۔" علی، بابا کے جواب دینے سے پہلے بولا۔ "مگر پہلے تم یہ بتاؤ کہ تم یہ اتنی مشکل اردو کیسے بول رہی ہو بھائی .... ایسے بھاری بھرکم الفاظ کیسے بول لیتی ہو؟"

"کون سے بھاری بھرکم الفاظ؟" میں نے اُسے گھورا۔

"یہ شکستِ فاش، ہائی کمانڈ — یہ دلوں کے نام لگ رہے ہیں۔ انسان سن کر پریشان ہو جاتا ہے۔"

"الفاظ مشکل نہیں ہیں ..... بس ساری بات قابلیت کی ہوتی ہے علی۔" میں نے متانت سے پلکیں جھپکتے ہوئے کہا۔ "اب سب کا آئی کیو تمہارے جیسا تو نہیں ہوتا..... اردو ہماری قومی زبان ہے ہمیں اس میں مہارت ہونی ہی چاہیے کیوں بابا؟"

"بالکل صحیح بات ہے۔" بابا نے سر ہلایا۔ "اپنی زبان سے وابستگی ہی الگ ہوتی ہے۔"

"جی بابا...... مجھے بھی اردو سے بہت دلچسپی ہے اب میں اس پر زیادہ محنت کروں گا وہ جو شاعر نے کہا ہے کہ 'نازکی اس کے لب کی کیا کہیے — پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے' ویسے شاید یہاں موقع کے لیے تو نہیں ہے۔"

"ہمیں فضول باتیں کروا لو تم سے .... اتنے اہم ٹاپک کو چھوڑ کر کہاں اُلجھ گئے ہو۔" میں نے اسے گھورا۔ "میں تو سوچ رہی ہوں کہ آج ابراہام پر کیا گزر رہی ہوگی۔"

"شکر ہے اللہ کا ..... اس نے اس سازش سے ہمارے وطن کو بچا لیا مگر وہ لوگ ہار ماننے والے نہیں ہیں۔ خطرہ ابھی ٹلا نہیں ہے۔" بابا نے کہا۔

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں بابا...... اب ہمیں زیادہ محتاط رہنا چاہیے۔" اس بار علی نے بھی سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ "زخمی درندے یوں بھی زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ جتنی چالبازی سے انہوں نے یہ سب کیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا بچھایا ہوا جال ہر طرف موجود ہے، افسوس کی بات تو یہ ہے کہ ہمارے اپنے بھی کچھ لوگ ڈالرز کی چمک میں اندھے ہو کر اپنی جڑیں کھوکھلی کرنے میں مصروف ہیں۔" اس کے لہجے میں افسوس تھا۔

"ٹھیک کہتے ہو بیٹا تم .... مگر یہ شکرانے کا موقع ہے،

روٹی کا ٹکڑا

بچہ بلک رہا تھا لیکن اس کے چہرے پر ندامت نہیں تھی۔ وہ ایسے کھڑا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ عورت اسے پیٹ رہی تھی۔
"جا.. جا کر جمعدار ہو جا.. تو بھی بھنگی بن جا تو نے اس کی روٹی کیوں کھائی ہے"
بچے نے معصومیت سے کہا۔ "ماں! کیا ان کے گھر کا ایک ٹکڑا کھا کر میں بھنگی ہو گیا؟"
"کیوں نہیں ہو گیا؟"
"اور جو کالو بھنگی ہمارے گھر میں پچھلے دس برسوں سے روٹی کھا رہا ہے۔ وہ پنڈت کیوں نہیں ہو گیا؟" بچے نے پوچھا۔
ماں کا اٹھا ہوا ہاتھ ہوا میں لہرا کر رہ گیا۔ وہ کبھی اپنے بچے کو دیکھتی، کبھی اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا روٹی کا ٹکڑا دیکھتی۔
(ہندی پنجابی ادب .. بھوپندر سنگھ)
(انتخاب۔ محمد الیاس چوہان، کراچی)

"راتب"

سرکاری افسر کو تین چار ماتحتوں کے ساتھ اپنی دکان کی طرف آتا دیکھ کر اس نے فوراً جلدی جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ہاتھ جوڑ کر انہیں سلام کیا اور بٹھانے کے لیے اپنی دھوتی کے پلو سے کرسیاں صاف کرنے لگا۔
وہ لوگ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ان کے کھانے کے لیے خشک میوہ اور پینے کے لیے پھلوں کا رس آ گیا۔ افسر نے کھانے پینے کے بعد اپنی مونچھوں پر انگلیاں پھیریں اور دکاندار سے حساب کتاب کا رجسٹر لے کر جانچ پڑتال کرنے لگا۔ ایک صفحے پر اس کی نظر ٹھہر گئی۔ وہ حیران بھی ہوا اور مسکرایا بھی۔ اس نے وہ صفحہ اپنے ماتحتوں کو دکھایا۔ وہ بھی پڑھ کر مسکرانے لگے۔
"کیسے لوگ ہیں...؟ انکم ٹیکس بچانے کے لیے کتے کو ڈالی گئی روٹی کے ٹکڑے کا خرچ بھی درج کر دیتے ہیں۔"
کھلے ہوئے صفحے پر لکھا تھا۔
"12-2-89 ... کتے کا کھانا 50 روپے۔"
دکاندار بھی ہی ہی کرتا ہوا ان کے ساتھ ہنسنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ لوگ چلے گئے۔
دکاندار نے رجسٹر دوبارہ کھولا۔ خشک میوے سے لے کر جوس تک سارا خرچ جوڑا اور رجسٹر میں ایک نئی سطر لکھی۔
"29-8-89 ... کتوں کا کھانا =/150 روپے"
(ہندی پنجابی ادب۔ درشن متوالا)
(انتخاب۔ محمد الیاس چوہان، کراچی)

انشاء اللہ ایک دو دن میں کریم بھی آجائے گا۔" بابا نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"جی بابا..... انشاء اللہ، مگر آپ دیکھیے کہ کریم نے ایک فون تک نہیں کیا۔" میں نے شکایتی انداز میں کہا۔

"ارے بیٹا وہ مشن پر جائے تو اس سے رابطہ اسی طرح مشکل ہوتا ہے ہم بھی اسی لیے نہیں کرتے کہ نہ جانے وہاں کن حالات کا سامنا ہو۔ ایسے میں اس کو ڈسٹرب نہ ہی کرنا مناسب ہے۔ اگر اسے وہاں زیادہ رکنا ہوتا تو یقیناً آج اس کا فون آجاتا۔ اب فون نہ آنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ آنے ہی والا ہے۔" بابا نے پُرشفقت انداز میں کہا۔ جبکہ علی ان کے پیچھے کھڑا آنکھیں مٹکا رہا تھا۔

"سونیا کیسی ہے ڈاکٹر صاحب....." بابا نے علی سے پوچھا۔

"وہ ٹھیک ہے بس تھوڑی اُلجھی ہوئی ہے۔" علی نے جواب دیا۔ "ظاہر ہے کہ اسے اپنے بارے میں کچھ یاد نہیں آرہا۔ وہ جتنا ذہن پر زور ڈالتی ہے، اتنا ہی مزید اُلجھتی جاتی ہے۔"

"او تو اس کا حل کیا ہے؟"

"حل تو وقت کے پاس ہے بابا..... عموماً اس صورتِ حال میں مریضوں کی یادداشت رفتہ رفتہ لوٹ آتی ہے اور کبھی یکدم بھی واپس آجاتی ہے جب تک یہ نہیں ہوتا، اسے اس زندگی کے ساتھ جینے کی عادت کرنا ہوگی فی الحال تو اسے سکون آور دوائیں دی جارہی ہیں مگر ایک ہفتے بعد یہ بھی بند ہوجائیں گی۔"

"اللہ اسے صحت دے۔" بابا نے پورے خلوص سے کہا اور اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئے۔

☆☆☆

غضنفر اس چھوٹے سے کمرے میں بالکل تنہا تھا۔ لائی ڈیٹیکٹر ٹیسٹ کے بعد سے اب تک اس سے کسی نے رابطہ نہیں کیا تھا البتہ کھانا اسے وقت پر مل رہا تھا۔ اتنا تو وہ سمجھ ہی رہا تھا کہ اس ٹیسٹ میں گڑبڑ ہوگئی تھی۔ وہ یہ سوچ کر پریشان تھا کہ انہوں نے اس کے جھوٹ کو پکڑ لیا ہے یا نہیں۔ اگر وہ سمجھ گئے ہیں تو پھر اس سے سوال کیوں نہیں ہورہے؟ اسے اس طرح تنہا کیوں چھوڑ دیا گیا ہے۔

دوسری صورت اسے اور زیادہ خوف زدہ کر رہی تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ لوگ اس کی شناخت کو پہچان گئے ہیں۔ اگر وہ اب بھی خاموش رہتا ہے تو پھر وہ اسے اس بم دھماکے کے ساتھ جوڑ دیں گے جس کا وہ آفیسر ذکر کر رہا تھا اور جس میں نوے افراد کے جاں بحق ہونے کا [illegible] تھا۔ اس صورت میں وہ اپنے بچاؤ کے لیے کچھ بھی نہیں کر پاتا تھا۔ اس کے سامنے بچت کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ ایک ہی امید تھی کہ شاید زورین اسے تلاش کر رہی ہو شاید وہ اسے بچا لے۔

مگر دل کی گہرائی میں وہ یہ جانتا تھا کہ ایسا ہونا ناممکن ہے..... پکڑے جانے والا جتنا زیادہ جانتا ہے اس کی اتنی ہی جلد موت کے احکامات جاری ہوتے ہیں۔

وہ جتنا سوچ رہا تھا اسی قدر الجھتا جا رہا تھا۔ اس کا ذہن اسے صرف ایک ہی راستہ دکھا رہا تھا جس میں اس کی تھوڑی بہت بچت کے امکانات تھے۔ اگر وہ اسے وعدہ معاف گواہ بنانے پر راضی ہوجائیں تو شاید اسے کم سزا ملے..... پھر بیان میں وہ خود کو جس حد تک بچا سکے گا بچانے کی کوشش بھی کر سکتا ہے۔

اسے یہی راستہ درست لگ رہا تھا۔ وہ انہیں سب کچھ بتا دے گا شاید اس طرح اس کی سزا کم ہوسکے۔

اس فیصلے پر پہنچ کر وہ قدرے پُرسکون ہوگیا۔ اب اسے ان کے رابطے کا انتظار تھا۔

☆☆☆

"اس قدر سخت انتظامات کے باوجود ان وارداتوں میں ذرہ بھر بھی کمی نہیں آرہی، ہر روز اتنے لوگ اس کا نشانہ بن رہے ہیں خواہ وہ ایک ہے یا کئی افراد ہیں مگر ہم ان میں سے کسی کو بھی پکڑنے میں کامیاب نہیں ہوسکے۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟" ڈی آئی جی کے لہجے میں غصہ پھنکار رہا تھا۔

"یہی مسئلہ ہے سر..... شہر میں سخت ناکابندی موجود ہے مگر پھر بھی وہ ان جگہوں پر واردات کر جاتا ہے جہاں بیک اَپ کمزور ہو۔" ایس ایس پی شفقت احمد نے جواب دیا۔

"اس سوال کا جواب تلاش کرنا آپ لوگوں کا کام ہے کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟ لوگوں میں پولیس کا امیج بُرے سے بُرا ہوتا جا رہا ہے۔ میڈیا میں ہمیں نالائق کہا جا رہا ہے۔ کل منسٹر صاحب نے اس بات پر خاصا ایکشن لیا ہے۔"

"میں جانتا ہوں سر..... مگر وہ درحقیقت "چھلاوا" ہے۔" ایک اور پولیس افسر نے کہا۔

"اب آپ تو میڈیا کا رکھا نام نہ لیں۔" ڈی آئی جی نے اسے گھورا۔ "وہ چھلاوا ہے یا بھوت ہے یا جو بھی ہے، ہمارا کام اسے پکڑنا ہے اور عوام کو اس سے محفوظ رکھنا ہے۔"

"یس سر....." انہوں نے یک زبان ہو کر کہا۔

"ہمیں اس حوالے سے اپنے انتظامات کو فول پروف بنانا ہوگا۔ یہ بھی معلوم کیجیے کہ کہیں کوئی کالی بھیڑ ہماری صفوں میں موجود تو نہیں جو ہماری ساری محنت کو چند سکوں کے عوض برباد کر رہی ہو۔"

"ٹھیک ہے سر۔"

"میں امید کرتا ہوں کہ ہم اس مسئلے پر جلد قابو پالیں گے۔" یہ گویا میٹنگ کے برخاست ہونے کا اعلان تھا۔ ایس ایس پی شفقت احمد تمام افسران کے ساتھ کھڑا ہوگیا تھا مگر ان کے ایک ایک کر کے کمرے سے نکل جانے کے باوجود وہ اپنی جگہ کھڑا رہا تھا۔

"ہاں شفقت تمہیں کوئی بات کرنا ہے؟" ڈی آئی جی نے اس کی جانب دیکھا۔

"یس سر....."

"بولو....." وہ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے۔

"سر، میری ایک درخواست ہے۔" وہ ایک لمحے رکنے کے بعد بولا۔

"ہاں، ہاں بولو..... بیٹھو۔" وہ کرسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"سر اس "چھلاوے" معاف کیجیے گا اس کیس کا ایک عجیب پیٹرن نظر آرہا ہے۔" وہ بولا۔ وہ اس کیس کے انچارج کے طور پر کام کر رہا تھا۔

"کیسا پیٹرن؟"

"وارداتیں روزانہ کی بنیاد پر خاص ان علاقوں میں ہوتی ہیں جہاں نفری کم ہے یا بالکل نہ ہو، اور یہ سلسلہ بدلتا رہتا ہے۔"

"ہم....." ڈی آئی جی نے سوچتے ہوئے کہا۔

"میں یہ چاہتا ہوں کہ اگلے چند دنوں میں ہم ناکابندی کا شیڈول کرنے کے بجائے فوری فیصلہ کی پالیسی اپنائیں۔"

"تمہیں لگتا ہے کہ خبریں باہر جارہی ہیں؟"

"جی سر۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"اوکے..... تم شیڈول بھی بننے دو اور فوری فیصلے کے تحت بھی کام کر سکتے ہو..... ہمیں کسی کو خبردار ہونے کا موقع دیے بغیر یہ کام کرنا چاہیے، اس واردات کے ساتھ ساتھ اگر ایسا کچھ ہے تو ہمیں اس سلسلے کو بھی روکنا ہوگا۔"

"ٹھیک ہے سر۔" شفقت احمد نے کہا اور سلیوٹ مار کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے ذہن میں ایک خاص پلان تشکیل پا رہا تھا اور وہ عالم تصور میں کامیابی کے بعد خود کو انٹرویوز دیتے دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

جوزز ٹریڈمل پر مصروف تھا، اس کے کانوں پر ایئر پلگس لگے ہوئے تھے جن سے وہ اپنی پسندیدہ موسیقی سے بھی لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اچانک تیز گھنٹی نے اس کے کان جھنجھنا ڈالے۔ اس نے موسیقی بند کی، اسکرین پر جمبو کا نام دیکھ کر اس نے فوراً کال ریسیو کی۔

"کہاں مصروف ہو جوزز؟" جمبو نے پوچھا۔

"بس تیاری کر رہا تھا، آج کے معاملات اور علاقوں کا پلان بنا رہا تھا۔ جس کے بعد ڈیوٹیاں الاٹ کروں گا۔" وہ مشین سے اتر کر پسینہ صاف کرتے ہوئے بولا۔

"اب تمہیں یہ سب کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" جمبو نے کہا۔

"کیا مطلب؟" جوزز نے حیرت سے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ یہ مشن پورا ہوگیا ہے، آج سے فی الحال یہ کام موخر کیا جا رہا ہے۔"

"اوکے..... مگر بات یہ ہے کہ اب تو اس کام میں مزہ آنا شروع ہوا تھا۔" جوزز نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔

"فکر نہ کرو، اب آگے تمہیں مزید زیادہ مزہ آنے والا ہے۔" جمبو نے ہنستے ہوئے کہا۔

"یعنی نیا پلان تیار ہے؟"

"بالکل تیار ہے۔ میں رات میں تم سے اس کی تفصیلات پر بات کروں گا، فی الحال تمہیں ایک پتا بھیجا جا رہا ہے وہاں سے [illegible] وصول کرلو اور ہاں ہمیں دو مقامی افراد کی ضرورت بھی ہے۔"

"دو؟ زیادہ بھی مل جائیں گے۔"

"نہیں زیادہ نہیں، فی الحال دو ہی چاہئیں، میں تم سے رات کو بات کرتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے جمبو..... میں کرتا ہوں یہ دونوں کام..... ایک خیال آرہا تھا۔"

"وہ کیا.....؟"

"یہاں جو لوکل ٹیم پہلے زورین کے ساتھ کام کر رہی تھی، ان کو انوالو کیا جائے تو کیسا رہے گا؟"

"جوزز یہ سوچنا تمہارا یا میرا نہیں، باس کا کام ہے اگر وہ کہیں گے تو یہ بھی ہوسکتا ہے مگر جب تک وہ نہ کہیں ہمیں خود سے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"ہوا کیا ہے اکبر بھائی؟" غفار نے پوچھا۔ "کیا کہتے ہیں وہ؟"

"بدتمیز لونڈے ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ یہ سب زمین ہتھیانے کے طریقے ہیں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"چاروں کو نکال کے باہر پھینکے ہیں۔" مسجد کے باہر موجود لوگ طیش میں آرہے تھے۔

حالات تیزی سے بگڑ رہے تھے۔

"دیکھیے میں نے پولیس کو فون کر دیا ہے، ضرورت پڑی تو حکومت تک جائیں گے آپ لوگ پرسکون رہیں بلکہ یہاں سے چلے جائیں۔" علاقے کے ناظم جمشید اللہ نے کہنے کی کوشش کی۔

"چلے جائیں کیا مطلب؟ پولیس تو اب تک آئی نہیں... ہم بھی چلے گئے تو یہ معاملہ ہی ختم ہو جائے گا۔" کمیٹی کے چیئرمین نے کہا۔

ابھی یہ بحث جاری ہی تھی کہ اچانک ایک بجے سے دھماکے کی آواز آئی اور پھر یکے بعد دیگرے کئی بار پٹاخوں کا شور بلند ہوا۔

"فائرنگ ہو رہی ہے۔" کوئی چلایا۔ مجمع دیکھتے ہی دیکھتے منتشر ہونے لگا۔ یہ ہوائی فائرنگ کون کس طرف سے کر رہا تھا۔ یہ نظر نہیں آرہا تھا نہ ہی اس بھگدڑ میں کسی کو اس جانب توجہ دینے کا خیال آیا۔

غفار بھی تیزی سے مڑا۔ وہ چند قدم ہی آگے گیا ہوگا کہ اچانک اسے یوں لگا جیسے اس کی پیٹھ میں آگ کا گولا اتر گیا ہو۔ ایک شدید جان لیوا اذیت نے اس کے رگ و پے کو بے بس کر دیا۔ وہ آگے بڑھنا چاہ رہا تھا مگر اس کی ٹانگوں میں حرکت کرنے کی ہمت بھی نہیں بچی تھی۔ وہ چند لمحے لہرایا اور پھر زمین پر آرہا... اس کا سر فٹ پاتھ سے ٹکرایا اور پھر اس کے چاروں جانب اندھیرا پھیل گیا۔

☆☆☆

وہ ایک عجیب سی عمارت تھی۔

شہر کے اس پسماندہ علاقے میں بنی اس بلڈنگ میں باڈی بلڈرز کا ایک کلب اس کی منزل تھی۔ جوزف کو یہ ایڈریس جیمز نے بھیجا تھا۔ اسے یہاں سے ضرورت کا سامان ملنا تھا۔ وہ نیم اندھیری لابی سے گزر کر ہال نما کمرے میں داخل ہوا جہاں کئی نوجوان مختلف مشینوں پر ورزش کر رہے تھے۔ اندر ایک باکسنگ رِنگ بھی موجود تھا۔

جوزف نے اسے دیکھ کر سر ہلایا۔ اسے باڈی بلڈنگ وغیرہ سے دلچسپی تھی اس لیے اس حوالے سے اس کی معلومات بھی زیادہ تھیں۔ اس نے سن رکھا تھا کہ یہاں بھی باکسنگ کے پرائیویٹ جان لیوا مقابلے کیے جاتے تھے جن پر ہزاروں لاکھوں کی شرطیں بھی لگتی تھیں۔ ان مقابلوں میں کسی اصول قاعدے کا لحاظ نہیں کیا جاتا، ان کے اپنے اصول تھے اور مقابلہ جتنا خوفناک ہوتا لوگوں کی دلچسپی اور شرطوں کا لیول اسی حساب سے بڑھ جاتا۔

"جی... کون ہے بھائی تم... تم کو کس سے ملنا ہے؟" ایک کھردری اکھڑ آواز پر وہ مڑا۔ ایک ادھیڑ عمر گنجا اسے گھور رہا تھا۔ اس کی پرانی سی وردی کے ساتھ جدید رائفل عجیب سی لگ رہی تھی۔

"بابا ہے... ؟ تو اور کیوں کھڑے ہو؟ آؤ میرے ساتھ۔" وہ آگے بڑھتا ہوا بولا۔

کمرا در کمرا گزر کے وہ ایک دروازے پر رکا۔

"تم ادھر رکو، ام پوچھ کر آتا ہے۔"

"انہوں نے مجھے بلایا ہے... ان کو بتا دو کہ چھوٹا استاد آیا ہے۔" جوزف نے کہا۔

"چھوٹا استاد...؟" اس نے ایک لمحے اس کا جائزہ لیا پھر بولا۔ "چھوٹا تو نہیں ہے تم... استاد ہے کہ نہیں یہ تو بابا کو پتا... ام ابھی آتا ہے۔" وہ یہ کہہ کر کمرے کے اندر داخل ہوا اور اگلے ہی لمحے واپس باہر آ گیا۔

"آپ چھوٹا استاد... بابا آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔" بابا محسن کے کمرے میں داخل ہو کر جوزف کو ایک بار پھر حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔ یہ کمرا اس عمارت اور جم کا حصہ ہونے کے باوجود اس سب سے بالکل الگ تھا۔ کمرے کو بالکل جدید اور اسٹائلش انداز میں سجایا گیا تھا۔

"آؤ... آؤ... تمہارا ہی انتظار تھا۔" سامنے صوفے پر براجمان ایک بے حد ہینڈسم نوجوان شخص نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "میں بابا ہوں۔"

"میں تو سمجھا تھا کہ میرا سامنا کسی عمر رسیدہ شخص سے ہوگا۔" جوزف اس سے مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔

"اکثر لوگ یہی کہتے ہیں۔" وہ مسکرایا۔ "مہمان کے لیے کچھ لاؤ... کیا پینا پسند کرو گے، یہاں ہر مشروب مل جائے گا۔"

"کچھ بھی نہیں... ڈیوٹی پر ہوں۔" جوزف بھی مسکرایا۔ "بس اپنا سامان درکار ہے مجھے۔"

"ہاں وہ سب تیار ہے۔" اس نے سامنے رکھے ایک چھوٹے جدید بریف کیس پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"اس میں سب موجود ہے۔"
"بالکل... جو تم نے کہا تھا وہ سب ہے۔"
"ٹھیک ہے پھر، اگر اجازت ہو تو میں چلوں؟" جوزف نے کہا، اسے معلوم تھا کہ بابا کو اس کی منہ مانگی قیمت مل چکی تھی۔
"بالکل... مجید تم کو کار تک چھوڑ دے گا۔" اس کے اشارے پر گارڈ نے وہ بریف کیس اٹھا لیا تھا۔
کچھ ہی دیر بعد جوزف گھر پہنچ چکا تھا۔ گھر پہنچنے کے کچھ دیر بعد اس نے بریف کیس کھول کر اس کا جائزہ لیا۔ اس میں دو عدد موبائل فون رکھے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ کچھ مخصوص انداز کی سرنجیں اور ایک تھیلی میں کچھ انجکشن موجود تھے۔ اس نے اس مختصر سے سامان کو دیکھ کر کندھے اچکائے اور بریف کیس بند کر دیا۔ اسے جبر کی فون کال کا انتظار تھا اور اس سے قبل اسے ایک اور کام بھی نمٹانا تھا۔

☆☆☆

کریم، کرنل جواد اور دوسرے افسران اس وقت ڈیوڈ (باباجی) کے آستانے کے باہر موجود تھے۔ لیوی اور جوزف کے بیانات سے انہیں باباجی کی اصلیت کا علم ہو چکا تھا۔ اس نیٹ ورک کو جاننے اور اس کو ختم کرنے کے لیے اس کی گرفتاری نہایت ضروری تھی۔ وہ ہر ممکن تیزی اور خاموشی سے یہاں پہنچے تھے اور افسران نے عمارت کو اپنے گھیرے میں لے لیا تھا۔
کریم اور کرنل جواد دو افراد کے ساتھ آستانے کے اندر داخل ہوئے۔ اس وقت چند ہی افراد موجود تھے۔ ان کے اندر جاتے ہی شہزاد ان کی جانب بڑھا۔
"جی صاحب......"
"باباجی سے ملنا ہے ہمیں......" کریم نے نرمی سے کہا۔
"باباجی نہیں مل سکتے۔ وہ ایک اہم عمل کر رہے ہیں اس دوران کسی سے ملاقات ممکن نہیں ہے۔" اس نے مسکرا کر کہا۔ "آپ اپنا کام مجھے بتا دیں...... میں ان کی خدمت میں پہنچا دوں گا۔"
"ہمیں کام تو صرف انہی سے ہے۔" کریم جواباً مسکرایا۔ "اور کر بھی وہی سکتے ہیں جہاں تک ان کی خدمت میں پہنچانے کی بات ہے وہ تمہیں ہم لوگوں کو ہی پہنچانا پڑے گا۔"
"آپ میری بات سمجھے نہیں ہیں شاید......" اس بار وہ کچھ سختی سے بولا۔
"نہیں، یہ جملہ اس طرح نہیں ہے، یہ جملہ کچھ یوں ہے کہ شاید تم ہماری بات نہیں سمجھے۔" کریم نے اس کو گردن سے پکڑتے ہوئے کہا۔ "ہمیں اسی وقت تمہارے باباجی سے ملنا ہے... فوراً۔"
"تم مگر......" وہ ہکلایا۔
ہال میں موجود باقی تین چار لوگ سراسیمہ سے ہو کر ان کو دیکھ رہے تھے۔ کریم کے ساتھ موجود افسران ان سب کو باہر لے گئے۔
"چلو......" کریم نے جیب سے پسٹل نکال کر شہزاد کے سر پر رکھ دی۔ "اب تو تم کہہ سکتے ہو نا اپنے باباجی سے کہ ہم زبردستی لائے ہیں تمہیں؟"
"آ... آپ لوگ کون ہیں......؟"
"جتنا کہا ہے صرف وہ کرو اگر زندہ رہنا ہے تو......" کریم نے سرد لہجے میں کہا اور پسٹل سے اس کے سر پر ہلکا سا ٹہوکا دیا۔
"ج ج جی میں چل رہا ہوں۔" شہزاد لرز کر آگے بڑھا۔
تہ خانے میں اتر کر وہ ایک بند دروازے کے سامنے رک گیا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ کریم نے اسے آواز دے کر دروازہ کھولنے کو کہا۔
"بابا صاحب......" اس نے دستک دے کر بالآخر زور سے کہا۔
"کیا مصیبت پڑ گئی ہے تمہیں شہزاد......" دو دستکوں میں ہی دروازہ کھل گیا۔
"اسے نہیں ہمیں ملنا تھا تم سے......" کریم نے مسکرا کر کہا۔
"میں نہیں مل سکتا کسی سے...... تم نے انہیں نہیں بتایا کہ میں مصروف ہوں۔" وہ شہزاد کی جانب دیکھ کر غرایا۔
"اب کس کام میں مصروف ہو ڈیوڈ، تمہارا کام تو ختم ہو گیا اور وہ بھی ناکام۔" کرنل جواد کے الفاظ پر وہ بری طرح گڑبڑا گیا۔ اس کی ساری تیاری مکمل تھی اور اسے آج ہی رات یہاں سے نکل جانا تھا مگر اب اسے ایسا ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔
"تم کیا کہہ رہے ہو مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔" وہ بولا اور مڑتے مڑتے ہی اس نے جیب سے پسٹل نکالی اور بجلی کی سی تیزی سے کرنل جواد کے سر پر رکھ دی۔ "اگر تم نے ذرا بھی حرکت کی تو اپنی جان سے جاؤ گے...... چلو آگے بڑھو اب تم مجھے یہاں سے نکالو گے۔"

کریم چپ چاپ اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔
"تم اب تک یہاں کھڑے ہو؟ اگر اپنے ساتھی کی زندگی چاہتے ہو تو سامنے سے ہٹ جاؤ۔" وہ کرنل جواد کو ڈھال بنا کر آگے بڑھتے ہوئے بولا۔
کریم نے ایک نظر کرنل جواد پر ڈالی اور ڈیوڈ کو دیکھا پھر بولا۔ "ٹھیک ہے میں ہٹ جاتا ہوں، تم کچھ مت کرو۔" کہتے ہوئے وہ تیزی سے گھوما اور اس کی کک ڈیوڈ کے کندھے سے ہوتی ہوئی اس کے چہرے پر پڑی۔ کریم کے گھومتے ہی کرنل جواد نے جھک کر اس کے پیٹ میں کہنی ماری، دونوں طرف سے اچانک پڑنے والی افتاد نے ڈیوڈ کے ہاتھ سے پسٹل کو اڑا دیا۔ کریم نے اسے گریبان سے پکڑ کر اس کے پیٹ میں دو گھونسے رسید کیے۔ ان دو گھونسوں نے ہی اسے ادھ موا کر دیا تھا۔
"کمال ہے یار تم تو بڑی آسانی سے قابو میں آ گئے......" کریم نے اسے بازو سے پکڑ کر زمین سے اٹھایا۔ "چلو اب چلتے ہیں باقی باتیں آرام سے کریں گے۔" کچھ ہی دیر میں آستانے میں ہر طرف افسران نظر آ رہے تھے۔

☆☆☆

غفار کی ہلاکت نے پورے علاقے میں آگ سی لگا دی تھی۔ لوگ جگہ جگہ جمع ہو رہے تھے۔ نعرے بازی کر رہے تھے۔ بات حکومت کے خلاف احتجاج تک جا پہنچی تھی۔ پولیس نے اگرچہ مسجد کے معاملات پر قابو پا لیا تھا مگر قبضہ کرنے والوں یا فائرنگ کرنے والوں میں سے کوئی بھی گرفتار نہیں ہو پایا تھا۔ وہ اس ہنگامے کی آڑ میں منظر سے غائب ہو گئے تھے۔ غفار کی نماز جنازہ اسی مسجد میں پڑھائی گئی اور پورا علاقہ اس کے جنازے میں شریک ہوا تھا۔ شہر کے کئی بڑے علما بھی وہاں پہنچ گئے تھے اور اس واقعے کے خلاف ایک بڑے احتجاجی جلوس کی تیاری شروع کر دی تھی۔
"اگر آپ میری بات مانیں تو چند دنوں کے لیے رک جائیں! اس وقت اس سب سے ہنگامہ بڑھنے کا خدشہ ہے...... تحقیقات کو مکمل ہونے دیں۔" علاقے کے ناظم نے اپنی رائے دی مگر کوئی بھی اس کی بات سننے کو تیار نہیں تھا۔
"معاف کرنا میاں! یہ ہمارا حق ہے اور ہمارے ساتھ برا ہوا ہے۔ پولیس تو کسی کو گرفتار تک نہیں کر پائی۔۔۔ یہ جلوس پرسوں جمعۃ المبارک کو نکالا جائے گا اور اس میں مزید افراد اور جماعتوں کو ساتھ ملایا جائے گا۔ ہمیں شہید غفار کے قاتل چاہئیں۔ اگر ایسا جلد نہ ہوا تو پھر مزید حکمت عملی طے کی جائے گی۔" پیش امام صاحب نے کہا۔ ان کے اس اعلان کی تائید میں نعرے لگائے گئے۔ مسجد میں ہی اس احتجاجی جلوس کی تیاری کے لیے کیمپ آفس بنا دیا گیا تھا۔ یہ اندازہ لگانا بالکل آسان تھا کہ اس جلوس میں ہزاروں کی تعداد میں شرکا شامل ہونے والے تھے۔ مسجد کے باہر میڈیا کی او بی وینز اور اینکرز کی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ مختلف انٹرویو اور بریکنگ نیوز کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ ماحول میں تناؤ اور گرمی بڑھتی جا رہی تھی۔

☆☆☆

جبر کی کال آنے تک جوزف اپنے کام نمٹا چکا تھا اور اطمینان سے پاور ڈرنک کے مزے لے رہا تھا۔ فون کی پہلی گھنٹی پر اس نے کال ریسیو کر لی تھی۔
"گڈ یعنی تمہاری تیاری مکمل ہو گئی ہے۔" دوسری جانب سے جبر کی آواز میں مسکراہٹ جھلک رہی تھی۔
"بالکل بس حکم کا انتظار ہے۔" وہ بولا۔
"حکم بھی آ گیا ہے، میں نے ابھی تمہارے نمبر پر ایک پتا بھیجا ہے تمہیں اپنے سامان کے ساتھ وہاں پہنچنا ہے۔ کارروائی کا بیس کیمپ یہی جگہ ہوگی۔"
"بہتر ہے، مجھے ابھی جانا ہے یا صبح؟"
"ابھی۔" جبر نے لفظ ابھی پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "تمہیں کچھ تیاری بھی کرنا ہوگی۔ میں نے تم سے دو افراد کے بارے میں کہا تھا۔"
"جی ہاں، ان کے لیے بات کرنی ہے اور یوں سمجھیے کہ وہ میرے پاس ہیں۔"
"ٹھیک ہے، ان کو بھی تمہیں اپنے ساتھ لے جانا ہوگا، ہمارے پاس وقت بالکل نہیں ہے۔ تمہیں انہیں کل ہی استعمال کرنا ہوگا۔"
"کل......؟ کیا انہیں کوئی ٹریننگ وغیرہ نہیں دی جائے گی؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔
"نہیں۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اس کے بغیر بھی سب کچھ ہو جائے گا۔" وہ بولا۔ "تم وہاں پہنچو، وہاں تمہاری مدد کے لیے ایک شخص موجود ہے جو ان کو تیار کر دے گا۔"
"ہمیں یہ فائر ورک (آتش بازی) کل ہی کرنا ہے؟" جوزف نے پوچھا۔
"ہاں، کل بہت اچھا موقع ہے۔ اس فائر ورک کی چمک انہیں بہت عرصے تک پریشان رکھے گی۔"

میں رات کافی دیر بعد سو پائی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اپنے معمول کے مطابق میری آنکھ کھل نہیں پائی۔ عرصے سے میں الارم وغیرہ کا استعمال بہت کم کرتی تھی۔ اس کے بغیر ہی اپنے مخصوص وقت پر میری آنکھ کھل جاتی البتہ کبھی کبھار سارا سسٹم گڑبڑ بھی ہو جاتا تھا جیسا کہ آج ہوا تھا۔ گھڑی پر نظر پڑتے ہی میں بستر سے کھڑی ہوگئی۔ دوپہر ہونے والی تھی۔

"صفیہ بی! آپ نے مجھے جگایا ہی نہیں۔" مجھے دیکھ کر وہ کافی لے آئی تھیں۔

"آپ رات بہت دیر سے سوئی ہوں گی یقیناً ورنہ تو خود ہی جاگ جاتی ہیں۔ صاحب نے بھی منع کیا تھا کہ آپ کو سونے دیا جائے۔ سونیا بی بی کو ناشتا کروا کر دوا دے دی تھی۔"

"اچھا..... بابا نے ناشتا کرلیا.....؟"

"بی بی! ان کو تو گئے ہوئے بھی ایک گھنٹا ہوگیا۔" وہ بولی۔

"کہاں---؟ بابا کہاں گئے؟" میں نے بے اختیار پوچھا۔

"پتا نہیں --- کہہ رہے تھے کہ دوپہر تک آجائیں گے۔ سکندر ساتھ گیا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ آپ کا بہت شکریہ۔"

"میں ناشتا لے آؤں آپ کا؟"

"نہیں نہیں..... اب کھانا ہی کھاؤں گی۔" میں نے مسکرا کر جواب دیا اور لاؤنج کی طرف بڑھ گئی۔ میں صوفے پر بیٹھی ہی تھی کہ فون کی گھنٹی بجی۔

"بیٹا تم جاگ گئیں؟" دوسری جانب بابا تھے۔

"جی بابا! آپ کہاں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"بیٹا ایک دو ضروری کام تھے۔ سوچا تھا کہ صبح ہی نمٹا لوں مگر یہاں گاڑی کو نہ جانے کیا ہوگیا ہے۔ سکندر کوشش کر رہا ہے۔ لوگ بتا رہے ہیں کہ ایک جلوس بھی اسی طرف سے گزرنے والا ہے۔ کیا تم مجھے پک کرلوگی آکر.....؟"

"بالکل بابا! میں آرہی ہوں۔ آپ پلیز اپنی لوکیشن بھیج دیں۔" میں کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ کچھ ہی دیر میں، میں تیز رفتاری سے بابا کی بھیجی ہوئی لوکیشن کی جانب بڑھ رہی تھی۔ میں جلوس کے اس جانب پہنچنے سے قبل بابا کو وہاں سے لے جانا چاہتی تھی ورنہ رش میں ہم پھنس جاتے اور بابا کی صحت کے لیے یہ ٹھیک نہیں تھا۔

مگر یہ بات وہ تھی جو میں جانتی تھی۔ مقدر میری ہار اور مقدر مجھے کیوں اس طرف لے جا رہا تھا؟ یہ تو شاید مجھے بھی نہیں پتا تھا۔

☆☆☆

گرمی میں تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا۔ انہیں کار میں چلتے ہوئے اے سی کے باوجود پسینہ آرہا تھا۔

"صاحب! جلوس اسی طرف آرہا ہے۔ پولیس والے ساری گاڑیاں ہٹوا رہے ہیں۔" سکندر بونٹ بند کر کے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"اوہ، پھر تو اسے کسی ذیلی گلی میں لے چلو ورنہ جلوس آگیا تو ہم پھنس جائیں گے۔" وہ بولے۔ "یہ کار کو اچانک ہو کیا گیا ہے؟"

"کچھ سمجھ میں نہیں آرہا صاحب!" وہ شرمندہ لہجے میں بولا۔ "اس میں کوئی بھی مسئلہ نہیں تھا۔ سروس بھی چند دن پہلے ہی ہوئی ہے۔ پیٹرول فل ہے پھر بھی اڑیل ٹٹو کی طرح جمی کھڑی ہے۔"

"چلو بہرحال اسے ایک جانب کرلینا چاہیے پھر سارہ آرہی ہے۔ میں اس کے ساتھ چلا جاؤں گا اور تم نے مکینک سے بات کی؟"

"جی صاحب! کرلی ہے۔ میں کار کو پچھلی والی گلی میں لے جاتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے، اترتا ہوں میں بھی....." بابا نے دروازے کی جانب ہاتھ بڑھایا۔

"نہیں صاحب! آپ اندر ہی رہیں۔ میں دھکا لگالوں گا۔ یہاں سے بھی کوئی نہ کوئی ہاتھ بٹالے گا۔" وہ اور نیچے اتر گیا۔ وہ کار کو دھکا لگاتے ہوئے موڑ رہا تھا۔ وہ اس دوران ڈرائیونگ سیٹ پر آگئے تھے۔ انہیں جلوس کے بارے میں معلوم تو تھا مگر انہیں اس سے خاصا پہلے وہاں سے نکل جانا تھا۔ اگر گاڑی خراب نہ ہوتی تو اب تک تو وہ گھر بھی پہنچ چکے ہوتے۔ اندر گلی میں کئی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ سکندر کو دو افراد مل گئے تھے جن کی مدد سے وہ کار کو آگے لے جا رہا تھا۔ وہ کار کو اس گلی کے اختتام تک لے گیا جہاں سے دوسری سڑک نکلتی تھی اور بالکل کونے میں گاڑی کھڑی کردی۔ اس طرح وہ سڑک سے خاصے دور آگئے تھے۔ اب انہیں تقاریر اور نعروں کی گونج سنائی دینے لگی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ جلوس سڑک پر پہنچ چکا تھا۔

☆☆☆

جیو گھر واپس آچکا تھا۔

اس کے دونوں موبائلز پر ان دونوں لڑکوں کے نمبر موجود تھے۔ وہ ایک مخصوص ایپ کے ذریعے ان دونوں پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ مخصوص مقام پر پہنچنے کے بعد اسے ان دونوں کو کال کرنی تھی۔

ڈاکٹر سلمان نے ان دونوں کو انجکشن لگا دیا تھا۔ ان دونوں کے جانے کے بعد وہ وہاں سے نکل آیا تھا۔ وہ دونوں ہی انجکشن سے خوفزدہ تھے مگر سلمان نے انہیں بہلا لیا تھا۔

"یہ لگانا ضروری ہے کیونکہ وہاں بہت رش ہوگا۔ ہم نہیں چاہتے کہ تم کورونا لے کر آؤ۔" اس نے کہا۔

"تو کیا یہ ویکسین ہے؟ مگر میں تو ویکسین لگوا چکا ہوں، وہ دونوں بار۔" ان میں سے تیز طرار لڑکا بولا۔

"میں بھی....." دوسرے نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ "مگر ہم نے ساتھ لگوایا تھا انجکشن۔"

"یہ بوسٹر ہے اور اس کا لگانا بہت ضروری ہے۔ اگر تم اسے نہیں لگواتے تو پھر ہم کسی اور کو سر دے کا یہ کام دے دیں گے۔ ہمارے پاس بہت لوگ ہیں۔ خود ہی سوچو، اتنے آسان کام کے اتنے ڈالرز دے رہے ہیں تو کون منع کرے گا..... جب کام ہمارا ہے تو ہمارے طریقے سے ہی ہونا چاہیے کہ نہیں؟" اس نے مکاری سے پوچھا۔

"آپ جو کہیں۔ ہم نے منع تو نہیں کیا، صرف بتایا تھا۔ یہ بھی تو ضروری تھا ناتاکہ آپ کو پتا رہے اور آپ اس حوالے سے کام کرسکو۔" دوسرا لڑکا تیزی سے بولا۔

"پیسے کب ملیں گے صاحب؟" ان میں سے ایک نے پوچھا۔

"کام ختم ہوتے ہی..... جیسے ہی تم واپس آؤ گے، تمہاری رقم تیار ہوگی۔" سلمان نے اسے انجکشن لگاتے ہوئے کہا۔

"پورے ایک ایک لاکھ.....؟" دوسرے لڑکے نے رقم دہراتے ہوئے پوچھا۔

"بالکل، جو طے ہوا ہے، وہ ملے گا۔" ڈاکٹر سلمان نے کہا۔ "ویسے کرو گے کیا تم ان پیسوں سے؟" وہ ماحول کو تناؤ سے بچانے کے لیے گفتگو کیے جا رہا تھا۔

"صاب میں تو اپنا ٹھیلا لگاؤں گا تاکہ روزگار کا سلسلہ بن جائے۔"

"اور میں..... مجھے تو ماں کا علاج بھی کرانا ہے۔" خاموش طبع لڑکا بولا۔

"نام کیا ہے تم دونوں کے -؟"

"میں اصغر ہوں اور یہ پرویز ہے۔" باتونی لڑکا بولا۔ "رفیق بھائی نے ہمیں آپ کا بتایا تھا۔ وہ ہمارے محلے میں رہتے ہیں۔ ان کی وجہ سے ہی ہمیں یہ کام ملا ہے۔"

"تم گھر میں یا کسی کو بتا کر آئے ہو اس بارے میں کچھ؟" جوزف نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیا۔

"نہیں نہیں..... رفیق بھائی نے منع کیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ کام ختم ہونے سے پہلے کسی سے اس کا ذکر نہیں کرنا ہے۔" اصغر نے جواب دیا۔

"گڈ..... یہ بہت ضروری ہے۔" وہ بولا۔

رفیق سے اس کا براہِ راست کوئی تعلق یا تعارف نہیں تھا۔ کسی کے حوالے سے انہوں نے اس کے لیے یہ کام کیا تھا اور وہ حوالہ بھی اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ صرف جعلی شناختی کارڈ پر حاصل کردہ ایک سم کا نمبر اس کے پاس تھا جسے وہ ضائع کرچکا تھا۔ ان دونوں کو اچھی خاصی رقم دی گئی تھی جس کے عوض انہیں ہر صورت اپنا منہ بند رکھنا تھا۔

اسکرین پر حرکت میں نظر آنے والی دو سرخ لکیریں وہ دونوں تھے جو آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ وہ دلچسپی سے انہیں دیکھ رہا تھا پھر ان میں سے ایک لکیر رک گئی تھی۔ وہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر اس نے فون بند کر کے دوبارہ کھولا۔ ایک سرخ لکیر اب بھی رکی ہوئی تھی۔ ان کے طے شدہ پروگرام کے مطابق اسے اپنی منزل تک پہنچنے میں مزید تین منٹ درکار تھے مگر وہ مسلسل رکا ہوا تھا۔

"شاید رش کی وجہ سے وہ آگے نہیں بڑھ پا رہا۔" اس نے سوچا۔ "مگر اسے اپنا راستہ بنالینا چاہیے تھا۔" وہ اسے وقت سے پہلے کال نہیں کرسکتا تھا۔

دونوں سرخ لکیروں کے درمیان اب خاصا فاصلہ آچکا تھا۔

"نہ جانے یہ کیا کر رہا ہے؟" وہ بڑبڑایا۔

اس کی نگاہیں اسی سرخ لکیر پر جمی ہوئی تھیں۔ وقت کے لیے ٹائمر بھی چل رہا تھا جسے مقررہ وقت پر الارم بجانا تھا اور اس کے بعد اسے ان نمبروں پر کال کرنی تھی۔

جوزف کے چہرے پر اُلجھن کے آثار نمایاں تھے۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ چند لمحوں بعد کمرا بیپ کی تیز آواز سے گونج اٹھا۔ انہیں فون کرنے کا وقت ہوچکا تھا۔ جوزف نے اپنا فون اٹھایا۔ طے شدہ نمبروں میں سے ایک کو دبایا۔ اب وہ اسے کال کرنے جا رہا تھا۔

☆☆☆

"سارہ کو کافی دیر لگ گئی ہے۔" بابا اب بے چین ہو رہے تھے۔ انہوں نے جیب سے فون نکالا اور نمبر ملایا۔

"جی بابا....!" دوسری جانب سے پہلی بیل پر کال ریسیو ہو گئی تھی۔

"تم آ رہی ہو بیٹا؟"

"جی بابا! میں راستے میں ہوں۔ رش بہت زیادہ ہے۔ شاید اسی جلوس کی وجہ سے.... بس میں کچھ دیر میں پہنچ جاؤں گی۔"

"میں نے تمہیں دوبارہ لوکیشن سینڈ کی ہے۔ اب ہم مین روڈ پر نہیں ہیں بیٹا، اندر کی ایک گلی میں ہیں۔ یہاں بھی ہمیں کافی اندر جا کر جگہ ملی ہے۔"

"میں نے دیکھ لی ہے بابا!" میں نے جواب دیا۔

"میں قریب پہنچ کر آپ کو کال کروں گی۔ آپ دونوں گاڑی وہیں بند کر کے پیدل آگے آ جایئے گا۔"

"ٹھیک ہے بیٹا!" وہ بولے۔ انہیں آج نکلنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ انہوں نے سوچا۔ بہرحال، اب تو جو ہونا تھا، ہو گیا تھا۔ اب انہیں گاڑی سے نکلنے کے لیے سارہ کے فون کا انتظار تھا۔

☆☆☆

میں سڑک پر مڑی تو جلوس وہاں پہنچ چکا تھا۔ شور شرابے اور نعرے بازی سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے بابا کو کال کرنے کے بارے میں سوچا پھر چند لمحوں کے بعد کرنے کا فیصلہ کر کے گاڑی کو ایک سمت میں لگایا اور گاڑی سے اتر گئی۔

جلوس بھی وہاں ٹھہر گیا تھا۔ کسی تقریر کا آغاز ہو رہا تھا۔ ایک ورکنگ ڈے (کام کے دنوں) میں ایک مرکزی شاہراہ کو اس طرح بند کر دینا اور اتنا ہنگامہ کر پانا، یہ آزادی یہیں ممکن تھی۔ دنیا کے دوسرے مہذب شہروں میں اتنی آسانی سے یہ سب ممکن نہیں تھا۔

میں بچتی بچاتی آگے بڑھ رہی تھی کہ اچانک مجھے وہ نظر آیا۔

اس کی عمر پندرہ سولہ سال کے لگ بھگ ہوگی۔ اس نے عام سے کپڑے پہن رکھے تھے۔ یہاں موجود ہر شخص کے مانند اس کے ہاتھ میں بھی ایک موبائل تھا جسے اس نے ایک ہاتھ سے تھام رکھا تھا۔ یہ سب کچھ تو عام سا تھا مگر جس چیز نے مجھے اس کی جانب متوجہ کیا تھا، وہ اس کا انداز اور چہرہ تھا۔

اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ حتیٰ کہ اس کی آنکھوں میں بھی کوئی تاثرات نہیں تھے۔ وہ عجیب سے انداز میں تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ روبوٹ ہو یا کسی کے زیرِ اثر ہو۔ موبائل کو اس نے مخصوص انداز میں اپنے سامنے رکھا ہوا تھا جیسے اس پر اس کی منزل کی لوکیشن موجود ہو۔

اچانک اسے ایک زوردار دھکا لگا۔ یوں لگا تھا کہ جیسے اب وہ گر ہی جائے گا مگر آخری لمحوں میں اس نے خود کو سنبھالا اور مڑ کر دھکا دینے والے کی جانب گھورا۔ میں اس سے کچھ فاصلے پر تھی مگر وہاں سے میں اس کے چہرے پر آنے والی درشتی اور آنکھوں میں لپکتے شعلوں کو دیکھ سکتی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اسے جان سے مار دے گا مگر وہ صرف اسے گھور کر رہ گیا۔ اس نے منہ سے ایک لفظ تک نہیں نکالا تھا۔ صرف اسے گھورا اور آگے بڑھ گیا۔ مجھے وہ، اس کا انداز، اس کا رویہ سب بہت عجیب لگ رہا تھا۔ اس وقت سڑک پر اس رش میں کسی کے رویے یا تاثرات پر غور کرنا ویسے تو آسان یا نارمل کام نہیں تھا مگر اس نے میری چھٹی حس کو جگا دیا تھا۔

"کہیں یہ کوئی روبوٹ تو نہیں۔" اچانک ایک خیال میرے ذہن میں چمکا، اور یہاں اسے تباہی پھیلانے کے لیے بھیجا گیا ہو یا پھر کسی نے اسے ہپناٹائز کیا ہو، دونوں صورتوں میں تباہی کا خدشہ موجود تھا۔

میں نے اپنی رفتار تیز کی اور دوڑتی ہوئی اس لڑکے کے قریب پہنچنے کی کوشش کی۔ اس مجمع میں عورتوں کی تعداد تقریباً نہ ہونے کے برابر تھی اور جو تھیں بھی ان کی وضع قطع مجھ سے بہت الگ تھی۔ اسی وجہ سے میرے اس طرح بھاگنے پر سب ہی لوگ مجھے مڑ مڑ کر دیکھ رہے تھے۔ میں بالآخر اس تک پہنچ ہی گئی۔

"سنو....!" میں نے اسے آواز دی مگر یوں لگ رہا تھا کہ اس تک میری آواز پہنچ ہی نہیں پائی ہو۔

"بات سنو...." اس بار میں نے اس کے کاندھے کو چھوتے ہوئے کہا۔ وہ تیزی سے میری طرف گھوما۔ اس کے چہرے پر غصہ نمودار ہو چکا تھا۔

"تم کون ہو؟" مجھے اپنے سوال کے احمقانہ ہونے کا احساس ان الفاظ کی ادائیگی کے ساتھ ہی ہو گیا تھا۔ "میرا مطلب ہے کہ مجھے تم سے ایک منٹ کے لیے کام ہے۔ میرا فون بند ہو گیا ہے۔ کیا تم مجھے اپنا فون ایک منٹ کے لیے دے سکتے ہو؟" مجھے یہی بہانہ سوجھ پایا تھا۔

"نہیں...." وہ سخت اور غیر انسانی آواز میں بولا اور آگے بڑھنے لگا۔

"کیوں؟ صرف ایک کال کرنی ہے۔" میں نے اس کے سامنے آتے ہوئے کہا۔

"ہٹ جا...." اس نے مجھے دھکا دینا چاہا مگر میں نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

"کس طرح بات کر رہے ہو؟ کسی کی مدد کرنا کوئی بری بات تو نہیں ہے۔" ہر گزرتے لمحے کے ساتھ میرا اس پر شک بڑھتا جا رہا تھا۔ مجھے یہ تو معلوم نہیں تھا کہ یہ کیا چکر تھا مگر بہرحال کچھ نہ کچھ غلط ضرور تھا۔

"تو ایسے نہیں مانے گی۔" اس نے ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑاتے ہوئے کہا۔ اس کی عمر اور جسامت کے لحاظ سے اس کی طاقت نے مجھے مزید حیران کر دیا۔ اس کے دھکے نے مجھے لڑکھڑا دیا تھا۔

"رک جاؤ.... تم آگے نہیں بڑھ سکتے۔" میں غرائی۔

"تیری تو...." اس نے ایک گالی کے ساتھ مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں نے جھکائی دے کر اس کے گھونسے سے خود کو بچایا اور گھوم کر اس کے سینے پر فلائنگ کک جمائی۔ مجھے یقین تھا کہ یہ میرا مخصوص وار اسے زمین چٹا دے گا۔ وہ لڑکھڑا کر گرا مگر فوراً کھڑا ہو گیا اور پھر غیر انسانی آواز میں چنگھاڑتا ہوا مجھ پر حملہ آور ہوا۔ عجیب بات یہ تھی کہ اس سب کے دوران اس نے موبائل کو ہاتھ سے نہیں گرنے دیا تھا۔

میں نے اس کے حملے کو روکا اور اسے اپنی گرفت پر رکھ لیا۔ پے در پے تین چار ککس نے اسے قدرے متاثر کیا تھا۔ اس بار میرا نشانہ اس کا موبائل والا ہاتھ تھا۔ میں نے اس کے بازو پر کک لگائی جس سے موبائل اڑ کر سڑک پر جا گرا۔

موبائل کے گرتے ہی اس نے پہلے موبائل کو اور پھر مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں گویا خون اترا ہوا تھا۔

ہمارے اردگرد کافی لوگ جمع ہو گئے تھے۔ وہ غالباً کچھ سمجھ نہیں پا رہے تھے نہ ہی یہ فیصلہ کر پا رہے تھے کہ انہیں اس جھگڑے میں دخل دینا چاہیے بھی کہ نہیں۔

وہ زمین پر پڑے موبائل کی جانب لپکا جسے میں نے اپنے پیر سے کچھ آگے سرکا دیا جس پر وہ رکا اور پھر اس نے مجھ پر چھلانگ لگائی۔ اس سے پہلے کہ میں اس پر وار کر پاتی، اس نے میری گردن کو اپنے دونوں ہاتھوں میں دبوچ لیا۔

"ارے ارے، یہ کیا ہو رہا ہے؟" مجمع میں سے کوئی چلایا۔

"یہ اسے مار دینا چاہتا ہے۔ جانے کیا چکر ہے۔" کوئی اور بولا۔

"پکڑو.... الگ کرو...." کئی لوگ اسے پکڑ کر پیچھے کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں بھی اس پر ہر ممکن وار کر رہی تھی مگر اس میں ایک عجیب سی حیوانی طاقت تھی جس سے وہ کسی کے قابو میں نہیں آ رہا تھا۔

"پپ پپ پولیس...." میں بہ مشکل چلائی۔ "پولیس کو بلاؤ...." میری گردن اس کے ہاتھوں میں تھی اور مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ کسی مشین میں آ گئی ہو۔ لمحہ بہ لمحہ سانس گھٹتا جا رہا تھا اور اردگرد کا منظر دھندلاتا جا رہا تھا پھر میں نے اپنی تمام طاقت کو جمع کیا۔ اللہ کا نام لے کر اپنا دایاں گھٹنا بلند کیا اور اس کے پیٹ کے نیچے ایک زوردار ٹھوکر ماری۔ وہ اوغ کی آواز نکال کر پلٹ گیا تھا۔ وہاں موجود لوگوں کے لیے یہ ایک لمحہ کافی تھا۔ انہوں نے اسے چاروں جانب سے جکڑ لیا تھا۔ وہ انہی غیر انسانی آوازوں کے ساتھ چلا رہا تھا، گالیاں دے رہا تھا مگر ان سب کی گرفت سے نکلنا آسان نہیں تھا۔ میں نے چند لمبی گہری سانسیں لیں، اپنی گردن کو سہلایا تب جا کر میرے دم میں دم آیا۔

اتنی دیر میں پولیس بھی وہاں پہنچ گئی تھی۔

"کیا ہوا ہے میڈم؟ کیا جھگڑا ہو رہا ہے یہاں؟"

"یہ...." میں نے اپنی انگلی سے اس کی جانب اشارہ کیا۔ "اسے گرفتار کر لیں۔"

"او جی، کر لیں گے پر پہلے آپ قصہ تو بتائیں، ہوا کیا ہے؟ آخر اس نے ایسا کیا کیا ہے؟" کانسٹیبل نے بیچ میں آتے ہوئے کہا۔

وہ اب بھی تڑپ اور مچل رہا تھا۔

"آپ پہلے اسے گرفتار کریں...." میں نے دوبارہ کہا۔

"بی بی! آپ ہمیں احکامات جاری نہ کریں۔ پہلے ہی بہت سے لوگ موجود ہیں اس کام کے لیے۔" کانسٹیبل کے ساتھ موجود اے ایس آئی اکھڑ لہجے میں بولا۔ "ہمیں پتا ہے کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ کیوں اور کیسے کرنا ہے؟ آپ یہ بتاؤ کہ یہ چکر کیا ہے.... اور تو.... انسان کا بچہ بن ورنہ ہمیں آتا ہے بگڑے سانڈوں کو ہوش میں لانا۔"

اے ایس آئی کے اشارے پر لوگوں نے اسے چھوڑ دیا۔ عین اسی وقت زمین پر پڑا اس کا موبائل بج اٹھا تھا۔ وہ تیزی سے اس کی جانب لپکا مگر میں نے اسے پیر کی حرکت سے آگے بڑھا دیا۔

وہ غرا کر اس کے پیچھے آگے بڑھا۔ یہ سب اتنی سرعت کے ساتھ ہو رہا تھا کہ وہاں موجود کوئی بھی شخص کچھ

مجھے پاکر پانے کے بارے میں سوچتا ہی رہ گیا تھا۔
"یہ کیا تماشا لگایا ہے، ہٹ جا بکی تو ......" اے ایس آئی اس پادہ باز اور فون کی جانب بڑھا۔ فون مسلسل بج رہا تھا۔ اس نے فون اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا مگر اس لڑکے نے اسے دھکا دے دیا اور لپک کر فون اٹھالیا۔
"ابے سالے — تیری یہ ہمت......" اے ایس آئی غرایا اور اس نے اس کی گردن پکڑنے کی کوشش کی مگر اس میں کئی ہارس پاور کی طاقت آ گئی تھی۔ وہ اسے چکما دے کر سیدھا بھاگتا چلا گیا۔
"اسے پکڑیے — اس میں کوئی مسئلہ ہے—"
میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کہوں۔
کانسٹیبل اور کئی افراد اس کے پیچھے لپکے۔ میں نے بھی اسے پکڑنے کے لیے آگے بڑھنا چاہا مگر اے ایس آئی نے مجھے آگے نہیں بڑھنے دیا۔
"وہ بھاگ گیا ہے اور اب تم بھی بھاگ رہی ہو ...... قانون بے وقوف نہیں ہے۔ تم یہاں سے کہیں نہیں مل سکتیں۔ یو آر انڈر اریسٹ (تمہیں گرفتار کیا جا رہا ہے)۔"
"کیا بکواس ہے — میں کہہ رہی ہوں کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ آپ اُسے فوراً پکڑیں۔" میں غرائی۔ "یا مجھے جانے دیں۔"
"پکڑ رہے ہیں اُسے اور تمہیں بھی دیکھ لیں گے۔ چلو تم موبائل میں چل کر بیٹھو۔" وہ مجھے دھکا دیتے ہوئے بولا۔
"تمیز سے —" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "تم جاہل انسان اب تک نہیں سمجھ سکے کہ میں کون ہوں —— میں خفیہ سے تعلق رکھتی ہوں۔ اب ذرا بھی بدتمیزی کی تو وردی کے ساتھ ساتھ اپنی جان سے بھی جاؤ گے — بات سمجھ میں آ رہی ہے یا نہیں —"
"تم بھی — اپنی بات کا ثبوت دو۔" وہ گڑبڑا کر بولا۔
"میں سیکیں ہوں۔ ثبوت بھی دے دوں گی۔ تم پہلے اُسے پکڑو۔" میں چلائی۔
اتنی دیر میں وہ لڑکا اور اس کے پیچھے بھاگتے افراد کافی دور جا چکے تھے۔ اے ایس آئی بہت زیادہ کنفیوز ہو گیا تھا۔ میرے اعتماد نے اسے مجھ پر یقین کرنے پر مجبور کر دیا تھا مگر اس کی انا اسے پیچھے ہٹنے سے روک رہی تھی۔
میرا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ اس لڑکے کی حرکتوں، حملوں اور پھر اس سب کے باوجود موبائل لے کر اس طرح بھاگنے نے میرے شکوک و شبہات کو تقویت دی۔
میں نے اسے اے ایس آئی کو دھکا دیا اور آگے بڑھی اسی وقت ایک زوردار دھماکا سنائی دیا۔ پہلے ... بعد دوسرا دھماکا بھی ہوا جس کے بعد ... شعلوں، اڑتی گرد، دھوئیں اور خون کی ... تھا۔ اتنے فاصلے پر ہونے کے باوجود میں ... تھی اور یہ میرے لیے گویا قدرت کی جانب سے ... کیونکہ میرے پیچھے گرنے کے ساتھ ہی ... ہوا ایک بڑا لوہے کا ٹکڑا اے ایس آئی پر ... حلق میں پیوست سا ہو گیا۔ وہ اسے دونوں ہاتھوں سے نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ خون اس کی گردن سے تیزی سے بہہ رہا تھا۔
میں زمین سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔
دھوئیں اور آگ نے مجھے جھلسا دیا تھا مگر ... مجھے ساکت سا کر دیا تھا۔
ہر طرف چیخ و پکار اور واویلے کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ چند ہی لمحوں بعد ایمبولینسوں اور پولیس کے سائرن بجنا شروع ہو گئے۔
"بابا......!" اچانک کسی نے میرے ذہن پر سرگوشی کی۔
بابا بھی تو یہیں تھے۔ انہیں ہی لینے تو میں آئی تھی۔
وہ کہاں ہوں گے؟ کس حال میں ہوں گے؟
دھماکے نے انہیں کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا ہوگا؟
"بابا!" میرے ہونٹوں سے اُن کا نام چیخ کی صورت بلند ہوا اور میں تیزی سے دوسری جانب موجود لاؤنج کی جانب دوڑ پڑی۔ میرے پیچھے لوگوں کی کراہیں تھیں۔ رضاکاروں کی آوازیں تھیں۔
روکنے والے جملے تھے۔
مگر مجھے کچھ بھی دکھائی یا سنائی نہیں دے رہا تھا۔ میری آنکھیں صرف بابا کو دیکھنا چاہ رہی تھیں۔ میری سماعت ان کی آواز سننے کو بے تاب تھی۔ میرا دل ان کے لیے بے چین تھا اور میرے پیر آگ کی گرمی، سڑک پر بکھرے پتھروں، کرچیوں سے بے نیاز مجھے تیزی سے آگے ہی آگے لے جا رہے تھے۔

بے بسی کے اندھیروں میں ڈوبتی لڑکی کی دردناک داستانِ حیات کے مزید واقعات اگلے ماہ پڑھیے

جانشین

جمال دستی

ذہانت... لیاقت اور فطانت ایسی صلاحیتیں ہیں جو بچپن سے ہی نمایاں نظر آنے لگتی ہیں... اس کے پاس دولت کی کمی نہ تھی... اس نے کم عمری میں ہی دولت کمانے کا ہنر سیکھ لیا تھا... ایک دولت شناس شخص کا قصہ جس نے خود کو بے مثال جانشین ثابت کر دیا تھا...

دادا کی پوتے کے لیے انوکھی رہنمائی...... ایک انوکھے تحفے کی رونمائی......

سن میں سوچیں رواں دواں تھا۔ جیسی سن بلوغ کو پہنچ چکا تھا۔ آج وہ پورے بیس سال کا ہو گیا تھا۔ رات میں وہ اپنے دوستوں کو ایک شاندار پارٹی دینے والا تھا۔ جیسی کی سالگرہ پر وہ سب مل کر خوب موج مستی کرتے۔ جیسی کے پاس دولت کی کمی نہیں تھی۔ اس نے کم عمری میں ہی پیسے کمانے کا ہنر سیکھ لیا تھا۔ وہ دماغ کا استعمال کر کے مگر

سچا پیار

تفریح کے لیے لمبی ڈرائیو پر گئے میاں بیوی سنسان جگہ پر کار سے اتر کر ٹھنڈی ریت پر سکون کے لیے جا بیٹھے۔
کافی دیر کے بعد سرگوشی کے انداز میں خاوند کچھ کہنے کے لیے بیوی کے نزدیک ہوا تو بیوی نے شکر ادا کیا کہ آج لگتا ہے کچھ رومانوی سننے کو ملے گا۔
خاوند نے آہستگی سے کہا۔
"تجھے مار کر یہاں دبا دوں تو کسی کو تیرا پتا بھی نہیں چلے گا۔"

بیٹھے ہزاروں ڈالرز بنا رہا تھا۔
دوپہر سے تھوڑی دیر پہلے اُس کے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے فوراً کال ریسیو کرلی۔ دوسری جانب ان کی ویکیل اٹارنی جیکلین تھی۔ اس کے "ہیلو" کے جواب میں جیکلین نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔
"مسٹر جیسی! سالگرہ مبارک ہو۔"
"تھینک یو میم۔" وہ تشکرانہ انداز میں بولا۔
"آج آپ بیس سال کے ہو گئے ہیں۔" جیکلین نے معتدل انداز میں کہا۔ "کیا آپ کسی وقت میرے آفس آسکتے ہیں۔ میں آپ کو کچھ دینا چاہتی ہوں۔"
"کوئی تحفہ؟"
"بے شک ایک تحفہ ہی ہے۔"
جیسی نے بے تابی سے پوچھا۔ "کیا یہ تحفہ آپ کی طرف سے ہے؟"
"نہیں!" جیکلین نے سپاٹ آواز میں جواب دیا۔
جیسی کے استفسار میں اُلجھن در آئی۔ "پھر؟"
"یہ تحفہ آپ کے دادا جان کی طرف سے ہے۔" جیکلین نے بتایا۔
"مگر میرے دادا کے انتقال کو تو لگ بھگ دس سال ہو گئے ہیں۔" جیسی نے نیم احتجاجی لہجے میں کہا۔ "کیا آپ مجھ سے کوئی مذاق کر رہی ہیں؟"
"ہرگز نہیں مسٹر جیسی!" اٹارنی جیکلین نے دوٹوک انداز میں کہا۔ "آج سے دس سال پہلے، یعنی اپنی موت سے چند روز قبل آپ کے دادا جان نے یہ تحفہ امانتاً میرے پاس رکھوایا تھا، اس خواہش کے ساتھ کہ جب آپ بیس سال کے ہو جائیں تو میں یہ تحفہ آپ کے حوالے کر دوں...... "برتھ ڈے گفٹ" کے طور پر، سو......" کچھ توقف کر کے اٹارنی نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔
"آپ جلدی سے میرے پاس آ کر مجھ سے یہ تحفہ وصول کرلیں تاکہ میں اپنی ذمے داری سے سبکدوش ہو سکوں۔"
"ٹھیک ہے۔" جیسی نے کہا۔ "میں ایک گھنٹے میں آپ کے پاس پہنچ رہا ہوں۔"
دوسری جانب سے سیلولر رابطہ موقوف کر دیا گیا۔

☆☆☆

اٹارنی کی کال نے جیسی کے ذہن میں کھلبلی مچا دی تھی۔ اُس کے دادا جوزف کے انتقال کو دس سال گزر چکے تھے۔ وہ محض دس سال کا تھا جب جوزف اس دارِ فانی سے کوچ کر گیا تھا۔ جیسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، ایسا کیا تحفہ ہو سکتا ہے جو دادا نے دس سال پہلے اٹارنی کے پاس رکھوایا تھا، اس ہدایت کے ساتھ کہ بیس سال کی عمر میں اسے دیا جائے۔ یہ تحفہ کسی سنسنی خیز سرپرائز سے کم نہیں ہو سکتا تھا۔
انہی تجسس آمیز خیالات کے ساتھ وہ اٹارنی جیکلین کے پاس پہنچ گیا۔ جیکلین کا آفس ایک فلک بوس عمارت کے پچیسویں فلور پر واقع تھا۔ جیکلین نے سرسری انداز میں اس کا استقبال کیا اور اپنے سامنے بیٹھنے کو کہا۔ وہ اس کی میز کی دوسری جانب رکھی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔
"تو شروع کرتے ہیں۔" جیکلین نے اپنے بائیں ہاتھ پر موجود چوبی ریک میں سے ایک گتے کا مستطیل ڈبا اٹھا کر جیسی کے سامنے میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ رہا تمہارے دادا جان کا گفٹ۔"
جیسی نے بہ غور اس مستطیل ڈبے کو دیکھا جسے کسی گفٹ کے مانند ہی باقاعدہ پیک بھی کیا گیا تھا۔ جیسی کی سوالیہ نظر جیکلین کی جانب اٹھ گئی۔
"اس ڈبے کے اندر کیا ہے؟" جیسی نے بے ساختہ پوچھا۔
"میں نہیں جانتی۔" وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "کیونکہ میں نے اسے کھول کر نہیں دیکھا۔ اگر میں ایسا کرتی تو یہ امانت میں خیانت کے مترادف ہوتا۔" ذرا توقف کر کے وہ اپنی میز کی دراز کے ساتھ مصروف ہو گئی پھر وہاں سے ایک لفافہ برآمد کرتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

"جوزف نے آپ کے لیے ایک وصیت نما قانونی دستاویز بھی چھوڑی ہے جو اس لفافے کے اندر بند ہے۔ آپ اسے پڑھ لو۔ ممکن ہے کہ اس دستاویز میں، باکس کے حوالے سے کسی قسم کی معلومات یا ہدایات......"
"نہیں، نہیں......" جیسی قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔ "وکلا کی قانونی موشگافیاں کبھی میری سمجھ میں نہیں آئیں۔ اگر آپ دستاویز کو پڑھ کر آسان انگریزی میں مجھے سمجھا دیں تو یہ آپ کا مجھ پر احسان ہوگا میم۔" بات کے اختتام پر جیسی نے شک بھری نظر سے اس مستطیل ڈبے کو دیکھا جیسے اس کے اندر تحفے کے بجائے کوئی خطرناک شے پیک کی گئی ہو۔
"اچھا ٹھیک ہے۔" اٹارنی جیکلین نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ "یہ دستاویز آپ کے لیے ہے چنانچہ آپ کی اجازت سے میں اسے پڑھ سکتی ہوں۔"
اس کے بعد جیکلین نے وہ لفافہ کھول لیا اور اس کے مطالعے میں مصروف ہو گئی۔ مذکورہ دستاویز نما وہ وصیت لگ بھگ پانچ صفحات پر مشتمل تھی۔ دورانِ مطالعہ...... جیسی، اٹارنی جیکلین کے چہرے کے تاثرات کا بہ غور جائزہ بھی لیتا رہا تھا جس سے اسے یہ اندازہ لگانے میں دقت پیش نہیں آئی کہ اس وصیت کے مندرجات نہایت ہی سنسنی خیز اور انکشاف انگیز ہوں گے۔
چند منٹ کے بعد اٹارنی نے ٹٹولنے والی نظر سے جیسی کو دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز اور طنزیہ مسکراہٹ بھی ہوئی تھی۔ جیسی نے اس کی مسکراہٹ کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اضطراری لہجے میں پوچھا۔
"کیا لکھا ہے اس وصیت میں؟"
جیسی کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ کھوجتی نظر سے اسے گھورتی رہی پھر سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔ "کیا آپ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ آپ کے دادا جان ایک جیب کترے تھے، ایک پاکٹ مار؟"
جیسی کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات نمودار ہوئے۔ "ہاں!" اس نے بیزاری سے کہا۔ "میں نے ڈیڈ کی زبانی ایسی کئی ایک کہانیاں سنی ہیں مگر ان معاملات کا اس باکس سے کیا لینا دینا؟"
"آپ کے دادا کا پیغام عام وصیتوں سے کافی ہٹ کر اور منفرد قسم کا ہے اور ان سب باتوں کا اس باکس سے بڑا گہرا تعلق ہے۔" پھر اٹارنی نے انگلی سے مذکورہ مستطیل ڈبے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے توانا لہجے میں کہا۔
"اسے کھولیں مسٹر جیسی!"
چند لمحات تک جیسی خالی خالی نظروں سے اٹارنی جیکلین کو تکتا رہا۔ اس دوران میں اُس کے چہرے پر تذبذب اور ہچکچاہٹ کے تاثرات بھی پیدا ہوئے جیسے وہ کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا ہو۔ بالآخر اس نے باکس کو کھول دیا۔
کھلے ہوئے ڈبے کے اندر انسانی ہاتھ سے مشابہ ایک لمبا دستانہ رکھا ہوا تھا جس کا اگلا حصہ یعنی ہاتھ کسی گوشت پوست کے انسان کے ہاتھ ہی جیسا تھا مگر درحقیقت وہ ایک نقلی ہاتھ تھا جو شکل و شباہت اور حرکات و سکنات میں ہو بہو ایک زندہ انسان کا اصلی ہاتھ ہی نظر آتا تھا۔

"یہ ... یہ کیا ہے؟" جمی نے اُلجھی ہوئی نگاہ سے اٹارنی کو دیکھا۔

"یہ آپ کی وراثت ہے مسٹر جمی!" جیکلین نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "آپ کے دادا جان کی اس دستاویز کی وصیت سے پتا چلتا ہے کہ وہ ایک پاکٹ مار اور چور اُچکے ہوا کرتے تھے لیکن اکثر وارداتوں کے بعد وہ پکڑے جاتے تھے اور اس کا بنیادی سبب تھا ان کے فنگر پرنٹس۔" وہ سانس ہموار کرنے کے لیے تھمی پھر جمی کے چہرے پر نگاہ جما کر اپنے بیان کو جاری رکھتے ہوئے بتانے لگی۔

"دادا جان آپ سے بہت پیار کرتے تھے۔ وہ آپ کے اندر خود کو دیکھتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ آپ بھی ان کی طرح ایک جیب تراش بنیں لیکن ناکام نہیں بلکہ ماہر اور ہر لحاظ سے کامیاب جیب تراش جو کبھی پولیس کی گرفت میں نہ آئے اسی لیے انہوں نے آپ کے مستقبل کو تابناک بنانے کے لیے یہ مصنوعی "نقل مطابق اصل" ہاتھ تیار کیا تھا۔ اس لیے دستانے کو ہاتھ پر چڑھا کر آپ جو بھی جرم کریں گے، آپ کے فنگر پرنٹس کہیں بھی ثبت نہیں ہوں گے اور دیکھنے والوں کو آپ کے اس "ہاتھ" پر نقلی کا گمان بھی نہیں ہوگا۔ آپ اس ہاتھ کی مدد سے عوام کی پاکٹ مارنے کا کام بے فکری سے کر سکتے ہیں۔ اس دستاویز کے آخر میں بھی وہی ہدایات درج ہیں جیسا کہ انہوں نے مجھ سے زبانی بھی کہا تھا۔ "اس باکس کو میرے پوتے جمی کی بیسویں سالگرہ کے موقع پر ..... برتھ ڈے گفٹ کے طور پر دیا جائے۔"

جمی نے اٹارنی جیکلین کا شکریہ ادا کیا اور مذکورہ باکس اٹھا کر، بوجھل قدموں سے چلتے ہوئے آفس سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

جمی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اٹارنی کے آفس میں اسے ایسی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑے گا۔ جیکلین نے دادا جان کی وصیت کے مطابق، اسے جو بھی پڑھ کر سنایا، وہ اس کا دماغ گھمانے کے لیے کافی تھا۔ وہ متضاد سوچوں میں اُلجھے ہوئے ذہن کے ساتھ کثیر المنزلہ عمارت سے باہر آ گیا۔

نیچے سڑک کے کنارے پر جمی کی کار پارک تھی اور تھوڑے فاصلے پر کچرے کا ڈرم رکھا نظر آ رہا تھا۔ وہ سست قدموں کے ساتھ چلتے ہوئے، اس ڈرم کے پاس پہنچا پھر کچھ دیر تک اس مستطیل باکس کو سالگرہ کے تحفے ... کچرے کے ڈرم میں ڈالنے کے بعد چشمِ تصور میں ... دادا سے مخاطب ہوتے ہوئے بزبانِ خاموشی ...

"گرینڈ پا! آئی ایم ویری سوری۔ میں نے ... کے محبت سے بھیجے ہوئے "برتھ ڈے گفٹ" کو کوڑے میں ڈال دیا۔ آپ اسے میری ایک مجبوری سمجھ کر معاف کر دیجیے گا جیسا کہ میں نے آپ کی بھی ... کی مجبوری کو معاف کر دیا ہے۔ اس وقت آپ ... جانتے تھے کہ دس سال کے بعد امریکا کہاں سے کہاں پہنچ جائے گا۔ ابھی حال ہی میں ایک نیا قانون نافذ کیا گیا ہے جس کے مطابق، پورے امریکا میں، کسی بھی سطح پر ... نوٹوں کا لین دین ممنوع بلکہ سنگین جرم قرار دے دیا گیا ہے۔ اس قانون کی خلاف ورزی کرنے والے ... بھاری جرمانے کے علاوہ کئی سال کی سزا بھی کاٹنا پڑے گی۔ آپ جانتے ہیں، امریکی عوام موت سے ڈریں یا نہ ڈریں مگر جیل جانے کے تصور ہی سے خوف زدہ ہوتے ہیں لہٰذا پورے امریکا میں اب لوگ اپنے بٹوے، پرس اور جیب میں کیش رقم کے بجائے پلاسٹک منی یعنی ڈیبٹ اور کریڈٹ کارڈ رکھتے ہیں اور ان کارڈز کے حصول کی خاطر کسی کی پاکٹ مارنا ایسا ہی ہے جیسے کسی کچرے کے ڈھیر پر سے جوس، سگریٹ اور بسکٹ کے خالی ڈبے چننا۔"

جمی اپنی کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا پھر گاڑی کو اسٹارٹ کرنے سے پہلے اس نے بہ آوازِ بلند اپنے دادا سے کہا۔

"گرینڈ پا! اس وقت آپ جہاں بھی ہیں، آپ کو میری باتیں سن کر مایوس یا افسردہ ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ آج ہم لوگ ہاتھ پاؤں کی نہیں بلکہ صرف ذہن کی دنیا میں سانس لے رہے ہیں چنانچہ ہمیں فنگر پرنٹس سے پکڑے جانے کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ ہم سوچ کی انگلیوں سے اپنے ٹارگٹ کی جنس "ہیک" کرتے ہیں۔ آپ خوش ہو جائیں کہ میں آپ کا سچا جانشین ثابت ہوا ہوں۔" اس نے کار کے اگنیشن میں چابی گھمائی اور یہ کہتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دی۔

"سائبر کرائمز کی دنیا میں چار ایسے امریکی ہیکرز پائے جاتے ہیں جو آج تک قانون کی گرفت میں نہیں آئے اور ان میں سے ایک آپ کا یہ ہونہار پوتا جمی بھی ہے۔"

❖❖❖

شہ مات

زہرا بتول

خواہش پر قابو پانے کے لیے بہت سا وقت صرف کرنا پڑتا ہے... مگر عجلت پسند نہ تو وقت کو تھامتے ہیں اور نہ ہی اپنی خواہش سے دست بردار ہوتے ہیں... وہ بس اپنی مرضی چاہتے ہیں... مرد اور عورت وقت کا ایک مخصوص دورانیہ جو ایک دوسرے کے ساتھ بتا چکے ہوتے ہیں... اسے فراموش کر کے فرار کی کوششوں میں لگ جاتے ہیں... نہلے پہ دہلا جیسے ہی جوڑے کی چال بازی...

جیت کے نشے میں مست شاطر محبوب کی ساز بازی......

وہ اپنی بیوی سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا مگر اس طرح کہ کوئی اس کی طرف انگلی نہ اٹھائے۔ اس کے پاس ملت کی کمی نہیں تھی۔ وہ طلاق کا کارڈ استعمال کر کے للی کو بہ آسانی اپنی زندگی سے نکال سکتا تھا لیکن یہ راستہ خطرے سے خالی نہیں تھا کیونکہ اس صورت میں للی کی زبان کھل جاتی جو اس کے لیے کسی بڑی تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی تھی۔ وہ کچھ ایسا چاہتا تھا کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی سلامت رہے۔

وہ کافی دنوں سے اپنی اس پریشانی کو ذہن میں بٹھا کر اس کے حل کے لیے گہری سوچ بچار کر رہا تھا مگر کوئی محفوظ راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا پھر ایک روز یہ مسئلہ حل ہو گیا۔ وہ اپنے آفس میں بیٹھا تھا کہ اس کی سیکریٹری نے انٹرکام پر اطلاع دی۔

"سر! ایک صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ وہ پہلے بھی کئی بار آ چکے ہیں مگر آپ کی مصروفیت کو دیکھتے ہوئے ملاقات نہیں ہو سکی۔"

واصف کریم نے پوچھا۔ "ان صاحب کا نام کیا ہے اور

وہ کس سلسلے میں مجھ سے ملنا چاہتے ہیں؟"
اتفاق سے اس وقت واصف کریم بالکل فارغ بیٹھا تھا۔ شاید اسی لیے اس کی سیکریٹری نگہت نے یہ بات بھی کر دی تھی۔ وہ واصف کے مزاج سے واقف تھی۔

"ان کا نام نوید علی ہے۔" نگہت نے بتایا۔ "اور وہ کسی انشورنس کمپنی کی طرف سے آئے ہیں۔"

"نگہت! آپ جانتی ہیں نا یہ انشورنس والے کتنے چپکو ہوتے ہیں۔" واصف نے کہا۔ "اس قسم کے لوگوں سے مغز ماری کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔"

"سر! آپ کہیں تو میں انہیں منع کر دیتی ہوں۔"

"نہیں....!" ایک فوری خیال کے تحت واصف نے کہا۔ "تم انہیں اندر بھیج دو۔"

"اوکے سر!" نگہت نے شائستہ لہجے میں کہا۔

پتا نہیں نوید علی کی قسمت اچھی تھی یا واصف کا دریائے سخاوت موج پر تھا جو تمام تر ناپسندیدگی کے باوجود بھی اس نے ملاقاتی کو اپنے پاس بلا لیا۔ دو منٹ کے بعد ہی نوید علی اس کے سامنے بیٹھا تھا۔

واصف نے آج تک کئی انشورنس ایجنٹس سے ملاقاتیں کی تھیں مگر یہ بندہ ان سب سے مختلف دکھائی دیتا تھا۔ دراز قامت، وجیہ، اسمارٹ اور خوش لباس۔ اپنی بات چیت سے بھی وہ تعلیم یافتہ اور سلجھا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد واصف نے کہا۔

"نوید صاحب! آپ کے لیے ٹھنڈا منگواؤں یا گرم؟"

"سر! حرارت زندگی ہے اور ٹھنڈک موت۔" وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولا۔ "چینی قوم نے اس نکتے کو صدیوں پہلے پا لیا تھا اور اس پر نہایت مستقل مزاجی کے ساتھ کاربند بھی ہیں۔ آپ دیکھ لیں، چائنا کے اسپتال خالی پڑے رہتے ہیں اور پارکس میں تل دھرنے کی جگہ نظر نہیں آتی۔"

"آپ انشورنس ایجنٹ ہیں یا کوئی فلسفی؟" واصف نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

"ان دونوں میں سے کچھ بھی نہیں۔" نوید نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "چند سال پہلے میں نے ایم بی اے کیا تھا مگر دو تین سال تک اپنے پروفیشن سے مطابقت رکھنے والے شعبے زیادہ کرتا رہا لیکن کہیں بھی خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی حتیٰ کہ کوئی بینک بھی پچیس ہزار سے زیادہ کی جاب نہیں دے رہا تھا۔ بس پھر......" اس نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا اور اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"بس پھر کیا۔ میں نے اپنی بقا کی جنگ میں سرخرو ہونے کے لیے یہ کام شروع کر دیا۔ انسان بہت ہی بے بس ہے سر! حالات اور وقت اسے جس سمت لے جا کر، چاہیں چھوڑ دیتے ہیں.... نو وے ٹو اسکیپ!"

"انٹرسٹنگ!" واصف نے توصیفی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ "چائے اور کافی دونوں حرارت بخش ہیں۔ آپ ان میں سے کیا لینا پسند کریں گے؟"

"کافی سر!" نوید نے فوراً جواب دیا۔ "کافی، چائے کی بہ نسبت کم نقصان دہ اور زیادہ حرارت بخش ہے۔"

واصف نے اثبات میں گردن ہلائی اور انٹرکام پر دو کافی کا کہہ کر دوبارہ نوید کی طرف متوجہ ہو گیا اور پوچھا۔

"انشورنس کا کام کرتے ہوئے آپ کو کتنا عرصہ ہو گیا ہے؟"

"صرف تین ماہ سر!" نوید نے جواب دیا۔

"نوید صاحب! آپ کی صاف گوئی مجھے پسند آئی ہے۔" واصف نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "اس وقت من حیث القوم ہم دروغ گوئی، منافقت اور دھوکا دہی کے مرض کا شکار ہو چکے ہیں۔ ایسے میں کوئی راست گوئی کا مظاہرہ کرے تو ہمیں اس کی بات کا بالکل یقین نہیں آتا۔"

"اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ آپ کو میرے کسی بیان پر یقین نہیں آیا؟" نوید نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

"ایسی بات نہیں ہے نوید صاحب!" واصف نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "آپ حقیقت بیان کر رہے ہیں۔ میں مارکیٹ میں بیٹھا ہوں اور ملک کے معاشی و معاشرتی امور پر میری گہری نظر ہے۔ میں جانتا ہوں۔ سچ بہت کڑوا ہوتا ہے۔ میں حقائق کی کڑواہٹ اور تلخی کو پینے کا عادی ہو چکا ہوں۔ آپ نے اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کی جس ناقدری اور بے وقعتی کا ذکر کیا ہے، اسے محسوس کر سکتا ہوں۔ آپ تین ماہ سے انشورنس پالیسیز بیچتے پھر رہے ہیں جبکہ اس فیلڈ میں آپ کا کوئی تجربہ بھی نہیں ہے۔ یہاں تو ایسے ایسے گھاگ انشورنس ایجنٹ بیٹھے ہیں کہ اس شعبے میں نئے آنے والوں کو وہ سانس لینے کا بھی موقع نہیں دیتے۔ آپ کو بڑی مشکلات سے گزرنا پڑ رہا ہوگا؟"

گفتگو کے دوران میں واصف بہ نظرِ غور نوید علی کی ایک ایک چیز کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔ واصف ایڈورٹائزنگ اور مارکیٹنگ کا کنگ تھا اور کروڑوں کا بزنس خوش اسلوبی سے چلا رہا تھا۔ پبلک ڈیلنگ نے اسے مستند مردم شناس بنا دیا تھا۔

"کوئی مشکل، کوئی پریشانی نہیں سر!" نوید نے پُراعتماد لہجے میں جواب دیا۔ "یہ کام تو میں نے چند روز ہی میں سیکھ لیا

ہے۔"

"وہ کیسے؟" واصف نے الجھن زدہ نظر سے اسے دیکھا۔ "میں جاننا چاہوں گا اگر آپ اپنا یہ راز مجھ سے شیئر کرنا پسند کریں تو......؟"

اسی وقت ان کے لیے کافی آ گئی۔ ان کی بات چیت میں چند لمحات کا تعطل پیدا ہوا پھر کافی کا پہلا سپ لینے کے بعد نوید نے جواب دیا۔

"سر! لائف انشورنس پالیسی بیچنا ایسا ہی ہے جیسے بس میں سرمہ اور کنگھی بیچنا یا پھر مجمع لگا کر سانڈے کا تیل فروخت کرنا۔ بس بیچنے والے کے لہجے میں اعتماد اور بیانیے میں تاثیر ہونا چاہیے۔ کلائنٹ تو بس یوں پھنستا ہے......" بات کے اختتام پر اس نے چٹکی بجا کر اپنی بات کو مکمل بھی کر دیا۔

"آپ کے لہجے کا اعتماد اور باتوں کی تاثیر کا تو میں قائل ہو گیا ہوں نوید صاحب!" واصف نے کافی کا مگ اپنے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ "آپ اپنے کلائنٹ کو گھیرنے کا فن جانتے ہیں۔"

"تھینک یو سر!" اس نے تشکرانہ انداز میں کہا پھر اپنے پہلو میں فرش پر رکھا بریف کیس اٹھا کر میز پر رکھا اور اسے کھول کر چند کاغذات برآمد کر لیے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنا قلم بھی سنبھال لیا۔

"یہ آپ کیا کرنے جا رہے ہیں؟" واصف نے چونکے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

"جب آپ مجھ سے متاثر ہو ہی گئے ہیں تو ایک پالیسی تو بنتی ہی ہے نا۔" نوید علی نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔" واصف نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ "میں نے پہلے ہی کئی ایک پالیسیز خرید رکھی ہیں۔ ہاں، آپ کے لیے میرے پاس ایک بہتر جاب ہے جو آپ کی شخصیت سے مطابقت بھی رکھتی ہے۔ سچ پوچھیں تو یہ انشورنس والا کام آپ جیسے آدمی کے لیے موزوں نہیں ہے۔ اس میں بہت زیادہ ذلیل خوار ہونا پڑتا ہے اور بعض اوقات تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کلائنٹ کی قدم بوسی کے بعد ہی گوہرِ مراد ہاتھ آئے گا۔"

"یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں سر!" وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "ایسا لگتا ہے جیسے آپ نے بھی کبھی اس فیلڈ کا مزہ چکھ رکھا ہے۔"

"آپ کا اندازہ غلط نہیں ہے نوید صاحب!" واصف نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "برسوں پہلے، اپنے کیریئر کی ابتدا میں مجھے بھی چند ماہ یہ کام کرنے کا تجربہ ہوا تھا۔ بعض ایسے کینے اور ہیلے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے کہ ان کی الٹی سیدھی جرح سن کر جی چاہتا ہے ان کا گلا گھونٹ ڈالیں۔"

"میں آپ سے مکمل اتفاق کرتا ہوں سر!" نوید نے معتدل انداز میں کہا پھر اپنی دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ "آپ کسی جاب کا ذکر کر رہے تھے؟"

"ہاں!" واصف سر کی اثباتی جنبش سے بولا۔ "جاب پر ہم بعد میں بات کریں گے پہلے آپ مجھے یہ بتائیں کہ ان تین ماہ میں آپ نے پرافٹ کتنے روپے کمائے ہیں؟"

"پرافٹ کا حساب لگانا تو مشکل ہے سر!" اس نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ "بس یوں سمجھ لیں کہ ان تین ماہ میں کل ملا کر میں نے ایک لاکھ روپے کمائے ہیں۔"

"یعنی اوسطاً تینتیس ہزار ماہوار۔" واصف نے کہا۔ "ایک ایم بی اے شخص کے لیے یہ آمدنی خاصی شرمناک ہے۔"

"سو تو ہے۔" نوید کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ "وہ کیا کہتے ہیں کہ...... مجبوری میں انسان گدھے کو بھی باپ بنا لیتا ہے۔"

"میں آپ کو مجبوری میں اس حد تک نہیں گرنے دوں گا نوید صاحب!" واصف نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ "آج شام میں آپ کی کیا مصروفیات ہیں؟"

"نت نئی روٹی، نت نئی فکر ہے......" وہ ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ "میرے خیال میں انسان کی زندگی میں غمِ روزگار سے بڑا اور کوئی دکھ نہیں ہے۔"

"تو سمجھ لیں آج سے آپ کے دکھ درد اور غم دالم رخصت ہوئے۔" واصف نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "ابھی آفس میں میری ایک دو ضروری میٹنگز ہیں۔ آپ شام میں ٹھیک سات بجے مجھے کینے بلوم میں ملیں پھر سکون سے بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔"

"کینے بلوم......!" نوید علی نے زیرِ لب دہرایا۔ "یہ وہی کینے بلوم ہے جو جوہری سائنڈ کی طرف واقع ہے؟"

"بالکل وہی۔" واصف نے تصدیقی انداز میں کہا۔

کافی ختم ہونے تک وہ تازہ ترین ملکی حالات پر بات کرتے رہے پھر نوید، واصف کا شکریہ ادا کر کے وہاں سے رخصت ہو گیا۔

☆☆☆

واصف کریم اس شہر کا ایک کامیاب بزنس مین تھا۔ اس نے ایڈورٹائزنگ اور مارکیٹنگ کی دنیا میں بہت نام کمایا تھا۔ وہ تعلیم کے میدان میں محض میٹرک تھا لیکن اس کی مستقل مزاجی

اور لگتا تھا بخت نے اسے زمین سے آسمان تک پہنچا دیا تھا۔ شاہراہ فیصل کی ایک بلند و بالا عالیشان بلڈنگ میں وہ پورے ایک فلور کا آفس لیے بیٹھا تھا۔ اس کی کمپنی کا نام "مارننگ اسٹار" تھا جس میں بیس سے لے کر جنرل منیجر تک درجن بھر افراد کمپنی کے دست و بازو بن کر کام کرتے تھے۔ لینڈ کروزر اس کے علاوہ تھی۔ اس کے پاس عزت، دولت، شہرت سبھی کچھ تو تھا مگر اس کے باوجود بھی اس کے احساس میں ایک کانٹا سا چبھا ہوا تھا جو اسے دن رات بے چین رکھتا تھا۔ اس کا المیہ یہ تھا کہ وہ اپنے اس دکھ کو کسی کے سامنے بیان بھی نہیں کرسکتا تھا لیکن اب نوید علی کو دیکھ کر اسے اپنا مسئلہ حل ہوتا نظر آ رہا تھا۔

نوید نے اسے انکار کی کوفت سے نہیں گزارا۔ جب واصف کیفے بلوم پہنچا تو نوید پہلے سے وہاں موجود تھا۔ کیفے بلوم کا ماحول بہت ہی پُرسکون اور فرحت بخش تھا۔ ساحلِ سمندر پر واقع ہونے کے باعث اس کی فضا میں ایک منفرد سی رومان پرور سی خوشبو رچی بسی تھی جو انسان کے احساسات میں ایک کیف آور کرنٹ سا دوڑا دیتی تھی۔

آرڈر کرنے کے بعد ان کے بیچ گفتگو کا سلسلہ چل پڑا۔ نوید علی تھا پُرجوش دکھائی دیتا تھا۔ واصف نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ایک غیر متوقع سوال کیا۔

"مسٹر نوید! آپ نے کبھی محبت کی ہے؟"

"ایسا کوئی خوشگوار تجربہ ابھی تک میری زندگی کی کتاب میں درج نہیں ہوا سر۔" نوید نے جواب دیا۔ "لیکن آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"اس لیے کہ میں جو جاب آپ کو آفر کرنے والا ہوں، اس کا تعلق محبت سے ہے۔" واصف نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "آپ کو ایک حسین عورت سے محبت کا ناٹک کرنا ہوگا۔"

واصف کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی نوید نے پوچھ لیا۔ "اگر مجھے اس حسینہ سے اصلی محبت ہوگئی تو؟"

"آئی ڈونٹ کیئر۔" واصف نے بے پروائی سے کہا۔ "آپ اس سے اصلی محبت کریں یا نقلی، اس سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مجھے صرف کچھ ثبوت چاہئیں جن سے ظاہر ہوتا ہو کہ وہ عورت شادی شدہ ہونے کے باوجود بھی ایک نامحرم مرد سے افیئر چلا رہی ہے۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟"

"سر! میری سمجھ میں تو یہی آ رہا ہے کہ یہ کوئی بلیک میلنگ کا معاملہ ہے۔" نوید نے اپنا خیال ظاہر کرنے میں کسی ہچکچاہٹ سے کام نہیں لیا۔ "آپ ان ثبوتوں کی مدد سے اس خوب صورت عورت کو بلیک میل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟"

"آپ اسے کاؤنٹر بلیک میلنگ کہیں تو زیادہ مناسب ہوگا مسٹر نوید!" واصف نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "دراصل اس عورت کے ہاتھ میری زندگی کا ایک اہم راز لگ گیا ہے جس کے بل بوتے پر وہ میری خانگی زندگی کو تہس نہس کرنے کی پلاننگ کر رہی ہے جبکہ اس نے یہ کام شروع بھی کردیا ہے۔ میرے پاس دولت کی کوئی کمی نہیں۔ اگر وہ مجھ سے رقم کا مطالبہ کرتی تو میں اسے منہ مانگے پیسے دے کر راضی کر لیتا لیکن اس نے تو مجھے برباد کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ اگر اس نے میرے راز کو آشکار کردیا تو میری برسوں کی محنت سے بنی ہوئی عزت خاک میں مل جائے گی۔ میں یک لخت آسمان سے زمین پر آ گروں گا۔ چنانچہ میں یہ چاہتا ہوں کہ اس کے کسی خطرناک اقدام سے پہلے ہی میں اس کے خلاف کچھ ایسے ثبوت جمع کرلوں جس کی بنا پر میں اسے اس کے خطرناک اور تباہ کن ارادے سے باز رکھ سکوں۔" وہ سانس ہموار کرنے کے لیے تھم کر پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"میں آپ کو اس عورت کے بارے میں مکمل معلومات فراہم کردوں گا۔ اس کا نام، ایڈریس، ٹیلی فون نمبر، دن بھر کی مصروفیات اور چند تصاویر بھی۔"

"لیکن سر! اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ وہ عورت بھی مجھ سے محبت کرنے کے لیے تیار ہوجائے گی؟" نوید نے نہایت اہم سوال کیا۔

"میری تجربہ کار آنکھوں نے آپ کے اندر وہ ٹیلنٹ دیکھ لیا ہے جس کا استعمال کرکے آپ کسی کو بھی اپنا گرویدہ بنا سکتے ہیں۔" واصف نے معتدل انداز میں کہا۔ "اس دلکش عورت نے آپ ہی کی طرح ایم بی اے کر رکھا ہے اور اس وقت وہ اپنا ایک کامیاب بزنس چلا رہی ہے۔ آپ اسے ایک ایکٹیو بزنس ویمن کہہ سکتے ہیں۔ وہ مختلف ٹیلرز سے لیڈیز ڈریس تیار کرانے کے بعد انہیں سعودی عرب اور پورے یو اے ای میں بھیجتی ہے۔ بھیجتی کیا ہے، خود اپنے ساتھ لے کر جاتی ہے۔ وہ کوئی باقاعدہ ایکسپورٹر نہیں ہے مگر کام ایکسپورٹ ہی کا کر رہی ہے اور ہزاروں نہیں، لاکھوں کما رہی ہے۔" لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

"آپ کس طرح اس کے قریب جائیں گے اور کیسے اسے اپنی محبت کے جال میں پھنسائیں گے، یہ سوچنا آپ کا کام ہے۔ اگر آپ میرے لیے یہ جاب کرنے کو تیار ہیں تو ہم آگے بات کریں ورنہ اس کیفے سے اٹھنے کے بعد ہم دونوں

ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہوجائیں گے۔"

واصف بات مکمل کرنے کے بعد سوالیہ نظروں سے نوید علی کو تکنے لگا تو نوید نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

"سر! کسی فیصلے تک پہنچنے سے پہلے میں آپ سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔"

"یہ تو آپ کا حق ہے نوید صاحب!" واصف نے دوستانہ انداز میں کہا۔ "میں ایک بزنس مین ہوں اور بزنس میں سامنے والے کو اسپیس دینے کا قائل ہوں۔ آپ مجھ سے جو بھی پوچھنا چاہتے ہیں، بے دھڑک پوچھیں۔"

"اگر میں آپ کا یہ کام کرنے کے لیے اپنی آمادگی ظاہر کردیتا ہوں تو اس کے بدلے میں آپ مجھے کیا دیں گے؟" نوید نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ "اس کام کی تکمیل کا ٹائم فریم کیا ہے اور کیا آپ مجھے یہ بتانا پسند کریں گے کہ اس بزنس ویمن کی آپ سے کیا دشمنی ہے؟ وہ آپ کو کیوں برباد کرنا چاہتی ہے؟"

"جب ہم بزنس کی دنیا میں داخل ہوتے ہیں تو وہاں ہمارے دوست کم اور دشمن زیادہ ہوتے ہیں مسٹر نوید!" واصف نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔ "کسی زمانے میں میرے ہاتھوں اس خاتون کو کوئی نقصان پہنچا تھا جس کا بدلہ وہ اب لے رہی ہے۔ پتا نہیں، کہاں سے میرا ایک راز اس کے ہاتھ لگ گیا ہے۔ خیر...... یہ معاملہ آپ سے متعلق نہیں ہے۔ آپ اپنے کام پر فوکس کریں گے تو سب ٹھیک رہے گا۔ آپ ینگ اینڈ اسمارٹ ہیں۔ آپ کو گفتگو کرنے کا فن آتا ہے۔ آپ کے اندر بے پناہ مارکیٹنگ اسکلز بھری ہوئی ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ آپ دونوں نے ایک ہی ٹائپ کی ایجوکیشن لے رکھی ہے لہٰذا اس عورت کے نزدیک پہنچنا، اسے اپنی محبت کا اسیر کرنا اور اس کے ساتھ مختلف پبلک پلیسز پر وقت گزارنا آپ کے بائیں ہاتھ کا کام ہوگا۔"

"ٹھیک ہے سر! اب میں آپ سے یہ نہیں پوچھوں گا کہ آپ کے اور اس عورت کے بیچ کیا چل رہا ہے۔" نوید نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "آپ جلدی سے میرے باقی سوالوں کا جواب دے دیں تاکہ مجھے کوئی فیصلہ کرنے میں آسانی ہوجائے۔"

"ٹائم فریم اور اس رومانک جاب کا معاوضہ؟" واصف نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے پوچھا۔ "آپ یہی جاننا چاہتے ہیں نا؟"

"یس سر!" نوید نے سپاٹ آواز میں کہا۔

"میں اس مشن کے لیے تمہیں دو ماہ کا وقت دوں گا۔ تمہیں کوشش کرکے اس کام کو دی ہوئی مدت سے پہلے ہی پایۂ تکمیل تک پہنچانا ہے۔" واصف نے دوٹوک انداز میں کہا۔ "اور اس جاب کا معاوضہ ہوگا پورے پانچ لاکھ روپے۔ ڈھائی لاکھ روپے ایڈوانس اور باقی کے ڈھائی لاکھ اس وقت جب تم میری مطلوبہ چیزیں مجھے فراہم کردو گے یعنی اس عورت کی بے وفائی کے ٹھوس ثبوت۔"

"ڈھائی لاکھ ایڈوانس......" نوید نے واصف کے الفاظ کو دہرایا۔ "ناٹ بیڈ!" پھر وہ واصف کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مستفسر ہوا۔ "سر! اگر میں ایڈوانس کے ڈھائی لاکھ روپے لے کر فرار ہوگیا تو؟"

"فرار ہونے والی شکلیں ایسی نہیں ہوتیں۔" واصف نے اس کے چہرے کی جانب انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے پُراعتماد انداز میں کہا۔ "میں نے اپنے بال دھوپ میں سفید نہیں کیے ہیں۔ میرا تجربہ مجھے دھوکا دے سکتا ہے اور نہ ہی تم۔"

اس گفتگو کے دوران میں واصف "آپ" سے "تم" پر اتر آیا تھا تاہم نوید نے اس کے اس طرزِ تکلم کا بُرا نہیں منایا اور فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"ڈن سر! مجھے یہ ڈیل منظور ہے۔"

واصف نے اپنے ہینڈ بیگ سے چیک بک نکالی اور ڈھائی لاکھ مالیت کا ایک چیک لکھ کر اسے نوید کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ "جب یہ چیک کیش ہوجائے تو تم اپنے کام کا آغاز کردینا اور اب میں تمہیں، تمہارے ٹارگٹ کے بارے میں تفصیلات سے آگاہ کرتا ہوں۔"

نوید نے اثبات میں سر ہلایا اور ہمہ تن گوش ہوگیا۔

☆☆☆

واصف نے کچھ سچی، کچھ جھوٹی کہانی سنا کر نوید علی کو اپنے شیشے میں اتار لیا تھا اور اسے اُمید تھی کہ یہ ملٹی ٹیلنٹڈ شخص لیلیٰ صدیقی کی بے وفائی کے ٹھوس اور ناقابلِ تردید ثبوت اکٹھا کرنے میں کامیاب ہوجائے گا۔ اس کے بعد واصف کا کام آسان ہوجائے گا۔

واصف ایک آدھ روز کے بعد فون کرکے نوید کی کارکردگی کی رپورٹ حاصل کرتا رہتا تھا اور وہ اس کی کارگزاری سے کلی طور پر مطمئن تھا۔ لگ بھگ بیس دن بعد وہ دونوں ایک بار پھر کیفے بلوم میں بیٹھے ہوئے تھے۔

نوید نے ایک پھولا ہوا لفافہ واصف کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ "سر! آپ اسے دیکھ لیں۔"

واصف نے اس کے ہاتھ سے مذکورہ لفافہ لے کر کھولا تو اس کے اندر پوسٹ کارڈ سائز کی درجن بھر تصاویر بھری ہوئی

تھیں۔ ہر تصویر میں لیلیٰ اور نوید ایک ساتھ بیٹھے یا کھڑے نظر آرہے تھے اور خاصے خوشگوار موڈ میں بھی۔ انہیں اور ان کے پوز کو دیکھ کر یہ واضح ہوجاتا تھا کہ ان کے بیچ کوئی گہرا جذباتی رشتہ موجود ہے۔

"تم نے بہت اچھا کام کیا ہے۔" جب سے واصف نے نوید کو اپنی جاب پر رکھا تھا، وہ اسے آپ کے بجائے تم ہی سے مخاطب کرنے لگا تھا۔ "لیکن یہ کافی نہیں ہے۔ یہ تمام اسٹل پکچرز ہیں جن میں سے زیادہ تر سیلفی کے زمرے میں آتی ہیں۔ مجھے کچھ آڈیو، ویڈیو کانٹینٹ وِدھ ڈیٹ اینڈ ٹائم بھی چاہیے۔ میری بات سمجھ رہے ہونا؟"

"سمجھ گیا سر!" نوید نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "آئندہ ملاقات میں، میں آپ کی یہ ڈیمانڈ بھی پوری کردوں گا۔"

"ویری گڈ!" واصف نے توصیفی نظر سے اسے دیکھا۔

ایک ہفتے کے بعد انہوں نے پھر ملاقات کی۔ اب کی بار نوید، واصف کی پسند کا مال لایا تھا۔ ان آڈیو، ویڈیو کلپس میں نوید اور لیلیٰ ایک دوسرے سے اس طرح جڑ کر بیٹھے تھے کہ یک جان دو قالب والی ترکیب گویا انہی کے لیے ترتیب دی ہوئی لگتی تھی۔ ان میں سے بیشتر کلپس ریسٹورنٹس، پارکس اور لیلیٰ کی گاڑی کے اندرونی حصے کے تھے۔ کئی ایک مقامات پر انہوں نے بڑے پیار سے ایک دوسرے کا ہاتھ بھی تھام رکھا تھا اور رومان بھری باتیں کرتے دکھائی اور سنائی دیتے تھے۔ ایک کلپ میں تو وہ اپنی شادی کی پلاننگ بھی کررہے تھے۔

"ویل ڈن!" واصف نے تعریفی نظر سے نوید کو دیکھا اور کہا۔ "یار! تم نے میرا دل خوش کردیا ہے۔"

"سر! آپ بادشاہ ہیں۔" نوید نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا اور پوچھا۔ "کیا آپ کو معلوم ہے کہ بادشاہ سلامت ایسے مواقع پر کیا کرتے ہیں؟"

اگر معلوم ہو تو بھی میں تمہاری زبان سے سننا چاہوں گا۔" واصف اسے متوقع ہوئی نظر سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "ہاں، تو بتاؤ پھر؟"

"بادشاہ سلامت دو کاموں کے بہت ماہر ہوتے ہیں سر!" نوید نے معتدل انداز میں کہا۔ "وہ جس بندے سے خفا ہوں، اس کا سر قلم کروادیتے ہیں اور یا پھر اسے قید میں ڈلوادیتے ہیں اور جس بندے سے خوش ہوں، اس کے لیے اپنے خزانے کا منہ کھول دیتے ہیں۔" لمحاتی توقف کرکے اس نے امید بھری نظر سے واصف کو دیکھا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"سر! میں آپ سے ایسا کوئی مطالبہ نہیں کروں گا کہ آپ مجھے مالا مال کردیں لیکن یہ تو ثابت ہوچکا کہ میں نے اپنی جاب کو بہ طریق احسن مکمل کردیا ہے اور آپ میری کارکردگی سے مطمئن اور خوش بھی ہیں لہٰذا آپ سے میری درخواست ہے کہ ڈیل کے مطابق آپ باقی کے ڈھائی لاکھ بھی مجھے ادا کردیں۔"

"صرف ڈھائی لاکھ ہی نہیں بلکہ میں تمہیں بونس میں ایک لاکھ مزید بھی دوں گا لیکن ایک آخری کام کرنے کے بعد۔"

"آخری کام!" نوید نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔ "میں سمجھا نہیں سر؟"

"تم نے لیلیٰ سے آخری محبت بھری ملاقات کے لیے کسی شاندار ہوٹل میں ایک کمرا بک کرنا ہے۔" واصف نے اسے اپنے منصوبے سے آگاہ کرتے ہوئے بولا۔ "میں عین وقت پر اس کمرے میں پہنچ کر تم دونوں کو رنگے ہاتھوں چونچیں لڑاتے دیکھوں گا۔ یہ اس ڈرامے کا ڈراپ سین ہوگا۔"

"سمجھ گیا سر! آپ کو تو اسکرپٹ رائٹر ہونا چاہیے۔" نوید نے توصیفی انداز میں کہا۔ "میں یہ کام کرنے کے بعد آپ کو ہوٹل کا نام اور کمرا نمبر بتادوں گا۔"

"مقامی لوگوں کو ہوٹل میں کمرا لیتے ہوئے پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔" واصف نے کہا۔ "اگر کوئی مشکل پیش آئے تو مجھے بتانا۔ میں یہ کام کرادوں گا۔"

"آپ بے فکر ہوجائیں سر!" نوید نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ "ہوٹل لائن میں میرا ایک جاننے والا ہے۔ میں اس کے توسط سے یہ مشکل کام آسان بنالوں گا۔"

واصف، نوید علی کے کہنے کے مطابق بے فکر ہوگیا۔

☆☆☆
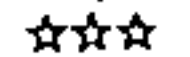
دو روز بعد نوید نے فون کرکے واصف کے ہوٹل میں کمرے کی بکنگ کی خوشخبری سنادی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اسے ایک معروف ہوٹل کا نام اور کمرا نمبر بھی بتادیا تھا چنانچہ واصف کریم پوری تیاری کے ساتھ لیلیٰ کو ذلیل کرنے مذکورہ ہوٹل پہنچ گیا تھا لیکن ہوٹل کے ریسیپشن پر اسے ایک ذہنی صدمے سے گزرنا پڑا۔

"آپ کے ہوٹل میں میرے دو مہمان ٹھہرے ہوئے ہیں۔" اس نے ریسپشنسٹ کو بتایا۔ "میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"گیسٹ کے نام پلیز!" ریسپشنسٹ نے شائستہ لہجے میں استفسار کیا۔ "اور کمرا نمبر؟"

واصف نے ریسپشنسٹ کی مطلوبہ معلومات فراہم کردیں۔ اس نے اپنے کمپیوٹر پر چیک کرنے کے بعد بتایا۔ "سر! اس نام کے گیسٹ ہمارے ہوٹل میں نہیں ٹھہرے۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے؟" واصف قدرے بلند آواز میں بولا۔ "آپ اچھی طرح دیکھ کر بتائیں پلیز!"

"سر! میں نے اچھی طرح چیک کرنے کے بعد ہی آپ کو انفارم کیا ہے۔" ریسپشنسٹ نے ٹھوس انداز میں جواب دیا۔ "آپ کا بتایا ہوا روم گزشتہ ایک ہفتے سے خالی پڑا ہے اور آپ اپنے جن مہمانوں سے ملنے آئے ہیں، وہ ہمارے ہوٹل کے کسی بھی کمرے میں قیام پذیر نہیں ہیں۔ آپ انہیں فون کرکے اپنی پریشانی کا حل نکال سکتے ہیں۔"

ریسپشنسٹ کی تجویز واصف کو پسند آئی۔ وہ لابی کے ایک صوفے پر بیٹھ گیا اور نوید کو فون لگایا۔ اب اس سے رابطے کا بھی ایک راستہ رہ گیا تھا۔

ایک بار، دو بار...... دس بار کی کوشش کے بعد بھی اس کا سیل فون "سوئچڈ آف" ہی ملا۔ ایک فوری خیال کے تحت اس نے لیلیٰ کا نمبر ٹرائی کیا۔ وہاں بھی "سوئچڈ آف" والی صورت حال سے سامنا ہوا۔

"یہ دونوں کہاں غائب ہوگئے ہیں؟" واصف کے ذہن میں مختلف نوعیت کے خدشات سر اٹھانے لگے۔ "کہیں ان دونوں کو ایک دوسرے سے حقیقی محبت تو نہیں ہوگئی اور نوید، لیلیٰ کے ساتھ کہیں نکل گیا ہے؟ ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟ میں ہرگز ایسا نہیں ہونے دوں گا...... مجھے فوراً گھر جانا چاہیے......"

اس خیال کے ساتھ ہی وہ ہوٹل سے نکلا اور اپنے گھر کی جانب روانہ ہوگیا۔ راستے بھر زہریلے اندیشے اور وسوسے اس کے دل و دماغ میں ہلچل مچاتے رہے۔ ہوٹل کے ریسیپشن پر پہنچ کر اگر اسے ذہنی صدمہ سہنا پڑا تھا تو گھر میں قدم رکھنے کے بعد تو گویا اس پر ایٹم بم ہی گر گیا تھا۔

لیلیٰ صدیقی گھر میں موجود نہیں تھی مگر اس کا پیغام ایک پرچے کی صورت اس کے لیے سٹنگ روم کی ٹیبل پر پڑا تھا۔ واصف نے وہ پرچہ اٹھالیا اور اس کی تحریر کو پڑھنے لگا۔ لیلیٰ نے اسے مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا۔

"میں نے اس خط کو باقاعدہ ٹائپ کرکے اس کا پرنٹ نکالا ہے تاکہ تم میرے ہاتھ کی تحریر کو کسی غلط مقصد کے لیے استعمال نہ کرسکو۔ تم اس قدر گھٹیا اور ذلیل انسان ہو کہ تم سے کسی بھی گھناؤنی حرکت کی توقع کی جاسکتی ہے۔ تم نے جس شخص کو پانچ لاکھ روپے دے کر میری بے وفائی کے ثبوت جمع کرنے پر لگایا تھا، وہ بندہ مجبور ضرور تھا مگر ضمیر فروش نہیں لہٰذا حقیقت سے واقف ہونے کے بعد وہ مجھ سے مل گیا۔ میں نے اسے اپنے ساتھ کام میں لگالیا ہے اور دو روز پہلے اسے مال دے کر دبئی بھیجا ہے۔ وہ وہاں بیٹھ کر میرے بزنس کو دیکھے گا۔ اسی بہانے میرا دبئی والا آفس بھی آباد ہوجائے گا اور میں...... میں تمہیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر اپنے پولیس انسپکٹر انکل کے پاس جارہی ہوں۔ تمہاری اطلاع کے لیے بتاتی چلوں کہ میں نے تین روز پہلے تم سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے خلع کا کیس فائل کردیا ہے۔ ایک آدھ دن میں تمہیں نوٹس مل جائے گا۔ اب عدالت ہی میں ملاقات ہوگی۔"

واصف کی حالت دیدنی تھی۔ اس کے ذہن میں بارودی دھماکے ہورہے تھے۔ اس ٹائپ شدہ لیٹر میں لیلیٰ صدیقی نے مزید لکھا تھا۔

"عورت ایک نااہل مرد کے ساتھ گزارہ کرسکتی ہے مگر شوہر اگر اس کے کردار کی دھجیاں اڑانے کے لیے کوئی گیم پلے کرے تو اسے برداشت کرنا ناممکن ہے۔ تم نے اپنی نااہلی کو چھپانے کے لیے میری کردار کشی کا جو کھیل رچایا تھا، وہ تمہیں بہت بھاری پڑنے والا ہے۔ اتنا تو تمہیں معلوم ہی ہوگا کہ ہر کورٹ کیس مقامی اخبارات میں ضرور رپورٹ ہوتا ہے اور میڈیا والے بھی اس کی کوریج سے غافل نہیں رہتے۔ خصوصاً جن کیسز میں چاٹ مسالا زیادہ ہوتا ہے، وہ تو بریکنگ نیوز بن جاتے ہیں۔ ہمارا کیس بھی خاصا چٹ پٹا اور سنسنی خیز ہے کیونکہ میں نے خلع کی درخواست میں "وجہ نجات" تمہاری نااہلی بیان کی ہے......"

واصف کا سر چکرانے لگا اور وہ ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ لیلیٰ کا خط ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ اس نے کڑوے الفاظ میں لکھا تھا۔

"اب تم پہلی فرصت میں کسی حرام خور ڈاکٹر کی جیب گرم کرکے اپنے لیے مردانگی کا جعلی سرٹیفکیٹ بنوالو اور اسے پلاسٹک کوٹ کرواکے اپنے گلے میں لٹکالینا کیونکہ تمہیں قدم قدم پر اپنی اہلیت کو ثابت کرنے کے لیے اس کی ضرورت پیش آئے گی...... آل دی ورسٹ!"

واصف کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا پھیل گیا۔ پچھلے پانچ سال میں وہ جب بھی لیلیٰ کی تنہائی میں گیا تھا تو اس میدان میں اسے ہمیشہ اپنی کم مائگی اور شکست خوردگی کا احساس ہوا تھا اور ...... آج تو وہ اسے شہ مات دے گئی تھی۔

◆◆◆

میلے ہاتھ

عبدالرب بھٹی

ہمارے اردگرد پھیلی کشیدگی احساسِ عدم تحفظ کو جنم دیتی ہے... محرومی میں مبتلا کردیتی ہے... انجانے اور پُراسرار ماحول کا حصہ بن جانے والے ایک ایسے ہی شخص کا ماجرا... اس کی اگلی منزل سراسر محبت کی منزل تھی... جستجو اور شوق کا بہاؤ اسے آگے دھکیل رہا تھا... اس کے جذبوں کی بے غرضی... وابستگی اور بے لوث محبت میں اتنی طاقت تھی کہ وہ مسلسل ایسے ماحول میں بھٹک رہا تھا جس کا ہر منظر خوف و دہشت میں ڈوبا ہوا تھا... بااثروت لوگوں کی حیوان پرستی کا شکار ہو جانے والوں کی حیرت انگیز صورتِ حال...

غفلت اور عداوت میں گم ہوجانے والی محبت کی جیت......

نگینہ نے مجھے ایک امتحان میں ڈال دیا تھا۔

کبھی میں سوچتا کیا واقعی وہ ایک ذہنی مریضہ ہے؟ لیکن پھر فوراً ہی میں نے اپنے اس لغو خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔

نگینہ میری پہلی اور آخری پسند تھی، محبت تھی اور میں اُسے دیوانہ وار چاہنے لگا تھا۔ وہ اب جیسی بھی تھی، میری محبت تھی۔ محبت صرف محبوب کی خوبیوں سے ہی تو نہیں کی جاتی، اگر وہ کسی ایسی مصیبت کا شکار تھی تو مجھے اس کی مدد کرنی چاہیے تھی، اس مصیبت نے اُسے عارضے میں مبتلا کردیا تھا۔ عارضہ تو مصیبتوں کا ہی شاخسانہ ہوتا ہے، وہ مصیبت دور ہو جائے تو عارضہ بھی خودبخود ختم ہوجایا کرتا ہے۔

''نگینہ! تم نے مجھ پہ بھروسا تو کیا ہوتا۔ میں بہت جلد تمہیں اس مصیبت سے نجات دلا سکتا تھا۔'' میں خودکلامیانہ انداز میں بڑبڑایا۔

میرا سیل فون اس وقت میرے ہاتھ میں تھا اور اس نے مجھے جو خط لکھا تھا، اس کی تصویر کھینچ کر مجھے واٹس ایپ کردیا تھا۔ اسے مجھ تک فوری طور پر بات پہنچانے کا یہی ایک طریقہ آسان لگا تھا۔

اس کا خط پڑھنے کے بعد جب میں نے گھبرا کر اُسے کال کرنا چاہی تو میں دہل گیا۔ مجھے اُمید نہ تھی کہ وہ اس قدر جلد اپنا نمبر بھی بند کردے گی۔ مجھ سے ہر طرح کا تعلق قطع کر ڈالے گی۔

''نگینہ! کیا محض ایک نمبر بند کردینے سے تم سمجھتی ہو میرا اور تمہارا تعلق ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا؟'' میں بچوں کی طرح رو دینے والے انداز میں دوبارہ بڑبڑایا۔

''ہرگز نہیں، نگینہ! یہ تم نے کیسے سمجھ لیا؟ میں ابھی آرہا ہوں۔'' میں ایک دم جوش میں آگیا۔

میں اس وقت میں دفتر میں تھا۔ میں نے شارٹ لیو دی اور ایک بجے ہی دفتر سے اُٹھ گیا۔ میرے پاس بائیک تھی جو کمپنی نے ہی مجھے دی تھی۔ میں ایک پرائیویٹ کمپنی

میں جاب کرتا تھا، جو میرے مطابق اور اچھی تھی۔ اکیلا آدمی تھا، بھلا میرا کیا خرچہ تھا۔ ایک اسٹوڈیو فلیٹ میں نے کرائے پر لے رکھا تھا۔

میں کھاد بنانے والی ایک فیکٹری میں کلرک تھا۔ یہ منشی کے جیسی جاب ہوتی ہے۔

درحقیقت مجھے خالہ اور خالو نے ہی پال پوس کر جوان کیا تھا۔ بہ قول اُن کے میرے ماں باپ کا ایک ناگہانی حادثے میں انتقال ہوگیا تھا، میں پانچ برس کا تھا۔ اس کے بعد خالہ نے مجھے گود لے لیا۔ ان کی نئی نئی شادی ہوئی تھی، بعد میں ان کی بھی اولادیں ہوئیں۔ ایک لڑکا ایک لڑکی مگر آفریں ہے خالہ اور خالو پر کہ انہوں نے مجھے بھی اپنی اولاد ہی کی طرح پالا تھا۔

انہوں نے مجھے پڑھا لکھا کر جوان کیا تھا۔ وہ اپنی بیٹی سے میری شادی بھی کردینا چاہتے تھے اور مجھے بھی اس وقت کوئی اعتراض نہ تھا، کیونکہ اس وقت نگینہ میری زندگی میں نہیں آئی تھی لیکن شائلہ کے دل پر کوئی اور نوجوان دستک دے چکا تھا اور اس نے اسی سے شادی کرلی تھی۔ اب ان کا بیٹا تھا مگر میری اس سے کم ہی بنتی تھی جب سے اسے اس حقیقت کا علم ہوا تھا کہ میں اس کا سگا بڑا بھائی نہیں ہوں۔

میں اپنے پیروں پر کھڑا ہو چکا تھا، ہم کراچی میں ہی رہتے تھے۔ مجھے ٹھٹھہ میں ایک فیکٹری میں جاب کی آفر ہوئی اور میں وہیں چلا گیا۔ ٹھٹھہ کراچی سے ایک سو دو کلومیٹر پر مشرق میں واقع سندھ کا ایک قدیم اور مشہور تاریخی شہر ہے۔

ٹھٹھو کے معنی ہی سندھی زبان میں ''دریا کے کنارے آباد ہونا ہے'' اصل نام ٹھٹھو ہے۔ بعد میں ٹھٹھہ پڑ گیا۔ دریائے سندھ کی ایک شاخ ٹھٹھہ کے قریب سے بھی بہتی ہے۔ میں جب کراچی جامعہ میں زیرِ تعلیم تھا تو دوستوں کے ساتھ اکثر کینجھر جھیل اور ٹھٹھہ سیر و تفریح کے لیے آیا کرتا تھا۔ تاہم مزید۔ باتیں مجھے نگینہ نے بھی بتائی تھیں۔ وہ ادھر ہی پیدا ہوئی تھی۔ اس کے ماں باپ جو اَب مرحوم ہو چکے تھے، زمیندار تھے۔

اس شہر میں آنے کے بعد مجھ پر اس کی اسراریت کھلنے لگی، یہ واقعی ایک پُراسرار اور قدیمی سا تاثر دیتا شہر ہے۔

یہاں سے گھوڑاباڑی کا ساحلی علاقہ بھی قریب تھا۔ مجھے سمندر اور ساحل شروع ہی سے پسند تھے۔ تنہا تھا اس

لیے ہر روز شام میں سمندر کی طرف نکل جایا کرتا۔ ٹھٹھہ کے مشہور ساحلی علاقوں میں جاتی اور گھوڑا باڑی مشہور تھے، اور بھی تھے مگر یہ میرے گھر اور فیکٹری سے قریب تھے اسی لیے میں ادھر چلا آیا کرتا تھا۔

یہاں ... ماہی گیروں کی بستی کے علاوہ پکی سڑک کی جانب ایک بڑی آبادی بھی تھی، جہاں بڑے چھوٹے مکان بنے ہوئے تھے اور کھاتے پیتے لوگ رہا کرتے تھے۔

میں نے ایک کمرے کا اسٹوڈیو فلیٹ یا یوں کہہ لیں پورشن لے رکھا تھا۔ میں تنہا تھا، فارغ اوقات میں جاسوسی ناولز اور کتابیں پڑھتا رہتا یا پھر دریا یا جھیل کی سیر کو نکل جاتا۔ میرے پاس بائیک تھی۔

نگینہ نے ان دنوں فیکٹری میں نئی نئی ملازمت کی تھی۔ اگرچہ اور بھی لڑکیاں تھیں لیکن جانے کیا بات تھی یا پھر یہ دل کی بات تھی کہ جو بھا جائے، یوں نگینہ مجھے بھا گئی تھی۔

وہ بھی مجھے پسند کرنے لگی تھی۔ ہم دونوں اکثر ہی ڈیوٹی سے واپسی میں اپنے اپنے گھر جانے کے بجائے بائیک پر ساحلِ سمندر کی طرف نکل آتے تھے۔

اگرچہ کمپنی کی پک اینڈ ڈرائیو کی سہولت ایک ائرکنڈیشنڈ کوسٹر کی صورت میں موجود تھی۔

عقدہ کھلا کہ نگینہ بھی میری طرح اندر سے تنہا تھی، حالانکہ اس کے گھر والے تھے۔ ایک دادا اور بڑا بھائی جس کا نام دل مراد تھا۔ دادا سائیں پگل کے نام سے مشہور تھے۔ وہ اُن کے ساتھ رہتی تھی۔ کھاتے پیتے لوگ تھے اور صاحبِ جائیداد بھی۔ بقول نگینہ کہ وہ خود کو مصروف رکھنے کی خاطر یہ جاب کرتی تھی۔

ایک دن میں نے اس کی طبیعت میں کچھ محسوس کر کے دریافت کیا۔ ”نگینہ! کیا بات ہے، تم اکثر مجھ سے اچھی بھلی باتیں کرتے کرتے کسی انجانے خوف میں کیوں مبتلا ہونے لگتی ہو؟“

اس نے چونک کر میری جانب دیکھا تھا۔ اس وقت ہم ساحلِ سمندر کے قریب ماہی گیروں کی بستی سے ذرا دور ساحلِ سمندر پر پتھروں کے ڈھیر پر بیٹھے تھے۔ اس نے اپنا چہرہ سمندر کی جانب کر دیا، جہاں کچھ کشتیاں تیر رہی تھیں اور ان کے اوپر بگلے اُڑانیں بھرنے میں مصروف تھے۔

”شاید تم اس لیے کسی انجانے خوف کا شکار ہو کہ ہمارا اور تمہارا ہمیشہ کا ساتھ ممکن نہیں؟ اگر ایسی کوئی پریشانی ہے تو پلیز، مجھ سے شیئر کرو، ہم دونوں مل کر اس کا حل نکال لیں گے۔“

میں نے اس کے خوف کو روایتی رنگ میں جانا تھا حالانکہ ایسی بات ہی نہ تھی۔

”یہ بات نہیں ہے۔“ بالآخر نگینہ نے کہا۔

”تو پھر تم باتیں کرتے کرتے ایک دم اداس اور خوف زدہ سی کیوں ہونے لگتی ہو؟“ میں نے محبت سے پوچھا۔ ”بلکہ...... اکثر تو اس خوف تلے تم مجھ سے ٹھیک طرح بات بھی نہیں کرتیں اور ایک دم اُٹھ کر گھر جانے کا کہنے لگتی ہو؟“

”میں شاید اس خوف تلے ذہنی مریضہ بن چکی ہوں۔“ وہ بولی۔ مجھے اس پر بے اختیار پیار آ گیا اور ترس بھی۔ میں نے بڑی محبت سے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ ساحلِ سمندر کی نرم عطر بیز ہواؤں میں نباتاتی باس تھی۔ نرم ہواؤں کے جھونکے اس کے ریشمی گھنے بالوں کو سہلاتے ہوئے میرے چہرے پر بکھیر گئے۔ اس کی نکہت نے مجھ پر بے اختیاری سی طاری کر دی۔ نگینہ کے حسن اور معصومیت لیے چہرے پر ایک غمگین سی اُداسی تھی۔

میں نے کہا۔ ”پگلی! میرے کہنے کا یہ مطلب تھوڑی ہی تھا، لیکن میں محسوس کر رہا ہوں تم کسی انجانی پریشانی اور تشویش کا شکار ہو۔ مجھے بتاؤ۔“

نگینہ نے میری جانب اپنی گھنیری پلکیں اُٹھا کر دیکھا‘ اس کی جھیل سی آنکھوں میں محبت کا سمندر موجزن تھا۔

”جاوید! میں نے زندگی میں پہلی بار کسی سے محبت کی ہے وہ بھی صرف اور صرف تم سے۔ مجھے تمہارے ہی کھونے کا ڈر لگا رہتا ہے۔“

”ٹھیک ہے، یہ تو میں بھی سمجھتا تھا۔“ میں نے اسی کے انداز کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ شکر تھا کہ وہ کچھ بولی تو تھی۔

”دیکھو، ہم دونوں ہی ایک دوسرے سے سچی اور اٹوٹ محبت کرتے ہیں اور ایسے دلوں کے درمیان جدائی کا ڈر ہوتا ہے، یہ ایک فطری امر ہے، کوئی نئی بات نہیں، بس تم اسے دل پر مت لو۔“

”میں نے ایسا ہی کیا تھا جاوید!“ وہ تڑپ کر بولی۔ ”لیکن...... نجانے کیا بات ہے، بیٹھے بیٹھے میں اکثر ڈر جاتی ہوں، ہم...... مجھے لگتا ہے جیسے تمہیں مجھ سے کوئی ہمیشہ کے لیے چھین لے گا، میں تو اپنی جان بھی تم پر قربان کر دوں، لیکن یہ کسی صورت برداشت نہیں کر سکتی کہ میری وجہ سے کوئی تمہاری جان کا دشمن بن جائے۔“

”اوہ...... کیا ایسی کوئی بات ہے؟ کیا گھر میں کوئی

ناراض ہے مجھ سے، یا انہیں تمہارا اور میرا ملنا جلنا پسند نہیں، میرا مطلب ہے تمہارا بڑا بھائی، شاکر......“

”شاید...... وہ بہت تندخو ہے۔ سربراہ تو گھر کے دادا جان ہی ہیں مگر دل مراد کا اثر گھر میں زیادہ چلتا ہے، دادا جان اسی کی بات کو فوقیت دیتے ہیں، جائداد اور زمینوں کا کام بھی اسی نے سنبھال رکھا ہے اور...... اور......“

وہ کہتے کہتے گھبرا کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ”دیر ہو رہی ہے میں چلوں گی۔“

میں پریشان کن اُلجھن کا شکار ہو گیا۔

چند دنوں بعد میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھ سے کترانے لگی ہے۔ بالآخر ایک دن جب میں دفتر پہنچا تو چونکا دینے والی اطلاع میری منتظر تھی۔

نگینہ نے جاب سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ میں دھک سے رہ گیا۔ یہ کیا بات ہوئی۔ کیا وہ اپنے بھائی کے رعب اور دباؤ میں آ گئی تھی یا پھر کوئی اور بات تھی؟

ابھی میں اُس کے گھر جانے کی ٹھان ہی رہا تھا کہ واٹس ایپ پر اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا خط کا عکس موصول ہو گیا۔

میں نے خط پڑھا اور ہک دک رہ گیا۔ میں نے اسی وقت اسے فون کیا جو بند ملا۔ میں مزید پریشان ہو گیا۔ نچلا بیٹھنے والا تو اب میں بھی نہیں تھا، میں نے بھی تہیہ کر لیا تھا کہ خواہ اس کے بھائی سے جھگڑا کرنا پڑے، میں نگینہ سے ضرور ملوں گا۔

خط میں اُس نے یہی لکھا تھا کہ وہ ایک ذہنی مریضہ ہے، وہ مجھے مزید پریشانی میں مبتلا نہیں کرنا چاہتی۔ یہاں تک بھی اس نے لکھا تھا کہ وہ مجھ سے محبت کر کے بھی پچھتا رہی تھی، اس محبت نے اس کے انجانے خوف کو مزید سوا کر ڈالا ہے۔ اگر میں نے اُس سے شادی کر بھی لی تو اس کی وجہ سے میری زندگی جہنم بن کر رہ جائے گی۔ وہ میری زندگی خراب نہیں کرنا چاہتی تھی، یہی سچی اور بے لوث محبت کا تقاضا ہے کہ وہ ابھی سے ہی میرے راستے سے ہٹ جائے۔ میرے سامنے ایک سنہرا مستقبل تھا وغیرہ۔

”میں تمہاری کسی بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں نگینہ! میں ابھی آ رہا ہوں۔“

میں نے ایک جوشیلے انداز میں کہا۔ اپنی بائیک نکالی اور سیدھا نگینہ کے گھر کا رخ کیا۔

☆☆☆

نگینہ کا گھر تھوڑا دور سہی مگر قابلِ رسا تھا۔ اس طرف تنگ سی سڑک جاتی تھی۔ میں اسی پر بائیک دوڑا رہا تھا۔ راستے کی دونوں جانب گنجان جھاڑیوں کا سلسلہ تھا۔ سردیوں کا موسم تھا، بارش کا بھی موسم ہو رہا تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور دن میں بھی تاریکی کا سا گماں ہوتا تھا۔ کچھ آگے جا کر میں نے سڑک کو گھومتے دیکھا۔ سہ پہر کا وقت اب شام کے جھٹپٹے میں بدلنے لگا تھا۔

میں مناسب رفتار سے بائیک دوڑاتا آگے بڑھتا رہا۔ راستے کی ایک جانب سیاہی مائل، گاڑھے پانی کی تالاب نما جھیل سی نظر آ رہی تھی۔ ساکت اور پُرسکون پانی جس کی سطح پر ایک بھی شکن نہ تھی۔

دوسرے کنارے پر سفید سی چیز فضا میں بلند ہوئی، ایک لمحے کے لیے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سنائی دی پھر آواز اور خود وہ پرندہ نہ جانے کہاں غائب ہو گیا۔

آسمان پر بادل سیاہ ہونے لگے تھے۔ راستہ اچانک ہی تاریک ہو چلا تھا۔ مجھے بارش کی پروا نہ تھی۔ مجھ پر تو فقط ایک ہی دُھن سوار تھی کہ نگینہ نے خود سے کیوں اتنا بڑا فیصلہ کر لیا تھا۔ کہیں اس نے کسی کے دباؤ میں تو ایسا نہیں کیا تھا؟ ہم دونوں ہی پڑھے لکھے تھے اور اپنی زندگی کے اہم فیصلوں میں آزاد تھے۔

اب دونوں طرف بلند جھاڑیوں کی باڑ تھی۔ چوتھائی میل کا فاصلہ ایک پُلیا کے نیچے بنی سرنگ میں سے گزار کے دوسری جانب پہنچا تو ایک چھوٹا سا صحرائی خطہ اُبھرا۔ دائیں طرف دریا کے چمکیلے دھارے کی جھلک نظر آ رہی تھی، دریا کے کنارے وہ بڑا سا مکان تھا جو میری منزلِ مقصود تھی۔

وہ حویلی نما مکان عام آبادی سے الگ تھلگ واقع تھا۔ اُس طرف کھیت اور ہریالی بھی نظر آتی تھی۔

بہرکیف، میں بائیک روک کر نیچے اُتر آیا۔ مکان قدیم طرزِ تعمیر کا نمونہ تھا۔ میں ایک بار یہاں نگینہ کے ساتھ آ چکا تھا، مگر مجھے ایک تلخ تجربہ ہوا تھا وہ یہ کہ کسی نے میری موجودگی کو نگینہ کے ساتھ پسند نہیں کیا تھا۔ میں بھی ضدی آدمی تھا۔ پیچھے ہٹنے والا بھی نہیں تھا۔ میں نے کوئی پروا نہ کی تھی۔ اب دوسری بار آیا تھا مگر اکیلا۔

نگینہ نے ایک بار مجھ سے ذکر کیا تھا کہ اس کا گھر ایک بہت بڑے باغ کے عین وسط میں واقع ہے، مجھے دکھایا بھی تھا، لیکن اب شاید کچھ محلِ وقوع مجھے بدلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اگرچہ باغ اپنی جگہ موجود تھا۔

مجھے اعتراف تھا کہ نگینہ کے بارے میں مجھے اب بھی کم ہی معلومات تھیں۔ صرف یہ جانتا تھا کہ وہ ایک یتیم لڑکی

ہے۔ اپنے بھائی دل مراد کے ساتھ رہتی ہے جو اپنے دادا سائیں پکل کے مکان اور زمینوں کی نگرانی کرتا ہے۔ میری نظر مکان کی طرف اُٹھ گئی۔

یہ سرخ اور قرمزی پتھروں کی بنی عمارت تھی جو اندھیرے میں بڑی پُراسرار دکھائی دے رہی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے زمین نے درختوں کی اوٹ میں کسی بڑی سی چٹان کو اُگل دیا ہو۔ میں حویلی نما مکان کے سامنے آکر رک گیا۔

تین طرف سے سیاہ پانی سے گھرا ہوا یہ مکان واقعی عجیب سی تاثر پیش کرتا محسوس ہوتا۔ اس تالابی یا دریائی پانی میں گدلی اور سیاہ آبی گھاس پھوس بھی نظر آتی تھی۔

میرے ذہن میں نگینہ کا پیکر اُبھرا اور رگوں میں دوڑتے لہو کی گردش جوش اختیار کرنے لگی۔ میں نے کندھے جھٹکے، آگے بڑھا۔ طویل بائیک کے سفر نے مجھے کچھ تھکا بھی دیا تھا۔ پندرہ بیس کلومیٹر سے کچھ زیادہ ہی کا سفر طے کر کے میں یہاں پہنچا تھا۔

میں ابھی بڑے سے گیٹ نما دروازے کے قریب ہی پہنچا تھا کہ ٹھٹک کر رکا، میرے کانوں میں بانسری کی سُریلی آواز ٹکرائی۔ مقامی زبان میں جسے مرلی دُھن کہتے ہیں۔ کوئی بڑے ہی ماہرانہ انداز میں کسی لوک گیت کی دُھن بجا رہا تھا۔

مجھے حیرت تھی کہ اتنے بڑے لوگ ہونے کے باوجود کوئی چوکیدار یا نوکر نظر نہیں آیا تھا اب تک۔ میں نے دروازے پر دستک دی۔ چند سیکنڈ تو مرلی کے سُر فضا میں تحلیل ہوتے رہے پھر یکایک خاموشی چھا گئی۔ میں دروازے پر کھڑا انتظار کرتا رہا۔ دروازہ کھلا اور ایک سایہ نظر آیا۔

دروازے کی دوسری جانب ہال کمرا مجھے تاریک دکھائی دیا۔ میں نے ابھی کسی کے قدموں کی آہٹ بھی نہیں سنی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اندھیرے میں کوئی ناقابلِ شناخت متحرک شبیہ دروازے تک آگئی تھی۔

میں چند قدم آگے بڑھا۔ دروازے میں ایک نوجوان کھڑا ہوا تھا۔ وہ میرا ہم عمر تھا۔ دُبلا پتلا جسم اور سیاہ بال۔ مدھم سے اُجالے میں بھی دیکھ سکا تھا۔ میں کچھ پہچان گیا، وہ نگینہ کا بھائی دل مراد ہی تھا۔ دوسری بار دیکھ رہا تھا اُسے..... اسی لیے کچھ کنفیوز رہا۔

''میں نگینہ سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''وہ یہاں نہیں ہے.....'' اس نے رُکھائی سے کہا۔

مجھے یوں لگا جیسے میں ہوا میں معلق ہو گیا ہوں۔ لمحے بھر کے لیے مجھے جیسے سکتہ سا ہو گیا۔ بھلا وہ کہاں جا سکتی ہے؟ جبکہ مجھے نگینہ سے گھر پر ملنے کی پوری اُمید تھی۔ میں اس سے بات کرنے کے لیے اس قدر بے چین تھا کہ بے دھڑک اس کے گھر چلا آیا تھا۔ میں اس سے مل کر یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ آخر اسے یہ اچانک کیا ہو گیا ہے؟

''کیا تم بتا سکتے ہو کہ وہ کہاں گئی ہوئی ہے؟''

سایہ دروازے سے آگے بڑھا۔ شام کے جھٹپٹے میں اس کا چہرہ مزید اُجاگر ہو گیا۔ وہ ایک تومند خوب صورت نوجوان تھا۔

پہلی ملاقات میں جب نگینہ بھی میرے ساتھ تھی، اس سے میرا مختصراً تعارف ہوا تھا۔ نگینہ نے مجھے اس وقت اپنے دادا اور بھائی سے ایک کولیگ کی حیثیت سے ملوایا تھا۔

''کیا تمہیں نہیں پتا؟'' اس نے سپاٹ سے لہجے میں کہا۔ وہ بھی مجھے شاید پہچان چکا تھا۔

''اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ دفتر بھی نہیں آئی۔ وہ کچھ روز سے.....''

دل مراد نے میری بات کاٹ دی۔ اُس کا انداز مجھے چڑ چڑایا ہوا لگا۔ ''وہ اس وقت بھی اپنے معالج ڈاکٹر مظفر کے گھر گئی ہوئی ہے۔''

''گھر؟''

''ڈاکٹر مظفر اپنے گھر میں ہی کلینک کرتے ہیں۔''

''اوہ، اچھا، پتا بتا سکتے ہو؟'' مجھے حیرت تھی کہ وہ اکیلی ڈاکٹر کے کلینک کیوں گئی ہے؟

دل مراد نے مجھے ڈاکٹر کے گھر کا پتا بتا دیا جہاں بہ قول اس کے کلینک کرتا تھا۔

''تم یہاں بیٹھ کر اس کی واپسی کا انتظار کر سکتے ہو۔'' اس نے کہا۔ وہ مجھے کچھ نرم لگا، مگر جانے کیوں میرا دل اس کے بھائی کے ساتھ یہاں رکنے کو نہ چاہا، نجانے وہ کس قسم کے سوالات کرتا مجھ سے، پھر میں اس وقت نگینہ کی طرف سے بہت بے چین بھی تھا۔

میں شکریہ کہہ کر پلٹا، دو ایک قدم آگے ہی بڑھا تھا کہ اس نے عقب سے پکارا۔

''سنو۔''

میں پلٹا۔ وہ بولا۔

''میں نے بتایا نا تمہیں کہ ڈاکٹر کا کلینک جھیل کے پار ہے..... تقریباً تین میل دور..... لیکن میرا خیال ہے اگر تم سڑک سے جاؤ تو زیادہ آسانی ہوگی۔'' یہ کہہ کر وہ مسکرانے لگا۔ مجھے اس کی مسکراہٹ میں ایک سنسناتی ہوئی اسراریت محسوس ہوئی۔ مجھے بدستور اپنی جانب تکتا پا کر آگے بولا۔ ''مجھے یقین ہے کہ وہ جلد ہی واپس آجائے گی، لیکن اگر تم اس سے فوری طور پر ملنا چاہتے ہو تو..... واپس بڑی سڑک پر چلے جاؤ، اس کے بعد اُلٹے ہاتھ گھوم جانا۔ آدھ میل آگے جا کر ایک مرتبہ پھر بائیں سمت گھوم کر تم ڈاکٹر کے گھر پہنچ جاؤ گے۔ وہ راستہ بھی بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ تم یہاں آتے وقت ضرور دیکھ چکے ہوگے۔''

مجھے اس قدر تفصیل سن کر کچھ حیرت ہوئی۔ تاہم اچھا تھا کہ اس نے مجھے اچھا گائیڈ کر دیا تھا۔ یوں بھی ڈاکٹر مظفر کا پتا ایسا تھا کہ اس کی قیام گاہ کو تلاش کرنا کوئی اتنا مشکل کام نہیں تھا۔

میں نے ایک بار پھر اس کا فاصلے سے شکریہ ادا کیا اور روانہ ہو گیا۔

جلدی ہی مجھے بڑی سڑک کے کنارے بائیک کی ہیڈ لائٹ میں ڈاکٹر مظفر کے نام کی تختی صاف نظر آگئی۔ اس کے عقب میں کھجور اور سید مشک کے درختوں کا ایک طویل سلسلہ تھا۔ دائیں سمت عمارت تھی۔ مکان میں اس وقت صرف ایک بلب روشن تھا۔

میں نے بائیک کا انجن بند کیا۔ ہیڈ لائٹ بھی بجھ گئی۔ اسے سائیڈ اسٹینڈ کیا۔ قدمچے طے کر کے اُوپر دروازے تک پہنچا۔ یہاں ٹھنڈ کا احساس زیادہ ہو رہا تھا۔ ایک عجیب بات محسوس ہوئی۔ یہاں خلافِ توقع مجھے سناٹا محسوس ہوا۔ اگرچہ علاقہ ہی ایسا تھا مگر بہرحال یہ ایک ڈاکٹر کا کلینک تھا، کوئی تو نظر آتا۔ میں نے دروازے پر دستک دے ڈالی۔

دستک کی آواز پُرسکون سی، مگر اندھیرے ماحول میں بڑی عجیب محسوس ہوئی۔

اچانک مجھے دائیں سمت میں پانی کا ایک چھپاکا سنائی دیا۔ کوئی چیز پانی میں گری تھی یا پھر کوئی کودا تھا۔ وہ جگہ اس روشنی سے باہر تھی، جو اس مکان کی پیشانی پر لگے بلب سے آرہی تھی۔ لہٰذا میں کسی کو نہ دیکھ سکا۔

تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کے میں آواز کی سمت بڑھا تو وہاں جھیل کا کچھ حصہ مکان سے متصل نظر آیا۔ اس طرف ایک کشتی بھی بندھی ہوئی تھی اور ایک چھوٹا سا چوبی فلیٹ فارم بنا ہوا تھا۔ چونکہ یہ سارا دریائی علاقہ تھا، سیر و تفریح کی غرض سے بھی اور کچھ یہاں اکثر تیز بارشیں اور سیلابی صورتِ حال رہتی تھی اسی لیے بھی کچھ لوگوں کے پاس اپنی ذاتی کشتیاں بھی ہوتی تھیں۔ میں واپس مڑ گیا۔ مگر میرے اندر ایک کھد بدی ہونے لگی تھی۔ آخر یہ پانی میں گرا کون تھا؟

میں نے اپنا خیال اس طرف سے ہٹا کر دوبارہ دروازے پر دستک دی۔ اس بار بھی کوئی جواب نہ ملا۔ میری حیرت دوچند اور پریشانی سوا ہونے لگی۔ میں واپس پلٹا، قدمچے طے کرتا ہوا نیچے آیا اور اپنی بائیک کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ میں سگریٹ کم ہی پیتا ہوں، کبھی کبھار شوقیہ پینے کے لیے ایک پیکٹ پاس رکھتا ہوں جو دو تین دن چل جاتا ہے۔

میں نے ایک سگریٹ نکال کر سلگا لیا اور گومگو سے انداز میں کھڑا کسی آہٹ کا منتظر رہا، مگر مجھے کچھ بھی سنائی نہ دیا۔ عجیب ڈرامائی، پُراسرار اور اُلجھی ہوئی سی صورتِ حال تھی۔ میں نگینہ سے ملنے کے لیے بہت بے چین ہو رہا تھا۔ نجانے کیوں مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کسی بڑی مصیبت میں ہو۔

ابھی میں نے دو تین ہی کش لیے تھے کہ اچانک میری منتظر اور تھکی ہوئی سماعتوں سے کسی لڑکی کی آواز ٹکرائی۔ درد میں ڈوبی ہوئی آواز.....

''ج..... جاوید..... جاوید.....''

میں نے فوراً سگریٹ پھینک دیا۔ یہ آواز نگینہ کی تھی۔ میں چونک کر اس طرف متوجہ ہوا۔ اگلے ہی لمحے میری بےتابانہ نظریں نگینہ پر مرکوز تھیں۔ غالباً وہ قریب ہی کہیں موجود تھی۔ میرے لائٹر یا سگریٹ کی روشنی میں وہ میری طرف بھاگی چلی آئی تھی۔

''نگینہ.....!'' میں نے بےتابی سے کہا۔ وہ لپک کر مجھ سے لپٹ گئی۔ میرے درماندہ سینے میں جیسے ٹھنڈک اُتر آئی۔ وہ پھر الگ ہوئی۔ اس کے نرم و گداز ہاتھ اب تک میرے ہاتھوں کی گرفت میں جمے رہے۔

''تم..... تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' اس نے کہا۔ ''تم کب آئے تھے؟''

''ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو یہاں پہنچا ہوں۔'' میں نے جواب میں کہا۔ ''میں وہاں تمہارے گھر بھی گیا تھا، تمہارے بھائی نے بتایا تھا کہ تم یہاں آئی ہو تو سیدھا اِدھر ہی چلا آیا۔''

''اوہ..... جاوید.....!'' نگینہ نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ میں نے گہری نظروں سے نگینہ کی طرف دیکھا۔ مجھے ایسے میں اپنے دل پر ایک بوجھ سا محسوس ہوا۔

''نگینہ..... کیا ہوا ہے؟ کچھ بتاؤ تو سہی؟ یہ تم نے مجھے اپنا خط واپس ایپ کیا تھا اور پھر اپنا فون بھی بند کر دیا، کیا

تمہیں میری پریشانی کو بھی احساس نہ ہوا۔"
وہ خاموش رہی۔ میری شکایت پر اس کے چہرے سے ندامت عیاں تھا۔
"میں... میں ایک مریضہ ہوں۔"
"مجھے یقین نہیں، لیکن اصل وجہ ضرور جاننا چاہوں گا۔ کیا ڈاکٹر مظفر تمہارا نفسیاتی معالج ہے؟"
وہ خاموش رہی۔
"جواب دو نا۔"
"ہاں۔" بالآخر اس نے جواب دیا۔
"وہ کیا کہتا ہے تمہاری بارے میں؟"
"دراصل، میں نے اسے ابھی کچھ بتایا ہی نہیں۔" نگینہ نے میرے ہاتھوں سے اپنا ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا۔ مجھے اس کی بات عجیب سی لگی مگر میں بھی ذہن کا پکا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔
"میں آج شام اسی سلسلے میں ڈاکٹر مظفر سے ملنے آئی تھی۔ شیلو... میں دراصل آج ڈاکٹر کو اصل وجوہات بتا دینا چاہتی تھی۔"
"افسوس! تم نے مجھے نہیں بتایا اور ڈاکٹر کو بتانے چلی آئیں؟" میں نے پھر شکوہ کیا۔
"وہ میری بات سمجھ سکتا تھا، ڈاکٹر تھا وہ۔" نگینہ بولی۔
"کیا کہا پھر ڈاکٹر نے؟" میں نے دریافت کیا۔
"میں یہاں پہنچی تو وہ موجود ہی نہیں تھا..."
"کیا...؟" بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔
اس کی بات پر مجھے چونکا دینے والا جھٹکا لگا۔ مگر دوسرے ہی لمحے میں نارمل ہو گیا۔ میرے لیے یہی کافی تھا کہ نگینہ مجھے صحیح سلامت مل گئی تھی ورنہ تو نجانے میں کس قدر وحشت انگیز وسوسوں کا شکار رہا تھا۔
"میرے ساتھ چلو اب..." میں نے کہا۔ "میں تمہیں گھر لے چلوں گا۔ ڈاکٹر سے تو تم کل بھی مل سکتی ہو۔ ویسے اگر تم ایک درجن ڈاکٹرز سے بھی مشورہ کرو گی تو وہ تمہیں یہی کہیں گے کہ سرے سے تمہیں کوئی بیماری ہی نہیں ہے۔ ہاں! اگر اپنی فیس کھری کرنی ہوں تو وہ تمہیں بیماریوں کی ایک لمبی لسٹ بتا دیں گے۔ تمہیں بہرحال اس طرح خود سے مجھے چھوڑ دینے کا فیصلہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔"
"اب تم میرے ساتھ ہو، تمہاری موجودگی میں مجھے اس قدر سکون مل رہا ہے جاوید...! مجھے پتا نہ تھا کہ تم خط پڑھ کر اس قدر پریشان اور بے چین ہو جاؤ گے میرے لیے کہ یہاں تک چلے آؤ گے۔" نگینہ نے پُرسکون انداز میں کہا۔
"تمہیں قرار مل گیا نا۔ میں ہی تمہاری دوا ہوں پگلی!" میں نے بھی مسکرا کے کہا۔
ہم پانڈ کے قریب آ گئے تھے۔
"تم تو خبیث اور دیوانے عاشقوں کی طرح میرا پیچھا کرتے ہوئے آ گئے۔" وہ پھر مسکرائی۔
"میں تمہاری محبت میں اس سے بھی آگے جا سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔
"میں تمہارے ساتھ چل رہی ہوں..." نگینہ نے آہستگی سے کہا۔ "میری کار اُس طرف کھڑی ہے۔" اس نے اشارہ کیا۔
"وہ تو تمہیں چلنا ہی تھا۔" میں بھی ڈھٹائی سے مسکرایا۔ تب ہی اچانک مجھے کچھ یاد آیا۔
"کیا ہوا؟" اس نے مجھے رکتے پا کر پوچھا۔
"میں نے یہاں تھوڑی دیر پہلے پانی میں ایک چھپاکے کی آواز سنی تھی۔"
"اوہ... اچھا۔" نگینہ بولی۔
"کیا تم نے بھی سنی تھی؟"
"نہیں۔" نگینہ نے نفی میں سر ہلایا۔
"کیا اندر کوئی بھی نہیں؟"
"کلینک کا اٹینڈنٹ تو ہوتا ہے مگر وہ بھی کہیں غائب تھا۔ میں اندر ہی انتظار گاہ میں جا بیٹھی تھی اور پریشان تھی۔"
"آؤ تو ذرا دیکھیں۔" میں نے اپنے اندر ہونے والی کھد بد سے مجبور ہو کے کہا۔
"چلو۔" وہ بھی تیار ہو گئی۔ میں اور وہ اسی طرف آ گئے۔
دائیں طرف لان تھا۔ آس پاس گھنی جھاڑیوں کی بہتات تھی۔ ہمارے بائیں جانب قدرے عقب میں گھاٹ سا بنا ہوا تھا۔ مشرقی اُفق پر چمکتا ہوا چاند اس وقت بڑا دلکش منظر پیش کر رہا تھا۔ اس کا عکس جھیل میں کسی چمک دار جیلی مچھلی کے مانند نمایاں تھا۔
چوبی پلیٹ فارم پر آ کر میں اور وہ جھک جھک کر پانی میں دیکھنے لگے۔ کشتی ایک جانب بندھی ہوئی تھی۔
دفعتاً نگینہ کے حلق سے ایک چیخ سی خارج ہوئی۔ میں چونک کر اس کی جانب متوجہ ہوا۔ میں اگر فوراً ہی اسے اپنی بانہوں میں نہ جکڑ لیتا تو وہ نیچے گر جاتی۔
"کیا ہوا...؟ تم خوف زدہ ہو کر کیوں چیخیں، کیا نظر

آیا تمہیں؟" میں نے پوچھا۔
اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تاہم اس نے انگلی سے پانی کی سطح کی جانب اشارہ کیا۔ مارے خوف سے اس کے حلق سے آواز نہیں برآمد ہو پا رہی تھی۔
اس طرف پلیٹ فارم کی مختصر سی سیڑھیاں نیچے پانی میں اتر رہی تھیں۔ میں جھکا جھکا اس طرف گیا اور مزید قریب ہو کے پانی میں جھانکا۔
میں بُری طرح چونک پڑا۔ اندر کچھ آبی جھاڑیاں تھیں۔ میں نے بیٹھے کے بل لیٹ کر انہیں ہٹایا تو پانی میں ایک ہاتھ نظر آیا۔ ایک انسانی ہاتھ... جو کلائی تک پانی سے باہر نکلا ہوا تھا۔ ہاتھ کا کچھ حصہ ایک جھاڑی کے دو شاخ میں پھنسا ہوا تھا۔ ہاتھ کی بے جان اُنگلیاں مردہ سوسن کے پھول (کنول) کے مانند بکھری ہوئی تھیں۔
اس بے جان جسم کو اُوپر لانا چنداں مشکل نہ تھا۔ میں نے نگینہ کو حوصلہ رکھنے کی تلقین کی اور اندر دوڑ گیا۔ وہاں سے ایک رسی لے آیا۔ اس کا ایک سرا پلیٹ فارم کے ایک ستون سے باندھا اور دوسرا اپنی کمر کے گرد پھر پانی میں اُتر گیا اور پھر لاش کو باہر سیڑھیوں تک لے آیا۔
تب تک نگینہ بھی سنبھالا لے چکی تھی۔ اس نے بھی نیچے آ کر میری مدد کی اور پھر ہم دونوں لاش کو پلیٹ فارم تک کھینچ لانے میں کامیاب ہو گئے۔
وہ ایک پستہ قد بوڑھے آدمی کی لاش تھی۔ تب ہی نگینہ نے مجھ سے کپکپاتی آواز میں کہا۔
"یہ... یہ تو ڈاکٹر مظفر کی لاش ہے۔"
میں نے چونک کر نگینہ کی طرف دیکھا۔ اُس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا اور آنکھیں خوف سے پھیل گئی تھیں۔
"یہ دل کا مریض تھا، شاید اسے اچانک دل کا دورہ پڑا ہو گا۔"
"نہیں۔" میں نے سرگوشی میں جنبش دے ڈالی۔ لاش کو پانی سے نکالتے وقت میری اُنگلیاں اس کے سر سے ٹکرائی تھیں۔ میں نے تب ہی محسوس کر لیا تھا کہ ڈاکٹر مظفر کی کھوپڑی کا عقبی حصہ پچکا ہوا ہے۔
میں نے نگینہ کے اس خیال سے اختلاف کرتے ہوئے اپنا اطمینان کرنے کے لیے جیب سے لائٹر نکالا اور اسے روشن کر کے لاش پر جھک گیا۔
"یہ حادثہ نہیں ہے، کسی نے اس کے سر پر اتنی شدید چوٹ ماری ہے کہ بھیجا نکل آیا ہے۔ یہ صریحاً قتل کی واردات ہے۔"

باڈی گارڈ... میں نے کہا اور نگینہ کی آنکھوں میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ سیچ سیلے ماحول میں کسی جانور کے بولنے کی آواز ابھری تھی۔ جیسے وہ رو رہا ہو۔
ذرا ہی دیر بعد میں اپنی بائیک پر اور وہ اپنی کار میں واپس جا رہی تھی۔

☆☆☆

اس وقت کمرا کسی ڈرامے کے سیٹ کا منظر پیش کر رہا تھا۔ یہ کشادہ کمرا ڈاکٹر مظفر کی مطالعہ گاہ تھی۔ گول میز، آرام کرسی، جس پر اس وقت علاقے کا ایس ایچ او حق زعلی بیٹھا ہوا تھا۔ آتش دان، جس میں کوئلے دہک رہے تھے۔ ان سب کے علاوہ کمرے میں چھ، سات افراد تھے جن کا میں نے طائرانہ جائزہ لے چکا تھا۔
ایس ایچ او حق زعلی ایک قوی الجثہ آدمی تھا۔ اس کا چہرہ ہر قسم کے جذبات سے عاری مگر کسی قدر نرم خو تھا۔ مجھے یہ آفیسر ایک کھرا اور تجربے کار محسوس ہوا تھا۔ نگینہ اپنے بھائی دل مراد کے ساتھ ایک صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس حادثے نے اسے شدید ذہنی صدمہ پہنچایا ہو۔ دل مراد نے اپنے ایک بازو سے اسے سہارا دے رکھا تھا۔
ان تین افراد کے علاوہ دو آدمی اور ایک عورت بھی کمرے میں موجود تھے۔ گمان تھا کہ ان سب میں سے کوئی ایک قاتل ضرور ہے۔ خود میں غور سے ایک ایک چہرہ دیکھ رہا تھا کہ ان کے چہروں پر اُبھرنے والی کسی علامت سے میں ہی کوئی اندازہ قائم کر سکوں۔
عورت کا نام بیگم سرور تھا۔ وہ ایک سنجیدہ اور پُروقار عورت تھی۔ اس وقت اس کا چہرہ بے حد مغموم نظر آ رہا تھا، لیکن چہرے پر پھیلی ہوئی سلوٹوں سے ایسا لگتا تھا جیسے وہ مسکرا رہی ہو۔ اس کی آنکھیں قدرے بھوری مائل سیاہ تھیں اور عمر پینتیس سال سے متجاوز ہی محسوس ہوئی۔
مجھے پتا لگا تھا کہ کسی زمانے میں یہی عورت "مسز مظفر" ہوا کرتی تھی۔ اس عورت کی یہاں موجودگی مجھے عجیب لگی تھی اور وہ خود بھی... لیکن حق زعلی نے اگر اسے یہاں طلب کیا تھا تو ضرور اس کی کوئی وجہ بھی ہو سکتی تھی۔
دوسرا آدمی دراز قامت تھا اور یہ ڈاکٹر مظفر کا قانونی مشیر تھا۔ تیسرا آدمی قدیر تھا، وہ ایک خوب رُو نوجوان تھا۔ وہ بیگم سرور کا ملازم تھا۔ ایک ڈاکٹر مظفر کی کلینک کا اٹینڈنٹ تھا۔ کمال شاہ... وہ ایک ادھیڑ عمر مگر مضبوط تن و توش کا مالک شخص تھا۔ اس کی شرافت اور دیانت داری ہی تھی

وفاداری کی بھی بیگم سرور تو کیا پورے علاقے نے گواہی دی تھی کہ وہ ایک شریف النفس انسان تھا اور عرصے سے ڈاکٹر مظفر کی خدمت پر مامور تھا۔ وہ اس وقت اس قدر مغموم اور غم زدہ نظر آرہا تھا کہ جیسے اس کا کوئی اپنا مر گیا ہو۔

مختار علی، بیگم سرور سے پوچھ گچھ کر رہا تھا اور وہ جواب میں اسے بتا رہی تھی۔

''نگینہ اس وقت بالکل نا سمجھ تھی۔ وہ بہت معصوم تھی۔ اکثر کلینک آتی تھی، میری اس سے دوستی ہو گئی تھی۔ دیگر اور خواتین مریضائیں میری دوست بن چکی تھیں لیکن افسوس۔۔۔'' کہتے ہوئے وہ ذرا رکی، پھر ایک سرد سی آہ بھرنے کے بعد وہ دوبارہ بولی۔

''افسوس کہ ڈاکٹر مظفر سے میری زیادہ عرصے نہ بن پائی۔ مجھے اس کا آج تک افسوس ہے اور نگینہ کو بھی تھا۔ مزے کی بات تو یہ کہ نگینہ سمیت دیگر مریضاؤں سے یہ بن کر مجھ پر عقدہ کھلا کہ خود ڈاکٹر مظفر کو بھی اس کا افسوس ہے۔ پر اب کیا ہو سکتا تھا۔

عموماً طلاقوں کے بعد ہی دونوں فریقین کو کچھ غلط کا احساس ہوتا ہے۔ خیر۔'' وہ ایک گہری ہنکاری خارج کرنے کے بعد رک گئی۔

میرے لیے یہ انکشاف تھا کہ یہ اجنبی خاتون ڈاکٹر مظفر کی بیوی بھی رہ چکی ہے۔ بہرحال مجھے جانے کیوں یہ خاتون کچھ چالاک اور ہوشیاری محسوس ہوئی۔

ساتھ ہی میرے ذہن میں اب ایک ہی بات کھٹک آئی کہ ضرور کوئی وصیت کا بھی معاملہ تھا لیکن وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ اس کے لیے کیا چھوڑا گیا ہے۔ یا پھر اس نے آسرا کر رکھا ہو کہ کیا خبر ڈاکٹر مظفر نے اس کے لیے بھی کچھ نام کر رکھا ہو، حالانکہ اب وہ ''بیگم سرور'' بن چکی تھی۔

ڈاکٹر مظفر کی جائداد کافی تھی۔ ڈاکٹر کے قانونی مشیر کے چہرے سے یہ بات ظاہر ہو رہی تھی۔ ایڈووکیٹ مسعود کو جیسے ہی ڈاکٹر مظفر کے قتل کی اطلاع ملی، وہ فوراً اپنی کار میں یہاں آن پہنچا تھا۔

''ایک دن نگینہ نے ہی مجھے بتایا تھا کہ ڈاکٹر مظفر مجھ سے ملنے کا متمنی ہے۔۔۔۔ مگر مجھے یہ بات سخت ناپسند تھی۔ میں نے انکار کر دیا پر۔۔۔۔ اس کے پیہم اصرار پر مجھے سوچنا پڑ گیا۔ کیا خبر وہ کوئی ایسی بات بتانا چاہتا ہو جو میرے لیے جاننا ضروری ہو۔ میرے شوہر سرور فراخ دل آدمی ہیں۔ ڈاکٹر مظفر کو وہ بھی جانتے تھے۔ انہی سے اجازت لے کر میں نے ان سے ملنے کا فیصلہ کر لیا تھا، مگر اس حادثے کے بعد موقع ہی نہ مل سکا۔''

مجھے یہ عورت حد درجہ مکار لگی۔ وہ محض جائداد سے کچھ حصہ ملنے کے لیے ہی یہاں آئی تھی یا پھر ایس ایچ او کے دباؤ پر۔

''تو گویا تمہیں ڈاکٹر مظفر سے ملنے کا موقع نہ مل سکا۔'' مختار نے اس کی طرف تیز سی نظروں سے گھورنے کے بعد پوچھا۔

''نہیں۔'' بیگم سرور نے فوراً نفی میں اپنے سر کو جنبش دی۔

''ہم۔۔۔'' مختار علی نے ایک ہنکاری بھری۔ پھر اس کے ملازم قدیر کی جانب متوجہ ہوا۔

''تم کبھی ڈاکٹر مظفر کے پاس آئے؟''

''نہیں جناب!'' قدیر نے جواب دیا۔

چند لمحے خاموشی سے بیت گئے۔ پھر اس نے کلینک کے اسسٹنٹ اور پرانے ملازم کمال شاہ کی جانب روئے سخن پھیرا۔

''تم کہاں چلے گئے تھے ڈاکٹر کی غیر موجودگی میں اس کے گھر اور کلینک کو کھلا چھوڑ کر۔۔۔؟''

سب کی نظریں بیک وقت ہی لامحالہ ادھیڑ عمر اور منحنی سے تن و توش کے شخص کمال شاہ کی طرف اٹھ گئیں۔ جو ہم میں سب سے زیادہ چپ چپ بیٹھا اور غمگین نظر آرہا تھا۔

بولا۔ ''میری تو دس سالہ محنت، وفاداری اور خیر داری پر جیسے اس سرد و خونی قاتل نے پانی پھیر ڈالا۔''

''صرف مقصد کی بات کرو اور جذباتیت چھوڑ دو۔'' مختار علی نے سخت لہجے میں کہا۔ کمال شاہ بولا۔

''حقیقت یہی تھی کہ۔۔۔ میں اپنے کمرے سے نکلا اور کلینک والے پورشن میں آکر صفائی کرنے لگا۔ وقت سے پہلے ہی میں سب کچھ ٹھیک ٹھاک اور اپنی جگہ پر برتنے کو رکھ دیا کرتا تھا۔ اپنے کام سے فارغ ہو کر میں مطمئن تھا کہ اب ڈاکٹر صاحب اپنے کمرے سے نکل کر کلینک میں آ بیٹھیں گے اسی لیے میں ذرا دیر کے لیے نیم اور بید مشک کے پتے توڑنے باہر چلا گیا۔ مجھے کچھ دیر ہو گئی اور لوٹا تو یہ ماجرا میرا منتظر تھا۔''

''تمہیں اتنی دیر ہو گئی تھی؟'' مختار کے لہجے میں حیرت تھی۔

''دیر کہاں ہوئی تھی سرکار؟'' وہ بولا۔ ''اتنی دیر تو میرا اس وقت کا معمول ہوتا ہے۔ مگر یہ سب جو ہوا وہ بہت جلدی ہو گیا تھا۔''

اس کی بات میں وزن تھا۔ اس کے بعد انسپکٹر مختار نے ڈاکٹر کے وکیل کو بولنے کا موقع دیا۔

اس نے وصیت کے مطابق بتا دیا کہ ڈاکٹر کی جائداد دو حصوں میں منقسم ہو گی۔ ایک اس کی طلاق یافتہ بیوی کے نام اور دوسری ایک رفاہی ادارے کے نام جن کے کئی خیراتی ہسپتال شہر اور شہر سے باہر پھیلے ہوئے ہیں۔ طلاق کے بعد ڈاکٹر نے دوسری شادی نہیں کی تھی۔

سب سے آخر میں انسپکٹر مختار نے نگینہ سے سوال کیا۔

''مس نگینہ! کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ ڈاکٹر مظفر سے ملنے آپ کیوں آئی تھیں؟''

میں اور دل مراد، نگینہ کی طرف دیکھنے لگے۔ میں نے صاف طور پر محسوس کیا کہ نگینہ کی آنکھوں میں خوف سا اُترا تھا اور دل مراد کا چہرہ بھی لمحہ بھر کو کٹ سا بن گیا تھا۔

نگینہ نے جلد ہی اپنی کیفیت پر قابو پایا اور بولی۔ ''میں۔۔۔ میں ڈاکٹر مظفر کے پاس اکثر اپنے علاج کے لیے آیا کرتی تھی۔ وہ ہمارا فیملی طبیب (فیملی ڈاکٹر) تھا۔''

''بہت خوب!'' مختار نے کہتے ہوئے یوں سر ہلایا جیسے اس کے جواب پر کوئی طنز کرنا چاہتا ہو۔ بولا۔ ''جب تم یہاں پہنچی تھیں تو خواب گاہ میں روشنی ہو رہی تھی۔ تم نے آواز دی، لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تم کچھ دیر خواب گاہ والے کمرے میں جا بیٹھیں اور پھر اُٹھ کر جانے لگیں تو تمہارا یہ دفتری ساتھی جاوید آن دھمکا۔ یہی کہا تھا؟''

''جی ہاں۔ بالکل ایسا ہی تھا۔''

حسب توقع اب مختار میری جانب متوجہ ہوا۔ ''کیا تمہیں یقین ہے کہ ڈاکٹر کی طرف آتے وقت تمہیں راستے میں کسی کی جھلک نظر نہیں آئی تھی؟''

''میں۔۔۔'' میں کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ مجھے اچانک ہی احساس ہوا تھا کہ نگینہ نے جھوٹ بولا تھا۔ کیونکہ وقت کافی ہو چکا تھا، یہ محض چند سیکنڈوں کی بات نہیں تھی۔ کیا نگینہ بھول گئی تھی۔ پھر میں نے تو دستک بھی دی تھی جو یقیناً نگینہ کے کانوں تک تو پہنچی ہی ہو گی۔

اس وقت وہ عمارت سے قریب ہی چھپی ہوئی تھی، مجھ تو فوراً میرے سامنے آگئی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے نگینہ کے اس ذرا سے غلط بیان پر ساری سچویشن ہی تبدیل ہو چکی ہو۔

تب یکایک مجھے یوں لگا جیسے نگینہ بھی اس قتل میں ملوث ہے، میں دہل گیا۔ جاسوسی کہانیاں جو میں فارغ اوقات میں پڑھا کرتا تھا، وہ سب میرے دماغ میں گھوم گئیں۔ کیا اس کے انجانے خوف کی وجہ بھی یہی تھی کہ وہ ایسی کسی مجرمانہ سرگرمی میں کسی کے ساتھ ملوث تھی۔۔۔ وہ خوف یہ تھا کہ بعد میں وہ مجرم آشکارا ہونے پر میں اس سے بدول ہو جاؤں گا۔ وغیرہ۔

''شاید اس وقت کوئی کار یہاں سے واپس جا رہی تھی۔'' میں نے بھی غیر ارادی طور پر جھوٹ بول دیا۔ تاکہ نگینہ کے دیے ہوئے جھوٹے بیان کو تقویت مل سکے۔ اس وقت میرے دل و دماغ میں صرف نگینہ کا خیال تھا۔

''اور۔۔۔ ممکن ہے کہ کوئی میرے قریب سے گزرا ہو اور میں نے توجہ نہ دی ہو۔''

''لیکن اس سے پہلے تو تم نے حتمی لہجے میں کہا تھا کہ کوئی تمہارے قریب سے نہیں گزرا؟'' انسپکٹر مختار علی کی آنکھیں سکڑ گئیں۔

''ہوں۔'' میں نے سر ہلایا۔ ''دراصل ابھی غور کرنے کے بعد مجھے احساس ہوا ہے کہ مجھے یہ بات اتنے یقین سے نہیں کہنی چاہیے تھی۔''

مختار کچھ سوچتا رہ گیا۔ نگینہ میری جانب کچھ ایسی نگاہوں سے دیکھنے لگی جیسے میرا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہو۔

☆☆☆

ڈاکٹر کے مکان کے باہر لان اور گاڑیوں کی گزرگاہ بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔ لاش اٹھائی جا چکی تھی اور ایک ایس آئی تصویر کشی کے لیے سامان سمیٹ کر رہا تھا۔ میں ایک لمحے تک اِدھر دیکھتا رہا پھر دوسری جانب مڑ گیا۔ نگینہ اس وقت دل مراد کی کار میں تھی۔

''میرے پیچھے آؤ۔'' دل مراد نے کہا۔ ''میں نے انسپکٹر مختار سے کہہ دیا ہے کہ فی الوقت تم ہمارے پاس قیام کرو گے۔''

☆☆☆

دل مراد کے گھر میں داخل ہونے کے بعد ماحول دیکھ کر مجھے کسی اُجڑے ہوئے فلمی گیٹ کا گمان ہوا۔ وہاں لمبی لمبی راہداریاں مکان کے بیرونی حصے سے عقبی حصے تک چلی گئی تھیں۔

دل مراد مجھے یہاں کیوں لایا تھا؟ اس لیے کہ میں پولیس کی تفتیش سے بچا رہوں کہ کہیں وہ مجھے تھانے ہی میں نہ لے جائیں یا پھر وہ جان گیا تھا کہ مجھے ان دونوں بہن بھائیوں پر کسی گھناؤنے جرم کی منصوبہ بندی پر شبہ ہو چکا ہے؟

بھی میں نے گمینہ کی محبت میں ان کا ساتھ دیا اور اب وہ مجھے بھی اس گھناؤنی منصوبہ بندی میں شریک بنانا چاہتے ہوں؟

زمین و جائداد کے مسائل تو یہاں کی عام بات تھی۔

میرے ذہن میں یہ سب چند سیکنڈ تک چکرا رہا اور وہ تمام ہمدرد و دماغ کی جاسوسی کہانیوں کے پلاٹ بھی جن میں یہی سب کچھ ہوا کرتا تھا۔ ہیرو آخر میں مجبوراً میں جا پھنستا تھا کیونکہ قانون کو حقیقت سے بے خبر رکھ پاتا اپنی مجبوری کو دور کر کے حادثے۔ میں نے سر جھٹک دیا۔

کمرے کشادہ تھے۔ حاکی کے آخری رنگت فرنیچر سمیت آسائش کا جملہ سامان وہاں نظر آتا تھا۔ وہاں ہر وہ شے موجود تھی جو ایک مکمل اور پُرآسائش گھروں حویلیوں میں موجود ہوتی ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ مجھے غیر استعمال شدہ نظر آرہا تھا۔

یہ احساس مجھے اس گرد کو دیکھ کر نہیں ہوا تھا جو فرنیچر یا دوسری اشیا پر جمی ہوئی تھی بلکہ کوئی اور وجہ تھی جس کی توجیہہ کرنا فی الوقت میرے اختیار میں نہ تھا۔

"آؤ نشست گاہ میں چلتے ہیں۔" دل مراد نے کہا۔ گمینہ بھی ساتھ تھی۔ "ایک کپ کافی چائے کی حاجت محسوس ہو رہی ہے۔"

"میں بنا کر لاتی ہوں۔" گمینہ اٹھنے لگی مگر دل مراد نے اسے روک دیا۔ مجھے یوں لگا جیسے گمینہ وہاں میری موجودگی کے سبب نہیں رکنا چاہ رہی ہو مگر کیوں؟

"ناجمہ کو بلاؤ۔"

لیکن جب ہم وہاں پہنچے تو ان کی ادھیڑ عمر پرانی ملازمہ ناجمہ وہاں موجود تھی۔ وہ بوڑھی اور لاغری تھی لیکن پھرتیلی تھا۔

"کیا بات ہوئی ہے، پولیس نے تمہیں کیوں بلایا تھا؟ اور میں نے سنا ہے کوئی حادثہ ــــ" وہ پوچھتے پوچھتے رہ گئی۔ دل مراد نے اس کی بات کاٹ دی۔

"کچھ نہیں ہوا اماں!" گمینہ نے کہا۔ "تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"پولیس ان سے کیا پوچھنا چاہتی تھی۔" ناجمہ نے دوبارہ پوچھا۔ وہ ان کی پرانی اور چہیتی ملازمہ ہی لگتی تھی مجھے۔

"کسی نے ڈاکٹر مظفر کو قتل کر دیا ہے۔" دل مراد نے انکشاف کیا۔

"کیا.....؟" ناجمہ کی آنکھیں حیرت اور خوف سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اس نے غیر یقینی کے عالم میں باری باری دل مراد اور گمینہ کی طرف دیکھا اور میری جانب بھی۔ پھر پوچھا۔

"یہ..... کب کی بات ہے؟"

"سہ پہر کے بعد کسی وقت کی۔" دل مراد نے کہا۔

"ہائے خدایا! ڈاکٹر مظفر..... فرشتہ صفت انسان تھا، سب کے کام آیا کرتا تھا، آندھی ہو یا طوفان، کوئی بھی بیمار پڑتا بلانے پر فوراً ساتھ چل پڑتا تھا۔" ناجمہ گہرے تاسف سے بولی۔ پھر پوچھا۔

"پولیس کیا کہتی ہے؟ کس مردود کی یہ حرکت ہو سکتی ہے؟"

"ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔" اس بار گمینہ نے کہا۔ میں زدیدہ نظروں سے کبھی گمینہ اور کبھی دل مراد کی طرف دیکھ لیتا تھا۔

"ہوا کیسے اس غریب کو کچھ بتی؟"

میں نے محسوس کیا کہ جیسے گمینہ کو بتاتے ہوئے وقت ہورہی ہو تاہم بولی۔

"کسی نے بھاری چیز سے ڈاکٹر کی کھوپڑی کے پچھلے حصے کو ضرب لگائی اور پھر لاش کو تالابی جنگل میں پھینک دیا تھا۔ قاتل کا خیال تھا کہ لاش دریا کی شاخ میں جا کے نکلے گی مگر اتفاق ہی تھا کہ..... وہاں یہ آن پہنچے۔" کہتے ہوئے گمینہ نے میری جانب اشارہ کر دیا اور مجھ سے نگاہیں چرائیں۔

ناجمہ نے کچھ مشتبہ انداز کی نگاہیں میرے چہرے پر گاڑ دیں۔

"تم وہاں کیا کرنے گئے تھے؟"

"میں..... وہ....."

"اپنی طبیعت دکھانے گئے تھے۔" میں ابھی یہ کچھ بتانے ہی والا تھا کہ گمینہ نے یک دم جھوٹ بولا۔ پھر اسے کافی کے لیے بھیج دیا۔ تاکہ وہ مزید سوالات نہ کرے۔

جھوٹ پر جھوٹ بولنے پر مجبور کیا جا رہا تھا مجھے آخر کس مقصد کے لیے..... وہ شاید اب یہ دونوں بہن بھائی میرے سامنے کھولنے والے تھے۔

میں بھی اسی وقت کا انتظار کر رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اگر ان دونوں بہن بھائیوں کا اس میں ہاتھ ہوا تو کیا میں ان کا ساتھ دے سکتا ہوں؟

ابھی میرے پاس اپنے ہی اس سوال کوئی جواب نہ تھا، منتظر وقت ضرور تھا۔

مگر ایسا کچھ نہ ہوا۔ تھوڑی دیر وہاں بیٹھنے اور باتیں

نہیں ہو سکتی۔ ورنہ وہ اپنے بھائی کو یہ حقیقت کیوں بتاتی کہ وہ اگر شادی کرے گی تو صرف مجھ سے ہی۔

اب مجھے ایک بے چینی لگ گئی۔ میں نے سوچا نگینہ سے کھل کر بات کروں۔ اس طرح کہ اسے بُرا بھی نہ لگے اور وہ کسی قسم کے خوف کے بغیر مجھے ساری حقیقت سے آگاہ بھی کر دے۔ مجھے یوں لگا جیسے نگینہ کو میری مدد کی ضرورت ہو۔

رات گئے میری آنکھ لگ گئی۔

صبح جب ہاجرہ ہی مجھے جگانے کے لیے آئی تھی تو اس بوڑھی خاتون کو ملازمہ کو دیکھ کر اچانک میرے ذہن طباع میں ایک خیال آیا اور میں نے اس سے کہا۔

''اماں! آپ اس خاندان کی پرانی اور کافی خیر خواہ ملازمہ لگتی ہیں۔'' وہ میرے نرم لہجے پر رک گئی۔

''ہاں، بیٹا! یہ دونوں تو میری گودوں میں کھیلے ہیں۔'' اس کی مراد یقیناً نگینہ اور دل مراد سے تھی۔

''کیا نگینہ کو ڈاکٹر مظفر نے... بلایا تھا یا پھر وہ خود وہاں گئی تھی؟'' میں نے پوچھا۔ ''میرا مطلب ہے کل جیسے آپ نے یہ بات بتائی تھی مگر کسی نے توجہ نہیں دی تھی۔''

''ہاں۔''

''کیوں، کیا علاج کے سلسلے میں؟ لیکن مجھے نگینہ نے بھی بتایا تھا کہ وہ کوئی خاص بات اس سے کرنا یا بتانا چاہتا تھا۔'' میں نے اب تک کی صورت حالات اور گفتگو کی روشنی میں اندھیرے میں تیر چلایا۔

''شاید۔ وہ ہمارا فیملی ڈاکٹر ہے اور بہت سی باتوں سے واقف بھی۔'' ہاجرہ بولی۔

میں جو اپنے ذہن رسا میں تانے بانے بن رہا تھا اس کے مطابق ہی ہاجرہ نے جواب دیا تھا۔

''کیسی باتیں؟''

''میں کیا جانوں، آؤ ناشتے پر سب موجود ہیں۔'' وہ چلی گئی۔ میں ہونٹ بھینچے کچھ سوچتا رہا۔

ناشتا ہم نے اکٹھے ہی میز پر کیا۔ دونوں بہن بھائی خاموش خاموش تھے۔ فقط دل مراد نے ایک جملہ ادا کیا تھا کہ ناشتے کے بعد ہو سکتا ہے، انسپکٹر عمار علی یہاں آ جائے۔

ناشتے کے بعد ہم اس کے منتظر رہے، جب وہ نہ آیا تو... نگینہ کے کہنے پر دل مراد نے اس سے فون کر کے پوچھ لیا۔

اس نے شام کو آنے کا کہا تھا۔ میں ان سے رخصت ہونا چاہتا تھا۔ نگینہ طبیعت خرابی کا کہہ کر اپنے کمرے میں چلی گئی تو دل مراد مجھے دروازے تک چھوڑنے آیا۔

اچانک اس نے مجھ سے باہر آ کر، جب میں اپنی بائیک سنبھال رہا تھا، ایک غیر متوقع جملہ کہا۔

''کیا تم نگینہ سے محبت کرتے ہو؟''

لامحالہ میں نے چونک کر پہلے اس کی طرف دیکھا پھر مسکرا کر بولا۔ ''میرا خیال ہے یہ موقع ایسی باتیں کرنے کا تو نہیں؟''

''وہ ایک خطرناک ذہنی مریضہ ہے۔ وہ اپنے ایک اور چاہنے والے کو بھی جانی نقصان سے دوچار کر چکی ہے۔ وہ طویل عرصے سے غائب ہے، شاید مار دیا گیا ہے۔ تم محتاط رہنا۔''

''میں سمجھا نہیں، تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' میں نے الجھ کر کہا۔

''میں صرف تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ نگینہ کی منگنی ہو چکی ہے۔'' یہ اطلاع میرے لیے چونکا دینے والی تھی۔

''لیکن، اس نے تو کبھی مجھے یہ نہیں بتایا؟''

''میرے یہ بتانے کا مقصد صرف اتنا ہی تھا کہ تم اس کا خیال دل سے نکال دو۔ کیونکہ نگینہ کا منگیتر شکیل بھی ایک حادثے میں مر چکا۔ خدا حافظ!'' وہ انتہائی رکھائی سے بولا اور پلٹ گیا۔

میں الجھن آمیز پریشانی کا شکار ہو گیا۔ اپنی تحیر آمیز طبیعت سے مجبور ہو کر جی تو چاہا کہ اسی وقت اندر جاؤں اور نگینہ سے اس بات کی تصدیق کر ڈالوں۔ پھر یہ سوچ کر کہ دل مراد نے یونہی جھوٹ بولا ہو گا۔ نگینہ سے پھر کبھی دریافت کر... لوں گا۔

میں واپس ہوا تو سوچا ابھی وقت ہے، ڈیوٹی پر ہی کیوں نہ چلا جاؤں۔

لہٰذا وہاں سے میں بائیک خاصی رفتار سے دوڑاتا ہوا ڈیوٹی پر پہنچ گیا۔ اپنی لیو (چھٹی) کینسل کروائی، بائیومیٹرک پر حاضری لگائی اور سیٹ پر جا بیٹھا۔

☆☆☆

یہی بات تھی کہ دفتر میں میرا دل ہی نہ لگا مگر چار و ناچار کام کرتا رہا۔ شام میں گھر پہنچا تو نگینہ کی کال آ گئی۔

میں خود بھی اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔

''کہو، خیریت ہے؟'' میں نے بے تابی سے پوچھا۔ جانے کیوں میرا دل تیز تیز دھڑکنے لگا۔

''تم ہمارے گھر سے واپسی پر ڈیوٹی پر چلے گئے تھے؟''

کرنے کے بعد ہم سب نے اکٹھے کھانا کھایا۔ دادا بہت ضعیف تھے، ان کی کل بندھی روٹین تھی۔ وہ الگ تھے اور ہاجرہ ہی ان کی دیکھ بھال کرتی تھی۔

''تم اب اس وقت گھر جا کر کیا کرو گے وہاں کون سے تمہارے اپنے بیٹھے منتظر ہوں گے۔ یہیں رک جاؤ، کل صبح دوبارہ تو آنا ہے، بیان وغیرہ کے سلسلے میں؟''

میں نے جب دیکھا کہ دونوں بہن بھائی مجھ سے ایسی کوئی بات نہیں کر رہے ہیں تو اپنے خیال کو رد کرتے ہوئے میں رخصت چاہنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تھا اور جواب میں دل مراد نے مجھ سے یہ کہا تھا۔

مجھے حیرت ہوئی کہ کہاں تو مجھے یہ شخص پسندیدگی کی نگاہ سے ہی نہیں دیکھتا تھا اور اب... جیسے اس کا رویہ نرم ہوا جا رہا تھا۔

''ہاں، بھائی صحیح کہہ رہے ہیں۔ آپ رک جائیں نا۔ اتنی رات ہو گئی ہے اور یہ سارا جنگلی علاقہ ہے۔'' نگینہ بھی بھائی کی دیکھا دیکھی بولی۔

ایک بار پھر تجسس نے مجھے گھیر لیا۔ میں نے حامی بھر لی۔ ان کا کہنا ٹھیک ہی تو تھا۔ ایک چھوٹے سے اسٹوڈیو فلیٹ میں میرا کون بیٹھا انتظار کرنے والا بیٹھا تھا بھلا؟ ماسوائے جاسوسی ناولوں کے ڈھیر اور کتابوں کے۔ رہی بات ڈیوٹی کی تو وہ میں فون پر اپنے سیکشن انچارج کو قانونی مجبوری بتا کر چھٹی لے سکتا تھا۔

مجھے کمرا دے دیا گیا۔ میں جب بستر پر لیٹا تو خود کو کسی سنسنی خیز جاسوسی کہانی کا ایک کردار ہی سمجھے ہوئے تھا۔ شاید مرکزی کردار... یا پھر...

''قربانی کا بکرا...'' کسی نے سرگوشی کی اور ایک انجانے خوف سے میرے پورے جسم میں پھریری سی دوڑ گئی۔

ایسے میں میری چشم تصور میں اسٹڈی کی ہر چیز گویا سامنے گھومتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی، جہاں سے ہم کچھ دیر پہلے اٹھے تھے۔ وہاں پر سجا ہوا فرنیچر، مکان تمام اشیا سے ممتاز تھا۔

''میں نے یہ کمرا اپنے اور مراد بھائی کے لیے سجایا تھا۔'' نگینہ کی آواز میرے دماغ میں گونجنے لگی۔

مجھے واش روم کی حاجت ہوئی اور میں جب فارغ ہو کے دوبارہ بستر کی جانب بڑھا تو مجھے کسی کی تیز آواز سنائی دی، یوں جیسے کوئی غصے یا جھلا کے تیز آواز میں بولا ہو۔

یہ آواز نگینہ کی تھی۔ میں چونک گیا۔ آہستگی سے دروازے کی جانب بڑھا اور اسے کھول کر راہداری میں آ گیا۔ پرایا گھر تھا، اس طرح جاسوسی کرنا مجھے اچھا تو نہیں لگا لیکن نگینہ کی آواز نے مجھے بے چین کر دیا تھا اور کچھ میں اپنے سابقہ خدشات کے سبب ایک تجسس کا بھی شکار تھا۔

راہداری میں مدھم روشنی ہو رہی تھی۔ اب باتیں کرنے کی آواز ہلکی ہو گئی، جو اسٹڈی روم سے آ رہی تھی جہاں ہم کچھ دیر پہلے بیٹھے تھے۔

تو کیا وہ دونوں بہن بھائی ابھی تک وہاں موجود ہیں؟

''ہرگز... ہرگز نہیں... میں یہ شادی کسی بھی صورت میں نہیں کر سکتی۔ میں صرف اور صرف جاوید کو پسند کرتی ہوں اور اسی سے ہی شادی کروں گی، کان کھول کر سن لو، اگر کسی نے مجھ پر دباؤ ڈالنے کی کوشش چاہی تو میں یہ راز سب کو بتا دوں گی۔ سمجھے تم؟''

میں ابھی دروازے سے کان لگائے ہوئے ہی تھا کہ مجھے نگینہ کی برہم ہوتی یہ آواز سنائی دی اور ساتھ ہی کرسی کے زور سے کھسکنے کی بھی۔

میں جلدی سے اپنے کمرے کی جانب لوٹ آیا اور دروازے کی جھری بنا کر نیم تاریک راہداری میں دیکھنے لگا۔ نگینہ نکل کر دوسری جانب چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد میں نے اس کے بھائی دل مراد کو بھی کمرے سے نکلتے دیکھا۔

اب خاموشی چھا گئی۔ میں دوبارہ بستر پر آ کر دراز ہو گیا۔ میرے اندر سائیں سائیں ہونے لگی۔

ان دونوں بہن بھائیوں کے بیچ مجھے کسی پُراسرار معاملے کی بھنک محسوس ہوئی۔ وہ آخر اپنی بہن نگینہ پر کس سے شادی کرنے کا دباؤ ڈالنے کی کوشش میں تھا؟ اور...

اور نگینہ کی یہ تہدید بھی میرے ذہن میں گونجنے لگی، جو اس نے اپنے بھائی کو دیتے ہوئے کہی تھی کہ اگر اس پر زیادہ دباؤ ڈالنے کی کوشش کی گئی تو وہ کوئی راز اگل دے گی۔

آخر وہ کیا راز تھا؟

ساتھ ہی مجھے نگینہ کی زبانی یہ سن کر بھی مسرت ہوئی تھی کہ وہ صرف مجھ سے ہی شادی کرنا چاہتی تھی اور اب تو اس نے گویا با نگِ دہل اپنے بھائی سے بھی یہ کہہ دیا تھا۔

خوشی اپنی جگہ مگر پھر وہی بات میرے ذہن گردش کرنے لگی۔ یہ دونوں بہن بھائی کسی خونی سازش میں ملوث ہیں، لیکن پھر مجھے کم از کم نگینہ کے سلسلے میں کسی قدر تسلی ہوئی کہ وہ اگر خدانخواستہ کسی دباؤ یا مجبوری کے سبب اپنے بھائی کے ساتھ کسی سازش میں شریک ہے بھی تو کم از کم وہ میری

بولا تھا؟"
اس نے چونک کر سر اُٹھایا اور میری طرف دیکھنے لگی۔ حالات ایسے تھے کہ مجھے تھوڑا پتھر دل ہونا پڑا۔ اس میں ہم دونوں کا ہی فائدہ تھا۔
"میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا تھا، اس وقت جو میرے ذہن میں آیا وہ کہہ دیا۔"
"ٹھیک ہے، میں خود ان باتوں کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کروں گا۔"
اس نے چونک کر پھر میری طرف دیکھا۔ "تم...... تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"
"تم نے کہا تھا کہ جب تم ڈاکٹر کے پاس پہنچی تھیں تو وہاں کوئی موجود نہیں تھا۔ جب تم واپس آ رہی تھیں تو مجھ سے ملاقات ہو گئی۔"
"یہ درست ہے جاوید!" وہ بڑے رسان سے بولی۔
"لیکن میں تمہارے پکارنے سے پہلے ہی وہاں موجود تھا۔ یہ وقت تم نے کہاں گزارا تھا؟"
"میں جھیل کے پاس تھی، اس تذبذب کا شکار تھی کہ شاید ڈاکٹر واپس آ جائے، تمہاری بائیک کو دیکھ کر میں اُلجھن میں پڑ گئی تھی، حتیٰ کہ بعد میں، میں نے تمہیں دیکھ لیا تھا۔"
"نگینہ ... ! کیا تم ڈاکٹر کے قاتل سے واقف ہو؟"
"نہیں، میں نے کسی کو نہیں دیکھا تھا۔"
"ہوں، تمہارے خیال میں یہ کس کی حرکت ہو سکتی ہے؟"
"کچھ نہیں کہا جا سکتا۔" اس کی آواز واضح طور پر کانپ رہی تھی۔ "میں کچھ نہیں بتا سکتی۔"
"اس کے باوجود کہ کسی نے اسے قتل کیا ہے۔" میرا لہجہ سخت ہو گیا۔ "ڈاکٹر نے تمہیں اپنے گھر کیوں بلایا تھا؟ یا تم کیا واقعی علاج کرانے گئی تھیں اس کے پاس؟"
وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے میرا چہرہ تکنے لگی اور لڑکھڑاتے لہجے میں بولی۔
"تت ... تمہیں یہ کس نے بتایا کہ ڈاکٹر نے مجھے بلایا تھا خاص طور پر ......؟"
میں نے اُس رات ملازمہ ہاجرہ کی زبانی یہ سنا تھا، جب ہم رات کے کھانے کی تیاری کر رہے تھے۔ یہ بات ابھی تک میرے ذہن میں اٹکی ہوئی تھی۔
"مجھے بتاؤ نگینہ! وہ کیا بات تھی، جو ڈاکٹر تمہیں بتانا چاہتا تھا مگر اس بے چارے کو قاتل نے موقع ہی نہ دیا؟"

"ممکن ہے کہ وہ میری بیماری کے بارے میں ہی گفتگو کرنا چاہتا ہو۔ جیسے کہ تم کہہ رہے ہو کہ مجھے کسی بڑے اچھے نفسیاتی معالج سے رجوع کرنا چاہیے۔"
اس نے بڑی چالاکی سے بات ٹھکرا دی تھی۔ نگینہ کو مجھ سے بھی محبت کا دعویٰ تھا، لیکن ایک بے گناہ خون کو ضائع نہیں جانے دیتا تھا۔ انسانیت کے ناتے یہ میرا فرض بنتا تھا جبکہ نگینہ کو میں اس میں ملوث محسوس کر رہا تھا۔
مجھے لگ رہا تھا کہ وہ بالواسطہ یا بلاواسطہ کسی جرم میں مجبوراً یا دباؤ میں آ کر ملوث کی جا چکی تھی۔ مگر وہ راز کیا تھا؟ اسی راز میں مجھے ساری قتل کی داستان چھپی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔
"تمہارے خیال میں کیا ڈاکٹر کی قاتل میں ہوں؟" اچانک نگینہ نے کہہ ڈالا۔ جی تو میرا چاہا کہ اُسے جوش دلانے اور ساری حقیقت بتا دینے پر مجبور کرنے کے لیے 'ہاں' کہہ ڈالوں۔ تاہم بولا۔
"سردست تو کچھ نہیں کہا جا سکتا۔" نگینہ نے اس کا کوئی اثر نہ لیا۔ ہم اب باتیں کرتے ہوئے باغات سے باہر دریا کے اس حصے پر آ گئے تھے جہاں ایک چھوٹی سی کشتی گھاٹ بنی تھی۔
"غوطہ خوری کا نادر اس جگہ تھا۔" نگینہ نے اشارہ کیا۔ "شکیل کے مرنے کے بعد دل مراد نے اسے ختم کرا دیا تھا۔"
قدرے ہچکچاہٹ کے بعد اس نے کہا۔ "ممکن ہے، شکیل نے خود کو ہلاک کر لیا ہو؟"
"کیا ... ؟" میں چونک کر بولا۔ "اُسے بھلا خودکشی کی کیا ضرورت تھی؟"
"ممکن ہے اسے بھی وہی بات معلوم ہو جو ڈاکٹر مظفر میرے بارے میں جانتا تھا؟" نگینہ نے نہایت اسرار بھرے اور چونکا دینے والے انداز میں کہا، یوں جیسے اس پر ایک بار پھر ذہنی مریضہ جیسا دورہ پڑنے لگا ہو اور وہ سب سچ بتانے پر مجبور ہو، ایسے میں مجھے خود بھی اس سے خوف آنے لگا۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔
"نگی ... یہ تم کیا کہہ رہی ہو، ہوش میں تو ہو؟" میں نے پوچھا۔ وہ ایک دم ہسٹریائی انداز میں چلّانے لگی۔
"مجھے کچھ نہیں معلوم، میں بے گناہ ہوں۔ آہ... !"
وہ نڈھال سی ہو کے گرنے لگی۔ میں اسے گھر لے آیا۔ دل مراد اور ہاجرہ اسے سنبھالنے لگے۔ دل مراد نے کوئی دوا لانے کا کہا۔

میں واپس اپنی بائیک کی جانب آیا۔ رات ہو چکی تھی۔ دل مراد نے بھی مجھے رکنے کا نہیں کہا بلکہ اس کے لہجے سے یہی لگا کہ وہ بھی مجھ سے جان چھڑانا چاہتا ہو۔ میں رات کے اندھیرے میں گھر آ گیا۔ اگلے دن میں نے ایڈووکیٹ مسعود کے دفتر کا رخ کیا۔ وہ اپنی بھاری بھرکم ریوالونگ چیئر پر بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر جیسے اس کی نظریں مجھ پر ٹھٹکیں لیکن دوسرے ہی لمحے وہ مجھے پہچان کر مصافحے کے لیے کھڑا ہوا اور ہاتھ میری جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔ "جاوید! میں تمہیں یہاں دیکھ کر حیرت زدہ ہوا ہوں۔"
"نگینہ نے مجھے بتایا ہے کہ آپ اس کے خاندانی معاملات سے بخوبی آگاہ ہیں۔" رسمی علیک سلیک اور گفتگو کے بعد میں مقصد کی بات پر آ گیا۔
"صرف کاروباری معاملات۔" مسعود نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "اس کا باپ مختیار احمد اور میں ایک دوسرے کو بچپن سے جانتے تھے۔ اُس وقت جائیداد کا سارا حساب میرے والد کے ہاتھ میں تھا۔"
میں نے اس سے نگینہ کی اس پُراسرار بیماری کا تذکرہ کیا۔ "کچھ تفصیلات معلوم نہیں" تو وکیل نے کہا۔ "اس خاندان میں بھی کسی کو خفقان کا مرض نہیں رہا۔ البتہ ان باغات سے سب کو پُراسرار انداز میں دلچسپی ضرور رہی ہے۔ سب نے اس باغ پر اتنی رقم صرف کی ہے کہ کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ لیکن اسے بھی شوق ہی کہا جا سکتا ہے پاگل پن نہیں۔"
"ٹھیک ہے۔" میں نے سر ہلایا۔ "کیا ڈاکٹر مظفر نے ان معاملات کے بارے میں کوئی دھمکی دی تھی؟"
یہ سوال اگرچہ مجھے خود بھی عجیب لگا تھا مگر مجھے کسی خیال کے تحت کرنا پڑا۔ میں نے محسوس کیا جیسے وکیل کے کان ایک دم کھڑے ہو کے پھر ساکت ہو گئے۔
"مجھے صرف نگینہ سے دلچسپی ہے۔ مجھے اس کی دولت اور امارت سے کچھ نہیں لینا دینا۔" اس سے پہلے کہ وہ میرے سوال کا غلط مطلب لیتا، میں نے کہہ دیا۔ کیونکہ اسے اسی رات ہی علم ہو گیا تھا جب ہم سب کی انسپکٹر مختار علی کے ساتھ ایک "تفتیشی" نشست لگی تھی کہ میں اور نگینہ ایک دوسرے میں دلچسپی لیتے تھے۔ وغیرہ۔
"نہیں...... ڈاکٹر نے کسی قسم کی کوئی دھمکی نہیں دی تھی اور دیتا بھی کیوں؟ وہ تو ان کا فیملی طبیب تھا۔"

"اچھا، کیا شکیل کی موت کے وقت یہ افواہ اڑی تھی کہ اس نے خودکشی کی ہے؟" میرا سوال اچانک تھا۔ وکیل کی آنکھوں سے حیرت جھلکنے لگی۔
"معلوم نہیں، اس سلسلے میں مکمل تحقیقات ہوئی تھیں اور قاتل نہیں مل سکا تھا۔" وکیل کا لہجہ سپاٹ ہو گیا۔ اس کا رویّہ اب میرے لیے ناقابلِ فہم تھا۔
"کیا تمہیں معلوم ہے کہ ڈاکٹر مظفر، نگینہ سے کیا بات کرنا چاہتا تھا؟"
"نہیں، وہ اپنے مریضوں کے بارے میں گفتگو کرنے کا عادی نہیں تھا۔"
"غالباً اس کے ہاں طبّی ریکارڈ تو ضرور ہوگا۔"
"یقیناً، لیکن وہ سب کچھ انسپکٹر مختار کے پاس پہنچ چکا ہوگا۔ اس نے آلۂ قتل کی تلاش میں پیشہ ور غوطہ خوروں کی خدمات حاصل کی ہیں۔"
"آخری سوال، کیا تمہیں معلوم ہے کہ نذیر خان کون تھا اور اس کی منگنی نگینہ کے ساتھ ہوئی تھی؟"
"تم یہ سب آخر کیوں پوچھ رہے ہو؟ کیا پولیس کے مخبر ہو یا پھر کوئی اور معاملہ ہے؟" وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔
"معاملہ مجھے بھی واقعی کوئی اور نظر آ رہا ہے جس کے بارے میں سب جانتے ہیں مگر ظاہر کچھ نہیں کر رہے، میرا سوال درمیان میں رہ گیا۔" میں نے بھی اپنا لہجہ سپاٹ بناتے ہوئے ذومعنی لہجے میں کہا اور مستفسرانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔
اس کا جواب بھی وہی تھا جو نگینہ مجھے دے چکی تھی۔ تاہم میں سمجھ چکا تھا کہ اس قانون داں سے کوئی بات معلوم کرنا ممکن نہیں ہے۔ میں اس کے عجیب و غریب رویّے کے بارے میں غور کرتا ہوا اُٹھا اور دفتر سے باہر نکل آیا۔

☆☆☆

ایک روز بعد جب میں وہاں پہنچا تو مقتول ڈاکٹر مظفر کے گھر کے قریب انسپکٹر مختار علی اور دیگر افراد موجود تھے۔ نگینہ نے مجھے ساتھ لیا اور اس جگہ پہنچی جہاں دو راتیں قبل اس نے اپنی کارکردگی کی تھی۔
"اوہ ......" نگینہ کانپتے ہوئے لہجے میں بولی۔ "میں زیادہ دیر تک وہاں نہیں ٹھہر سکی تھی۔ مجھے وہ منظر یاد آ گیا تھا جب اس کا مردہ ہاتھ پانی سے باہر نکلا ہوا تھا اور میں اس کی کوئی مدد نہیں کر سکی تھی۔"
"میں جانتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں قدرے اور

کمال شاہ سے بھی ملا ہوں۔" میں نے اپنی دانست میں اسے چونکایا۔ میرے ایک مبہم سے خدشے کے مطابق اگر وہ مجرم نہیں تھی تو اس بات پر قطعاً نہیں چونکے گی اور وہی ہوا۔

"اچھا، تم نے پولیس والوں جیسی تفتیش شروع کر دی۔" وہ پہلی بار ان حالات میں بھی ہنسی تھی۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ نگینہ اور دل مراد دونوں ہی معصوم تھے، یا پھر کوئی اور معاملہ تھا۔

"مجھے پلیز، ذرا قدیر کے بارے میں کچھ بتاؤ۔" میں نے کہا۔

"تم مل تو آئے ہو؟"

"ہاں، مگر ماسوائے معمولی باتوں کے۔"

"میں جانتی ہوں جاوید! کہ تم یہ سب تگ و دو میری خاطر کر رہے ہو۔ مطمئن رہو، تمہاری نگینہ کسی طرح بھی مجرم نہیں ہے۔" وہ آہستگی سے بولی۔ اس کے لہجے میں شکایت نہیں تھی، ایک پیار تھا، ایک مان تھا۔

"ہاں، نگینہ! تم ٹھیک کہتی ہو، خدا کرے ایسا ہی ہو، مجھے تم پر بھروسا ہے۔" میں نے کہا۔ وہ قدیر کے بارے میں بتانے لگی۔ حقیقت یہی تھی کہ قدیر نے مجھے کوئی لفٹ نہیں کروائی تھی۔

قدیر سے میرا ملنا غیر ضروری تھا اسی لیے میں نے سب سے پہلے کمال شاہ سے ملاقات کی تھی اس نے جو انکشافات قدیر کے بارے میں کیے تھے، اس کی بنا پر میں قدیر سے ملا تھا مگر اس نے مجھے کوئی رخ نہ دیا اور اُلٹا مجھ پر شک کرنے لگا تھا کہ میں — نگینہ کو اس کی دولت و جائداد کی خاطر پسند کرتا ہوں، وہ بیگم سرور کا خاصا منہ چڑھا ملازم تھا۔

اب دیکھنا یہ تھا کہ نگینہ، قدیر کے بارے میں مجھے کیا سچ جھوٹ بتاتی ہے۔ وہ مجھے قدیر کے بارے میں بتا رہی تھی۔

"سننے میں یہی آتا ہے کہ بہت عرصہ پہلے قدیر کے باپ دادا کی یہاں بڑی زمینیں تھیں، جہاں اب ہماری تھیں۔ قدیر جو کہ اب معمولی ملازم ہے، مگر کبھی صاحبِ جائداد ماں باپ کی اولاد ہوا کرتا تھا۔ پھر نجانے کیا ہوا کہ ان کے ہاتھ سے یہ سب نکلتا چلا گیا۔ باپ نشے کا عادی ہو گیا اور جرائم کی راہ پر جانے کے بعد جیلوں میں سب گنوا بیٹھا۔ قدیر کی ماں خود کو تب بھی معزز اور جاگیردارنی ظاہر کرنے کی کوشش کرتی رہی لیکن شوہر کے پاس اب دکھاوے کو پورا کرنے کے لیے بھی کچھ نہیں تھا۔

قدیر جوان ہوا تو اس نے اعلان کیا کہ اس کا باپ سادہ مزاج آدمی تھا جسے پہلے جان بوجھ کر نشے کی لت میں لگایا گیا پھر آہستہ آہستہ اس سے اس کا سب کچھ ہتھیا لیا گیا۔ اب میں وہ ایک ایک پائی ایک دن واپس حاصل کر کے رہوں گا۔ لوگوں نے اس کی بڑک پر کان نہیں دھرے۔ نہ ہی وہ کچھ کر سکا۔"

"اس کی کون سپورٹ کر رہا ہے؟"

"کس کی؟"

"قدیر کی؟"

"بھلا اس کی کون سپورٹ کر سکتا ہے؟ وہ خود اب ایک معمولی حیثیت کا نوجوان ہے۔"

"کیا خبر کوئی اسے اس کی انتقامی خواہش پر ہتھیار کے طور پر استعمال کر رہا ہو۔ کیونکہ میں نے یہ بھی سنا ہے کہ جن لوگوں کے بارے میں اس نے دھمکی دی ہے، اس میں تمہارے مرحوم باپ کا نام بھی آتا ہے۔"

میری بات پر نگینہ کا چہرہ خوف زدہ ہو گیا لیکن ایک دم ہی اس نے جیسے یہ تاثرات زائل کرنے یا چھپانے کی خاطر ایک کھوکھلا سا قہقہہ بلند کیا۔

"تمہیں تو واقعی پولیس میں بھرتی ہونا چاہیے تھا۔"

"ہاں، عموماً عاشق ناکامی میں شاعر بن جاتے ہیں مگر میں —" میں نے دانستہ جملہ اُدھورا چھوڑ دیا۔

"ہوسکتا ہے بیگم سرور ہی اس لڑکے کے ساتھ مل کر کچھ کر رہی ہو۔ درونِ خانہ —؟ کیونکہ اس کا دوسرا شوہر سنا ہے، اپنی بیوی سے دبتا ہے اور اس کی حیثیت "یس میم" کے سوا کچھ نہیں۔"

ہم واپس آگئے۔ معلوم ہوا کہ پولیس کو ابھی تک آلۂ قتل نہیں مل سکا تھا۔

☆☆☆

بوڑھی ملازمہ مجھ پر اب بھروسا کرنے لگی تھی۔ وجہ اس کی وہ باتیں تھیں جو میں تنہائی کے موقع پر اُس سے کرتا رہتا تھا۔ ایک چھوٹا موبائل فون اس کے پاس بھی تھا۔ اسمارٹ فون تو وہ نہیں استعمال کر سکتی تھی مگر عام سا چھوٹا سیل وہ کر لیتی تھی۔

ایک دن اس نے مجھے فون پر کہا۔

"پہلے مجھے تم پر شک ہوتا تھا مگر اب تمہاری کوششوں سے تمہارے خلوص اور نگی بی بی سے سچی محبت کا مجھے یقین ہو چلا ہے۔ تم ایسا کرو نگینہ کو یہاں سے کہیں لے جاؤ۔"

میں اس کی بات پر چونک پڑا۔ یوں لگا جیسے پل کے پل ہی اس ڈرامے کا ڈراپ سین ہوا چاہتا ہے۔ مجھے اپنا

ہی شک درست محسوس ہونے لگا۔

... تشویش سے کہتا تھا۔ "کیا ہوا اماں؟ سب ... نے اماں ہی کہتا تھا۔ "کیا ہوا اماں؟ سب ... ٹھیک تو ہے وہاں؟"

"بیٹا ... اگر نگینہ کا منگیتر خاموشی سے اسے یہاں سے لے ... تو آج وہ بھی زندہ ہوتا۔" اس نے کہا۔ اس کی بات پر ... موت کی ایک سرد لہر دوڑتی محسوس ہوئی۔

"لیکن یہاں ایسی کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

... خاموش رہی۔

"کیا آپ جانتی ہیں کہ ڈاکٹر مظفر کا قاتل کون ..." میں نے کہا۔ "نگینہ کے منگیتر کو کس نے ہلاک کیا؟"

"معلوم نہیں ... لیکن تم ابھی تک زندہ ہو۔" اس ... لہجے میں کہا۔ "بعض چیزیں قتل سے زیادہ ... ناک ہوتی ہیں۔"

اس کے بعد رابطہ منقطع ہو گیا۔ میں سوچتا رہ گیا۔ ... کی طرف سے فکر و تشویش نے آگھیرا تھا۔ ایسا کیا ... تھا نگینہ کے ساتھ کہ جسے اس کی بوڑھی اور پرانی ... ملازمہ نے بھانپ لیا تھا مگر وہ کچھ بتانے سے خائف ... اب مجھے ہی کھوج لگانا چاہیے تھا۔

میں وہاں پہنچا۔ شام کا وقت تھا۔ بڑی سیاہ اور اُداس ... محسوس ہو رہی تھی۔ ابھی میں نگینہ کے مکان کے ... تب ہی تھا کہ اچانک اسے سامنے دیکھ کر چونک پڑا۔ ... بلاشبہ وہ نگینہ ہی کا کمرا تھا۔ وہ کھڑکی سے چند فٹ کے ... فاصلے پر کھڑی تھی۔ اس کے جسم پر نیلا لبادہ تھا۔ نزدیک ... جلتے ہوئے بجلی لیمپ کی روشنی براہِ راست اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ وہ اس وقت بالکل خاموش، ساکت ... مغموم تھی۔ اس کا چہرہ زرد تھا اور آنکھیں جیسے اندھیرے ... میں بھٹک رہی تھیں۔

میں خاموش کھڑا اُسے وہیں سے گھورتا رہا۔ نگینہ کچھ دیر ... اسی حالت میں کھڑی رہی پھر نگاہوں کے سامنے سے ہٹ ... گئی۔ میں نے ایک طویل ہنکاری بھری۔ مجھے یوں محسوس ... ہو رہا تھا جیسے میں نے کوئی خواب دیکھا ہو۔ آنکھیں ملتے ... ہوئے دوبارہ قدم بڑھایا اور پھر ٹھٹک کر رک گیا۔

مجھے تاریکی میں ایک آدمی نظر آیا تھا۔ وہ آدمی مکان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں دبے قدموں اس کی طرف بڑھنے لگا۔ میرا دل تیز تیز دھڑک رہا تھا۔ قریب پہنچ کر میں نے اچانک اس سے ہولے سے "ہیلو" کہا۔

وہ شخص بُری طرح چونک پڑا۔ سراسیمگی کے عالم وہ ... بھاگنا ہی چاہتا تھا کہ میں یک دم تاریکی سے روشنی میں اس کے سامنے آ گیا۔ مجھے دیکھ کر اس آدمی نے ایک طویل سانس لی۔

"اوہ یہ تم ہو۔" دل مراد کی آواز سنائی دی۔ "تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ شاید تم آج نہیں آؤ گے۔"

"حالات ہی ایسے تھے کہ مجھے روز آنا پڑے گا۔" میں نے بھی ڈھٹائی سے کہا۔ آخر وہ نگینہ میری محبت تھی۔ میں اسے خطرات میں اکیلا کیسے چھوڑ سکتا تھا۔

ہم وہیں کھڑے کھڑے باتیں کرنے لگے۔ پہلے تو وہ کسی سوچ میں مستغرق رہا پھر بولا۔

"تم نگینہ سے شادی کرنا چاہتے ہو؟"

"ہاں" میں نے صاف کہہ ڈالا۔

"نگینہ اور میں اپنے والدین کے بعد ایک ساتھ رہے ہیں۔ میں نے ہی اس کی نگہداشت کی ہے اور میری حیثیت باپ جیسی ہے۔" اس نے کہا۔ "اور — میں اپنی اس حیثیت کی وجہ سے تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

"میں سن رہا ہوں۔" میں نے استفہامیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"نگینہ ایک بے حد حساس لڑکی ہے اور بڑی حد تک خوف زدہ بھی۔"

"کس چیز سے خوف زدہ؟"

"معلوم نہیں۔" اس نے میری جانب دیکھا۔ مجھے کوفت ہوئی۔ ہر کوئی کسی انجانے خطرے کا کہہ رہا تھا مگر بتا کچھ نہیں رہا تھا۔ میں نے دیکھا۔ دل مراد کے چہرے پر کرب کے آثار تھے۔

"مجھے ڈر ہے کہیں اپنے اس نفسیاتی خوف کی وجہ سے وہ کہیں بھاگ ہی نہ جائے۔ اس کا ذہنی توازن بگڑنے میں دیر نہیں لگتی۔"

"اسے کسی ڈاکٹر کو کیوں نہیں دکھاتے؟" میں نے کہا۔

"ہاں، لیکن میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر مظفر اس کا مسئلہ سمجھتا تھا، وہ اسی سلسلے میں اس سے کوئی بات کرنے والا تھا۔" اس نے کہا۔

"شکیل سے منگنی کے وقت ڈاکٹر مظفر یہاں موجود تھا؟"

"نہیں۔ اس نے تو شکیل کو کبھی دیکھا ہی نہیں تھا۔"

"نگینہ کا خیال ہے کہ شکیل نے خودکشی کی تھی۔"

"نہیں، میرا خیال ہے کہ اس کا اندازہ غلط ہے۔

''یہ کیوں لڑ رہا ہے تم سے؟'' دل مراد نے بھی قدیر کی طرف دیکھتے ہوئے مجھ سے سوال کیا۔

''اُلٹی سیدھی بکواس کر رہا تھا۔'' میں نے قدیر کا گریبان چھوڑتے ہوئے کہا۔ قدیر مجھے خطرناک نتائج کی دھمکیاں دیتا ہوا چلا گیا۔

''دفع کرو اسے، ایک نوکر کی کیا اوقات؟'' نگینہ نے کہا۔

''انسپکٹر مختار علی ایک سرکاری ڈاکٹر کے ساتھ یہاں پہنچنے والا تھا؟'' دل مراد بولا۔

''وہ چلے گئے۔''

''کچھ نیا رخ ملا تفتیش کا انہیں؟'' دل مراد نے پوچھا۔

''ابھی تو نہیں۔''

''ہم...... تم ہمارے ساتھ چلو۔''

''نہیں، میں ابھی کمال شاہ سے کچھ باتیں کروں گا۔'' میں نے محسوس کیا کہ نگینہ نے مجھے ساتھ چلنے کو بالکل بھی نہیں کہا۔ اس کے اس کٹھور پن پر مجھے دکھ تو ہوا، لیکن پھر سوچا جانے کیا اس کی مصلحت ہو۔ یہی ہوتا ہے محبت میں، محبوب کی ہلا روش بھی عاشق سر آنکھوں پر لے لیتا ہے۔

وہ دونوں بہن بھائی چلے گئے۔ میں کمال شاہ سے تھوڑی دیر باتیں کرتا رہا، پھر اپنی بائیک کی جانب بڑھ گیا۔ راستے میں بائیک خراب ہوگئی۔ پرانا ماڈل تھا، کچھ نہ کچھ ہوتا ہی رہتا تھا۔ میں نے اُتر کر دیکھا، سائڈ ٹول کھول کر سامان نکالا اور پلگ چیک کیا۔ اس میں کاربن آگیا تھا۔ وہ میں نے ریگ مال سے رگڑا اور پھر پلگ لگانے ہی والا تھا کہ دفعتاً مجھے عقب کی جھاڑیوں میں سرسراہٹ سنائی دی۔

میں اکڑوں بیٹھا پلگ لگا...... رہا تھا کہ ایک موٹا ڈنڈا فضا میں بلند ہوتے دیکھا، وہ کوئی آدمی تھا، جھاڑیوں کی آڑ سے مجھ پر حملہ کرنے کے لیے پر تول رہا تھا، میرے مڑ کر دیکھتے ہی وہ بھاگ اُٹھا۔ ایک بات میں نے ڈنڈے میں نوٹ کی تھی، دھوپ میں اس سے چمک اُبھری تھی اور میری آنکھوں پر پڑی تھی۔ شاید ڈنڈے کے سرے پر کوئی لوہے یا پیتل کی پتری چڑھی ہوئی تھی۔

میں درحقیقت ڈر گیا اور خوف زدہ بھی ہوگیا، اسی لیے مجھے اس کے تعاقب میں جانے کا خیال یا جرأت نہ ہوسکی۔ وہ یقیناً خود کو روپوش رکھتے ہوئے مجھے ہلاک کر دینے کا ارادہ رکھتا تھا مگر مجھے چوکنا پاکر وہ...... بھاگ اُٹھا۔

تھوڑا وقت گزرا تو میں نے اسی وقت پلگ لگا کر بائیک اسٹارٹ کی، شکر تھا کہ وہ صحیح ہوگئی تھی۔ میں نے اب گھر کے بجائے سیدھا بیگم سرور کے گھر کا رخ کیا۔ میرے اندر اب ایک عجیب سی جرأت اور ہمت آگئی تھی۔

میں آندھی طوفان کی طرح بائیک دوڑاتا ہوا بیگم سرور کے مکان پر پہنچا تو وہاں میں نے قدیر کو قریبی لان میں ایک لکڑی کی بینچ پر بیٹھے ہوئے دیکھا۔ وہ بُری طرح ہانپ رہا تھا۔ اس کے کپڑے میلے ہوئے تھے اور میلے بھی ہو رہے تھے۔

''تم نے ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھ پر حملہ کرنے کی کوشش کی تھی۔'' میں نے بائیک سے اُتر کر اس کے قریب آکر کہا۔ میری بھانپتی نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

''میں نے نہیں تم نے مجھ پر حملہ کیا تھا۔'' اس نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ اس کا اشارہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ڈاکٹر مظفر کے مکان میں ہماری ہونے والی تلخ کلامی کی طرف تھا، جب میں نے غصے میں اس کا گریبان پکڑ لیا تھا۔

''میں اس حملے کی بات کر رہا ہوں جب تم نے مجھے ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی۔ موٹے ڈنڈے کے ساتھ۔''

''تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں تو سیدھا یہاں پہنچا ہوں۔'' وہ حیران ہو کے بولا۔

''تو پھر تمہارے کپڑے اتنے میلے کیوں ہو رہے ہیں؟ تم ہانپ بھی رہے ہو۔'' میں نے شکی نظروں اُسے گھورا۔

''راستے میں ایک کُتّا میرے پیچھے لگ گیا تھا۔ جاؤ اب اپنے گھر۔'' قدیر نے غصے سے کہا اور اُٹھ کر دروازے کی جانب بڑھ گیا۔

''یاد رکھنا۔ میں یہ بات انسپکٹر مختار علی کو بتانے جا رہا ہوں۔'' میں نے اسے دھمکی دی۔ اس نے کوئی پروا نہ کی اور اندر چلا گیا۔

میں سیدھا تھانے پہنچا اور اُصولی طور پر اپنے اُوپر ناکام حملے کی رُوداد انسپکٹر مختار علی کو سنا ڈالی اور ساتھ ہی اپنے شک کا بھی اظہار کرتے ہوئے قدیر کے بارے میں بھی بتا دیا۔ اس کے بعد میں گھر آگیا۔

☆☆☆

اگلا دن فیصلہ کن اور سنسنی خیز ثابت ہوا۔ میرا خیال تھا کہ میں یہ گتھی خود بھی سلجھانے کی کوشش کروں گا، مگر انسپکٹر

مختار علی نے یہ سلجھا دی تھی۔

یوں بھی یہ اسی کا کام تھا۔ میں تو بس یہ دیکھنا چاہ رہا تھا کہ آخر معاملہ کیا تھا، اور نگینہ کے نفسیاتی اور نامعلوم خوف کی وجہ کیا تھی۔

انسپکٹر مختار نے ہی مجھے فون کیا تھا کہ میں فوراً دل مراد کے ہاں پہنچوں۔

میں وہاں پہنچا تو سب لوگ موجود تھے۔ یوں جیسے کسی خونی اور سنسنی خیز ڈرامے کا ڈراپ سین ہونے والا ہو۔ وہاں قدیر اور کمال شاہ بھی تھا۔ قدیر کو دیکھ کر مجھے تسلی ہوئی تھی۔ میرے خیال میں وہی اصل مجرم تھا۔ انسپکٹر مختار کسی دوسرے کمرے میں تھا۔

''چوہے بلی کا کھیل شروع ہوگیا۔'' قدیر نے نعرہ لگایا۔ مجھے اس کی مکاری پر غصہ آنے لگا۔ جیسے جن رہا تھا۔ بیگم سرور نے اسے ڈانٹ کر خاموش کروا دیا۔ وہ باز نہ آیا اور میری طرف دیکھ کر بولا۔

''انسپکٹر مختار، اب یہاں ہم میں سے کسی ایک کو مجرم ثابت کرنے کے لیے ڈرامے کا ایک اسٹیج تیار کر رہا ہے۔''

''لیکن ہم سے تو کوئی قاتل نہیں؟'' کمال شاہ بولا۔

غیر ارادی طور پر میری نظر... قریب موجود نگینہ اور دل مراد پر پڑی۔ دونوں کچھ پریشان سے دکھائی دے رہے تھے اور نگینہ نجانے کیوں مجھ سے نگاہیں چُرانے کی کوشش کر رہی تھی۔

اسی وقت انسپکٹر مختار اندر داخل ہوا۔ اس کے ہمراہ اسسٹنٹ بھی تھا جس نے ایک لمبوترے سے تھیلے میں کچھ اُٹھا رکھا تھا۔

وہ اس نے فرش پر رکھ دیا۔ باہر موبائل پر پولیس موجود تھی۔ انسپکٹر نے اپنے اسسٹنٹ کو اشارہ کیا۔ وہ کھڑکی کے پاس گیا اور دو ساتھیوں کو آواز دے کر اندر بلا لیا۔ وہ تینوں اب چوکس کھڑے ہوگئے تھے۔

''قاتل یہاں سے بھاگنے کی کوشش بالکل نہ کرے۔ ورنہ مارا جائے گا۔'' انسپکٹر نے اعلان کر دیا۔ کشادہ کمرے میں ایک دم سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ گویا قاتل یہاں موجود تھا۔ سب بے چین نظر آرہے تھے ماسوائے قدیر کے۔ اس کے چہرے پر کچھ ایسے آثار تھے جیسے وہ اس ڈرامائی منظر سے حظ اُٹھا رہا ہو۔

''دل مراد...... ! اِدھر آؤ۔'' سا انسپکٹر نے اسے پکارا۔

''م...... میں؟'' اس نے اپنے سینے کی جانب اشارہ کیا۔

''ہاں، تم...'' مختار علی اسے گھور کر بولا۔ وہ قریب گیا۔ سب نظریں یک ٹک ان پر جمی رہیں۔

''اسے ہتھکڑی پہنا دو۔'' انسپکٹر کی تحکمانہ آواز اُبھری اور اس کے ساتھ ہی کمرے میں کچھ حیرت بھری آوازیں اُبھریں۔ نگینہ بُری طرح سسک پڑی۔ میں اسے سنبھالنے کے لیے بڑھا۔ وہ میرے ساتھ لگ گئی اور بہت آہستگی سے اس نے مجھ سے سرگوشی میں کہا۔

''جاوید! مجھے معاف کر دینا۔''

میں دنگ رہ گیا۔

''شکیل اور ڈاکٹر مظفر کا قاتل یہی آدمی ہے۔'' انسپکٹر نے اعلان کر دیا۔ ایک بار پھر کئی ہراس زدہ آوازیں اُبھریں۔ انسپکٹر نے ہاتھ کے اشارے سے خاموش رہنے کا کہا اور میری طرف دیکھ کر بولا۔

''تیسرا قتل یہ کل سہ پہر میں جاوید کا کرنا چاہتا تھا مگر سوئے اتفاق ناکام ثابت ہوا، اگر جاوید مجھے کل ہی اس واقعے کی اطلاع نہ دیتا تو شاید میں مجرم تک کبھی نہیں پہنچ سکتا۔''

اس کے بعد اس نے اپنے ساتھی کو فرش پر پڑے تھیلے کو کھولنے کا کہا۔ وہ آگے بڑھا اور اندر سے ایک ڈنڈا برآمد کرلیا۔

''یہی ڈنڈا تھا وہ... جس سے مجھ پر حملہ کرنے کی کوشش کی گئی تھی مگر قدیر...'' میں جوش سے پکار اُٹھا۔ کیونکہ اس ڈنڈے کے سرے پر مجھے پیتل کی پتری چڑھی دکھائی دے گئی تھی جس کی لمحاتی چمک مجھ پر پڑی تھی۔

''دھیرج جاوید میاں!'' انسپکٹر نے مجھے خاموش کرایا اور آگے بولا۔ ''یہی وہ آلۂ قتل ہے، جس سے مجرم دل مراد پہلے شکار کے دماغ پر ضرب لگا کر اسے بے بس یا بے ہوش کر دیتا تھا اس کے بعد آسانی سے ہلاک کر ڈالتا تھا۔ جاوید نے جب مجھے اپنے اُوپر ہونے والے حملے کی اطلاع اور جگہ بتائی تو میں نچلا نہ بیٹھ سکا اور اسی وقت وہاں جا پہنچا۔ نشان تازہ تھے، ایک دیہاتی تجربہ کار کھوجی کو لے کر میں قاتل کے پیچھے دل مراد کے گھر جا پہنچا مگر اسے ابھی کچھ نہ بتایا۔

''نگینہ آرام کر رہی تھی ــ ہاجرہ نے دروازہ کھولا تو میں نے اس سے چھوٹتے ہی دل مراد کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بتایا کہ وہ اور نگینہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ڈاکٹر مظفر کے گھر سے آئے تھے۔ نگینہ کو چھوڑ کر دل مراد اپنی

ہاکی اُٹھائے کہیں چلا گیا۔ واپس لوٹا تو اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ وہ یہی سمجھی کہ شاید پریکٹس کر کے آرہا ہے۔ میں نے اس سے اس تھیلے کے بارے میں دریافت کیا۔ وہ اس نے کمرے میں رکھا تھا اپنے...... میں وہیں جا پہنچا، دل مراد باتھ روم میں تھا۔

تھیلا ابھی اس نے سنبھالا یا چھپایا نہ تھا۔ میں نے دیکھا اس کے اندر ہاکی کے بجائے ڈنڈا تھا وہی چتکل کی چتری والا ڈنڈا۔ جس کے بارے میں جاوید نے مجھے بتایا تھا۔ اس ڈنڈے پر قاتل کے فنگر پرنٹس کے نشان ثبت ہیں۔"

اس کے بعد وہ سر جھکائے کھڑے دل مراد کی جانب بڑھا۔

"بہتر ہوگا، اب تم اپنے گھناؤنے جرم کا اقرار کرلو۔"

دل مراد نے اقرار کرلیا تو ایک ساتھ کئی مضطربانہ چیخیں گونج اٹھیں۔

☆☆☆

"نگی! تم اگر پہلے ہی مجھے اس راز سے آگاہ کر دیتیں تو بہت سے حقائق پہلے ہی سے واضح ہو جاتے جس سے پولیس کی تفتیش بھی جلد اپنے منطقی انجام کو پہنچ جاتی۔"

دو روز گزرنے کے بعد میں نگینہ سے کہہ رہا تھا۔ اس وقت پہلی بار میں نے اس کے چہرے پر طمانیت اور ایک مسرت کے آثار دیکھ رہا تھا۔

"تمہارے انجانے خوف کی وجہ بھی یہی تھی جس نے تمہیں قریب قریب نفسیاتی مریض بنا دیا تھا۔ تم دل مراد کے دباؤ میں آگئی تھیں، لیکن حیرت کی بات ہے کہ تمہیں تب بھی دل مراد پر ایک خونی قاتل ہونے کا شبہ نہ ہوا؟"

"مجھے واقعی اس پر کسی قسم کا کوئی شبہ نہ تھا......" نگینہ ہولے سے بولی۔

"اب مجھے معلوم ہوا کہ وہ تم پر شادی کا دباؤ کیوں ڈالا کرتا تھا۔ یہ اُس خبیث کا ایک فتیح فعل تھا۔" میں نے کہا۔

"بے شک وہ تمہارا سگا بھائی تو کیا سوتیلا بھائی بھی نہ تھا، مگر...... لے پالک تھا، باوصف اس کے تم دونوں بچپن سے ہی بھائی بہن کی طرح پروان چڑھے تھے، جبکہ لوگوں کو بھی یہی پتا تھا کہ تم اور دل مراد سگے بہن بھائی ہو، اب ایسے میں اگر یہ حقیقت بتا دی جاتی، محض شادی کرنے کے لیے کہ دل مراد تمہارا بھائی یا تم اس کی بہن نہیں ہو تو لوگوں پر تب بھی برا اثر پڑتا۔"

"یہی بات میں اُسے بھی سمجھانے کی کوشش کیا کرتی تھی کہ میں نے اسے آج تک ایک بھائی کی نظر سے ہی دیکھا ہے۔" نگینہ بولی۔

"وہ خبیث تم سے شادی دولت ہی کی خاطر کرنا چاہتا تھا۔" میں بولا۔ "تمہیں اس مسئلے کو میرے ساتھ ڈسکس کرنا چاہیے تھا، مگر تم نے بے چارے ڈاکٹر مظفر سے ڈسکس کیا، وہ علاقے کی معزز شخصیت کہلاتا تھا، تمہارا خیال تھا کہ وہ دل مراد کو سمجھانے کی کوشش کرے گا، اس نے یہ کوشش کی بھی مگر...... دل مراد اُلٹا تم پر برہم ہوا، نتیجے میں ڈاکٹر مظفر نے دل مراد کو دھمکی دے دی، جس کے نتیجے میں دل مراد نے اس کا قتل کر دیا۔ مجھے تو دل مراد کی بے وقوفی پر حیرت ہے کہ اس پر دولت و جائداد کی طمع اس قدر غالب آچکی تھی کہ وہ تمہیں بھی اس راز کو راز میں رکھنے کا کہتا تھا، حالانکہ اس کے آشکارا ہونے پر تو اس کا ہی فائدہ تھا، بعد میں مجھے انسپکٹر مختار علی نے بتایا کہ دل مراد یہ راز کسی وقت اچانک آشکارا کرنے کا ارادہ رکھتا تھا، شاید اس سے پہلے وہ ڈاکٹر مظفر کا خاتمہ کرنا چاہتا تھا تاکہ اس پر کوئی شبہ نہ کر سکے۔"

"جاوید! تم بہت بہادر اور سچے انسان ہو، دل مراد کے لیے تم بھی خطرہ بن گئے تھے۔" نگینہ بولی۔ "لیکن تم نے آخری وقت تک میری مدد کی ٹھانے رکھی۔"

"مجھے یہ ڈر تھا کہ کہیں تم خدانخواستہ کسی دباؤ میں آکر اس کی شریکِ جرم نہ قرار دے دی جاؤ، میں اسی لیے یہ ساری تگ و دو کر رہا تھا۔"

"تمہارا احسان ہے مجھ پر۔"

"اب اس کا انعام چاہیے مجھے۔" میں نے معنی خیز مسکراہٹ اور محبت پاش نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر کہا تو وہ میرا اشارہ سمجھ کے شرم سے گلنار ہوگئی اور اسی لہجے میں بولی۔

"جو حکم کریں۔"

"میرا انعام میرے سامنے بیٹھا ہے، جیتا جاگتا، خوش اور مطمئن، بس، مجھے یہی چاہیے۔" میں نے دل کی عمیق گہرائیوں سے کہا۔ اس نے جذبات سے اپنی آنکھیں موند کر بہت دھیرے سے کہا۔

"میں بھی حاضر ہوں۔"

اس کے یہ کہنے کی دیر تھی کہ میں نے اس کا نرم و گداز ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اس نے کوئی مزاحمت نہ کی۔

❖❖❖

سرورق کی دوسری کہانی

موت کے بعد...

اسما قادری

کچھ لوگ خود ساختہ محبت کا محلِ وقوع طے کرتے ہیں اور پھر نفرتوں کا حدود اربع متعین کر لیتے ہیں... کارزارِ زیست میں کچھ موسموں اور کچھ محبتوں کا ممنوع ہونا لکھا ہوتا ہے... ایسے شکست گزیدہ لوگ اپنی ذات کے گرد ایک دائرہ کھینچ کر خود کو اس میں مقید کر لیتے ہیں... اس قید خانے سے کسی صورت رہائی نہیں چاہتے... اپنی اولاد کی محبت اور تشویش میں گم ہو کے ہر شے سے فراموشی اختیار کر لیتے ہیں...

موت کے بعد سامنے آنے والے ممنوع موسموں کی دل گداز داستاں......

"تم کیا ہر وقت کتابی کیڑا بنی رہتی ہو؟ لگتا ہے اس سال تمہیں ہی ٹاپ کرنا ہے۔" وہ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔

"ٹاپ نہ کرے مگر اچھے نمبروں سے پاس ہونے کی کوشش تو کرنی چاہیے۔ ماں باپ پڑھنے لکھنے کے لیے ہمیں یہاں بھیجتے ہیں۔" اس نے سر اٹھائے بغیر سنجیدہ لہجے میں جواب دیا اور مسلسل کاغذ پر قلم چلاتی رہی۔

"پڑھنے لکھنے سے کس کافر نے انکار کیا ہے لیکن بندہ

اتنے خوب صورت موسم میں فزکس میں سر کھپا کر اپنے بدذوق ہونے کا تو ثبوت نہ دے۔" اس نے کن انکھیوں سے ہانیہ کے سنجیدہ تیوروں کو دیکھا لیکن اپنے لہجے کی بے پروائی و بے نیازی کو برقرار رکھتے ہوئے اس کی توجہ موسم کی طرف مبذول کروانے کی کوشش کی۔

موسم واقعی بہت سہانا ہو رہا تھا۔ آسمان پر تیرتے ابر کے ٹکڑوں نے سورج کی تیز شعاعوں کی راہ میں حرام ہو کر درجۂ حرارت کم کر دیا تھا۔

"خوب صورت موسم میں لڑنا جھگڑنا اور آپس میں ہاتھا پائی کرنا تو بندے کے بے حد باذوق ہونے کی نشانی ہے نا؟" اس نے اس بار بھی اپنا سر نہیں اٹھایا لیکن ناراض سے لہجے میں جو کچھ کہا اسے سن کر مجتبیٰ اپنے سر پر ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔ خبر کو پر لگنے کا رواج اس وقت اسے سخت کھلا تھا۔

"کیوں—اب کیوں بولتی بند ہو گئی جناب کی؟" اس بار اس نے کتاب سے سر اٹھایا اور اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"یہ تو رعب حسن کی وجہ سے ہے۔ تمہارے حسین چہرے کو دیکھ کر میری زبان خود ہی گنگ ہو جاتی ہے۔"

"میں بہت سنجیدہ ہوں مونی! مجھے شعیب کے گروپ سے تمہارا جھگڑا ہونا بالکل بھی اچھا نہیں لگا۔"

"میں کب ان لوگوں سے جھگڑا کرنا چاہتا تھا لیکن وہ احمق خود ہی میرے گلے پڑ گئے۔ اور ان سے تو ہاتھا پائی ہو گئی۔" اس نے اپنی صفائی پیش کی۔

"صرف تُو تکار ہی....؟ تمہاری اُن سے باقاعدہ ہاتھا پائی ہوئی ہے جس کا ثبوت تم اپنے ساتھ لیے پھر رہے ہو۔" اس کا اشارہ مجتبیٰ کی قمیص کے ٹوٹے ہوئے بٹن کی جانب تھا۔

"کوئی ایسا بڑا جھگڑا نہیں ہوا تھا۔ شعیب کے اس وحشی نے میرے گریبان پر ہاتھ ڈالا تھا۔ مجھے بھی اسے سبق سکھانے کے لیے ایک دو لگے چلانا پڑے۔" اس نے گویا کان پر سے مکھی اڑائی۔

"مجھے تمہاری فکر ہے مونی! تمہیں کوئی تکلیف پہنچنے کا خیال ہی مجھے بے چین کر دیتا ہے لیکن تم اس بات کو سمجھتے نہیں ہو۔" اس بار وہ روہانسی ہو گئی اور آنکھوں میں آئے آنسو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے باقی چیزیں بیگ میں رکھنے لگی۔

"سمجھتا ہوں ہنی لیکن تم بھی تو میری مجبوری سمجھو۔ میں ایک نظریاتی انسان ہوں اور حبیب بھائی کی حمایت کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔" ہانیہ کے آنسوؤں نے اس کا لہجہ خود ہی پست کر دیا۔

"تم ایک سراب کے پیچھے بھاگ رہے ہو مونی! یہ سیاسی پارٹیاں تم جیسے طالب علموں کو صرف اپنے ایندھن کے طور پر استعمال کرتی ہیں۔ تمہیں ان لوگوں کے چکر میں پڑنے کے بجائے اپنا کیریئر بنانے کی طرف توجہ دینی چاہیے۔" اس نے ایک بار پھر اسے وہی بات سمجھانے کی کوشش کی جو اس سے قبل بھی کئی بار سمجھا چکی تھی۔

"میں تمہاری باتوں پر غور کروں گا لیکن تم فی الحال تو اپنا موڈ ٹھیک کرو۔ میں تو آیا تھا کہ چل کر آئسکریم کھائیں گے اور چہل قدمی کریں گے تاکہ موسم کو انجوائے کر سکیں۔" اسے معلوم تھا کہ ہانیہ اپنی جگہ ٹھیک ہے لیکن اپنے نظریات اور سیاسی وابستگی سے دستبرداری بھی آسان نہیں تھی اس لیے فی الحال اسے ٹال دینے میں ہی بہتری جانی۔

"چلو چلتے ہیں لیکن میں زیادہ دیر نہیں رکوں گی۔ موسم کے تیور دیکھ کر لگ رہا ہے کہ آج بارش ہوگی۔ بہتر ہوگا کہ میں بارش شروع ہونے سے پہلے ہی گھر پہنچ جاؤں ورنہ پھر بھی راستے خراب ہونے سے پریشانی ہو جاتی ہے۔" اس نے مشروط ہامی بھری اور بیگ کندھے سے لٹکا کر کھڑی ہوگئی۔

"تمہارے ساتھ یوں تھوڑی دیر تک ہی چلوں تو میرا دل خوشی سے بھر جاتا ہے۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ تم مستقل میری زندگی کی ساتھی بن گئیں تو میرے قدم ہی زمین پر نہیں ٹکیں گے۔" وہ اس سے محبت کرتا تھا لیکن یوں رومانس بھی کبھار ہی بگھارتا تھا اور جب ایسا کرتا تھا تو ہانیہ کی بولتی بند ہو جاتی تھی۔ اس وقت بھی وہ کینٹین سے خریدی گئی کون آئسکریم کو نزاکت سے کھاتی اس کے سنگ روش پر ٹہلتی بس اسے سن رہی تھی۔

"اوہ پاپا کال کر رہے ہیں۔" اس نے موبائل کی اسکرین دیکھی اور بولتے ہوئے تیزی سے کال ریسیو کی۔

"جی پاپا جانی! کلاسز ختم ہو گئی ہیں۔ میں بس نکلنے ہی لگی ہوں۔ آپ فکرمند نہ ہوں میں بارش شروع ہونے سے پہلے پہلے گھر پہنچ جاؤں گی۔" اب وہ باپ کی فکر دور کرنے کی فکر میں تھی۔

"آپ جلدی گھر آنے والے ہیں، یہ تو بہت ہی اچھی بات ہوگی۔ آپ نکلیں اپنے آفس سے۔ میں انشاء اللہ آپ سے پہلے گھر پہنچ جاؤں گی۔" وہ فون پر مصروف تھی اور مجتبیٰ مسکراتا ہوا یہ یک طرفہ گفتگو سن رہا تھا۔

"اب تو میں لاکھ منتیں کر لوں، تم ہرگز نہیں رکوگی۔" وہ فون بند کر کے اس کی طرف پلٹی تو وہ شریر سے لہجے میں بولا۔

"مجھے معلوم ہے کہ تم مجھے آزمائش میں ڈالنے کی

بات نہیں کرو گے۔" وہ جانے کے لیے بالکل تیار تھی اور وہ بھی روکنے کا ارادہ بھی نہیں رکھتا تھا لیکن اچانک ہی ان بدتمیز لوگوں نے وہاں آکر انہیں گھیر لیا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟" اس نے اپنی پریشانی کو چھپا کر سختی سے پوچھا۔

"سنا ہے تو بڑی ہیرو گیری کرتا پھر رہا ہے۔ ہاتھ بھی چلانا سیکھ لیے ہیں۔ میں موقع پر موجود نہیں تھا ورنہ دیکھتا کہ تو میرے گروپ کے لڑکے پر کیسے ہاتھ اٹھاتا۔" وہ شعیب تھا جس کے گروپ کے لڑکوں سے آج ہی اس کا جھگڑا ہوا تھا۔ جھگڑے کے وقت وہ موجود نہیں تھا اس لیے اب کسر پوری کرنے آگیا تھا۔

"تمہارا ساتھی بدکلامی نہ کرتا تو میں بھی ہاتھ نہ اٹھاتا۔ پہلے اپنے ساتھیوں کو تمیز سکھاؤ پھر دوسروں کے منہ لگنا۔" وہ ہانیہ کے ساتھ ہونے کی وجہ سے تھوڑا پریشان تھا لیکن دب کر بات اس لیے نہیں کر رہا تھا کہ وہ لوگ اور بھی کچھ شیر ہو جاتے۔

"بات سن کا کے! اس کالج پر میرا راج چلتا ہے۔ تو بس سال بھر سے یہاں ہے اور میں نے ایک ایک کلاس میں تین تین سال لگائے ہیں۔ تجھ جیسا بچہ اگر مجھ سے مقابلہ کرے گا تو منہ کی کھائے گا۔ بہتر ہے یہ جو تیرا ایک سال رہ گیا ہے، یہاں خاموشی سے گزار کر نکل جا ورنہ یہ جو تیرے ساتھ پھر رہی ہے، تیرے بوتھے کی طرف دیکھے گی بھی نہیں۔ تیرا سارا ناک نقشہ بگاڑ دیں گے ہم۔" اس نے بولتے ہوئے مجتبیٰ کی ٹھوڑی کو اپنی انگلیوں میں دبوچ لیا۔ اس کی اس حرکت پر مجتبیٰ تپ گیا اور اس کی کلائی کو پکڑ کر اس زور سے دھکا دیا کہ وہ لڑکھڑا سا گیا۔

"تمیز سے دور رہ کر بات کرو اور اس غلط فہمی کو دور کر لو کہ یہ کالج تمہارے باپ کی جاگیر ہے۔" غصے میں بولا وہ یہ دیکھنے سے قاصر رہا کہ اپنے گروہ کی بے عزتی پر چراغ پا ہو کر اس کا ایک چیلا اس پر حملہ آور ہو چکا ہے۔ ہانیہ نے عین وقت پر دیکھا اور چیختی ہوئی بے اختیار ہی مجتبیٰ کے سامنے آگئی۔ نتیجتاً اسے اس کی طرف آنے والا مکا اپنے رخسار پر سہنا پڑا۔ ایک نرم و نازک سی لڑکی کے لیے ایک آوارہ گرد کا پوری قوت سے مارا گیا مکا معمولی نہیں تھا۔ درد کی شدت سے بلبلا کر وہ چیخ پڑی۔ پھر کیا تھا۔ مجتبیٰ بھی ان لڑکوں سے بھڑ گیا۔ وہ اچھے قد کاٹھ کا لڑکا تھا اور اس وقت طیش میں بھی آچکا تھا اس لیے ان کی عددی برتری کے باوجود خوب ہاتھ پیر چلا رہا تھا لیکن بہرحال وہ لوگ بھی کوئی ہاتھ پر ہاتھ دھرے تو بیٹھے نہیں تھے، اُن کی طرف سے بھی اس کی خوب خاطر کی جارہی تھی۔

"ہیلپ... پلیز ہیلپ...کوئی مدد کرو۔" ہانیہ نے معاملہ حد سے آگے بڑھتا دیکھا تو بدحواس ہو کر چیختی چلاتی کینٹین کی طرف بھاگی۔ اس کی چیخیں سن کر کینٹین میں موجود لڑکے اس طرف دوڑے۔ اچھی بات یہ تھی کہ لڑائی محض ہاتھوں پیروں کی تھی اور کسی قسم کے اسلحے کا استعمال نہیں کیا جا رہا تھا چنانچہ وہ لڑکے بے دریغ درمیان میں کود پڑے اور فریقین کو کھینچ کھانچ کر ایک دوسرے سے علیحدہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

"ابھی تو تُو بچ گیا لیکن یاد رکھنا آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔" شعیب اپنے ساتھیوں کے ساتھ جاتے جاتے اسے یہ آواز بلند دھمکی دے کر گیا۔

"یہ لوگ حد سے بڑھ گئے ہیں۔ پرنسپل صاحب کو اس واقعے کی رپورٹ کرنی ہوگی۔" ایک لڑکے نے مجتبیٰ کو سہارا دے کر بٹھاتے ہوئے غصے سے کہا۔

"تم ٹھیک ہو ہانیہ! زیادہ درد تو نہیں ہو رہا؟" اس نے سب کی باتیں نظرانداز کر کے ہانیہ سے پوچھا۔

"میں ٹھیک ہوں۔ تم میری فکر نہیں کرو۔" وہ کافی حد تک خود کو سنبھال چکی تھی۔

"آئی ایم سوری۔ میری وجہ سے تمہیں تکلیف اٹھانی پڑی۔" وہ شرمندگی سے بولا۔

"تم میری فکر چھوڑو اور کسی ڈاکٹر سے جا کر بینڈیج اپ کرواؤ۔" اس نے فکرمندی سے مجتبیٰ کی آنکھ کے قریب موجود نیل کے نشان کو دیکھا۔

"میں کروا لوں گا لیکن اب تم گھر جاؤ۔ تمہارا مزید یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں ہوگا۔" اسے لڑکوں کے بیچ ہانیہ کی موجودگی اسے اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

"بس میں جا ہی رہی ہوں۔" وہ فوراً جانے کے لیے تیار ہو گئی کیونکہ اسے یاد آگیا تھا کہ پاپا جانی گھر پہنچنے والے ہیں۔

"پاپا جانی کو اس چوٹ کے بارے میں کیا بتاؤں گی۔ وہ تو بہت پریشان ہو جائیں گے۔" عجلت میں مجتبیٰ سے رخصت ہو کر وہ اپنی گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر آکر بیٹھی تو پیچھے آئینے میں اپنے رخسار کا جائزہ لیتے ہوئے دل میں یہ پریشان کن خیال آیا۔ رخسار پر نیل پڑ گیا تھا اور ہلکی سی سوجن بھی محسوس ہو رہی تھی۔ جبڑے میں درد الگ تھا۔ درد کو تو وہ برداشت کر لیتی لیکن جو چوٹ دکھائی دے رہی

تھی، اسے چھپانا ممکن نہیں تھا۔ راستے بھر وہ اسی کے متعلق سوچتی رہی اس لیے جب گھر پہنچ کر اپنے پاپا منصور احمد سے سامنا ہوا تو ان کے استفسار کے جواب میں اس کے پاس ایک بہانہ موجود تھا۔

''وہ پاپا جانی اصل میں بات یہ ہے کہ ایک شخص اچانک ہی گاڑی کے سامنے آ گیا تھا اسے بچانے کے چکر میں، میں نے ایمرجنسی بریک لگائے تو خود کو لگنے والے جھٹکے سے سنبھال نہیں سکی اور میرا ماتھا اسٹیئرنگ پر لگ گیا۔''

''احتیاط کیا کرو پاپا کی جان! تمہیں پتا ہے ناکہ تمہارے پاپا تمہاری تکلیف کو برداشت نہیں کر سکتے۔'' منصور احمد نے فوراً اسے ٹوکا۔

''بس پاپا اچانک ہی ہو گیا ایسا۔ آئندہ میں مزید خیال رکھوں گی۔'' اس نے انہیں یقین دہانی کروائی اور پھر خود پر سے ان کی توجہ ہٹانے کے لیے شور مچانے کے انداز میں بولی۔

''مجھے اتنی بھوک لگ رہی ہے اور آپ اتنی چھوٹی سی چوٹ کی انکوائری کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ چوٹ سے تو مجھے کچھ نہیں ہوا لیکن بھوک سے فوت ہو گئی تو الزام آپ کے سر ہوگا۔''

''ٹھیک ہے پہلے کھانا کھا لیتے ہیں لیکن یہ مت کہو کہ یہ چھوٹی سی چوٹ ہے۔ اس چوٹ سے میرے دل کو جو تکلیف پہنچ رہی ہے وہ میں ہی جانتا ہوں اور خود کو اس وقت تک مطمئن نہیں کر سکتا جب تک تمہارا باقاعدہ ڈاکٹر سے ٹریٹمنٹ نہ کروا لوں۔'' انہوں نے دوٹوک لہجے میں کہتے ہوئے ڈائننگ روم کا رخ کیا۔ ہانیہ کے لیے اتنا بھی کافی تھا۔

☆☆☆

''پھر تم نے کیا سوچا ہے تاجور۔'' آج وہ پھر اس کی راہ میں کھڑا تھا۔

''مجھے کیا سوچنا ہے۔ میرے نصیب میں جو لکھا تھا، ہو چکا۔''

''نصیب کو تو تم خود ٹھکرا رہی ہو۔'' اس نے شکوہ کیا۔

''میرے اختیار میں ہے ہی کیا؟'' وہ آزردگی سے بولی۔

''کم از کم ایک ہاں پر تو اختیار ہے تمہارا۔ تم ہاں کہہ کر دیکھو، تمہارے حصے کی ساری جنگ میں لڑوں گا۔'' وہ ملتجی ہوا۔

''تم برسوں پردیس میں رہ کر اپنے ریت رواج بھول گئے ہو لیکن میں کیا کروں کہ میں ان سب کے درمیان رہتی ہوں جنہیں قرآن و حدیث سے بڑھ کر اپنے رواج اور رسمیں یاد ہیں۔'' وہ جیسے کراہی۔

''میں کچھ نہیں بھولا ہوں لیکن مجھے اس بات کا شعور آ گیا ہے کہ رسم و رواج کی اہمیت قرآن و حدیث سے زیادہ نہیں ہے۔ جس کام کی اجازت ہمیں ہمارا خدا اور اس کا رسولؐ دیتا ہے، اس سے ہمیں کوئی بزرگ، کوئی پنچایت یا کوئی رواج کیسے روک سکتا ہے؟'' اس کی آواز جوش میں قدرے بلند ہو گئی۔

''اللہ کے واسطے خاموش رہو۔ یوں اونچا اونچا بول کر میری رسوائی کا سامان کیوں کرتے ہو؟'' وہ بُری طرح گھبرا گئی۔

''تو پھر تم ایک بار اپنی زبان سے ہاں کہہ دو۔ میں تمہیں تمہارے سارے حقوق دلوا دوں گا۔'' ایک بار پھر اصرار ہوا۔

''مجھے اپنے لیے کچھ اچھا یا بُرا سوچنے کا اختیار ہی کب ہے؟ پہلے بھی دوسروں نے میری تقدیر کا فیصلہ کیا تھا اور اب بھی سب کچھ انہی کے ہاتھ میں ہے۔''

''بس تو پھر ٹھیک ہے میں جا رہا ہوں اباجی سے بات کرنے۔ تم ہمت کرو نہ کرو، میں تمہارے ساتھ ہونے والے ظلم پر احتجاج ضرور کروں گا۔'' وہ اچانک ہی فیصلے پر پہنچ گیا۔

''خدارا رحم کرو مجھ پر۔ کیوں میرے سر پر موجود چھت چھین لینا چاہتے ہو؟''

''نہیں چھنے گی چھت۔ اتنا ویلا نکما نہیں ہوں میں کہ اگر کسی نے تمہیں اس گھر سے نکال دیا تو تمہیں ایک چھت بھی نہ دے سکوں۔'' اسے اس کی اس درجے بزدلی پر غصہ آنے لگا۔

''میں رسوا ہو جاؤں گی۔'' اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو ٹپکے۔

''برباد ہونے سے بہتر ہے، رسوا ہی ہو جاؤ۔'' وہ اپنا فیصلہ سنا کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر نکل گیا۔ پیچھے اس کے پاس آنسو بہانے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔

☆☆☆

''کیا مبشر احمد بات کر رہے ہو؟'' نامعلوم نمبر سے آنے والی کال ریسیو کرنے پر گمبھیر لہجے میں کیے گئے سوال نے اسے تھوڑا سا چونکا دیا۔

''اس نمبر کو ڈائل کرنے سے قبل یقیناً آپ جانتے ہوں گے کہ یہ نمبر کس کے زیر استعمال ہے؟'' پوچھے گئے سوال کا سیدھے ہاں یا نہ میں جواب دینے کے بجائے اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں ایک نکتہ اٹھایا اور دروازے سے اندر داخل ہوتی اپنی بڑی بہن کو دیکھا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں ایک ٹرے اٹھا رکھی تھی جس میں بھاپ اُڑاتا ہوا چینی کا پیالہ دھرا تھا۔

''سوپ لائی ہوں تمہارے لیے ٹھنڈا ہونے سے پہلے پی لینا۔'' اسے فون پر مصروف دیکھ کر بہن نے دھیمی آواز میں اطلاع دی اور واپس پلٹ گئی۔ کل سے وہ اور بے چاری امی اسی طرح اس کی خدمت میں جتی ہوئی تھیں۔ گھر والوں کے سامنے اس نے اپنی چوٹوں کا سیدھا سادہ جواز پیش کیا تھا کہ بائیک سلپ ہو گئی تھی۔ بائیکرز کے ساتھ اس طرح کے حادثات پیش آنا ایک عمومی بات ہے اس لیے اس کے سادہ لوح گھر والوں نے اسے سچ تسلیم کرتے ہوئے اس کی خدمت پر کمر کس لی تھی۔

''یقیناً میں جانتا ہوں کہ یہ نمبر مبشر احمد کے زیر استعمال ہے لیکن تصدیق اس لیے کر رہا ہوں کہ کبھی کبھی اتفاقاً کوئی دوسرا شخص بھی کال ریسیو کر لیتا ہے اور میں کسی دوسرے شخص سے بات کرنے کی غلطی نہیں کرنا چاہتا۔'' اس کے انداز کے برعکس دوسری طرف سے بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا گیا۔ وہ شرمندہ ہو گیا اور ذرا نرمی سے بولا۔

''آپ اطمینان رکھیں میں مبشر احمد ہی بات کر رہا ہوں اس لیے آپ سے کوئی غلطی نہیں ہو رہی ہے۔''

''گڈ، یعنی ہم آپس میں بات کر سکتے ہیں؟''

''ضرور کریں جی لیکن پہلے اپنا تعارف کروا دیں۔'' اس نے سوپ والی ٹرے اپنی طرف کھسکائی۔ بہن کی ہدایت سے زیادہ سوپ کی اشتہا انگیز خوشبو نے اس سے یہ حرکت کروائی تھی۔

''میں......'' دوسری طرف موجود شخص نے اسے خود سے متعارف کروایا تو اسے اُچھو لگ گیا۔

''سو...... سوری، میں بالکل بھی آپ کی کال کو ایکسپیکٹ نہیں کر رہا تھا۔'' اس نے دل ہی دل میں خود کو اپنے لہجے کی چبھن، طنز اور بے تکلفی پر کوسا۔

''انسان کی زندگی میں کبھی بھی کچھ بھی غیر متوقع ہو سکتا ہے۔'' دوسری طرف سے فلسفیانہ لہجے میں کہا گیا۔

''جی جی، بالکل درست کہا۔'' اس کی کیا مجال تھی کہ اختلاف کر سکتا۔

''میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔'' اسے ایک دوسرا جھٹکا دیا گیا۔

''وہ کیوں جی؟'' بوکھلاہٹ میں اس کی زبان سے بے تکا سوال پھسلا۔

''میرے خیال میں یہ سوال غیر ضروری ہے۔'' اسے فوراً جتا دیا گیا۔

''سوری، میرا مطلب تھا کہ کب اور کہاں؟'' اس نے خود کو سنبھالا۔

''آج اور ابھی نیو مون ریسٹورنٹ پر چلے آؤ۔ تمہارے گھر سے اس ریسٹورنٹ کا فاصلہ بیس منٹ سے زیادہ نہیں ہوگا۔ میں اکیسویں منٹ پر تمہیں اپنے سامنے دیکھنا چاہتا ہوں۔ یاد رکھنا مجھے وقت کی پابندی نہ کرنے سے سخت چڑ ہے اس لیے بائیسواں منٹ شروع ہونے پر میں تمہیں وہاں نہیں ملوں گا۔'' نہایت سنجیدگی سے دی گئی ان ہدایات نے اس کے ہاتھ پاؤں پھلا دیے۔

''آپ بے فکر رہیں، میں بالکل وقت پر پہنچ جاؤں گا۔''

''اور ہاں میرے خیال میں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ فی الحال اس ملاقات کے بارے میں کسی کو نہیں بتانا ہے۔'' وہ تو اشتہا انگیز سوپ کو بھول بھال کر گھر سے نکلنے کی فکر میں تھا لیکن وہاں سے ہدایات کا سلسلہ جاری تھا۔

''جیسی آپ کی مرضی۔'' وہ بستر پہلے ہی چھوڑ چکا تھا۔ اب لنگڑاتے ہوئے الماری تک پہنچ کر اس میں سے ایک استری شدہ شرٹ نکال رہا تھا اور یہ کام کرتے ہوئے دل ہی دل میں بہن کو دعا بھی دے رہا تھا جس کی مہربانی سے وقتِ ضرورت اسے اپنے کپڑے ڈھنگ کی حالت میں مل جاتے تھے۔

''ویری گڈ، پھر نکل پڑو۔ میں تمہیں اپنا منتظر ملوں گا۔'' دوسری طرف سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

''اف مائی گاڈ! بالکل ایسا لگ رہا تھا کہ میں کسی ڈان سے بات کر رہا ہوں۔'' اس نے موبائل ایک طرف ڈالا اور جلدی، جلدی کپڑے تبدیل کرنے لگا۔ بیس منٹ کی مہلت میں معلوم نہیں کپڑے تبدیل کرنے کا وقت شامل تھا یا نہیں لیکن وہ اس اہم ملاقات کے لیے بالکل ہی رف حلیے میں بھی نہیں جا سکتا تھا۔ چلتے چلتے اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہونے کی مہلت بھی نکال ہی لی۔ نارمل اسپیڈ سے نیو مون کا فاصلہ بیس منٹ کا ہی تھا اس لیے وہ پُرامید تھا کہ تیاری میں صرف ہونے والے یہ چند منٹ تیز رفتاری سے کور کر لے گا۔

''تم کہاں جا رہے ہو؟ غضب خدا کا ڈھنگ سے چلا

نہیں جا رہا اور یہ صاحب زادے بائیک کی چابی گھماتے ہوئے باہر کا رخ کر رہے ہیں۔" موبائل جیب میں اڑس کر وہ بائیک کی چابی ہاتھ میں لیے تیزی سے کمرے سے باہر نکلا تو عین وقت پر امی سے سامنا ہو گیا۔ انہوں نے اس کی تیاری دیکھتے ہوئے شور مچانا شروع کر دیا۔

"ایک ضروری کام سے جانا ہے امی بس ابھی تھوڑی دیر میں آجاؤں گا۔" اس نے ملتجیانہ لہجے میں کہا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

"میں اکیسویں کے بجائے سترہویں یا اٹھارویں منٹ پر پہنچ کر آپ کو رنگ کروں گا جناب تاکہ آپ بھی یاد رکھیں کہ کیا وقت کا پابند بندہ لگ رہا تھا آپ سے۔" بائیک ہوا میں اڑاتا وہ اپنے متوقع ملاقاتی سے مخاطب تھا۔ خوش قسمتی سے موبائل ٹاؤن کی طرف جانے والا راستہ کسی معروف شاہراہ سے نہیں گزرتا تھا اس لیے اس کی تیز رفتاری کی راہ میں کوئی رکاوٹ حائل نہیں تھی۔ خوش قسمتی اس وقت بدقسمتی میں بدلی جب پیچھے سے آتی ایک بڑی گاڑی اس کی توقع کے برخلاف اسے اوورٹیک کر کے آگے نکل جانے کے بجائے کسی بدمست ہاتھی کی طرح اس پر چڑھ دوڑی۔ وہ جس تیز رفتاری سے جا رہا تھا اس کے لیے معمولی سی ٹکر ہی کافی تھی۔ بائیک کسی کھلونے کی طرح اچھلی اور ہوا میں اڑتی ہوئی دور جا گری۔ اس وقت تک وہ خود بائیک پر موجود نہیں رہا تھا اور کسی تنکے کی طرح اڑتا ہوا سڑک پر بائیک سے بھی کہیں آگے جا کر گرا تھا۔ گرتے ہی اس کا سر اتنی زور سے سڑک سے ٹکرایا کہ اسے اپنے ساتھ پیش آنے والے حادثے کا سبب سمجھنا تو دور کی بات ڈھنگ سے خوف زدہ ہونے کی بھی مہلت نہیں ملی اور ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گیا۔ بے ہوشی کے اس عالم میں ہی وہ بڑی سی گاڑی کسی عفریت کی طرح غراتی ہوئی اس پر چڑھی اور اسے روندتے ہوئے آگے نکل گئی۔ وہ جو کسی تک اکیسویں منٹ سے پہلے پہلے پہنچ جانا چاہتا تھا ٹھیک چھبیسویں منٹ پر اپنی آخری منزل تک پہنچ چکا تھا۔ سڑکوں پر بکھری موت نے آج پھر بیچ کے ایک آرزو مند سے اس کی زندگی چھین کر ان لوگوں کو بے موت مارنے کا انتظام کر دیا تھا جو اسے دیکھ دیکھ کر جیتے تھے۔

☆☆☆

"امی۔۔۔امی۔۔۔" روتی بلکتی آواز پر ماں کے ہاتھ میں موجود سلائیاں گر گئیں اور ہڑبڑا کر کھڑے ہونے پر گود میں رکھا ہوا گولا کر دور تک زمین پر لڑھکتا چلا گیا۔

"ذرا آرام سے بی بی! بچہ ہی رو رہا ہے کوئی قیامت نہیں آگئی۔" لپک کر کمرے سے باہر جاتے ہوئے اس نے طنزیہ لہجے میں ادا کیا گیا اپنی جیٹھانی کا جملہ سنا لیکن نظر انداز کر گئی کہ رک کر جواب دینے کی سکت نہیں تھی۔

"امی... دانش بھائی نے مجھے مارا ہے۔" کمرے سے باہر نکلتے ہی اس نے اپنے سات سالہ بیٹے کو دیکھا جو ایک ہاتھ رخسار پر رکھے آنسو بہاتا چلا آرہا تھا۔

"کیوں مارا ہے؟" اس نے اس کے ہچکیوں سے لرزتے وجود کو اپنی باہوں میں سنبھال کر نرمی سے پوچھا اور رخسار پر رکھا اس کا ہاتھ ہٹایا۔ گلابی رخسار پر چھپی انگلیوں کے نشانات نے اس کے دل کو دھکا سا لگایا۔ اس نے بے اختیار ہی بیٹے کا رخسار چوم لیا۔

"میری بال ان کے کمرے میں چلی گئی تھی۔ بال لگنے سے ان کی شیلف گر گئی تو انہوں نے مجھے بہت ڈانٹا اور پھر بھی مارا۔" ماں کی ہمدردی پا کر اس کی سسکیاں مزید تیز ہو گئیں۔

"آپ کو احتیاط سے کھیلنا چاہیے تھا بیٹا! آپ کی وجہ سے کسی کا نقصان ہو گا تو اسے غصہ تو آئے گا نا۔" اس نے بچے کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"نقصان تو کوئی نہیں ہوا امی! وہ تو بس شیلف تھی گرنے سے کوئی ٹوٹی تھوڑا ہی ہے۔" بچے کے پاس اپنے بے قصور ہونے کی دلیل ریڈی تھی۔

"یہ تو اچھا ہوا کہ کچھ ٹوٹی نہیں لیکن بال کمرے میں جانا ہی نہیں چاہیے تھی نا۔" اسے ہر حال میں اپنے ہی بچے کو سمجھانا تھا۔

"میں نے تو بال کروائی تھی اور کاشی نے چھکا مارا تو چلی گئی۔ میں تو صرف اپنی بال مانگنے گیا تھا وہاں۔" اس نے اپنے چچا زاد بھائی کا حوالہ دیتے ہوئے اصل بات بتائی تو ماں کا رنج مزید بڑھ گیا۔ اس کے بچے کو اس قصور کی سزا دی گئی تھی جو اس سے سرزد ہی نہیں ہوا تھا۔

"امی چلیں چل کر دانش بھائی کو ڈانٹیں۔ دیکھیں انہوں نے مجھے کتنی زور سے مارا ہے۔" وہ اپنے رخسار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ماں کو اکسا رہا تھا لیکن وہ اپنی جگہ گم صم کھڑی رہی۔ اس کے اندر اتنی ہمت نہیں تھی کہ اپنے جیٹھ کے عیال ہوتے ہوئے بھتیجے کو کچھ کہہ سکے۔

"چلیں نا امی! چل کر انہیں ڈانٹیں۔" اس نے ماں کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

"میں نہیں ڈانٹ سکتی۔" اس نے گویا بچے کے سامنے اپنی بے بسی کا اقرار کیا۔

"کیوں نہیں ڈانٹ سکتیں۔ اس دن بھاگتے ہوئے دھکا لگنے سے کاشی گر گیا تھا تو پھپو نے مجھے کتنا ڈانٹا تھا حالانکہ میں نے تو اسے جان کر گرایا بھی نہیں تھا۔" وہ اپنی ماں کی بے بسی کو سمجھنے سے قاصر تھا اس لیے مسلسل اپنے مطالبے پر اڑا ہوا تھا۔

"اچھا شام میں تمہارے ابو گھر آئیں گے تو تم ان سے شکایت کر دینا۔ وہ دانش بھائی کو خوب ڈانٹیں گے۔" وہ جانتی تھی کہ شام تک وہ سب بھول بھال چکا ہو گا اس لیے اس وقت اسے بہلانے کے لیے تجویز پیش کی۔

"بہت خوب... شاباش ہے بی بی! بڑی شاندار تربیت کر رہی ہو بچے کی۔ اسے چغل خوری سکھا کر گھر میں فساد برپا کرنے کی اچھی ترکیب سوچی ہے تم نے۔" اسے نہیں معلوم تھا کہ جٹھانی صاحبہ عقب میں کھڑی ماں بیٹے کے درمیان جاری مکالمے سن رہی ہیں۔ انہوں نے اس مکالمے میں وہ نکتہ تلاش کر لیا ہے جس کے زور پر وہ رائی کا پہاڑ بنا سکتی ہیں۔

"ایسی تو کوئی بات نہیں بھابی! میں تو بس ایسے ہی بچے کو بہلا رہی تھی۔" وہ عین موقع پر پکڑے جانے والے چور کی طرح دبے لہجے میں اپنی صفائی پیش کر رہی تھی۔ اس کا یہ دبنا ہی اس کی جٹھانی کو مزید شیر کر دیتا تھا اب بھی وہ چمک کر بولیں۔

"بہلا نہیں رہی تھیں بلکہ سکھا رہی تھیں بی بی اور وہ بھی یہ کہ جس تھالی میں کھاؤ اسی میں چھید کرو۔ غضب خدا کا۔۔۔ ایک تو پہلے ہی تم لوگ ہم پر بوجھ بنے ہوئے ہو اوپر سے تمہاری وجہ سے میرے بچے کو اس کے حق سے کم ملتا ہے اس پر سے اس کے باپ کو اس کے خلاف بھڑکا کر ہمارے درمیان دشمنی کرانے کی سازش بھی کی جا رہی ہے۔" وہ بات کو کہیں سے کہیں لے گئی تھیں۔

"یقین کریں بھابی میرے ذہن میں ایسا کوئی خیال نہیں تھا میں تو بس صرف اسے ٹالنے کے لیے..." بولتے بولتے اس کی نظریں دروازے میں استادہ وجود پر پڑیں تو اپنا وضاحتی جملہ مکمل نہیں کر سکی۔ کیا ضروری تھا کہ اس کی بے بسی کا تماشا دیکھنے کے لیے وہ بھی اسی وقت آن دھمکتا۔

"رہنے دو تم اپنی صفائیاں۔ ہم تو بس اس بات کو جانتے ہیں کہ جس سے نیکی کرو اس کے شر سے بچو۔ اللہ مجھے اور میرے بچوں کو تمہارے شر سے بچائے۔" انہوں نے بھی دروازے میں کھڑے وجود کو دیکھ لیا تھا اس لیے حسب خواہش بات کو مزید طول نہیں دے سکیں اور بس دو جملوں میں اپنی بات سمیٹ کر تن فن کرتی وہاں سے ہٹ گئیں۔ اس [illegible] سے بچے [illegible] ہوا تو وہ [illegible] کی صورت دیکھ رہا تھا۔

"آؤ بیٹا! میں تمہیں [illegible] دلا دوں؟" اس نے [illegible] سے نکل جانے کی خواہش میں بیٹے کا ہاتھ پکڑ کر [illegible]

"[illegible] تو ملا دو گی لیکن [illegible] کے باعث [illegible] نصیب ہی نہیں ہے۔" [illegible] ضائع کرنا۔ [illegible] کی کوشش کی۔

"چلو بیٹا۔" اس نے [illegible] ممکن نہیں تھا۔ [illegible] بیٹے کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

"تم جانتی ہو [illegible] تم کسی [illegible] نہیں ہو [illegible] کے حق میں بول سکے۔" وہ [illegible] پیچھے ہی کمرے میں چلا آیا۔

"اللہ کے لیے اس وقت تم تو مجھ پر رحم کرو۔" اس نے اس سے منت کی۔

"رحم تم کو اس بچے پر [illegible] اپنے سر پر باپ کے سائے کی ضرورت ہے۔" اس نے [illegible] کرتے ہوئے بچے کو کمرے میں جا کر [illegible] بچے کا [illegible] آنسوؤں کے [illegible] خود اس کے رخسار آنسوؤں سے تر ہو چکے تھے۔

"مت روئیں امی! اب میں آپ سے کسی کی شکایت نہیں کروں گا۔" معصوم بچے کی عقل میں جو بات آئی وہ ماں کو بہلانے کے لیے کہہ [illegible] خاموش ہونے کے بجائے [illegible] رونے لگی۔

"ٹھیک کرو گے میری جان! جن بچوں کے سر پر باپ کا سایہ نہ ہو انہیں شکایت کرنے کا حق بھی نہیں ہوتا۔" اپنی کیفیت کے باعث اسے احساس نہیں تھا کہ بچے سے کیا کہہ رہی ہے۔

"ٹھیک ہے امی میں سمجھ گیا لیکن [illegible] کے بعد اب آپ بھی مجھے چھوڑ کر نہ جانا۔" [illegible] نے اسے جو کہا تھا اس سے وہ ڈر گیا تھا اور اب اس بات کی تصدیق [illegible] چاہتا تھا کہ [illegible] بھی چھوڑ نہ سکے۔

"کبھی نہیں میری جان [illegible] کبھی نہیں۔ تم تو میرے دل کے ٹکڑے ہو۔ میں تمہیں چھوڑ کر بھلا کہاں جا سکتی ہوں۔" وہ نہیں جانتی تھی کہ [illegible] اسے بچے سے کیا کہنا

تھی۔ آج کی حقیقت یہ تھی کہ مبشر مر چکا تھا اور ہانیہ زندہ تھی جسے آگے چل کر نئی زندگی شروع کرنی تھی۔ اس نئی زندگی تک مبشر کے نام کا سایہ نہ ہی پہنچتا تو اس کے حق میں بہتر تھا۔

"آؤ اب گھر چلتے ہیں۔" جنازہ جا چکا تو غزالہ اس کا ہاتھ تھام کر باہر لے گئی۔ ان ہی کی طرح اور بہت سے لوگ بھی وہاں سے روانہ ہو رہے تھے۔

"اب تمہیں خود ہی ہمت سے کام لے کر اس صدمے سے سنبھلنا ہوگا۔ اگر ایسا نہیں کرو گی تو اپنے ساتھ ساتھ اپنے پاپا کو بھی تکلیف دو گی۔ تمہیں معلوم ہے نا کہ تم میں ان کی جان اٹکی رہتی ہے۔" گھر پہنچ کر بھی غزالہ اسے اس کے کمرے تک چھوڑنے آئی تھی۔ وہ اس کی نصیحتوں کے جواب میں زبان سے تو کچھ نہ کہہ سکی بس معمولی سا سر ہلا کر رہ گئی۔

"اگر نیند نہ آئے تو کوئی ٹرینکولائزر لے لینا۔ مجھے ممی کی طرف سے پرمیشن نہیں ہے ورنہ میں آج رات تمہارے گھر ہی رک جاتی۔" اسے ہدایات جاری کرتی غزالہ کے لہجے میں اس کے لیے تشویش تھی۔

"تم فکر نہ کرو۔ میں ٹھیک ہوں۔" اس نے سہیلی کو تسلی دے کر رخصت کر دیا لیکن اس کے جاتے ہی ضبط کھو بیٹھی۔ اچھی بات یہ تھی کہ پاپا بھی گھر پر موجود نہیں تھے۔ اس لیے اسے کھل کر رونے کا موقع مل گیا تھا۔ بہت سارا رونے کے بعد دل پر دھرا بوجھ کچھ کم ہوا تو اسے جنازے پر سنی گئی باتیں یاد آنے لگیں۔ ان باتوں میں سب سے اہم یہ اطلاع تھی کہ مبشر کسی کی فون کال آنے پر گھر سے باہر نکلا تھا۔ کال کرنے والا کون تھا۔ اس بات کا کسی کو بھی علم نہیں تھا لیکن وہ جوں جوں سوچ رہی تھی، دماغ میں شکوک و شبہات جنم لے رہے تھے۔ آخر کار وہ ایک فیصلے پر پہنچ گئی۔ فیصلے پر پہنچنے کے بعد اسے عملی قدم اٹھانے سے روکنے والا بھلا کون تھا؟

☆☆☆

"میں آج اباجی سے بات کرنے جا رہا ہوں۔ یہاں حالات میری برداشت سے باہر ہیں۔ اگر تمہیں اس گھٹن سے آزاد نہیں کروا پایا تو خود کو کبھی معاف نہیں کر سکوں گا۔" اس کے لہجے سے ظاہر تھا کہ حتمی فیصلہ کر چکا ہے۔ تاجور نے دہل کر اس کی طرف دیکھا۔

"بات تم کرو گے اور الزامات مجھ پر دھرے جائیں گے۔ سب یہی کہیں گے کہ تم تو چھوٹے تھے، میں نے تمہیں ورغلا دیا۔" اتنے برس ان کے درمیان رہ کر وہ ان کے ہر ردعمل کو جانتی تھی۔

"چھوٹا....." وہ ہنس کر زور سے ہنسا۔

"پورے اٹھائیس سال کا ہو چکا ہوں میں اور تم مجھے ایسے چھوٹا کہہ رہی ہو جیسے میں کوئی ٹین ایجر ہوں۔"

"مجھ سے تو چھوٹے ہی ہونا۔"

"صرف ڈیڑھ سال ... اور اس فرق کو میں تب بھی اہمیت نہیں دیتا تھا جب پڑھنے کے لیے ملک سے باہر گیا تھا۔ کیا میں جاتے جاتے تمہیں بتا کر نہیں گیا تھا کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔"

"اب اِن باتوں سے کیا حاصل؟ وقت بہت آگے بڑھ چکا ہے۔ اب میں تمہارے بھائی کی بیوہ ہوں۔ تمہیں مجھ سے ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔"

"جب تک تم میرے بھائی کی بیوی تھیں، میں نے اس رشتے کا احترام کیا اور لوٹ کر یہاں نہ آیا کہ تمہیں اور خود کو آزمائش میں نہ ڈالوں لیکن اب بیچ کا وقت آگے بڑھ چکا ہے۔ اب تم کسی کے نکاح میں نہیں ہو۔ مجھے حق ہے کہ میں تمہارے لیے نکاح کا پیغام دے سکوں۔" اس پر تاجور کے سمجھانے کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔

"تمہیں معلوم ہے کہ ہمارے خاندان میں بیوہ کی دوسری شادی کا کوئی رواج نہیں۔ عورت ایک بار جس کے نام لگ جائے آخری سانس تک اسی کے نام کے ساتھ جیتی ہے۔ تمہارے لیے تائی جان نے بھابی بیگم کی چھوٹی بہن کو منتخب کر لیا ہے، تم اس سے شادی کر کے اچھی سی زندگی گزارو اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔"

"تمہارے آنسو میرے لیے ایک چیلنج ہیں تاجور! ان آنسوؤں کی جگہ جب تک ہنسی نہ لے لے، میں چین سے نہیں بیٹھوں گا۔" اس نے دعویٰ کیا۔

"تمہیں اماں اپنے کمرے میں بلا رہی ہیں تاجور۔" ابھی وہ اپنی آنکھوں سے آنسو بھی صاف نہیں کر پائی تھی کہ بڑی بھابی وہاں چلی آئیں۔ وہ جلدی جلدی ہاتھ سے آنسو صاف کرتے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔

"کون سے دکھڑے رو رہی تھی تمہاری چھوٹی بھاوج؟" بھابی بیگم اس کے عین سامنے براجمان ہو کر پوچھنے لگیں۔

"ہم سب اس کا دکھ جانتے ہیں۔" اس نے روکھے لہجے میں انہیں جواب دیا۔

"ہمیں تو بھیا ان کے دکھ کی سمجھ نہیں آتی۔ میاں زندہ تھا تو کبھی اسے خوش نہیں رکھ سکی۔ کبیر اکثر چڑا کرتا تھا کہ کس مٹی کی عورت سے ناتا جوڑ دیا۔ سارا وقت اس کی ہر بات

ایسا نہیں کرنے دے گی۔

☆☆☆

"تم نے مجھے ڈرا دیا ہے موبی! اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو میں کیا کرتی؟"

"ڈر تو میں بھی گیا ہوں۔ تمہیں لگنے والی ایک چوٹ مجھے اپنے سارے زخموں پر بھاری لگ رہی ہے۔ یہ احساس چین نہیں لینے دے رہا کہ میری وجہ سے تمہیں تکلیف اٹھانی پڑی۔"

"تم ظاہری تکلیف کے بارے میں سوچ رہے ہو لیکن اصل تکلیف تو میرے دل کو ہے، تم کیا سمجھ رہے ہو کہ تمہیں اتنی زخمی حالت میں چھوڑ کر آنے کے بعد میں ایک پل بھی سکون سے رہ سکی ہوں گی۔" اس کی آواز بھرا گئی۔

"آئی ایم سوری ہانیہ! میں نے واقعی تمہیں تکلیف دی ہے۔" وہ شرمندہ ہو گیا۔

"یہ صرف ایک سوری کی بات نہیں ہے موبی! یہ پوری زندگی کا معاملہ ہے۔ تم میرے ساتھ زندگی کے سفر میں دور تک چلنا چاہتے ہو تو تمہیں یہ بات سمجھنی ہوگی کہ میں اپنے پاپا جانی کی اکلوتی بیٹی ہوں اور وہ میرے لیے ایک ایسا ساتھی چاہیں گے جس کے ساتھ میں پُرسکون زندگی گزار سکوں۔"

"اگر انہوں نے مجھے رد کر دیا تو کیا تم مجھے بھول جاؤ گی؟" وہ جیسے اسے کھونے کے خیال سے ڈر گیا تھا۔

"ایسا نہیں ہو سکتا۔ پاپا جانی نے ہمیشہ میری ہر فرمائش پوری کی ہے، انہیں میری یہ خواہش بھی پوری کرنی پڑے گی لیکن کیا یہ اچھا نہیں ہوگا کہ تم مجھے کسی آزمائش میں مبتلا ہی نہ کرو اور خود کو ایسا بنا لو کہ وہ کسی صورت تمہیں ریجیکٹ کرنے کا سوچ ہی نہیں سکیں۔" رات مبشر سے یہ سب کہتے ہوئے وہ کتنی پُریقین تھی کہ وہ اس کی بات مان لے گا لیکن اب اس کی لاش کے سرہانے بیٹھے اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ مر چکا ہے۔

"اللہ معاف کرے بڑا شدید ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ ماں، بہن کو ڈھنگ سے آخری دیدار بھی نصیب نہیں ہوا۔" جانے وہ کون تھی جو کانوں کو چھوتے ہوئے افسوس کا اظہار کر رہی تھی۔ ہانیہ کی نظریں تو بس تابوت میں جڑے مختصر سے شیشے سے نظر آتی اس کی نیم وا آنکھوں کو دیکھ رہی تھیں۔ پورے سر اور چہرے کے بیشتر حصے کو پٹیوں سے باندھے جانے کے بعد بس اس کی آنکھیں ہی تھیں جو نظر آ رہی تھیں۔ نیم وا آنکھیں جن میں جانے کتنے خواب ادھورے رہ گئے تھے۔

"سنا ہے کالج میں اس کی کچھ آوارہ لڑکوں سے لڑائی بھی ہوئی تھی۔ لڑائی میں زخمی ہونے کی وجہ سے کالج سے چھٹی کر کے گھر پر آرام کر رہا تھا۔" وہاں عورتوں کا جم غفیر تھا اور مسلسل ہوتی سرگوشیاں اس کے کانوں تک بھی پہنچ رہی تھیں۔

"اللہ جانے، ماں بہن کو تو ایسی کسی بات کی خبر ہی نہیں۔ بس یہی سنا ہے کہ کوئی فون سن کر گھر سے نکلا تھا کہ ضروری کام سے جا رہا ہوں پھر بے چارے کو واپس گھر آنے کی مہلت ہی نہیں ملی۔" سسکیوں، آہوں کے درمیان کچھ تبصرہ اور تجزیے بھی جاری تھے۔

"میں کہوں کہیں ان غنڈے موالی لڑکوں نے ہی کسی بہانے سے باہر بلا کر بے چارے کو ٹھکانے تو نہیں لگا دیا؟" وہ عورت دور کی کوڑی لائی تھی۔ آنسوؤں کی دھند کے باعث وہ اس عورت کو تو ٹھیک سے نہیں دیکھ سکی لیکن اس کا خیال اس کے دل میں بھی گڑ گیا۔

"ہانیہ آؤ پیچھے ہٹ جاؤ۔ مرد مبشر کو لے جانے کے لیے آ رہے ہیں۔" اس کی کلاس فیلو اور سب سے قریبی سہیلی غزالہ نے اس کے کان میں سرگوشی کی اور اسے اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے کر آہستہ سے وہاں سے اٹھایا۔ یہ غزالہ ہی تھی جو اپنی گاڑی میں اسے یہاں لائی تھی اور سائے کی طرح اس کے ساتھ لگی مسلسل اسے سنبھالے ہوئے تھی۔ ان دونوں کے علاوہ بھی بہت سے طلبہ و طالبات مبشر کے جنازے میں شرکت کے لیے آئے ہوئے تھے۔ جوان موت نے ہر ایک کو لرزا کر رکھ دیا تھا۔ مبشر کی امی اور بہن پر تو قیامت ہی گزر گئی تھی اور وہ اس قیامت پر خوب دل کھول کر بین کر رہی تھیں۔ قیامت ہانیہ پر بھی گزر رہی تھی لیکن اس کا مبشر سے ایسا کوئی رشتہ نہیں تھا جو اسے کھل کر بین کرنے کا حق حاصل ہوتا۔ اس کے آنسو اس کی آنکھوں سے بہنے سے زیادہ اس کے دل پر گر رہے تھے۔ اس کی کیفیت سے آگاہ غزالہ اسے ہر ممکن سہارا دینے کی کوشش کر رہی تھی۔

"کلمۂ شہادت....." جنازہ اٹھاتے مردوں نے نعرہ لگایا تو کلمے کی آواز سے زیادہ آہیں بلند ہوئیں۔ ہانیہ بھی خود کو سنبھالتے سنبھالتے لڑکھڑا سی گئی۔

"ہمت سے کام لو ہانیہ! ہمت نہیں کی تو یہاں تماشا بن جاؤ گی۔" غزالہ اسے اسی شرط پر مبشر کے آخری دیدار کے لیے یہاں لے کر آئی تھی کہ وہ ضبط سے کام لے گی اور اپنی کسی حرکت سے ظاہر نہیں ہونے دے گی کہ اس کا مبشر سے کوئی تعلق خاص تھا۔ غزالہ اس کی اچھی دوست تھی اور وہ کچھ بھی سوچ رہی تھی جو وہ صدمے کے باعث نہیں سوچ سکتی

کے جواب میں جی، جی کرتی رہتی تھی لیکن اُسے خوش نہیں رکھ پائی تھی۔"

"عورت کو مرد کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے بھائی۔ اپنے لیے نہ سہی اپنے بچے کے لیے سہی۔ بھائی کے نہ ہونے سے وہ اپنے بچے کو غیر محفوظ محسوس کرنے لگی ہے۔"

"اس کے بچوں کو بہت مردوں کا تحفظ حاصل ہے۔ دادا، تایا، چچا، کزنز سب ہی تو خیال رکھتے ہیں اس کا۔ اب کوئی خوامخواہ ناشکری کرے اور اپنی مظلومیت کے رونے روتا رہے تو اس کا کیا علاج کیا جا سکتا ہے۔" بھابی بیگم نے تیز لہجے میں اس سے اختلاف کیا تو اس نے خاموشی ہی کو مناسب جانا۔ وہ ایسے مزاج کی خاتون تھیں کہ وہ پہلے ہی ان سے کم کم بات کیا کرتا تھا۔

"یہ گھریلو مسئلے مسائل تو زندگی کے ساتھ چلتے ہی رہیں گے لیکن اب تم اپنی زندگی کے متعلق فیصلہ کرو اور اپنا گھر بساؤ۔ پہلے ہی اپنے دوسرے بھائیوں کے مقابلے میں تم شادی کے لیے خاصے لیٹ ہو چکے ہو۔" اب وہ لہجے کو شیریں بنائے اسے نصیحت کر رہی تھیں۔

"درست کہہ رہی ہیں آپ۔ میں بھی ایسا ہی کچھ سوچ رہا ہوں۔ انشاء اللہ جلد آپ کوئی اچھی خبر سنیں گی۔" وہ اپنی بات کہہ کر مسکراہٹ ہونٹوں میں دبائے وہاں سے رخصت ہو گیا۔ اصولاً بھابی بیگم کو اس جواب پر خوش ہونا چاہیے تھا لیکن جانے اس کے لہجے میں ایسا کیا تھا جس نے انہیں بے چین کر دیا تھا۔

☆☆☆

"تم کل صبح سے شام تک کہاں تھے؟" انسپکٹر غیاث نے اپنے سامنے بیٹھے لمبے بالوں والے لڑکے سے سخت لہجے میں پوچھتے ہوئے اس کا بغور جائزہ لیا۔ اس نے اپنے بال پونی کی شکل میں باندھ رکھے تھے۔

"صبح کالج میں تھا پھر دوستوں کے ساتھ نکل گیا تھا۔ ہم دوست مل کر اِدھر اُدھر گھومتے رہے۔ کہاں کہاں گئے یہ تو اچھی طرح یاد نہیں لیکن آپ کے لیے جاننا بہت ضروری ہے تو دوستوں سے پوچھ کر بتا دوں گا۔" وہ خود کو یوں تھانے لائے جانے پر اگر خوف زدہ تھا بھی تو ظاہر نہیں ہونے دے رہا تھا۔

"یہ مجھ سے زیادہ تمہارے لیے ضروری ہے۔ اگر تم اس سوال کا واضح جواب نہیں دے سکے تو مصیبت میں بھی پھنس سکتے ہو۔" انسپکٹر غیاث کے لہجے میں دھمکی تھی جس پر وہ تھوڑا سا نروس ہوا اور آہستہ سے بولا۔

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ آپ نے مجھے یہاں کیوں بلایا ہے اور ایسے سوالات کیوں کر رہے ہیں؟"

"سنا ہے تم بہت بڑے غنڈے ہو اور پورے کالج میں تمہارا راج چلتا ہے۔" انسپکٹر نے اسے گھورتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"ایسی تو کوئی بات نہیں سر! بس ایک عام سا اسٹوڈنٹ لیڈر ہوں۔" وہ کچھ اور کنفیوز ہوا۔

"اسٹوڈنٹ لیڈر کیا دوسرے طالب علموں کی ٹھکائی لگاتے پھرتے ہیں؟" انسپکٹر غیاث برہم ہوا۔

"میں آپ کی بات نہیں سمجھا سر! کبھی کبھار کسی سے معمولی جھگڑا ہو جاتا ہے لیکن ٹھکائی......" وہ خود کو معصوم ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"اچھا تو وہ معمولی جھگڑا تھا جس کے باعث مبشر احمد کو باقاعدہ ڈاکٹر سے چیک اَپ کروانے اور دوا کیا لینے کے بعد کالج سے چھٹی کر کے گھر پر آرام کرنا پڑا اور بانیاس کا جبڑا ٹوٹتے ٹوٹتے بچا تھا۔" انسپکٹر کے چبا چبا کر بولنے پر وہ ہڑبڑا گیا اور کوئی بات نہ بنا سکا۔

"وہ تو بس ایسے ہی غصے میں کہہ دیا تھا سر! ہم سیاسی کارکنوں کے درمیان یہ جھگڑے معمول کا حصہ ہیں۔" وہ ماتھے پر سے پسینا صاف کرتے ہوئے خاصا پریشان دکھائی دینے لگا۔

"جس جھگڑے کے بعد کوئی بندہ قتل کر دیا گیا ہو، اسے معمولی جھگڑا نہیں کہا جا سکتا۔" انسپکٹر غیاث نے سرد لہجے میں کہتے ہوئے اسے تیز نظروں سے گھورا۔

"قت...... قتل...... آپ کس قتل کی بات کر رہے ہیں سر؟" اس بار شعیب قطعاً اپنی بوکھلاہٹ کو نہ چھپا سکا۔

"مبشر عرف موبی کے قتل کی......؟" انسپکٹر نے کرسی کی پشت گاہ کے ساتھ بڑی فرصت والے انداز میں ٹیک لگائی اور اندر تک اتر جانے والی نظروں سے اسے گھورا۔

"وہ...... وہ تو روڈ ایکسیڈنٹ میں مرا ہے۔" شعیب جلدی سے بولا۔

"دشمن اگر چالاک ہو تو قتل کو روڈ ایکسیڈنٹ کا روپ دینا زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔"

"آپ مجھ پر غلط الزام لگا رہے ہیں سر! میں مانتا ہوں کہ میرا کالج میں مبشر کے ساتھ جھگڑا ہوا تھا لیکن وہ ایک عام سا جھگڑا تھا۔ ایسے جھگڑے سیاسی تنظیموں سے تعلق رکھنے والے لڑکوں میں ہوتے رہتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کی بنیاد پر کسی کو قتل کر دیا جائے۔" انسپکٹر

کے الزام نے شعیب کو اتنا مشتعل کیا کہ وہ خوف زدہ ہونے کے باوجود اونچے لہجے میں بولتا چلا گیا۔

"تعلیمی اداروں کی تاریخ بھری پڑی ہے قتل کی ایسی وارداتوں سے جو سیاسی جھگڑوں کی بنیاد پر ہوئے۔" انسپکٹر نے بے نیازی سے کہتے ہوئے اس کی دلیل رد کر دی۔

"وہ قتل موقع پر ہی فوری اشتعال کے نتیجے میں ہوتے ہیں۔ مبشر تو اگلے دن روڈ ایکسیڈنٹ میں مرا ہے سر اور یقین کریں میرا اُس کی موت میں کوئی ہاتھ نہیں۔ مجھے تو خود افسوس ہوا ہے اس کی جوان موت پر۔" وہ کسی نہ کسی طور انسپکٹر کو یقین دلانا چاہتا تھا کہ مبشر کی موت میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں۔

"ہو سکتا ہے کہ تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن پولیس کی نظر میں تم ایک مشتبہ شخص ہو اس لیے ہم تمہیں شک کی بنیاد پر گرفتار کر رہے ہیں۔" انسپکٹر نے اسے اپنا فیصلہ سنایا اور گھنٹی کے بٹن پر ہاتھ رکھ دیا۔ شعیب کی طرف سے کوئی احتجاجی ردِعمل ظاہر ہونے سے قبل ہی دو سپاہی اندر داخل ہوئے اور اسے دبوچ کر اپنے ساتھ لے گئے۔ انسپکٹر غیاث اپنی جگہ بیٹھا شعیب کے واویلا کرنے کی آوازیں سنتا رہا پھر یہ آوازیں بھی معدوم ہو گئیں۔

☆☆☆

"پلیز چپ ہو جاؤ تاجور! تمہارے یوں مسلسل رونے سے میں خود کو مجرم محسوس کر رہا ہوں۔" وہ بے بس سا اس عورت کے رُوبرو بیٹھا تھا جسے پانے سے بڑھ کر اس نے اگر کوئی چاہ کی تھی وہ یہ تھی کہ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھے۔ آج اسے پانے کا خواب تو پورا ہو گیا تھا لیکن وہ یوں اس کے سامنے تھی کہ آنسو سیلِ رواں کی طرح اس کی آنکھوں سے گر رہے تھے اور سارا بدن ہچکیوں سے لرز رہا تھا۔

"میں اپنے بیٹے کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ میں نے تم سے کہا تھا ناکہ تمہیں یہ بغاوت مہنگی پڑے گی۔ دیکھ لی بغاوت کی سزا...... انہوں نے مجھ سے میرا بیٹا ہی چھین لیا۔" وہ جو بہت دھیما بولا کرتی تھی مگر اس وقت اس کے سامنے چلا رہی تھی۔

"یہ وقتی ردِعمل ہے تاجور! ابھی بابا جان غصے میں ہیں لیکن میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں ان سے بات کروں گا اور تمہیں زیادہ دن اپنے بیٹے سے دور نہیں رہنا پڑے گا۔" وہ اسے تسلی دینے لگا۔

"میں انہیں تم سے بڑھ کر جانتی ہوں۔ انہوں نے اگر فیصلہ کر لیا ہے تو تم دیکھ لینا کہ وہ ساری عمر میری ممتا کو تڑپا کر رکھیں گے۔" وہ ذرا بھی پُرامید نہیں تھی۔

"اگر ایسا ہوا تو ہم بچے کی کسٹڈی کے لیے کیس دائر کر دیں گے۔ تم ماں ہو اور تم سے بڑھ کر اس پر کسی کا حق نہیں ہو سکتا۔"

"کیا تم سچ مچ ایسا کرو گے؟ تم میری خاطر اپنے بابا کے مقابل کھڑے ہو جاؤ گے؟" وہ بیک وقت حیرت اور بے یقینی کا شکار ہوئی۔

"میں ایسا ہی کروں گا تاجور کیونکہ میں جانتا ہوں کہ یہ تمہارا حق ہے۔ تم نے دوسری شادی کر کے کوئی گناہ نہیں کیا ہے۔ قانون اور شریعت تمہیں دوسری شادی کا بھی حق دیتے ہیں اور بچے کو اپنے ساتھ رکھنے کا بھی۔"

"مگر ہمارے ہاں قانون اور شریعت سے زیادہ خاندانی رسم و رواج کو اہمیت دی جاتی ہے۔" وہ چاہ کر بھی اپنے اندر امید نہیں جگا پا رہی تھی۔

"مجھ پر بھروسا رکھو جیسے میں نے تم سے نکاح کی ضد منوائی تھی ایسے ہی یہ بھی منوا لوں گا۔"

"ضد منوانے کی سزا انہوں نے تمہیں اور مجھے حویلی بدر کر کے دے تو دی ہے۔"

"تمہیں حویلی میں رہنے کی چاہ تھی یا میرے سنگ؟"

"میری تو ہر چاہت اسی روز مر گئی تھی جب میں کبیر کے نام لگائی گئی تھی۔ اس روز تم سے دستبرداری قبول کی تو پھر کوئی چاہ پالی ہی نہیں۔" اس کے لہجے میں ایسا کرب تھا کہ وہ تڑپ اٹھا۔

"بھول جاؤ وہ سارے بُرے دن۔ بس یہ یاد رکھو کہ اب میں تمہارا ہوں اور کسی کو تمہیں تکلیف نہیں پہنچانے دوں گا۔" اس نے تو اپنی جانب سے بہت سچے دل سے وعدہ کیا تھا لیکن جانتا نہیں تھا کہ اسے وہاں سے مات ہو گی جہاں سے اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔

"میں اپنے دادا کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے ہرگز بھی اس ماں کے ساتھ رہنا منظور نہیں جو کسی اور کی خاطر مجھے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔" وہ تاجور کا لختِ جگر تھا جس نے عدالت کے روبرو کھڑے ہو کر اپنے لیے تڑپتی اپنی ماں کو رد کر دیا تھا۔ وہ کتنا پُریقین تھا کہ منت سماجت سے راضی نہ ہونے والے اپنے باپ کو عدالت کے ذریعے زیر کر دے گا لیکن اس کے باپ کو ہمیشہ زیر کر دینے کا ہنر آتا تھا۔

"یہ میرے غیرت مند بیٹے کبیر کا خون ہے تاجور...... تو نے سوچ بھی کیسے لیا تھا کہ یہ اس عورت کے ساتھ رہنا منظور کرے گا جس نے اپنی بیوگی کی سفید چادر بھی بے داغ

نہ رکھ گئی اور اپنے ہی دیور پر ڈورے ڈال بیٹھی۔" عدالت کے احاطے میں اس کے سسر نے موچھوں کو بل دے کر اس پر لفظوں کے جو تیر چلائے تھے، وہ انہیں سہہ بھی جاتی لیکن ان کے پہلو میں کھڑے اپنے بیٹے کی نظروں سے برستے نفرت کے تیر کیسے برداشت کرتی۔ اس کا جگر چھلنی ہو گیا اور اُس رات وہ دنیا سے جھگڑ کر خود کو حاصل کرنے والے کو سوتا چھوڑ کر ہمیشہ کی نیند سو گئی۔ اپنے ہی خون کے ہاتھوں بے مول ہونے والی نے اپنے خون سے رگوں میں بہنے کی اجازت چھین لی تھی اور دونوں کلائیوں کی کٹی رگوں کے ساتھ گھر کی چھت پر اپنے ہی خون کے تالاب میں مردہ پڑی پائی گئی تھی۔ رگوں میں خون بن کر بہنے والے اس کے خون نے اس سے زندہ رہنے کا حق چھین لیا تھا۔

☆☆☆

"کیا بات ہے پاپا کی جان! تم آج کل اتنی بجھی بجھی کیوں دکھائی دینے لگی ہو؟ تمہاری صحت بھی روز بروز گرتی جارہی ہے۔ اگر کوئی مسئلہ ہے تو مجھے بتاؤ۔" منصور احمد نے کھانے کے لقموں سے کھیلتے ہوئے اسے دیکھا پھر بالآخر اس سے بات کرنے کا فیصلہ کر کے اس سے مخاطب ہوئے۔

"نہیں..... کچھ نہیں پاپا جانی..... میں ٹھیک ہوں۔" وہ اُن کے سوال کرنے پر چونکی اور خود کو ٹھیک ثابت کرنے کے لیے ڈھنگ سے کھانا کھانے لگی۔

"تم ٹھیک نہیں ہو ہانی! میں کتنے دنوں سے دیکھ رہا ہوں کہ نہ تم ٹھیک سے کھانا کھاتی ہو اور نہ ہی ہنستی بولتی ہو۔ میرے خیال میں تو تم کئی دن سے کالج بھی نہیں گئی ہو؟" اس کے جواب نے انہیں مطمئن نہیں کیا تھا۔

"میں نے آپ کو بتایا تو تھا کہ مجھے فلو ہے اور آپ جانتے ہیں کہ فلو میں میری کیسی حالت ہوتی ہے۔" اسے اپنی سرخ و متورم آنکھوں کا پردہ رکھنے کے لیے فلو ہی سب سے اچھا بہانہ محسوس ہوا تھا سو اسی کے سہارے پاپا جانی کو بہلائے جارہی تھی۔

"اتنے دنوں میں تمہارا فلو ٹھیک ہو جانا چاہیے تھا۔ میرے خیال میں ہمیں ڈاکٹر چینج کر لینا چاہیے۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے پاپا۔ آپ جانتے ہیں کہ میں صرف ظہیر انکل کی دوا سے ہی ٹھیک ہوتی ہوں۔" اس نے اپنے فیملی ڈاکٹر کا دفاع کیا۔

"میں جانتا ہوں بیٹا لیکن اس بار ایسا نہیں ہو رہا۔ میں نے ظہیر سے بھی بات کی تھی، اس کا کہنا ہے کہ تم اسٹریس میں ہو۔"

"نہیں پاپا میں ٹھیک ہوں بلکہ میری غزالہ سے بھی بات ہوئی ہے۔ کل سے میں کالج جاؤں گی۔ چھٹیاں کرنے سے میرا جو نقصان ہوا ہے، وہ غزالہ فری ٹائم میں مجھے کور کروا دے گی۔" اس نے بیٹھے بیٹھے نہ صرف فیصلہ کر ڈالا بلکہ اگلے دن اس پر عمل پیرا بھی ہو گئی۔

"تم نے بہت اچھا کیا ہانیہ کہ کالج آگئیں۔ مجھے تمہاری بہت فکر ہو رہی تھی۔" کالج میں غزالہ نے اسے دیکھتے ہی گلے سے لگایا اور بہت خلوص سے بولی۔

"پاپا جانی کی خاطر ہمت کرنی پڑی۔ وہ میری وجہ سے پریشان ہو رہے تھے۔" اس کی آنکھوں سے آنسو لڑھک کر رخساروں پر بہنے لگے۔

"ہمت تو تمہیں کرنی ہی پڑے گی۔ کوئی بھی انسان خود جانے والوں کے ساتھ نہیں مر سکتا۔ اسے اپنی زندگی کو آگے بڑھانا پڑتا ہے اور ان لوگوں کی خاطر جینا پڑتا ہے جو اس سے پیار کرتے ہیں۔" غزالہ اسے اپنے ساتھ لیے ایک گھنے درخت کے نیچے لگی سنگی بینچ تک لے آئی۔

"میں کوشش کر رہی ہوں غزالہ لیکن یہ بہت مشکل کام ہے۔ مونی کا خیال میرے دل سے جاتا ہی نہیں۔ میں نے تو کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ وہ یوں اس طرح بالکل اچانک مجھے چھوڑ کر چلا جائے گا۔ اب تو میرے دل کو سکون آنے کی ایک ہی صورت ہے کہ مونی کا قاتل اپنے انجام کو پہنچ جائے۔" اس کی حزن میں ڈوبی آنکھوں میں طیش کروٹیں لینے لگا۔

"ہو سکتا ہے تم غلط سوچ رہی ہو ہانیہ..... مبشر کی موت سچ مچ حادثہ بھی تو ہو سکتی ہے؟"

"اگر وہ حادثہ تھا تو وہ فون کال کس کی تھی جسے سن کر مونی ایمرجنسی میں گھر سے نکلا تھا۔ تم مانو یا نہ مانو غزالہ، میرا دل کہتا ہے کہ مونی کی موت صرف ایک حادثہ نہیں تھی۔"

"جائے حادثہ پر اس کا موبائل بھی تو نہیں ملا۔ اگر موبائل مل جاتا تو پتا چل سکتا تھا کہ وہ کس کی کال پر زخمی ہونے کے باوجود گھر سے باہر نکلا تھا۔" غزالہ نے خیال آرائی کی۔

"شعیب کا بتاؤ، وہ چھوٹا تو نہیں نا پولیس کسٹڈی سے؟"

"نہیں، ابھی تک تو تھانے میں ہی ہے۔"

"بس تو پھر پولیس والے مار ٹھوک کر اس سے سچ اگلوا لیں گے۔" شعیب کے رہا نہ ہونے کی خبر نے اسے سکون بخشا۔

"مگر سننے میں آرہا ہے کہ شعیب کے پاس حادثے کے وقت اپنی کہیں اور موجودگی کے ٹھوس ثبوت موجود ہیں۔ اس کے کئی دوست گواہی دے رہے ہیں کہ وہ اُس روز ان کے ساتھ تھا۔" غزالہ نے دبی زبان میں اسے اطلاع دی تو اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اور وہ تنفر سے بولی۔

"ہوں..... چور کے بھائی گرہ کٹ۔ ایسوں کے دوستوں کا بھلا اعتبار کیا جا سکتا ہے؟"

"وہ تو ہے لیکن....." غزالہ نے کچھ کہنا چاہا لیکن اچانک اپنے سامنے موجود اس اجنبی کو دیکھ کر خاموش ہو گئی۔ وہ جوان اور اسمارٹ آدمی تھا لیکن بہرحال کالج کا طالب علم دکھائی نہیں دیتا تھا۔

"مس ہانیہ منصور احمد.....؟" اس نے سوالیہ نظروں سے ان دونوں کی طرف دیکھا۔

"جی، میں ہوں۔" ہانیہ نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا۔

"میں انسپکٹر غیاث علی۔" نووارد نے اپنا تعارف کروایا تو وہ سراسیمہ ہو کر ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"پلیز آپ پریشان نہ ہوں۔ میرا مقصد آپ کو پریشان کرنا نہیں۔ میں بس مبشر مرڈر کیس میں آپ کی تھوڑی سی مدد چاہتا ہوں۔"

"کیسی مدد؟" وہ نروس سی ہو کر اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں مسلنے لگی۔

"مجھے آپ سے کچھ سوالات کے جواب درکار ہیں۔ پلیز، آپ آئیں میرے ساتھ۔" اس نے مہذبانہ لہجے میں ہانیہ سے درخواست کی تو وہ کچھ متذبذب سی غزالہ کی طرف دیکھنے لگی۔

"تم انسپکٹر صاحب سے بات کرو۔ میں کلاس کے بعد تم سے ملتی ہوں۔"

غزالہ نے کنایتاً اسے مشورہ دیا کہ اسے ڈرنے کے بجائے کھل کر انسپکٹر سے بات کر لینی چاہیے۔ اس بار وہ بغیر کسی مزاحمت کے سر جھکا کر انسپکٹر کے پیچھے چل پڑی۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ انسپکٹر اسے اپنے ساتھ کینٹین کے اسی عقبی حصے میں لے گیا جہاں اس نے مبشر سے آخری ملاقات کی تھی۔

"پلیز بیٹھیے۔" عقبی لان میں میز کرسیوں کا انتظام نہیں ہوتا تھا۔ یقیناً یہ انتظام انسپکٹر غیاث نے اپنے اختیارات کے زور پر کروایا تھا۔

"مجھے معلوم ہے کہ مبشر کی موت تمہارے لیے ایک بہت بڑا صدمہ ہے۔ اس موضوع پر بات کرنے سے تمہیں تکلیف ہوگی لیکن بات کرنی اس لیے ضروری ہے کہ ہمیں مبشر کے قاتل کو کیفر کردار تک پہنچانا ہے۔ یقیناً تم بھی ایسا ہی چاہتی ہو اس لیے تم نے تھانے میں وہ گمنام کال کی تھی۔" انسپکٹر زیادہ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بجائے براہِ راست اصل موضوع پر آگیا تھا اور پہلے ہی مرحلے پر آپ جناب کا تکلف بھی چھوڑ دیا تھا۔

"تو آپ کو اندازہ ہو گیا کہ وہ کال میں نے کی تھی۔" ہانیہ نے یک دم ہی سارے ہتھیار ڈال دیے۔

"یہ اتنی مشکل بات نہیں تھی۔ حالات و واقعات کا جائزہ اور خصوصاً شعیب کا بیان لینے کے بعد کوئی بھی پولیس والا سمجھ سکتا تھا کہ وہ کال آپ نے کی تھی۔"

"آپ مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟" اس نے اپنے رخسار پر آئی بالوں کی لٹ کان کے پیچھے اڑستے ہوئے آہستہ سے پوچھا تو غیاث ایک پل کے لیے اسے دیکھتا رہ گیا۔ وہ

بے وقوف بچہ

چھوٹا بچہ حجام کی دکان میں داخل ہوا۔ حجام نے بچے کو دیکھتے ہی اپنے گاہک سے آہستہ سے کہا۔

"یہ لڑکا دنیا کا سب سے بڑا بے وقوف ہے۔ دیکھو ابھی تمہارے سامنے ثبوت پیش کرتا ہوں۔"

حجام نے اپنے ایک ہاتھ میں دس روپے کا نوٹ رکھا اور دوسرے ہاتھ میں، دو روپے کی ریزگاری رکھی اور بچے کو بلا کر کہا۔ "بیٹا کون سے ہاتھ والے پیسے لوگے؟"

بچے نے دو روپے کی ریزگاری لی اور دکان سے نکل گیا۔

"دیکھا میں نے کیا کہا تھا... یہ بے وقوف کبھی بھی کامیاب نہیں ہوگا اپنی زندگی میں۔" حجام نے اپنے گاہک سے کہا۔

گاہک بال کٹوا کر باہر نکلا تو اس نے بچے کو آئس کریم کھاتے ہوئے پایا۔ اپنی معلومات کے لیے اس نے بچے کو روک کر پوچھا۔ "بیٹے! تم نے دس روپے کے بجائے دو روپے کی ریزگاری لی، ایسا کیوں کیا؟"

بچے نے آئس کریم کھاتے ہوئے اطمینان سے جواب دیا۔ "جس دن میں نے دس روپے کا نوٹ اٹھا لیا اسی دن یہ کھیل ختم ہو جائے گا۔"

(امریکا سے جاوید کاظمی کے شگفتہ پارے)

خوش شکل لڑکی تھی لیکن اس کی خوب صورتی ایسی نہیں تھی کہ پہلی نظر پڑتے ہی کوئی اپنا دل ہار بیٹھے۔ وہ اپنے بے ساختہ ناز و انداز سے دھیرے دھیرے اثر انداز ہونے اور بہت خاموشی سے دل میں جگہ بنانے والی شخصیت کی مالک تھی۔

''سونی کے متعلق میں نے فی الحال اپنے گھر میں کوئی بات نہیں کی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ وہ پڑھ لکھ کر کوئی مقام بنا لے تو پھر میں پاپا سے اس کا ذکر کروں لیکن زندگی نے اتنی مہلت ہی نہیں دی۔ اب جبکہ وہ چلا گیا ہے تو اس کا ذکر کرنا ہی بے حسی ہے۔ اسی لیے میں نے کوشش کی تھی اس کیس میں براہِ راست اپنا نام نہیں آنے دوں۔'' انسپکٹر نے اس سے سوال نہیں کیا تھا لیکن وہ خود ہی دھیرے دھیرے بولنا شروع ہوگئی۔ مبشر کی شعیب کے دوستوں سے ہونے والی پہلی لڑائی سے لے کر اس لڑائی تک ساری تفصیل سنا ڈالی جس میں مبشر کے ساتھ ساتھ اسے بھی چوٹ آئی تھی۔

''تقریباً یہی ساری باتیں مجھے شعیب نے بھی بتائی ہیں لیکن وہ یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہے کہ کالج میں ہونے والی ایک چھوٹی سی لڑائی کی وجہ سے اس نے مبشر کو باقاعدہ پلاننگ کر کے قتل کیا ہے۔'' انسپکٹر غیاث نے سکون سے اس کی ساری بات سنی اور آخر میں وہ الفاظ کہے جنہیں سن کر وہ تملا گئی اور تیز لہجے میں بولی۔

''آج تک کسی قاتل نے شرافت سے تسلیم کیا ہے کہ وہ قاتل ہے؟ آپ کو بھی شعیب سے سچ اگلوانے کے لیے اسے الٹا لٹکانا پڑے گا۔''

''تمہارے مشورے سے قبل پولیس یہ کام کرچکی ہے لیکن شعیب مستقل اپنے بیان پر قائم ہے۔ میرا تجربہ کہتا ہے کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا۔''

''مجھے تو آپ کا ایسا کوئی خاص قابلِ ذکر تجربہ لگتا ہی نہیں ہے۔'' وہ انسپکٹر کی طرف سے ہی مشکوک ہوگئی۔ اس کے اس بے ساختہ انداز پر انسپکٹر نے بمشکل اپنے قہقہے کا گلا گھونٹا اور سنجیدگی سے بولا۔

''تمہارا اندازہ اتنا غلط نہیں ہے۔ میں کمیشن کے ذریعے پولیس میں آیا ہوں اور واقعی میرا تجربہ ان پولیس والوں سے بہت کم ہے جو سپاہی بھرتی ہوتے ہیں اور اسٹیپ بائی اسٹیپ ترقی کرتے ہوئے کسی عہدے تک پہنچتے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ تم میری مردم شناسی پر شک کرنے لگو۔''

''شعیب بہت مکار انسان ہے سر! آپ نہیں جانتے کہ اپنی مکاری کے ذریعے اس نے صرف اسٹوڈنٹس ہی نہیں کئی ٹیچرز کو بھی شیشے میں اتار رکھا ہے۔ وہ بہت بڑا اداکار ہے۔'' اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی طرح غیاث کو شعیب کے مجرم ہونے پر قائل کرلے۔

''شعیب پر ہمارا کام جاری ہے۔ ہوسکتا ہے اس کے سلسلے میں تمہارا شک درست ثابت ہوجائے لیکن پولیس کی تفتیش اس طرح نہیں ہوتی، ہمیں ایک ہی معاملے کو مختلف زاویوں سے دیکھنا ہوتا ہے اور میں اسی سلسلے میں تمہارا تعاون مانگنے آیا ہوں۔'' غیاث بے حد سنجیدگی اختیار کر کے اس سے مخاطب ہوا۔

''کس قسم کا تعاون؟'' وہ فوراً مستفسر ہوئی۔

''کیا تم شعیب کے علاوہ ایسے کسی دوسرے فرد سے واقف ہو جو کسی وجہ سے مبشر کے لیے معاندانہ جذبات رکھتا ہو؟''

''نہیں۔ مبشر دوستانہ مزاج کا صلح جو لڑکا تھا۔ عام طور پر لوگ اسے پسند کرتے تھے۔'' اس نے انکار کیا۔

''جسے بہت لوگ پسند کرتے ہوں، اس سے کوئی نہ کوئی حسد کرنے والا بھی ضرور ہوتا ہے۔ خصوصاً ایسی صورت میں جب وہ ایک خوش شکل اور امیر کبیر لڑکی کا منظورِ نظر ہو۔'' انسپکٹر نے کھوجتی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''میں آپ کی اس بات کا کیا مطلب سمجھوں؟'' ہانیہ کے چہرے کی رنگت متغیر ہوئی۔

''رقابت کے امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ کوئی ایسا ہوسکتا ہے جو مبشر کی جگہ خود کو دیکھنا چاہتا ہو۔'' انسپکٹر نے مزید کھل کر اپنا سوال واضح کیا۔ اس سوال کے ردِعمل میں ہانیہ کے چہرے کے تاثرات میں ناگواری سی اتر آئی۔

''تم جانتی ہو کہ مبشر کا کیس حادثے کے کھاتے میں ڈالا جاچکا تھا۔ میں نے صرف تمہاری فون کال پر اس کیس کی تفتیش شروع کروائی ہے وہ بھی ایسی صورت میں کہ اس سلسلے میں ہمارے پاس کوئی ایف آئی آر درج نہیں کروائی گئی۔ مجھے معلوم ہے کہ تم چاہتے ہوئے بھی اس کیس کی مدعیت نہیں کرسکوگی۔ میں اپنے معاشرے کے ماحول کو سمجھتے ہوئے تم سے اصرار بھی نہیں کروں گا لیکن تمہیں مجھے کارروائی جاری رکھنے کے لیے کوئی تو جواز فراہم کرنا ہوگا۔ ورنہ میں اس کیس کو داخلِ دفتر کرنے پر مجبور ہوجاؤں گا۔'' اس بار انسپکٹر نے بھی بغیر کسی مروت کے اس پر ساری صورتِ حال واضح کردی۔ اس کا بدلا ہوا لب و لہجہ دیکھ کر ہانیہ سوچ میں پڑ گئی اور کچھ دیر کے توقف کے بعد بالآخر

دھیمے لہجے میں بولی۔
"میں بہت زیادہ پُریقین نہیں ہوں لیکن آپ کے اصرار کرنے پر ایک نام میرے ذہن میں آرہا ہے۔ جبران شکیل نام کا وہ لڑکا ہمیں ہمارے ساتھ اسی کالج میں پڑھتا تھا۔ ابتدائی چند ماہ میں اس نے مجھے خاصا تنگ کیا تھا اور مجھے اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے کئی حربے استعمال کرتا رہا تھا لیکن اب اسے کالج چھوڑ کر بھی کافی عرصہ ہو چکا ہے اسی لیے مجھے فوری طور پر اس کا خیال نہیں آسکا تھا۔"
"میں اس لڑکے کے بارے میں تفصیلات جاننا چاہتا ہوں۔" غیاث نے مطالبہ کیا۔
"تفصیل کیا ہوتی ہے؟ وہ بس اسی طرح کا لڑکا تھا جیسے عموماً فلمی اپروچ رکھنے والے لڑکے ہوتے ہیں۔ کبھی پھول پیش کر کے، کبھی بر تھ ڈے اور نیو ایئر وش کر کے مجھے اپنی طرف راغب کرنے کی کوشش کرتا رہتا تھا لیکن مجھے اس ٹائپ کے لڑکے پسند نہیں اس لیے کبھی اسے کوئی رسپانس نہیں دیا۔ میرے نزدیک وہ ایک فلرٹ تھا لیکن جب میری سحر سے دوستی ہوئی تو اس کے رویے میں دیوانگی کی جھلک دکھائی دی۔ وہ مجھے اپنے خون سے خط لکھ کر اپنی محبت کا یقین دلانے کی کوشش کرنے لگا۔"
"کیا وہ سچ مچ اپنے خون سے خط لکھتا تھا؟" انسپکٹر حیران ہوا۔
"مجھے بھی شک تھا لیکن یہیں کالج میں پڑھنے والی اس کی ایک کزن نے تصدیق کی تھی کہ وہ سچ مچ اپنے خون سے خط لکھتا ہے۔" ہانیہ نے جھینپتے ہوئے انداز میں تصدیق کی۔
"میں حیران ہوں کہ ٹیکنالوجی کے اس دور میں بھی ہمارا نوجوان ایسی جذباتی حرکات کرتا ہے؟" انسپکٹر نے بے ساختہ تبصرہ کیا۔
"میں نے آپ کو پہلے ہی بتایا تھا کہ وہ کچھ فلمی سا ذہن رکھنے والا لڑکا تھا اور اسی لیے بھی مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا تھا۔"
"تو پھر کیا انجام ہوا اس فلمی ہیرو کا؟" انسپکٹر نے دلچسپی سے پوچھا۔
"ہونا کیا تھا؟ میں نے اُس کی کزن سسٹر کے ذریعے اس کے گھر میں اس کی شکایت پہنچائی اور اس کے گھر والوں نے کسی دوسرے کالج میں اس کا ٹرانسفر کروادیا۔" ہانیہ نے مسکرا کر جواب دیا۔
"ٹرانسفر کے بعد اُس نے کبھی تم سے ملنے یا رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی؟"
"شروع شروع میں یہاں کے چکر لگاتا تھا لیکن پھر اس کے گھر والوں کو اس کی بھی رپورٹ مل گئی اور وہ یہاں نظر آنا بند ہو گیا۔"
"اس واقعے کو معمولی نہ سمجھو۔ بعض جنونی لوگ ایسی باتوں کو اپنی انا کا مسئلہ بھی بنا لیتے ہیں۔ مجھے جبران شکیل نامی اس لڑکے کے بارے میں اپنا اطمینان کرنا پڑے گا۔" غیاث کو ایک نیا کلیو مل گیا تھا لیکن ہانیہ کی اُلجھنوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ غیاث کے جانے کے بعد بھی بہت دیر تک اسی جگہ بیٹھی رہی تھی۔ اس بات سے بالکل بے خبر کہ ہونے والی ملاقات کو کتنی نظروں نے نوٹ کیا تھا۔

☆☆☆

"مجھے کچھ ہو جائے تو میرے طارق کا بہت خیال رکھنا طاہرہ! اسے کبھی اکیلا مت چھوڑنا۔"
"آپ ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں؟ شوگر خدانخواستہ اتنی خطرناک بیماری نہیں ہے کہ آپ زندگی کی طرف سے ہی مایوس ہو جائیں۔" طاہرہ کئی بار کی سنی وصیت کو سن کر بیزار ہوئی اور بہ مشکل ہی لہجے میں ناگواری کو جھلکنے سے روکا۔ ابھی دو دن پہلے ہی اس کے شوہر کے ذیابیطس کے مریض ہونے کی تصدیق ہوئی تھی۔ ان دو دنوں میں وہ بلامبالغہ پچیسویں بار الفاظ کے معمولی ردوبدل کے ساتھ اسے یہ وصیت کر چکا تھا۔
"میں دیکھ رہا ہوں کہ تم میری بات کو بالکل سیریس نہیں لے رہی ہو۔ شوگر کو اتنا عام مرض بھی نہ سمجھو۔ میں نے کئی شوگر مریضوں کو اچانک مرتے دیکھا ہے۔ میرے اپنے بابا بھی اسی مرض کے ہاتھوں جوانی میں چلے گئے تھے۔" اسے طاہرہ کا جواب پسند نہیں آیا لہٰذا تیز لہجے میں اپنی ناراضی کا اظہار کرنے لگا۔
"آپ خواہ مخواہ کی ٹینشن لے رہے ہیں اور ٹینشن اس مرض کے لیے سب سے خطرناک شے ہے۔ شوگر کا مریض اگر اپنی بیماری کو تمام تر حقائق کے ساتھ قبول کر لے تو آرام سے ایک اچھی اور لمبی زندگی گزار سکتا ہے۔ کرنا آپ کو صرف اتنا ہے کہ ڈاکٹرز کی تجویز کردہ دواؤں، ڈائٹ پلان اور ایکسرسائز کی سختی سے پابندی کریں لیکن میں دیکھ رہی ہوں کہ آپ ان ضروری باتوں پر عمل کرنے کے بجائے خواہ مخواہ کے واہموں میں اُلجھے ہوئے ہیں۔" طاہرہ نے کوشش کی تھی کہ اپنے لہجے کو نرم رکھے لیکن بولتے بولتے آخر میں اس کا لہجہ خود بخود تیکھا ہو گیا۔

"تم نہیں سمجھو گی طاہرہ۔ تم سمجھ ہی نہیں سکتیں کہ آج کل میں کن کیفیات کا شکار ہوں۔ مجھے مرنے سے اتنا ڈر نہیں لگتا جتنا طارق کے اکیلا رہ جانے سے لگتا ہے۔" وہ بے بسی کے انداز میں بڑبڑایا لیکن طاہرہ اب اس موضوع کو مزید جاری نہیں رکھنا چاہتی تھی۔ وہ دوسری بار تخلیق کے مرحلے سے گزر رہی تھی اور ایسے میں جبکہ اس کا پہلا بچہ محض ایک سال کا تھا اسے یہ سب بہت گراں گزر رہا تھا۔ حقیقت میں وہ اتنی جلدی دوسرے بچے کے حق میں نہیں تھی لیکن اس کے شوہر کی بھائی یا بہن کی صورت میں طارق کو جلد از جلد ایک ساتھی فراہم کرنے کی شدید خواہش تھی اور اس خواہش میں اس نے طاہرہ کی ہر دلیل کو رد کر دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا۔
"میں تمہاری خدمت اور بچوں کی دیکھ بھال کے لیے گھر میں ملازمین کی فوج کھڑی کر دوں گا لیکن تم مجھے یہ خوشی دینے سے انکار نہ کرو۔ میں چاہتا ہوں کہ ہمارے کم سے کم بھی چار بچے ہوں اور یہ بچے میری زندگی کا ہر وہ خلا بھر دیں جو تنہائی کی پیداوار ہے۔"
اپنی ذات کا خلا بھرتے بھرتے وہ طاہرہ کی نفسیاتی، جذباتی اور جسمانی پیچیدگیوں کو قطعی نظرانداز کر چکا تھا اور یہ چیز ان کے درمیان تنچ پیدا کر رہی تھی۔ طاہرہ روز بروز چڑچڑے پن کا شکار ہو رہی تھی۔ ہر طرح کی سہولت میسر ہونے کے باوجود اپنی اس کیفیت کے باعث وہ خون کی کمی اور ذہنی دباؤ کا شکار تھی۔ ڈاکٹر کئی بار اسے تنبیہ کر چکی تھی کہ اگر اس نے اپنا خیال نہ رکھا تو مزید پیچیدگیوں کا شکار ہو جائے گی۔ ڈاکٹر کے ہر وزٹ کے بعد وہ عہد کرتی تھی کہ اپنی صحت کے معاملات پر توجہ دے گی لیکن ہر بار کچھ نہ کچھ ایسا ہو جاتا تھا کہ وہ اس عہد پر قائم نہیں رہ پاتی تھی۔ اب شوہر کی ذیابیطس کی تشخیص کے بعد تو جو صورتِ حال درپیش تھی، اس نے تو اسے شدید اعصابی دباؤ میں جکڑ ڈالا تھا۔ حقیقتاً اسے ان دنوں میں ہی صحیح معنوں میں ادراک ہوا تھا کہ اس کا شوہر ایک نفسیاتی مریض ہے اور اپنی پوری زندگی ایک نفسیاتی مریض کے ساتھ گزارنے کے خیال سے اس کا دم گھٹنے لگتا تھا۔
ذہنی دباؤ اور گھٹن سے نجات کے لیے اپنے بیرونِ ملک سے آئے کزن نصیر کو کب اس نے روزن کی طرح سمجھنا شروع کیا، اسے احساس بھی نہیں ہوا۔ وہ اس کے ذہنی مسائل، شوہر کی نفسیاتی پیچیدگیوں اور طارق کی چھوٹی چھوٹی شرارتوں کے قصے اتنی توجہ سے سنتا کہ جیسے اس سے بڑھ کر دنیا میں کوئی اہم کام ہی نہ ہو۔ وہ توجہ اور فکر جس کی وہ اپنے شوہر سے خواہاں تھی۔ نصیر سے ملنا شروع ہوئی تو وہ غیر ارادی طور پر اس کی طرف متوجہ ہوتی چلی گئی۔ یہ غیر ارادی التفات ایک روز اظہار بن کر اس کی زبان پر آیا تو غضب ہی ڈھا گیا۔
"کیا ضروری تھا کہ میری شادی اس نفسیاتی مریض سے ہوتی؟ تم بھی تو خاندان ہی کے لڑکے تھے نصیر..... میرے ماں باپ میری شادی کے لیے تمہارا انتخاب بھی تو کر سکتے تھے۔" سیڑھیوں کے بالکل قریب رکھے اسٹائلش سے ٹیلی فون اسٹینڈ کے ساتھ طارق کو گود میں لیے کھڑی وہ اپنی حسرت کا اظہار کرتے ہوئے بالکل بھی نہیں جانتی تھی کہ اس کا شوہر نیند سے جاگ کر خواب گاہ سے باہر آ چکا ہے اور اس نے اس کی پوری بات حرف بہ حرف سن لی ہے۔
"دھوکے باز عورت......" ردعمل میں وہ پوری قوت سے دہاڑا تھا اور سخت طیش کے عالم میں اسے زوردار دھکا دیا تھا۔ وہ آخری دنوں سے تھی۔ خوف اور کمزوری نے اسے اتنی مہلت ہی نہیں دی کہ خود کو بچانے کی کوئی کوشش کر پاتی وہ سیڑھیوں سے بُری طرح لڑھکتی گئی اور اس سے قبل ہی اس کے ہاتھوں سے اس کا بیٹا چھوٹ کر گر گیا تھا۔ گرنے کے بعد موت نے اسے اتنی مہلت دے دی تھی کہ وہ خون میں لت پت اسپتال پہنچ کر نئی زندگی کو دنیا میں لانے کا واسطہ بن گئی تھی لیکن ننھا طارق سر پر لگنے والی مہلک چوٹ کے باعث موقع پر ہی دم توڑ گیا تھا۔
طاہرہ کو طارق کی موت کی خبر نہیں دی گئی تھی البتہ اس نے اپنے بہکے قدموں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے شوہر کے جرم کا پردہ رکھ لیا تھا۔ وہ اپنے ساتھ بچی کو محض حادثہ قرار دے کر چپ چاپ مر گئی تھی۔ فون کی دوسری طرف اس کے شوہر کی دہاڑ سن لینے والے نصیر میں بھی اتنی جرأت نہیں تھی کہ اس کے قتل پر کوئی سوال اٹھا پاتا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر ایک سوال اٹھائے گا تو دس سوالات اس کی ذات پر بھی اٹھیں گے۔

☆☆☆

انسپکٹر غیاث نے اپنے سامنے بیٹھے نوجوان لڑکے کو گہری نظروں سے دیکھا۔ اس نے جینز پر برانڈڈ ٹی شرٹ پہن رکھی تھی اور اس کا ہیئر اسٹائل عجیب و غریب ہونے کے باوجود گواہی دے رہا تھا کہ اسے بنوانے کے لیے کسی مہنگے ترین ہیئر ڈریسر کا سہارا لیا گیا ہے۔ اس کے بائیں کان میں ایک نگ والا ٹاپس اور کلائیوں میں رنگ برنگی بینڈز موجود تھے۔ وہ گھبرایا ہوا تھا لیکن بے اختیاری کسی فلمی ہیرو

کی طرح بار بار بالوں میں ہاتھ پھیرنے کا سلسلہ جاری تھا۔

''جبران شکیل.....؟'' بغور جائزہ سے فارغ ہونے کے بعد اس نے سوالیہ نظروں سے لڑکے کی طرف دیکھا۔

''یس سر! میں ہی ہوں لیکن مجھے سمجھ نہیں آرہی کہ آپ کے سپاہی مجھے راستے سے اٹھا کر تھانے کیوں لے آئے ہیں؟'' وہ یہ سب کہتے ہوئے آخر میں تقریباً روہانسا ہوگیا پھر اپنی بات میں زور پیدا کرنے کے لیے مزید بولا۔

''میں نے تو ٹریفک کا کوئی رول بھی نہیں توڑا ہے سر۔ میرے پیپرز کمپلیٹ ہیں۔ یہ دیکھیے بائیک کے پیپرز، میرا این آئی سی اور ڈرائیونگ لائسنس۔'' اس نے ایک ایک کر کے ساری اہم دستاویزات نکال کر اس کی میز پر ڈھیر کرنا شروع کردی تھیں۔

''تم میرے آدمیوں کو بے وقوف سمجھتے ہو کہ وہ اتنے چھوٹے جرائم میں جلا کسی شخص کو لا کر میرے سامنے کھڑا کر دیتے۔'' اس نے میز پر پڑے ان کاغذات پر ایک نگاہ غلط کی نہیں ڈالی تھی اور جبران کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سرد لہجے میں بولا تھا۔ اب پتا نہیں یہ اس کے الفاظ کا اثر تھا یا لہجے کا کہ پہلے ہی سے گھبرایا ہوا جبران مزید سٹپٹایا ہوا دکھائی دینے لگا تھا۔

''ک.....کیا، مطلب سر.....آ.....آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟'' الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے ہونٹوں سے نکلے تھے۔

''اکلوتے ہو، دولت کی کوئی کمی نہیں، اوپر سے باپ کا ٹرانسپورٹ کا کاروبار ہے۔ تمہارے لیے تو کوئی مشکل ہی نہیں کہ اپنا ہی کوئی ٹرک جب چاہو انتقام کی آگ بجھانے کے لیے کسی غریب کے اوپر چڑھوا ڈالو۔'' ایک ایک لفظ چبا چبا کر بولتے وہ جبران کے بدلتے تاثرات کا بھی گہری نظروں سے جائزہ لے رہا تھا۔ وہ اس الزام کو سن کر پہلے تو سراسیمہ ہوگیا تھا اور ایک دو بار کچھ بولنے کی خواہش میں ہونٹ بھی وا کیے تھے لیکن کچھ کہہ نہیں سکا تھا۔ غیاث اس کی اس کیفیت سے کوئی نتیجہ اخذ کرنے ہی لگا تھا کہ جبران کی کیفیت میں تبدیلی آئی اور وہ خوف زدہ ہونے کے بجائے طیش میں نظر آنے لگا۔

''یہ آپ مجھ پر کس قسم کا الزام لگانے کی کوشش کررہے ہیں سر؟'' اس کے لہجے سے بھی اس کے غصے کا اظہار ہو رہا تھا۔

''یہ الزام میں نے نہیں بلکہ ایک مدعی نے لگایا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ مبشر عرف موبی کی موت میں مبینہ طور پر تمہارا ہاتھ ہوسکتا ہے۔''

''میں ایسے کسی بے ہودہ الزام کو تسلیم نہیں کرتا۔ آپ کے پاس اگر میرے خلاف کوئی ثبوت ہے تو پیش کریں۔'' لب و لہجے کی یہ تبدیلی معلوم نہیں اپنی بے گناہی کے یقین نے بخشی تھی یا اسے خیال آگیا تھا کہ اس کا پیسے والا باپ اس کی پشت پناہی کے لیے موجود ہے۔

''ثبوت بھی وقت پر پیش کردیے جائیں گے بچو! لیکن پہلے تم تو یہ وضاحت دو کہ سولہ تاریخ کو تمہاری کیا مصروفیت تھی اور تمہارے اُس دن کی سرگرمیوں کے کون کون گواہ ہیں؟'' غیاث نے اس کے اعتماد کو توڑنے کے لیے نیا وار کیا۔

''مجھے نہیں یاد۔ ویسے کسی کو بھی اپنے ہر دن کی مصروفیات یاد نہیں رہتیں۔ خصوصاً میرے جیسا بندہ جو ہر روز دوستوں کے ساتھ کہیں نہ کہیں ہلا گلا کرتا رہتا ہو۔ کسی ایک تاریخ کے بارے میں کیا بتا سکتا ہے؟'' اس نے شانے اُچکائے۔

''یادداشت کی یہ کمزوری تمہارے لیے مشکلات کھڑی کرسکتی ہے۔'' غیاث نے اسے تنبیہ کی۔

''اگر مجھے کچھ یاد آگیا تو میں آپ کو بتا دوں گا۔'' اس نے بے رخی سے منہ پھیرلیا۔

''یہ تمہارے حق میں ہی اچھا ہوگا۔ بہرحال ابھی تم آرام کرو۔ رات تک اگر تمہاری یادداشت بحال ہوجائے تو بیان دے دینا۔'' غیاث کا لہجہ بھی خشک ہوگیا۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں سر! مجھے یاد نہیں کہ اُس روز میری کیا مصروفیت رہی تھی۔'' اب وہ اپنے ہاتھوں کو آپس میں رگڑ رہا تھا۔ اس میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ جو کچھ کہہ رہا تھا، غیاث سے نظریں ملا کر کہہ پاتا۔ غیاث نے اس سے بحث فضول جانی اور لاک اَپ میں بھجوا دیا۔

''اسے اچھی طرح کھنگالو کریم خان۔ مجھے سو فیصد یقین ہے کہ یہ لڑکا جھوٹ بول رہا ہے اور کچھ ایسا ہے جسے چھپانے کی کوشش کررہا ہے۔'' ماتحت کو یہ حکم دیتے ہوئے وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ انہیں کھل کھیلنے کا موقع دے رہا ہے۔ اگر لڑکے کو کوئی بھی نقصان پہنچا تو اس کا امیر باپ آفت کھڑی کردے گا۔

☆☆☆

''ارے، یہ شعیب کب حوالات سے باہر آیا؟'' غزالہ کے حیرت سے کہنے پر ہانیہ نے اُس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا۔ شعیب اپنے دوستوں کے جلو میں اسی طرف چلا آرہا تھا۔

''ایسے کیا دیکھ رہی ہو۔ تم کیا سمجھتی تھیں کہ میں ہمیشہ حوالات میں ہی رہوں گا؟'' وہ اس کے عین سامنے آ کھڑا ہوا اور دل جلانے والی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ وہ اسے دیکھ کر اتنے صدمے میں تھی کہ کچھ بول ہی نہیں سکی۔

''شعیب اتنا ہلکا بندہ نہیں ہے کہ پولیس اسے قابو میں کرلے۔ اپنی پارٹی کے بڑوں کی ناک کا بال ہوں میں بال۔۔۔ وہ جانتے ہیں اسٹوڈنٹس کو جیسے میں لے کر چل سکتا ہوں وہ کسی اور کے بس کی بات نہیں ہے۔ مبشر کو بھی میں یہ بات سمجھاتا تھا لیکن بچہ سمجھا نہیں۔'' قمیض کے کالر کھڑے کیے وہ بڑی اکڑ سے بول رہا تھا۔ ہانیہ کی مٹھیاں اس ساری بکواس کو سن کر غصے سے بھنچ گئیں۔

''چلو ہانی۔۔۔ یہاں سے چلیں۔'' وہ کوئی ردِعمل ظاہر کرتی اس سے قبل ہی غزالہ اسے کھینچ کر وہاں سے لے گئی اور ایک جگہ بٹھا کر پانی پلایا۔

''ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟ میں پوچھتی ہوں انسپکٹر غیاث سے۔'' وہ ذرا سنبھلی اور غصے سے انسپکٹر غیاث کا نمبر ملایا۔

''شعیب ضمانت پر ہے۔ اس نے وقوعے والے روز جائے حادثے سے اپنی موجودگی کے ٹھوس شواہد اور گواہ پیش کیے ہیں۔ ایسی صورت میں میرے لیے ممکن نہیں تھا کہ میں اس کی ضمانت منظور نہ کرتا۔'' غیاث نے اس کے استفسار کے جواب میں ایسا ٹھوس جواب پیش کیا کہ اس کے جوش کے غبارے سے ہوا نکل گئی۔

''تم مایوس نہیں ہو۔ شعیب کی ضمانت ہوجانے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں نے کیس پر کام بند کردیا ہے۔ پولیس کی تفتیش مسلسل جاری ہے اور مجھے امید ہے کہ ہم جلد اس کیس کو حل کرلیں گے۔'' غیاث نے اس کی مایوسی کو محسوس کرلیا اور اسے تسلی دینے لگا۔

''ٹھیک یو ویری مچ سر۔'' وہ جواباً ڈھیلے ڈھالے انداز میں بولی اور سلسلہ منقطع کرکے یکدم اٹھ کھڑی ہوئی۔

''کہاں؟'' غزالہ نے حیرت سے استفسار کیا۔

''میں گھر جارہی ہوں۔'' وہ کہہ کر رکی نہیں۔ غزالہ بے بسی اپنی جگہ کھڑی رہ گئی۔ ہانیہ آج کل جس موڈ میں رہنے لگی تھی، اس سے کسی بھی ردِعمل کی توقع کی جاسکتی تھی۔

''ہانی.....'' وہ گھر پہنچ کر سیدھی اپنے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی کہ منصور احمد کی پکار نے اسے رکنے پر مجبور کردیا۔

''کیا بات ہے بیٹا! کالج سے اتنی جلدی کیسے واپس آگئیں؟''

''کلاسز نہیں ہورہی تھیں تو میں نے سوچا وقت برباد کرنے کے بجائے واپس گھر ہی آجاؤں۔'' وہ کالج میں ہوتی تھی تب بھی اس سے کلاسز نہیں لی جاتی تھیں لیکن اس وقت پاپا کو بہلانے کے لیے یہی بہانہ سوجھا۔

''فری ہو تو کچھ دیر میرے پاس ہی بیٹھ جاؤ۔ تم تو آج کل اپنے پاپا جانی کو بھول ہی گئی ہو۔''

''ایسی تو کوئی بات نہیں ہے پاپا جانی! بس ایگزامز نزدیک ہیں تو میں ذرا..... بزی ہوگئی ہوں۔'' اس نے ایک بار پھر عذر تراشا۔

''مصروفیت اتنی بھی نہیں ہونی چاہیے کہ انسان اپنوں ہی سے غافل ہوجائے۔'' انہوں نے شکوہ کیا۔

''آپ ایسی باتیں کیوں کررہے ہیں پاپا جانی؟ آپ کے علاوہ میرا ہے ہی کون جو میں آپ سے غافل ہو جاؤں گی۔'' اس کا دل پہلے ہی بھرا ہوا تھا۔ انہوں نے شکوہ کیا تو روہانسی ہی ہوگئی۔

''غافل نہیں ہوئی ہو تو تم نے مجھ سے پوچھا کیوں نہیں کہ میں اس وقت گھر پر کیسے نظر آرہا ہوں اور آفس کیوں نہیں گیا؟'' انہوں نے ایک ایسی بات سامنے رکھی کہ وہ ٹھٹک گئی پھر خود کو سنبھال کر بولی۔

''میں بھی تھی کہ آج آپ ذرا دیر سے آفس جانے کے موڈ میں ہیں۔''

''مسئلہ موڈ نہیں میری طبیعت کا ہے۔ ڈاکٹر ظہیر کا خیال ہے کہ مجھے خود پر سے کام کا دباؤ کم کرکے کچھ آرام کرنا چاہیے۔ اس بار میری رپورٹس ٹھیک نہیں آئی ہیں۔'' انہوں نے بجھے بجھے لہجے میں اسے بتایا تو وہ دہل گئی اور ان کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ وہ اسے پہلے کے مقابلے میں خاصے کمزور نظر آئے۔ ایک دم احساسِ شرمندگی نے اسے بری طرح گھیرلیا۔ وہ اپنے غم میں اس بری طرح الجھ گئی تھی کہ اپنے جان چھڑکنے والے باپ کو ہی بھول گئی تھی۔

''آئی ایم سوری پاپا جانی..... آئی ایم ویری ویری سوری۔'' وہ بولتی ہوئی ان سے لپٹ گئی اور بُری طرح رونے لگی۔

''ایسا مت کرو بیٹا! تمہارے رونے سے مجھے تکلیف ہورہی ہے۔'' وہ اس کے یوں رونے پر بوکھلا گئے۔

''میں بہت بُری بیٹی ہوں۔'' وہ بسوری۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ تم تو میری جان ہو۔'' انہوں نے اسے چمکارا۔

"جو بیٹی آپ جیسے پیارے پاپا کی پروا نہیں کرے، وہ اچھی کیسے ہوسکتی ہے؟" وہ اپنے آپ سے سخت خفا ہوچکی تھی۔

"وہ ایسے اچھی ہوسکتی ہے کہ اس کے پاپا کو اس سے بڑھ کر دنیا میں کچھ اچھا ہی نہیں لگتا۔"

"پاپا جانی.....!" شدتِ جذبات سے اس کی آنکھیں ایک بار پھر بھر آئیں۔

"آپ دنیا کے سب سے اچھے پاپا ہیں۔"

"تو پھر میری بیٹی مجھ سے اپنی پریشانی شیئر کیوں نہیں کر رہی۔ مجھے بتا کیوں نہیں رہی کہ وہ کیا چیز ہے جس نے اسے اپنے پاپا ہی نہیں خود اپنے آپ سے بھی غافل کر دیا ہے۔" انہوں نے اتنی محبت سے پوچھا کہ اس کا دل چاہا موبی کے جانے کا دکھ ان سے بانٹ لے اور اپنے سارے آنسو ان کے شانے پر بہا کر خود بھی ہلکی پھلکی ہوجائے لیکن پھر عقل نے جذبات کا دامن تھام لیا۔ انہوں نے بتایا تھا کہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ایسے میں اگر وہ ان پر اپنے دکھ کا بوجھ لاد دیتی تو وہ مزید بیمار بھی ہوسکتے تھے۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں پاپا جانی بس ایگزامز کی پراپر تیاری نہ ہونے کی وجہ سے تھوڑا اسٹریس لے لیا تھا لیکن آپ فکر نہ کریں۔ اب آپ مجھے بالکل نارمل دیکھیں گے۔" اسے یک دم ہی ادراک ہوا تھا کہ وہ مرنے والے کے ساتھ مر نہیں سکتی تھی اس لیے بہتر تھا کہ اس انسان کی فکر کرتی جائے ..... دیکھ کر جیتا تھا۔

☆☆☆

"جبران نے کچھ بتایا کریم خان؟"

"نہیں سر مگر یہ بات پکی ہے کہ وہ کچھ نہ کچھ چھپا رہا ہے۔ آدمی کتنی ہی کمزور یادداشت کا مالک ہو یاد کرنے پر اسے کوئی نہ کوئی بات یاد آ ہی جاتی ہے لیکن وہ تو دو مہینے والے دن کی کوئی ایک بھی بات بتانے کو راضی نہیں ہے اور مسلسل یہی کہتا ہے کہ مجھے کچھ یاد نہیں۔"

"اس پر جلدی کام مکمل کرو کریم خان! ہم نے اسے غیر قانونی حراست میں لے رکھا ہے۔ اس کے والی وارثوں کو بھنک بھی پڑ گئی تو پنجے جھاڑ کر ہمارے پیچھے پڑ جائیں گے۔" کریم خان کی رپورٹ سن کر انسپکٹر غیاث نے تشویش زدہ لہجے میں اس سے کہا۔

"میں پوری کوشش کروں گا سر لیکن فی الحال تو میں آپ کو فرناز ملک کے بارے میں اطلاع دینے آیا تھا۔"

"فرناز ملک ..... وہی نا جس کی گمشدگی کی رپورٹ لکھوانے اس کی ماں آئی تھی۔ رابعہ اپارٹمنٹ والی ..... ؟"

"جی جی سر ..... وہی۔" کریم خان نے تصدیق کی۔

"کیا پتا چلا اس لڑکی کے بارے میں؟" غیاث نے معمولی دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔ فرناز نامی اس لڑکی کے بارے میں اس کی ٹیم نے جو معلومات حاصل کی تھیں، اس کے مطابق لڑکی کالج ٹائم پر کالج میں کسی فنکشن کا بہانہ بنا کر اُس روز پارٹی ڈریس میں گھر سے روانہ ہوئی تھی اور واپس لوٹ کر نہیں آئی تھی۔ پولیس کی تحقیق سے معلوم ہوگیا تھا کہ اُس روز کالج میں کوئی فنکشن نہیں تھا اور فرناز نے ماں سے جھوٹ بولا تھا۔ پولیس کو محلے کے ایک رکشے والے سے فرناز کے کالج سے مخالف سمت میں ایک بس اسٹاپ پر اترنے کی بھی رپورٹ مل گئی تھی۔ ان شواہد کی روشنی میں اندازہ لگایا گیا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے گئی ہے اور جلد نکاح نامے یا شوہر کے ساتھ منظرِ عام پر آجائے گی جیسا کہ عموماً اس طرح کے کیسز میں ہوتا ہے۔ کام کے لوڈ کی وجہ سے پولیس نے اس کیس کو خود ہی حل ہوجانے والے کیسز کے کھاتے میں ڈال کر ایک سائڈ پر کر دیا تھا۔ آج وہ دن آگیا تھا جب غیاث اس کیس کے بارے میں کوئی خبر سننے جا رہا تھا۔

"اس بے چاری کی لاش سمندر کے کنارے ایک نجی ہٹ سے ملی ہے۔ تفریح پر جانے والے کچھ لوگوں نے ہٹ سے شدید بُو آنے کے باعث رپورٹ کی تھی۔ کارروائی پر لڑکی کی لاش دریافت ہوئی۔ ساتھ ہی اس کا آئی ڈی کارڈ وغیرہ بھی تھا تو پولیس خود ہی اس کی ماں تک پہنچ گئی۔"

"ویری بیڈ۔" اس اطلاع پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے غیاث کی نظروں میں اس کی بیوہ ماں کی شکل گھوم گئی تھی۔

"پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق لڑکی کا مرنے سے پہلے ریپ کیا گیا تھا۔" فرناز کے بارے میں اگلی خبر بھی غیر متوقع نہیں تھی۔

"ہٹ کے مالک اور چوکیدار وغیرہ سے انکوائری ہوئی ہے کیا؟"

"مالک ملک سے باہر ہے سر۔ چوکیداری کرتا دھرتا ہے لیکن وہ بھی کئی دن سے بیٹی کی شادی کے سلسلے میں گاؤں گیا ہوا تھا۔ شواہد سے پتا چلتا ہے کہ دروازے کا تالا توڑ کر ہٹ کو استعمال کیا گیا تھا اور قاتل جاتے جاتے محض دروازے کو کنڈی مار کر چلا گیا تھا۔" کریم خان نے اس کے سوال کا جواب دیا۔

"فرانزک وغیرہ کی رپورٹ آجائے تو مجھے بتاؤ۔ لڑکی کی گمشدگی کی رپورٹ ہمارے تھانے میں درج ہے۔ ہمارا فرض بنتا ہے کہ اس کے قاتل کو اس کے انجام تک پہنچائیں۔" دل ہی دل میں وہ شرمندہ تھا کہ اس نے اس کیس کو خاطر خواہ توجہ نہیں دی تھی۔

"جی سر۔" کریم خان نے مستعدی سے جواب دیا۔

"لڑکی کے کالج اور موبائل فون وغیرہ کی کیا تفصیل معلوم ہوئی تھی؟" اس نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

"لڑکی کی ماں کے مطابق اس کے پاس موبائل فون نہیں تھا۔ کالج سے بھی کچھ خاص معلوم نہیں ہوا۔ کلاس فیلوز کے مطابق وہ زیادہ گھلنے ملنے والی نہیں تھی۔ پڑھائی میں بھی نارمل تھی البتہ کچھ عرصے سے اس کی غیر حاضریاں بڑھ گئی تھیں۔"

"غیر حاضریوں کے سلسلے میں اس کی ماں کا کیا کہنا تھا؟"

"اسے علم نہیں۔ وہ ملازمت کرتی ہے اور بیٹی کے کالج جانے سے پہلے ہی خود گھر سے نکل جاتی تھی۔"

"ان کے پاس لینڈ لائن فون بھی ہے یا نہیں۔"

"ہے سر۔"

"ٹھیک ہے پھر اس کا ریکارڈ نکلواؤ۔ حالات بتا رہے ہیں کہ وہ کسی لڑکے کے چکر میں تھی۔ اگر ایسا تھا تو کسی نہ کسی طرح رابطے میں بھی ہوگی۔"

"او کے سر۔" کریم خان اپنی ٹوپی سنبھالتا ہوا کھڑا ہوگیا۔

"اور ہاں، جبران کو جلدی نمٹاؤ۔" اس نے ایک بار پھر کریم خان کو یاد دہانی کروائی تو اس کے لہجے میں ہلکی سی فکرمندی کی جھلک تھی۔

☆☆☆

"کیا میں منصور احمد سے بات کرسکتا ہوں؟" مسلسل بجتی گھنٹی پر اس نے فون اٹھایا تو دوسری طرف سے خاصے مضطرب لہجے میں استفسار کیا گیا۔

"پاپا تو اس وقت گھر پر موجود نہیں ہیں۔ آپ مجھے اپنا نام اور میسج نوٹ کروا دیں تو میں انہیں انفارم کر دوں گی۔" اس نے شائستگی سے جواب دیا لیکن اس کے جواب نے دوسری طرف موجود شخص کو مزید مضطرب کر دیا تھا چنانچہ وہ کچھ بلجتی لہجے میں بولا۔

"مجھے اُن سے بے حد ضروری بات کرنی ہے۔ کیا آپ مجھے ان کا سیل فون نمبر دے سکتی ہیں؟"

"میں کسی اجنبی کو ان کا پرسنل نمبر کیسے دے سکتی ہوں؟ آپ پلیز مجھے اپنا میسج دے دیں، میں اسے پاپا تک پہنچا دوں گی اور پھر وہ خود آپ کو کال کرلیں گے۔" اس شخص کا مطالبہ عجیب محسوس ہونے کے باوجود اس نے اسے رسانیت سے جواب دیا۔

"سوری، اصل میں، میں بہت پریشان ہوں اس لیے آپ کی پوزیشن کو سمجھ نہیں سکا۔" وہ شرمندہ سا ہوا۔

"اٹس او کے۔ آپ مجھے اپنا میسج اور نام نوٹ کروا دیں۔"

"میرا نام دانش احمد ہے اور میرا منصور احمد کے لیے یہ پیغام ہے کہ ان کے تایا شدید بیمار بلکہ بسترِ مرگ پر ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ مرنے سے پہلے ایک بار منصور ان سے ملنے ضرور آجائے۔"

"کیا مطلب؟ کس کے تایا؟" وہ پیغام سن کر حیران ہوئی۔

"منصور احمد یعنی تمہارے پاپا کے تایا۔" دوسری طرف سے اس بار بے تکلفی کا مظاہرہ کیا گیا۔

"پاپا کے تایا..... میں تو پہلی بار سن رہی ہوں کہ اس دنیا میں پاپا کے کوئی رشتے دار بھی ہیں۔" اس کی حیرت ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

"اچھا خاصا بڑا خاندان ہے تمہارے باپ کا لیکن وہ شروع ہی سے کچھ سرپھرا تھا اور سب سے الگ رہنا پسند کرتا تھا۔ شادی کے بعد تو بالکل ہی سب سے کٹ گیا تھا۔" دوسری طرف سے اس کی معلومات میں اضافہ کیا گیا۔

"آپ..... آپ کون ہیں پاپا کے؟" اس نئے انکشاف نے اس کی آواز کپکپا ڈالی تھی۔

"میں اس کا کزن ہوں اور اس سے عمر میں بڑا ہونے کے ناتے تمہارا تایا لگتا ہوں۔"

"میرے تایا....." وہ جو ہمیشہ رشتوں سے محروم رہی تھی کسی ننھے بچے کی طرح چہکی۔

"ہانی..... کس سے بات کر رہی ہو بیٹا؟" اسی وقت اندر داخل ہونے والے منصور احمد نے اس کے الفاظ سنے تو لپک کر اس کے قریب آئے۔

"آپ کے کوئی کزن دانش احمد ہیں پاپا۔" ہانیہ کے الفاظ ابھی اس کے منہ میں ہی تھے کہ منصور احمد نے اس کے ہاتھ سے ریسیور جھپٹ لیا۔

"ہیلو، کون؟" ان کی آواز پھٹی پھٹی سی تھی۔

"کیوں فون کیا ہے آپ نے یہاں؟" ہانیہ دوسری

طرف کی گفتگو نہیں سن سکتی تھی لیکن اُسے اندازہ تھا کہ اس کے پاپا کے سوالوں کے جواب میں کیا کہا جا رہا ہوگا۔

"ٹھیک ہے۔ میں سوچوں گا۔" اس کے دیکھتے ہی دیکھتے منصور احمد نے مرے مرے سے لہجے میں کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔

"وہ سچ مچ ہمارے رشتے دار ہیں پاپا! کیا ہم اُن سے ملنے جائیں گے؟" رشتے داروں کا سن کر وہ پُرجوش ہو گئی تھی۔

"ابھی میں نے کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے۔" انہوں نے کھوئے کھوئے لہجے میں جواب دیا۔

"آپ کے تایا کی حالت سیریس ہے پاپا۔ ایسے حالات میں اگر ماضی میں انہوں نے آپ کے ساتھ کوئی زیادتی کر بھی دی تھی تو آپ کو انہیں معاف کر دینا چاہیے۔" یہ تو کوئی بھی اندازہ لگا سکتا تھا کہ اگر کوئی شخص خاندان ہوتے ہوئے بھی خاندان کے لوگوں سے دور ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اس کی کسی وجہ سے اپنے خاندان کے لوگوں سے ناراضگی چل رہی ہے۔

"میں نے کہا نا کہ میں سوچ کر فیصلہ کروں گا۔" وہ اُلجھے ہوئے سے تھے۔

"سوچنے میں اتنی دیر مت لگایئے گا پاپا کہ آپ کے انکار میں دروازے پر لگی آنکھیں بجھنے کے لیے بند ہو جائیں۔" اس نے ان سے آہستہ سے کہا اور وہاں سے ہٹ گئی۔ فیصلہ بہرحال منصور احمد کو ہی کرنا تھا۔

☆☆☆

"تو تم ہو وہ قاتل جس کی ہمیں تلاش تھی۔" انسپکٹر خیامت نے کینہ توز نظروں سے اپنے سامنے کھڑے جبران کو گھورا۔ وہ جس روز تھانے لایا گیا تھا، اس کے مقابلے میں آج اس کی حالت بہت ابتر لگ رہی تھی۔

"غلطی ہو گئی سر! جوانی کے جوش میں ہوش کھو بیٹھا۔ یقین کریں میری ایسی کوئی نیت نہیں تھی۔ میں بہت شرمندہ ہوں سر۔" اس کے خلاف اتنے ٹھوس ثبوت جمع کر لیے گئے تھے کہ وہ اپنے جرم سے مُکر نہیں سکتا تھا اس لیے اب ہاتھ جوڑے آنسو بہا رہا تھا۔

"شرمندہ کے بچے.... ایک انسان کو زندگی سے محروم کر کے اب معصوم بننے کی کوشش کر رہا ہے۔ تو دیکھنا کہ میں تیرے خلاف اتنا سخت کیس بناؤں گا کہ تیرے باپ کی دولت بھی تجھے نہیں بچا سکے گی۔" خیامت پڑھا لکھا آدمی تھا لیکن تھانے کے ماحول نے اس پر اثر ڈالا تھا اور اس وقت وہ تھا بھی شدید طیش میں، اس لیے روایتی پولیس والوں کی طرح نہ صرف تو تڑاخ سے بولا بلکہ جبران کو ایک زوردار تھپڑ بھی رسید کر ڈالا۔

"خدا کے لیے سر! رحم کریں مجھ پر، میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ کبھی کوئی غلطی نہیں ہوگی اور میں شریف انسان بن کر رہوں گا۔" وہ روتے ہوئے اس کے قدموں میں گرنے لگا۔

"سیدھا کھڑا ہو جا اوئے۔ زیادہ ڈرامے بازی نہ کر۔" ایک سپاہی نے اسے بالوں سے پکڑ کر کھینچ لیا۔

"آپ میرے ڈیڈی کو بلوا دیں سر! ان کے پاس بہت پیسا ہے۔ میری جان بچانے کے لیے آپ جتنی ڈیمانڈ کریں گے، وہ آپ کو دیں گے۔ بس آپ کسی طرح اس مصیبت سے میری جان چھڑوا دیں۔" وہ خوف زدہ تھا لیکن اپنی دولت کا زعم بھی بہرحال کہیں نہ کہیں باقی تھا اس لیے اس کا حوالہ دینے سے نہیں چُوکا تھا۔

"اس کا دماغ ابھی پوری طرح ٹھکانے پر نہیں آیا ہے۔ ذرا اور سروس کرو تاکہ باپ کی دولت کا خناس پوری طرح دماغ سے نکل جائے۔" اس نے ہدایت دی تو سپاہی جبران کو کھینچتے ہوئے لے گئے۔

"حال دیکھو بے غیرت کا۔ پورے پکے ثبوتوں کے ساتھ قاتل ثابت ہو گیا ہے پھر بھی چاہتا ہے کہ کسی طرح اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو جائے۔" جبران کی طرف سے رشوت کی پیشکش نے اس کے غصے کا گراف خاصا بلند کر دیا تھا۔

"پیسے والوں کو عادت ہوتی ہے سر دنیا کی ہر چیز کو اپنی ملکیت سمجھنے کی اور کیوں نہ ہو؟ یہاں اوپر سے نیچے تک ہر جگہ ایسے بکاؤ بندے بھرے ہوئے ہیں کہ ایک آدھ آپ جیسا آ جائے تو کسی کو یقین نہیں آتا کہ ایماندار لوگ بھی ہوا کرتے ہیں۔" کریم خان نے ایک تلخ سچ بیان کیا۔

"خیر تم چالان بناؤ۔ اس کا اقبالی بیان تیار کرو۔ پیش کرتے ہیں اسے عدالت میں۔" اس نے دماغ ٹھنڈا کرتے ہوئے ہدایت جاری کی.... اتفاقی طور پر جبران کے قاتل کی حیثیت سے سامنے آ جانے پر اس کا بوجھ خاصا کم ہو گیا تھا لیکن بہرحال ابھی بہت کام باقی پڑا تھا۔

☆☆☆

"بالکل اپنی دادی پر گئی ہے۔ وہی ناک، وہی آنکھیں، ویسی ہی رنگت۔"

"کہتی تو تم ٹھیک ہو پر رب سوہنا ضیا دادی جیسا نہ

کرے۔ اس بے چاری نے چھوٹی عمر میں بڑے دکھ دیکھے۔"

"دکھ تو منصور میاں نے بھی بڑے دیکھے۔ ماں باپ دونوں کے سائے کے بغیر پلے۔ میں نے تو کبھی ان کو ہنستا مسکراتا ہی نہیں دیکھا۔"

"زندگی میں کوئی سکھ ملتا تو ہنستے مسکراتے بھی۔ میں تو سوچتی ہوں کہ اب بھی جانے ان لوگوں کا دل کیسے پگھلا ہے کہ منصور میاں کی یاد آ گئی ہے۔ ورنہ تو سب خوش ہی تھے کہ وہ ایک بار حویلی چھوڑ کر جانے کے بعد بھی یہاں واپس نہیں لوٹے۔"

وہ دو ملازمائیں تھیں جو اپنے عقب میں بانیہ کی موجودگی سے بے خبر کام نمٹاتے ہوئے آپس میں گفتگو کر رہی تھیں۔ اس گفتگو سے بانیہ کو منصور احمد کے ماضی کے بارے میں اگرچہ سب کچھ معلوم نہیں ہوا تھا لیکن اتنا اندازہ ہو گیا تھا کہ ان کے ساتھ یہاں زیادتی ہوتی رہی ہے۔ شاید ان تلخ یادوں کی وجہ سے ہی وہ کبھی لوٹ کر اپنے خون کے رشتوں کے پاس واپس نہیں آئے تھے لیکن اب انہیں پکارا گیا تھا تو ان سے انکار بھی نہیں ہو سکا تھا۔ بانیہ اپنے تجسس اور اشتیاق کے باعث ضد کر کے ان کے ساتھ آ گئی تھی اور مطمئن تھی کہ یہاں ان کا مناسب استقبال ہوا تھا۔ کھانے پر بھی خاصا اہتمام تھا۔ پُرتکلف کھانے کے بعد منصور احمد کو ان کے تایا نے تنہائی میں بات کرنے اپنے کمرے میں بلا لیا تھا جبکہ بانیہ حویلی کو اچھی طرح دیکھنے کے شوق میں اِدھر اُدھر گھومتی پھر رہی تھی۔

"کیا سچ مچ میں اپنی دادی جیسی ہوں؟" وہ گھوم کر ان دونوں کے سامنے آئی اور بہت شوق سے پوچھا۔

"بالکل بی بی! آپ کا ناک نقشہ بالکل اپنی دادی جیسا ہے۔" وہ دونوں اسے سامنے دیکھ کر پہلے تو ذرا سی شپٹائیں پھر ایک نے تصدیق کی۔

"عادت کی کیسی تھیں میری دادی؟"

"بالکل سیدھی سادی۔ کبھی کسی سے تیز آواز میں بات نہیں کی۔ سرکار سائیں گزرنے کے بعد تو جیسے گونگی ہی ہو گئی تھیں۔ بڑی بی بی کا رعب بھی تو بہت تھا اُن پر۔" ملازمہ نے بولتے بولتے اپنی زبان دانتوں میں داب لی۔

"بڑی بی بی مطلب پاپا کی تائی جان؟" اس نے اندازہ لگایا لیکن اس بار ملازمہ نے کوئی تصدیق یا تردید نہیں کی۔

"وہ دیکھنے میں مجھے بھی تھوڑی سخت مزاج کی ہیں

گشت جاری ہے

شام کا وقت تھا۔ ہاتھوں میں بندوقیں تھامے دو سپاہی بھاری بوٹ کھڑکھڑاتے ہوئے گشت کر رہے تھے۔ تھوڑی دور جا کر ویران سڑک پر انہوں نے ایک جگہ کچھ لوگ کھڑے دیکھے۔ دونوں تیزی سے اس طرف بڑھے۔ لوگوں کے درمیان ایک لاش پڑی تھی۔ کوٹ پتلون پہنے مرنے والا کسی اچھے کھاتے پیتے گھر کا فرد معلوم ہوتا تھا۔ سپاہیوں کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوئی اور انہوں نے بھیڑ منتشر کر دی۔

ایک سپاہی نے آنے جانے والوں پر نگاہ رکھی، دوسرا سپاہی تیزی سے لاش کی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ اور جو کچھ بھی ملا اپنی جیبوں میں منتقل کرتا چلا گیا۔ مرنے والے کی انگلی میں سونے کی انگوٹھی چمک رہی تھی اس کے ساتھی نے کہا۔

"اوئے جلدی کر.... اتنی دیر....؟ چاروں طرف نگرانی ہو رہی ہے!"

"انگوٹھی ہے سونے کی!" سپاہی نے ساتھی کو بتایا۔

"تو اتار لے.... جلدی کر۔"

"اترتی ہی نہیں ہے۔ پھنسی ہوئی ہے.... انگلی کاٹ لوں....؟"

"نہیں نہیں۔ چھوڑ دے، دیر مت کر.... انگوٹھی بڑے صاحب کے لیے چھوڑ دے.... وہ ابھی گشت پر آنے والا ہے۔"

دونوں بندوقیں سنبھالے گشت کے لیے آگے بڑھ گئے۔

(ہندی پنجابی ادب۔ مصنف۔ درشن متوا)

(انتخاب: محمد الیاس چوہان، کراچی)

"بھکارن"

"بچہ بھوکا ہے۔ کچھ دے دو سیٹھ۔"

گود میں بچہ اٹھائے ہوئے ایک نوجوان عورت ہاتھ پھیلا کر بھیک مانگ رہی تھی۔

"اس کا باپ کون ہے.... پال نہیں سکتے تو پیدا کیوں کرتے ہو؟" سیٹھ جھنجلا کر بولا۔ عورت خاموش رہی۔

سیٹھ نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اس کے کپڑے میلے اور پھٹے ہوئے تھے۔ لیکن تھی وہ بہت خوب صورت اور سڈول۔

سیٹھ کہنے لگا۔ "میرے گودام میں کام کرے گی؟ کھانے کو بھی ملے گا اور پیسا بھی۔"

بھکارن سیٹھ کو دیکھتی رہی۔

سیٹھ نے کہا۔ "بول! بہت سارے پیسے ملیں گے!"

"سیٹھ.... تیرا نام کیا ہے؟"

"نام؟ میرے نام سے تجھے کیا غرض....؟"

"جب دوسرے بچے کے لیے بھیک مانگوں گی تو لوگ اس کے باپ کا نام پوچھیں گے؟"

(ہندی پنجابی ادب۔ مصنف شیام سندر اگروال)

(انتخاب: محمد الیاس چوہان، کراچی)

لیکن خیر کوئی مسئلہ نہیں۔ میں جلدی انہیں بھی دوست بنالوں گی۔ میں شکل و صورت میں اپنی دادی جیسی بے شک ہوں گی لیکن عادت میں مختلف ہوں۔ مجھ سے خاموش بالکل نہیں رہا جاتا اور باتیں بنا بنا کر منٹوں میں لوگوں کے دلوں میں بھی جگہ بنا لیتی ہوں۔" اس کے انداز میں اس کے باپ کا دیا ہوا اعتماد بول رہا تھا۔ منصور احمد نے اسے اتنے لاڈ سے پالا تھا کہ اسے کبھی کسی سے ڈرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی۔

"آپ یہاں لمبے عرصے کے لیے رہنے آئی ہیں بی بی؟" ملازمہ اس کے انداز پر مسکرائی اور تجسس سے پوچھا۔

"یہ تو پاپا پر منحصر ہے۔" اس نے بے پروائی سے شانے اچکائے پھر اگلا سوال کیا۔

"میری ممی کو دیکھا تھا آپ لوگوں نے؟"

"بس دور دور سے ہی دیکھا تھا جی! تھیں تو برادری کی ہی لیکن شادی سے پہلے یہاں کبھی آئی نہیں تھیں۔ منصور میاں بیاہ کر بھی سیدھے اپنے شہر والے گھر میں لے گئے تھے۔ میرے خیال میں بس ایک بار بڑے صاحب مطلب آپ کے پردادا کی میت پر ہی آئی تھیں یہاں۔ کیوں سعیدہ..... میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟" اس نے تصدیق کے لیے اپنی ساتھی کو مخاطب کیا۔

"ہاں بس وہ ایک دفعہ ہی کی بات ہے۔ منصور میاں خود اس کے بعد کب آئے جو انہیں لاتے۔ زندگی بھی تو تھوڑی ہی تھی ان کی۔" وہ دونوں باتیں کرنے کے ساتھ ساتھ مسلسل کام میں بھی مصروف تھیں۔ ہانیہ کا دل چاہ رہا تھا کہ ان سے مزید سوال جواب کرے لیکن موبائل کی بیپ نے اسے اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ انسپکٹر غیاث کا نام اسکرین پر دیکھ کر وہ جلدی سے وہاں سے دور ہٹ گئی۔ کالج میں ہونے والی ملاقات میں ہی ان کے درمیان فون نمبرز کا تبادلہ ہوا تھا۔

"میں نے تمہیں تھینکس کہنے کے لیے کال کی تھی۔" رسمی علیک سلیک کے بعد غیاث نے اس سے جو جملہ کہا، اس نے اسے حیران کردیا۔

"کس بات کا شکریہ؟"

"تمہاری وجہ سے میں ایک بے رحم قاتل کو نہایت آسانی سے گرفتار کرنے میں کامیاب ہوگیا ہوں۔"

"میں کچھ نہیں۔"

"جبران شکیل کی بات کررہا ہوں۔"

"کیا اس نے مبشر کے قتل کا اعتراف کرلیا؟" اس کے پورے جسم میں تناؤ کی سی کیفیت پیدا ہوگئی۔ اپنے پاپا کی خاطر اگرچہ وہ خود کو نارمل رکھنے کی کوشش کرتی تھی لیکن مبشر کی موت کبھی اس کے دل و دماغ سے نہیں نکل سکی تھی۔

"میرے سامنے اس کا اقبالی بیان موجود ہے۔ میں تمہیں پڑھ کر سناتا ہوں۔" غیاث اسے بیان پڑھ کر سنانے لگا اور وہ منہ کھولے ساکت سنتی رہی، یہ سب کچھ اس کے لیے قطعی غیر متوقع تھا۔

"ہانیہ—" جو کچھ سنا تھا، اس پر لب کشائی کی ہمت پیدا کرتی اس سے قبل ہی منصور احمد کی تیز پکار نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

"جی پاپا!" اس نے جلدی سے سلسلہ منقطع کیا۔

"چل کر گاڑی میں بیٹھو، ہم ابھی اور اسی وقت واپس جارہے ہیں۔" وہ اتنے غصے میں تھے کہ ہانیہ "کیوں" کا سوال نہیں اٹھا سکی۔ ویسے بھی اس کا ذہن غیاث کی کال میں اُلجھا ہوا تھا۔ واپسی کا سارا راستہ خاموشی سے کٹا۔ گھر پہنچ کر بھی منصور کا موڈ ٹھیک نہیں ہوا اور وہ سیدھے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ ہانیہ کے پاس بھی اپنے کمرے میں جانے کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ سوچوں کے گرداب میں اُلجھی ہوئی وہ لباس وغیرہ تبدیل کرکے اپنے بستر پر آکر لیٹی اور موبائل آن کیا تو دیکھا غیاث کا میسج آیا ہوا تھا۔

"میں جانتا ہوں کہ مبشر کی موت تمہارے لیے ایک بڑا صدمہ ہے لیکن میں امید کرتا ہوں کہ تم حقیقت پسندی سے کام لوگی اور خود کو اس صدمے سے نکال کر موو آن کرو گی۔" پیغام میں وہی کہا گیا تھا جو کسی بھی مخلص شخص کو کہنا چاہیے تھا پھر بھی جانے کیوں ہانیہ کو عجیب سا احساس ہوا۔ اس احساس کو کوئی نام دینے کی کوشش کرتے ہوئے بالآخر اسے رات کے کسی پہر نیند آہی گئی۔

"ہانیہ بی بی، جلدی آئیں ہانیہ بی بی، دیکھیں صاحب کو پتا نہیں کیا ہوگیا ہے۔" وہ صبح صبح کا وقت تھا جب ملازمہ نے اس کے کمرے کا دروازہ بجا کر اسے یہ اندوہناک اطلاع دی۔

وہ بستر چھوڑ کر دیوانہ وار پاپا کے کمرے کی طرف بھاگی۔ وہ رائٹنگ ٹیبل کے قریب قالین پر بے ہوشی کی حالت میں گرے ہوئے تھے۔ قریب ہی ان کی کرسی لڑھکی ہوئی تھی اور میز پر ان کی ڈائری کھلی پڑی تھی۔ شاید کچھ لکھتے لکھتے ہی ان کی طبیعت بگڑی تھی۔

"میں تو صاحب کو بیڈ ٹی دینے آئی تھی، دیکھا تو یہ اس حال میں پڑے تھے۔" ملازمہ کی آواز اسے کہیں دور

سے آتی ہوئی محسوس ہورہی تھی۔ اس نے بہ مشکل اپنے مختل ہوتے حواس پر قابو پایا اور کپکپاتی ہوئی آواز میں بولی۔

"ڈرائیور سے کہو گاڑی نکالے۔ ہمیں پاپا کو فوراً اسپتال لے کر جانا ہوگا۔"

☆☆☆

"فرناز سے میری دوستی کالج آتے جاتے ہوئی تھی۔ وہ گرلز کالج میں پڑھتی تھی۔ میں نے اسے دیکھا تو وہ مجھے اچھی لگی۔ شاید اس لیے بھی کہ اس میں ہانیہ کی جھلک تھی۔ شروع شروع میں وہ میری طرف متوجہ نہیں ہوئی لیکن آخرکار میں اپنی مسلسل کوشش سے اس سے دوستی کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ وہ بیوہ ماں کی اکلوتی بیٹی تھی اور بدنامی سے بہت ڈرتی تھی۔ اس لیے اس نے ہماری دوستی کے بارے میں کسی کو آگاہ نہیں کیا۔ میرے اصرار پر وہ کبھی کبھی کالج سے چھٹی کر کے مجھ سے ملنے آجاتی تھی لیکن میں ان ادھوری ملاقاتوں پر خوش نہیں تھا۔

میری برتھ ڈے والے دن میں اسے راضی کرنے میں کامیاب ہوگیا کہ وہ میرے اس اہم دن پر شام تک کا وقت میرے ساتھ گزارے۔ میری فرمائش پوری کرنے کے لیے اس نے اپنی والدہ سے کالج میں فنکشن کا بہانہ بنایا اور بن سنور کر میری بتائی ہوئی جگہ پر پہنچ گئی۔ وہاں سے میں اسے اپنے ساتھ ساحلِ سمندر پر لے گیا۔

صبح کا وقت تھا اور وہاں بہت ہی کم لوگ موجود تھے۔ میں اور فرناز ایک دوسرے کا ساتھ انجوائے کرتے کافی دور تک نکل گئے اور پھر ہمیں ہٹ نظر آیا جس کے دروازے پر تالا لگا تھا۔ یونہی شرارت، شرارت میں، میں نے تالا توڑا اور فرناز کو لے کر ہٹ میں چلا گیا۔ تنہائی، فرناز کے بھیگ کر جسم سے چپکے کپڑوں اور شیطان نے مل کر ایک ساتھ مجھ پر حملہ کیا اور میں فرناز کے انکار کے باوجود اس سے زبردستی کرنے لگا۔ میری اس زبردستی پر اس نے بھرپور احتجاج کیا اور ساری محبت وحبت بھول کر مجھے جنگلی بلیوں کی طرح نوچنے کھسوٹنے لگی۔ مجھے اُس کی اس حرکت پر غصہ آگیا اور غصے کی شدت میں، میں نے اُس کا سر زور سے دیوار پر دے مارا۔ وہ فوراً ہی گر گئی۔ میں نے اسے چیک کیا تو مجھے لگا اس کی سانس بند ہوچکی ہے۔ میں گھبراہٹ میں اسے وہیں چھوڑ کر بھاگ نکلا اور گھر واپس پہنچ کر باقی کا پورا دن اپنے کمرے میں چھپا رہا۔"

"یہ جبران کے اقبالی بیان کے وہ اہم مندرجات تھے جس میں اس نے فرناز سے دوستی اور اس کے قتل کا اعتراف کیا تھا۔ پولیس، لینڈ لائن نمبر کا کال ریکارڈ دیکھ کر اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔ فرناز کی والدہ نے اس کے موبائل نمبر کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کیا تھا اور پولیس کو جاننے میں زیادہ وقت نہیں لگا تھا کہ یہ نمبر کس کا ہے۔ فرناز کے جسم اور ہٹ سے حاصل ہونے والے نمونوں نے مزید ہر طرح کا شک وشبہ دور کر کے ثابت کردیا تھا کہ مجرم جبران شکیل ہی تھا اور یہ اتفاق تھا کہ وہ پہلے ہی پولیس کی تحویل میں تھا۔ مبشر کی موت والے دن وہ جائے حادثہ پر اپنی عدم موجودگی کا ثبوت دینے میں اس لیے ہچکچاہٹ کا شکار رہا تھا کہ اس روز وہ جہاں موجود تھا وہاں اس سے سنگین ترین جرائم سرزد ہوچکے تھے اور اس کے لیے سچ بتانا ممکن ہی نہیں تھا۔

"یہ کیس تو حل ہوگیا اور میں پوری کوشش بھی کروں گا کہ مجرم کو اس کے کیے کی پوری سزا ملے لیکن مبشر والے کیس کا کیا ہوگا؟ اس لڑکے کی موت کا معما ابھی تک حل نہیں ہوا اور اس معمے کو حل کیے بغیر میں ہانیہ منصور احمد کی نظروں میں سرخ رُو نہیں ہوسکتا۔" فرناز قتل کیس کی فائل پر دستخط کرتے ہوئے وہ مسلسل سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

"میں ہانیہ کی نظروں میں سرخ رُو کیوں ہونا چاہتا ہوں؟ ایک پولیس آفیسر کی حیثیت سے کیس حل کرنا اہم ہونا چاہیے نہ کہ کسی لڑکی کو متاثر کرنا۔" وہ اپنی سوچ پر خود ہی اپنا مواخذہ کرنے لگا۔

"پولیس آفیسر ہونے کے ساتھ ساتھ میں ایک انسان بھی ہوں اور ہر انسان کے اندر جذبات ہوتے ہیں۔ میں جتنی جلدی یہ اعتراف کرلوں کہ میرے دل میں ہانیہ کے لیے پسندیدگی کے جذبات پیدا ہوچکے ہیں۔ تب ہی مجھے کوئی فیصلہ کرنے میں آسانی رہے گی۔" وہ ایک عملی انسان تھا اس لیے اسے اپنے جذبات کا تجزیہ کرنے میں بہت زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔

"مگر وہ تو مبشر سے محبت کرتی ہے۔" انسان کتنا ہی عملی ہو اس کے اندر کہیں نہ کہیں ایک خوف زدہ بچہ چھپا بیٹھا ہوتا ہے۔ اس کے اندر کے بچے نے اسے ڈرایا۔

"مبشر ماضی کا قصہ بن چکا ہے۔ ہانیہ چاہے نہ چاہے ایک دن اسے مبشر کو بھول کر اپنی زندگی میں آگے بڑھنا ہوگا۔ کیا تم وہ شخص نہیں بن سکتے جو اس مشکل وقت میں آگے بڑھ کر اسے سہارا دے اور اس کا ہاتھ تھام کر اسے زندگی میں آگے لے جائے؟" سوال اندر سے اٹھا تھا اور جواب بھی اندر سے ہی آیا تھا۔

''کیوں نہیں، محبت کرنے والوں میں اتنا ظرف ہوتا ہے کہ وہ صرف محبوب کو بانہوں میں سمیٹنے کے خواب نہ دیکھیں بلکہ اس کے دکھوں اور کمزوریوں کو بھی سمیٹ لیں۔'' فیصلہ ہو گیا تھا تو اس کے قدموں کو آگے بڑھنے سے کون روک سکتا تھا۔

☆☆☆

''میں کیسے اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا تھا کہ یہ لوگ کبھی محبت سے بھی مجھے پکار سکتے ہیں؟ اتنے برسوں بعد بھی تایا جان نے مجھے بسترِ مرگ پر سے پکارا تو یہ کہنے کے لیے کہ میں حویلی میں اپنے حصے سے دانش بھائی کے حق میں دستبردار ہو جاؤں۔'' وہ میز پر دھری ڈائری کو پڑھتے ہوئے اس دکھ کو محسوس کر رہی تھی جس سے اس کا باپ گزرا تھا۔

''میں بھی دانش بھائی کی طرح حویلی والوں ہی کا خون تھا لیکن میرے باپ کی موت نے مجھ سے اور میری ماں سے زندہ رہنے کے سارے حقوق چھین لیے۔ شاید ان حقوق کے حصول کے لیے ہی میری ماں نے چاچو سے نکاح کی جرأت کر لی تھی لیکن اسے اس جرأت کی سزا اپنے اکلوتے بیٹے سے ہمیشہ کی جدائی کی صورت بھگتنی پڑی۔ میں ان دنوں بچہ ہی تو تھا۔ سب کی زبانی اپنی ماں کی برائیاں سن سن کر یقین کر بیٹھا کہ میری ماں نے دوسرا نکاح کر کے کوئی برا فعل کیا تھا جب ہی عدالت کے رُوبرو اسے بری طرح رد کر دیا۔ وہ جو مجھے دیکھ دیکھ کر جیا کرتی تھی میری بے رخی نہ سہہ سکی اور جان سے چلی گئی۔ دنیا کی نظروں میں چاہے اس نے خودکشی کی تھی لیکن میں جانتا ہوں کہ اس کا قاتل میں تھا۔ میں نے اسے صرف رد نہیں قتل کیا تھا۔ یہ جانتے ہوئے کہ وہ میرے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی، اسے خود سے محروم کر دینا قتل نہیں تو اور کیا تھا؟ احساسِ جرم اور شرمندگی میں ڈوبے وہ الفاظ ہانیہ منصور احمد کی آنکھوں میں اشک بھر لائے تھے۔

''ماں نے موت کو گلے لگا کر خود تو اذیت سے نجات حاصل کر لی اور میں اس کے بغیر سسک سسک کر جیتا رہا۔ اس کی جدائی مجھے رُلاتی تھی تو اس کے نام کے طعنے مجھے زخم زخم کر ڈالتے تھے۔ محبت اور توجہ سے محروم میں نے ہمیشہ ایک ایب نارمل زندگی گزاری اور اس ایب نارملٹی کو اپنی ذہانت اور قابلیت کے پردے میں چھپائے رکھا۔ دادا کتنے ہی سخت مزاج اور تنگ نظر آدمی تھے لیکن میرے حق میں اس اعتبار سے اچھے ثابت ہوئے کہ میری تعلیم پر خرچ کرنے میں کسی بخل سے کام نہ لیا اور اپنی زندگی میں ہی جائداد میں میرا حصہ مقرر کر دیا۔

میں وہ دن کبھی نہیں بھول سکتا جب طاہرہ میری زندگی میں آئی۔ وہ دادا کی پسند تھی لیکن میں خوش تھا کہ اب میرا بھی کوئی گھر اور خاندان ہوگا۔ میں نے اپنی علیحدہ پُرسکون دنیا بسانے کی خواہش میں، شادی سے قبل ہی اپنا گھر اور بزنس الگ کر لیا تھا۔ میں سب سے دور اپنی ایک الگ جنت بنانا چاہتا تھا لیکن طاہرہ کو میری یہ باتیں سمجھ نہیں آتی تھیں۔ وہ سمجھتی تھی کہ میں نے اسے گھر میں قید کر کے رکھا ہوا ہے اور باقی دنیا سے کاٹ کر صرف اپنا غلام بنائے رکھنا چاہتا ہوں۔ وہ مجھے ایب نارمل سمجھتی تھی اور شاید میں تھا بھی لیکن میں اتنا بُرا انسان نہیں تھا کہ میری بیوی میری وفاؤں کے بدلے مجھ سے بے وفائی کرتی۔'' یہ وہ مقام تھا جہاں پر کرب سے اپنی آنکھیں بند کر لینا ہانیہ کی مجبوری تھی۔

''میں اس کے اور گھر کے لیے محنت کرتا رہا اور وہ میرے حصے کی توجہ اور محبت کسی اور پر لٹاتی رہی۔ اسے اس وقت بھی مجھ سے کوئی ہمدردی محسوس نہیں ہوئی جب میں ذیابیطس میں مبتلا ہونے کے بعد موت کے واہمہ کا شکار ہو گیا۔ بخدا مجھے اپنے لیے موت سے ڈر نہیں لگتا تھا۔ میں صرف اس بات سے ڈرتا تھا کہ میرے پیچھے میرے بچے بے آسرا نہ ہو جائیں۔ میں نے یتیمی کاٹی تھی۔ اس خیال سے ہی میرا دل کٹنے لگتا تھا کہ اگر میرے بچوں پر بھی یہ وقت آن پڑا تو کیا ہوگا۔ مجھے ایک سالہ طارق کو یتیم تصور کر کے وہ منصور احمد یاد آنے لگتا تھا جس نے یتیم ہونے کے جرم میں سب سے ماریں کھائی تھیں۔ طاہرہ میرے ان واہموں اور خوف کو نہ سمجھ سکی اور میرا سہارا بننے کے بجائے مجھے نفسیاتی قرار دے کر خود اپنے دل کو بہلانے کا سامان کرنے لگی۔

''اس روز میں نے اس کی نصیر سے ہونے والی گفتگو سنی تو خود پر قابو نہ رکھ سکا اور بے اختیار ہی میرا اس پر ہاتھ اٹھ گیا۔ غصے میں، مجھے ہوش ہی نہیں رہا تھا کہ وہ کس حالت میں ہے اور کس جگہ کھڑی ہے۔ وہ میرے دھکے سے گری تو اس کے ساتھ ساتھ، اس کی گود میں موجود میرا طارق بھی موت کی گود میں چلا گیا۔ ان دونوں کی موت مجھے پاگل کر دیتی یا شاید میں خود ہی اپنے آپ کو قاتل کی حیثیت سے پولیس کے حوالے کر دیتا لیکن طاہرہ کی چھوڑی آخری نشانی نے مجھے ایسا کچھ بھی نہیں کرنے دیا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ مجھے طاہرہ کی چھوڑی ہوئی آخری نشانی کی حفاظت کرنی ہے، اس کی خاطر زندہ رہنا ہے۔ میں اپنی بیماری سے بھی لڑا اور احساسِ جرم سے بھی۔ میں نے ہانیہ کو ماں کے حصے کا بھی

پیار دینے کی خواہش میں اتنا چاہا، اتنا چاہا کہ اس کے بغیر سانس لینا بھی ناممکن لگنے لگا۔ وہ بھی میری دیوانی تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ میری عمر بھر کی محرومیوں کا ازالہ ہو گیا ہے لیکن......

لیکن میرا امتحان ابھی ختم کہاں ہوا تھا۔ وہ لڑکا مبشر جانے کہاں سے ہانیہ کی زندگی میں آ گیا تھا۔ وہ بھی اس طرح کہ وہ اس کی خاطر زخم کھاتی اور مجھ سے جھوٹ بولتی پھر رہی تھی۔ میں نے ماں اور بیوی کی بے وفائی کو معاف نہیں کیا تھا تو بیٹی کی بے وفائی کیسے سہتا ہاں بس اس بار میں نے راہ الگ چنی اور سزا بیٹی کے بجائے اس شخص کو دینے کا فیصلہ کیا جس نے میری بیٹی کو مجھے دھوکا دینے پر مجبور کیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس لڑکے کو کھونے پر اسے دکھ ہوگا لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ میں اسے سنبھال لوں گا۔ اسے میری خاطر اس لڑکے کا غم بھول کر جینا پڑے گا۔ میرا یہ اندازہ غلط بھی نہیں تھا۔ ہانیہ نے میری خاطر خود کو سنبھالنا شروع کر دیا تھا لیکن......

لیکن ماضی کے کرداروں کی طرف ایک بار پھر پلٹنے سے لگتا ہے میرے سارے زخم اُدھڑ گئے ہیں۔ میں جانتا ہوں مجھے آرام کی ضرورت ہے لیکن یادوں نے اس طرح سے حملہ کیا ہے کہ آنکھیں بند ہونے کے لیے تیار ہی نہیں ہیں۔ اب تو کچھ کچھ مجھے خود بھی اس بات پر یقین آنے لگا ہے کہ میں ایک نفسیاتی مریض ہوں جسے اس کی محرومیوں نے ایب نارمل بنا دیا ہے۔ میں اپنی زندگی میں محبت کا خلا پُر کرتے کرتے اس مقام پر آ کھڑا ہوا ہوں جسے خودغرضی کی انتہا کہا جا سکتا ہے۔ اب میں مظلوم نہیں ظالم بن گیا ہوں اور ضمیر کے آئینے میں دکھائی دیتا اپنا یہ روپ مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا۔ میں مر......'' اس لفظ کے بعد جملہ مکمل نہیں تھا۔ شاید اسی وقت انہیں دورہ پڑا تھا اور وہ درد کی شدت سے خود کو سنبھال نہ سکنے کے باعث کرسی سے نیچے لڑھک گئے تھے۔ پچھلے دو دن میں ہانیہ نے بے شمار بار ڈائری کے ان مندرجات کو پڑھا تھا اور ہر بار ایک نئی اذیت سے گزری تھی۔

''بی بی! کوئی انسپکٹر غیاث آئے ہیں اور آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔'' وہ جو پہلے ہی خود میں وہاں سے اٹھنے کی ہمت نہیں پا رہی تھی بالکل ڈھیلی ہو کر بیٹھ گئی اور آہستہ سے بولی۔

''انہیں یہیں بھیج دیں۔''

''جی بی بی۔'' ملازمہ واپس چلی گئی۔

''السلام علیکم۔'' تھوڑی دیر میں ہی اس نے ہلکی سی دستک کے ساتھ غیاث کی بھاری آواز سنی۔

''وعلیکم السلام۔ آئیں تشریف رکھیں۔'' اس نے خود کو سنبھالا۔

''مجھے آج ہی آپ کے والد صاحب کے بارے میں علم ہوا۔ سن کر بہت افسوس ہوا۔'' وہ تعزیت کے وہی روایتی الفاظ بول رہا تھا جو وہ ہر آنے والے سے سن چکی تھی۔

''آپ کی آمد کا شکریہ۔'' اس کا جواب بھی مشینی انداز لیے ہوئے تھا۔

''کیا ہوا تھا انہیں؟''

''ہارٹ فیل۔'' اس کا وہی سپاٹ انداز تھا۔ غیاث کو محسوس ہوا کہ اس نے اسے اخلاقاً ملاقات کے لیے بلا تو لیا ہے لیکن بات کرنے کے موڈ میں نہیں ہے۔ چند لمحے ان کے درمیان یونہی خاموشی میں گزرے پھر غیاث اپنی جگہ سے کھڑا ہوتا ہوا بولا۔ ''میں اب چلتا ہوں۔ ہو سکتا ہے دو چار دن میں آپ سے رابطہ کروں۔ پچھلے دنوں میں ذرا دوسرے کیسز میں پھنس گیا تھا تو مبشر کے کیس کو خاطر خواہ وقت نہیں دے سکا اب اس کیس پر جم کر کام کرنے کا ارادہ ہے۔ ان شاء اللہ جلد کوئی اچھی خبر سناؤں گا۔''

''وہ کیس سولو ہو گیا ہے انسپکٹر صاحب۔''

''کیسے؟'' غیاث کو حیرت کا جھٹکا لگا اور اس نے غور سے ہانیہ کو دیکھا۔ وہ کھوئی کھوئی سی بیٹھی کسی غیر مرئی نکتے پر اپنی آنکھیں جمائے ہوئے تھی۔ غیاث کو وہ بالکل بھی نارمل نہیں لگی۔

''آپ تشریف رکھیں۔'' وہ اسے تشویش سے دیکھ رہا تھا کہ اس نے پلکیں جھپکیں اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے اصرار کیا۔ غیاث دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

''یہ پڑھ لیں۔'' اس نے اپنے ہاتھ میں موجود ڈائری غیاث کو تھمائی اور خود یوں کرسی کی پشت کا دے سر ٹکا کر بیٹھ گئی جیسے بہت زیادہ تھک گئی ہو۔ غیاث نے کوئی بھی سوال کیے بغیر ڈائری کھولی اور توجہ سے پڑھنے لگا۔ مکمل پڑھ لینے کے بعد اس نے ایک گہری سانس لی اور ہانیہ کی طرف غور سے دیکھا۔ وہ بہت زیادہ ڈسٹرب لگ رہی تھی۔

''جو کچھ بھی ہوا افسوس ناک ہے۔ یقیناً تمہیں اپنے والد کی حرکت سے صدمہ بھی پہنچا ہے لیکن میں یہ تحریر پڑھ کر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ان کے ماضی کے حالات اور مسائل نے انہیں اس حال تک پہنچایا تھا۔ وہ اپنے اندر سے کبھی اس خوف زدہ بچے کو نکال ہی نہیں سکے تھے جو اپنے

بیاروں کو کھو دینے کے ڈر سے سہا رہتا تھا۔ کاش کسی نے ان کے اس مسئلے کو سمجھا ہوتا اور ان کا باقاعدہ علاج کروایا ہوتا تو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔" اس کے لہجے میں شدید افسوس تھا۔

"تو کیا پاپا سچ مچ نفسیاتی مریض تھے؟" ایک ایسی بیٹی جس کے لیے اس کا باپ دنیا کا سب سے بہترین انسان تھا حقیقت کو قبول کرنے سے ہچکچا رہی تھی۔

"تمہیں ماننے میں تکلیف ہوگی لیکن یہی سچ ہے۔"

"کاش میں پاپا کی اس ایب نارملٹی کا اندازہ لگا پاتی تو آج وہ ہمارے ساتھ ہوتے۔" اس کی آنکھوں سے آنسو لڑھکے۔

"وہ ایک ذہین انسان تھے اور نفسیاتی مریض اگر ذہین ہو تو بہت مشکل سے پکڑائی دیتا ہے۔" غیاث کا منصور احمد کے بارے میں تجزیہ بالکل درست تھا۔

"ممی یہ کام کرسکتی تھیں۔ اگر وہ پاپا کے دکھ کو محسوس کر کے ان سے بیزار ہونے کے بجائے ان کا علاج کروانے پر دھیان دیتیں تو بہت کچھ بدل سکتا تھا۔" خاندان ختم ہونے کا دکھ معمولی نہیں ہوتا۔ ہانیہ بھی اسی دکھ کے زیر اثر تھی۔

"بیتے ہوئے کل پر بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اب تمہیں آگے کے بارے میں سوچنا ہوگا۔" غیاث نے اسے حقیقت کا احساس دلایا۔

"آگے کے بارے میں کیا سوچنا ہے؟" اس نے ناسمجھی سے پوچھا۔

"میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تمہارے پاپا تمہاری مستقل نگرانی نہ بھی کرواتے ہوں تو کسی نہ کسی ذریعے سے وقتاً فوقتاً تمہارے بارے میں معلومات حاصل کرتے رہتے ہوں گے جب ہی انہیں مبشر کے بارے میں علم تھا۔ ہم ان کے اسٹاف میں ایسے شخص اور اس ٹرک ڈرائیور کو ڈھونڈیں گے جس نے ان کے حکم پر مبشر کو ہلاک کیا تھا۔ اول الذکر شخص کو تو خیر کوئی سزا نہیں دی جاسکتی لیکن ٹرک ڈرائیور یقینی طور پر سزا کا مستحق ہوگا۔"

"اور اگر میں کہوں کہ آپ اس کیس کو کلوز کردیں تو...؟" اس نے غیاث کی بات سن کر کچھ دیر سوچا اور پھر سر اٹھا کر سوال کیا۔

"تم ایسا کیوں چاہتی ہو؟"

"اصل مجرم پاپا تھے۔ وہ اس دنیا سے جا چکے ہیں۔ ان کا فیصلہ اب رب پر ہے تو بہتر ہے کہ ہم باقیوں کا معاملہ بھی اسی رب کی ذات پر چھوڑ دیں۔"

"یہ کسی طور مناسب نہیں ہوگا۔ یقینی طور پر اس ٹرک ڈرائیور نے مبشر کو ہلاک کرنے کے لیے رقم لی ہوگی اور اسے چھوڑ دینے کا مطلب ہوگا کہ ہم ایک اجرتی قاتل کو مزید لوگوں کو قتل کرنے کے لیے معاشرے میں آزاد چھوڑ دیں۔" غیاث نے دلیل کے ساتھ اس کے فیصلے کو رد کردیا۔

"میرے ذہن میں تھا کہ میں مبشر کی والدہ کو خون بہا ادا کردوں گی تاکہ کچھ تو پاپا کا بوجھ کم ہو۔" اس نے دھیمے لہجے میں بتایا۔

"تم نے بالکل ٹھیک فیصلہ کیا ہے۔ جو دنیا سے چلا گیا ہم اسے قانون کے کٹہرے میں تو نہیں کھڑا کرسکتے لیکن اپنی طرف سے جو مداوا کرسکتے ہیں، وہ ضرور کرنا چاہیے۔" غیاث نے اس کے فیصلے کو سراہا۔

"میں نے پاپا کے بزنس کو بھی کلوز کردینے کا فیصلہ کیا ہے۔ میں اکیلی اتنا سب کچھ نہیں سنبھال سکتی۔ اس لیے سوچا ہے کہ سب کچھ سیل کر کے رقم کسی فلاحی منصوبے وغیرہ میں لگا کر پاپا کے لیے ثواب جاریہ کا سلسلہ شروع کردوں۔" اس نے اپنے اگلے قدم کے بارے میں بتایا۔

"یہ بھی اچھا خیال ہے لیکن......"

"لیکن کیا؟"

"میں نے تمہیں مشورہ دیا تھا کہ جو کچھ ہو چکا، اسے بھول کر موو آن کی کوشش کرو۔"

"میں اس مشورے پر عمل کی کوشش کروں گی۔" اس نے اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو دیکھتے ہوئے آہستہ سے جواب دیا۔

"اگر اس کوشش میں کوئی تمہارا ساتھ دینا چاہے؟" غیاث کے معنی خیز لہجے نے اسے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے پر مجبور کیا۔ وہ آنکھوں میں محبت کے رنگ سجائے اس کے جواب کا منتظر تھا۔ وہ تھوڑی سی حیران ہوئی۔

"ایسے حیران ہو کر کیا دیکھ رہی ہو؟ ہم پولیس والوں کے سینے میں بھی دل ہوا کرتا ہے، یہ اور بات ہے کہ اس پولیس والے کا دل تم نے پہلی ملاقات میں ہی چرا لیا تھا اور اب یہ پولیس والا اس جرم میں تمہیں ہمیشہ کے لیے گرفتار کرنا چاہتا ہے۔" نگاہوں کی وارفتگی نے ہانیہ کی پلکیں جھکا دیں اور ہونٹوں پر ایک اثباتی مسکراہٹ پھیل گئی۔ زندگی ایک بار پھر اس کے لیے اپنی بانہیں وا کیے کھڑی تھی۔ ان کھلی بانہوں میں سمانے کے بجائے ماضی کے دھندلکوں میں بھٹکتے رہنا کفرانِ نعمت کے مترادف تھا اور وہ ناشکری نہیں تھی۔

❖❖❖